سخنوران اعظم گڑھ

(حصہ اول الف)

از

قمرالزماں مبارکپوری

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

نام کتاب:.........................سخنوران اعظم گڑھ (حصہ اول الف)

نام مؤلف:.........................قمرالزماں مبارکپوری

کمپوزنگ:.........................(قاری) عثمان غنی عادلؔ جہانا گنج

طباعت:.........................

طبع اول:.........................فروری ۲۰۱۵ء

صفحات:.........................۵۲۸

قیمت:.........................۲۲۳

رابطہ:.....جعفر لائبریری محلہ حیدرآباد، سکٹھی گیٹ، مبارکپور 276404، اعظم گڑھ (یوپی)

موبائل نمبر: 7617819321- 9236626995

ملنے کے پتے

انصاری بک ڈپو۔ بڑی ارجنٹی، مبارک پور، اعظم گڑھ
فہیم بک ڈپو۔ ریحان مارکیٹ صدر چوک، مئوناتھ بھنجن
قاضی اطہر اکیڈمی، الجامعۃ الحجازیہ، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ
البدر بک سینٹر۔ مہاجنی ٹولہ، سرائے میر ضلع اعظم گڑھ
کمال بک ڈپو کریم الدین پور متصل شمس العلوم گھوسی، مئو

انتساب

مرحوم ادبی انجمن
یوتھ لیگ مبارک پور کے اس عہدِ شباب کے نام
جس کی علمی سرگرمیوں نے
میری تربیت میں بالواسطہ حصہ لیا
میں اپنی نسل کی تمام ادبی وشعری
علمی وفکری جہت کو
یوتھ لیگ کی زندہ روایت کی توسیع خیال کرتا ہوں

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

قمرالزماں مبارکپوری

فہرست

مرے کاندھے پہ ہے احساں ان کا

یہ بندۂ حقیر سراپا تقصیر اپنے رب کے حضور ہزاروں ہزار شکر اور اعتراف احسان کے ساتھ حاضر ہے جس نے ایک دیرینہ منصوبۂ علمی کی تکمیل کی توفیق بخشی۔ یہ اسی کی کارسازی ہے کہ یہ کتاب اہل علم کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کرنے کی سعادت نصیب ہورہی ہے اگر مالک لوح وقلم کی توفیقات شامل حال رہیں تو بقیہ پانچوں جلدوں کی اشاعت کی صورتیں بھی نکل آئیں گی۔

اس کتاب کی تیاری میں راقم کے اتنے مددگار ہیں جن کی نام شماری بڑی مشکل ہے پھر بھی بہت سے ایسے صاحبان علم ہیں جنھوں نے حالات وکلام کی فراہمی اور مشورہ دینے میں کافی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی کا مظاہرہ کیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنے والد محترم خلیل الرحمٰن فاروقی مرحوم کی خود نوشت قصص الجمیل فی سوانح الخلیل مع اضافات جدیدہ نجم الرحمٰن فاروقی کا نیا ایڈیشن راقم کے استفادہ کے لئے بھجوایا جس کا شکریہ نہ ادا کرنا احسان فراموشی ہوگی۔ راقم ان تمام حضرات کا بھی ممنون ہے جنھوں نے اپنی کتابوں اور بیاضوں سے استفادہ کی صورت پیدا کی۔ ورنہ یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتا۔

راقم ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا خصوصیت سے ممنون ہے کہ انھوں نے قدم قدم پر رہنمائی فرمائی اور کتاب کی اشاعت میں زبردست مدد پہنچائی۔ محمد عمیر الصدیق ندوی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ڈاکٹر شباب الدین، مولانا شمیم الحسن پرنسپل جوادیہ کالج بنارس، الحاج اشتیاق احمد راشد اعظمی سرائمیر، عبدالاحد ساز بمبئی، احرار احمد اعظمی بمبئی، سید جعفر عسکری، رضوان اللہ فاروقی، مولانا محمد عاصم اعظمی، مولانا اشتیاق احمد گھوسوی، سلام فیضی گورکھ پوری، ڈاکٹر شفیق اعظمی سرائمیر، ڈاکٹر انور شفیق اعظمی، ڈاکٹر شکیل احمد مئو، الحاج ماسٹر مظہر علی چشتی، جاوید چشتی، جاوید سامر مئو، کبیر الدین، نادار اعظمی، مولانا محمد افروز قادری چریا کوٹی، برادر عزیز ڈاکٹر اختر الزماں، عبدالرحمٰن قمر عباسی، مولانا فضل الرحمٰن اصلاحی ظلی، مشتاق احمد بیدل مئو، ڈاکٹر حبیب اللہ، مولانا ریاض الحق قاسمی مئو، محمد قاسم جوادی، قاری شفیق احمد مبارک پوری، مولانا انعام الرحمٰن، مولانا ابوالقاسم عبدالعظیم نے بعض ماخذ تک پہنچنے میں راقم کو بڑا سہارا دیا۔ مولانا افروز قادری، عارف اعظمی اور مولانا قاضی محمد سلمان مبارک پوری ابن مولانا قاضی

اطہر مبارک پوری اور منصور اعظمی نے کمپوزنگ میں بھی مدد بہم پہونچائی ہے۔ان کرم فرماؤں کے لئے دل میں بے پناہ جذبات تشکر موج زن ہیں۔

مولانا مظہرالحق مدنی "راقم" کے ماموں زاد بھائی عزیزم ابوالقاسم سلمہٗ، ڈاکٹر عبدالحنان رہبر، زیست یار فیصل، برادرِ عزیز شمس الدین ساقی ادیبی، مولانا فیض احمد، عابد سلیمان ابدانؔ، الحاج ماسٹر بدیع الزماں املوبھی وقتاً فوقتاً راقم کے دست و پا بنے اور تحقیق کا ہفت خواں طے کرنے میں آسانیاں پیدا کیں۔

قاری عثمان غنی عادلؔ جہانا گنجی بھی شکریے کے خاص مستحق ہیں جن کی نظر فنی باریکیوں اور کمپیوٹر کی خوبیوں خامیوں پر بھی ہے۔انھوں نے راقم کو بہت سے امتحان سے بچا لیا۔اللہ ان کی تمام جائز تمنائیں پوری فرمائے۔آمین

اس کتاب میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ کسی طرح کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہو اور ہر پہلو پر نظر رہے لیکن کام تحقیق و تلاش کا ہے۔جو کبھی حرف آخر نہیں ہوتا اور نئی دریافتوں کا امکان ہمیشہ رہتا ہے۔ماخذ کی کمی اور خود راقم کے محدود وسائل بھی سد راہ بنے۔اس لئے اہل نظر سے باادب التماس ہے کہ جو غلطی یا کمی بیشی نظر آئے اس سے راقم کو آگاہ فرمائیں۔تاکہ نقش ثانی کو بہتر صورت میں پیش کیا جاسکے۔

قمرالزماں مبارک پوری

۳۰/جنوری ۲۰۱۵ء جمعہ

مقدمہ

صوبہ اتر پردیش کا مشہور مشرقی ضلع اعظم گڑھ گومتی اور گھا گھرا ندیوں کے درمیانی حصے میں واقع ہے۔ جس کے بیچوں بیچ ٹونس (تمسا) ندی بہتی ہے۔ یہ علاقہ بڑا زرخیز اور سرسبز وشاداب ہے۔ جاڑا، گرمی، برسات تینوں موسم اس سرزمین کو متاثر کرتے ہیں۔

تمام تاریخی شواہد اور دستاویزی شہادتوں سے انحراف کرنے والے فرقہ پرست کچھ مخصوص نظریات اور فرقہ وارانہ رجحان کا زہر پھیلانے کی غرض سے اعظم گڑھ کو آریہ نگر کا نام دینے کی مہم کو اندر ہی اندر ہوا دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کو مسلم دہشت گردی کی نرسری کہہ کر بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ اعظم گڑھ کی کتنی عظیم اور انسانیت دوست روایت ہے اس کا ان کو ادنیٰ درجے کا بھی علم نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ ضلع صلح کلی، مخلوط معاشرت، قومی یکجہتی اور تہذیبوں کی رنگا رنگی کا نہایت خوش نما گلدستہ ہے۔ یہاں کی کثرت میں وحدت کا ایک ایسا نظر فریب اور جنت نگاہ شفق زار ہے جو جریدۂ عالم کی پیشانی پر اقبال سہیل کے اس بصیرت افروز شعری قول کو جلی حرفوں میں لکھ چکا ہے کہ

مل جل کے بہ رنگِ شیر وشکر دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیب کا سنگم ہوتا ہے

اعظم گڑھ اس معنیٰ میں بھی اپنی ایک الگ شان رکھتا ہے کہ اس کی آغوش میں صرف ایک قوم، ایک نسل اور ایک ہی رنگ وعلاقہ کے لوگ نہیں پلتے اور نہ ہی یہاں کے باشندے ایک مذہب کے پیروکار ہیں اور نہ ہی ایک زبان بولتے اور لکھتے ہیں۔ یہ ضلع ایک مختصر خطۂ ارضی ہونے کے باوجود اپنے گوناگوں تمدنی منظرناموں کے حوالے سے دامان باغبان وکف گل فروش اور حریف تمکین وہوش ہے۔ یہ اپنے تنوع، نسلی اختلاط، مذہب وعقیدہ، رسم ورواج، صناعی وطباعی، سیاست وتجارت اور کثیر رنگی تمدنی اقدار کے مثبت امتزاج کے اعتبار سے براعظم ایشیا کی رنگا رنگی کا دلکش نمونہ ہے۔ یہاں کے لوگ بعض امور ومعاملات میں ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں پھر بھی اپنی حقیقت میں ایک قوم ہیں۔ یہاں کی انیکتا میں ایکتا کی جوت ہے۔ اس خصوصیت نے اہل اعظم گڑھ کے مزاج میں فلسفیانہ تفکر، شاعرانہ جذباتیت، منفی جذبات

وتصورات سے انحراف، خلاقانہ وصناعانہ شعور وادراک اور صوفیانہ وراہبانہ قناعت پسندی وسادہ لوحی کے رنگ کو گہرا کردیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر طرح کی علمی وتمدنی، فکری وفنی، مذہبی ولسانی، سماجی وسیاسی سرگرمیوں میں دریا کے بہاؤ جیسی تیزی آئی ہے۔ یہاں کے ارباب دانش وحکمت نے تمام علوم وفنون کی توسیع وترقی میں نمایاں حصہ لیا اور اپنی انفرادیت واولیت کے نقوش کی کہکشاں جگمگائی۔ یہی وجہ ہے کہ علم وفضل اور شہرت نے ہمیشہ اس دور افتادہ ضلع کا طواف کیا ہے۔

اس کی تہذیبی دین کا تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ یہ ضلع عصری علوم میں بھی اپنی قیادت وامامت کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس کو سائنسی خدمات کے حوالے سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ اس کی بزم دوشیں کا تذکرہ تو حکایت لذیذ تر ہے ہی اس کے حال کا آئینہ خانہ بھی بڑا رنگین اور دل آویز ہے۔ ایک چھوٹے سے گانو مہوارہ (اعظم گڑھ) کے پروفیسر اسرار احمد (۱۹؍جولائی ۱۹۴۰ء۔ ۲؍اپریل ۲۰۱۰ء) کو لوگ ان کی علمیت وذہانت کی وجہ سے نئے ہندوستان کا پروفیسر نیوٹن کہتے تھے اور واقعتاً وہ اس درجے کے تھے بھی۔ اسی سرزمین کی آغوش کے پالے ہوئے ڈاکٹر طارق صاحب کی سائنسی خدمات وتجربات کا دائرۂ علمی وعصری دنیا کے لئے ایک روشن ستارہ سے کم نہیں ہے۔ عروس البلاد بمبئی کے آنچل میں قائم ہندوستان کے سب سے بڑے سائنسی مرکز بھابھا انومک ریسرچ سینٹر کی قبائے ناموری میں وہ اپنے سائنسی جوہر کمال کے گل بوٹے ٹانک رہے ہیں۔ دین ومذہب اور علم وادب کی سرزمین جیراج پور کے ایک علمی خانوادے کے فرزند ڈاکٹر شمیم جیراج پوری کی سائنسی عبقریت سے کون ہے جو واقف نہیں۔ سائنسی تحقیق کی دنیا میں موصوف جہان نو کی دریافت کے حوالے سے کولمبس کی شہرت وناموری کو اپنے نام کر چکے ہیں۔ وہ زولوجیکل سروے آف انڈیا کلکتہ کے سب سے کم عمر ڈائرکٹر اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی حیدرآباد کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی تحقیق ومطالعہ کے نتائج کو سائنسی دنیا میں بڑی وقعت حاصل ہے۔

ابھی چند دنوں پہلے ضلع اعظم گڑھ کے نامور صحافی وادیب اور مفکر ودانشور ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی پروفیسر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے اپنے ایک انٹرویو میں توجہ دلائی ہے کہ

> "شمیم جیراج پوری کی آپ حیثیت دیکھئے کہ سائنس کے میدان میں دو چار آدمیوں کے نام آپ انگلیوں پر گنیں گے تو اس میں شمیم جیراج پوری کا بھی نام ہوگا۔ فزکس کی دنیا میں ایک بڑا نام عبدالسلام صاحب کا ہے ان کا کہنا ہے کہ میں ہندوستان کو صرف پروفیسر اسرار احمد کی وجہ سے جانتا

ہوں۔ فزکس میں ان کی جو فائنڈنگس رہی ہیں، ان کے جو اکتسابات رہے ہیں، جس طرح کے انھوں نے نتائج اخذ کئے ہیں انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسی طریقے سے بائیوٹیکنالوجی میں محمد صلاح الدین صاحب تھے، فی الحال فزکس ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر توحید احمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو نوبل انعام مل سکتا ہے۔ یقین جانئے ایک لمبی فہرست ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سائنس کے حوالے سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی جو خدمات رہی ہیں وہ زیادہ تر اعظم گڑھ کے حصے میں جاتی ہیں"۔(۱)

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ کیمیکل انجینئرنگ کے سابق چیرمین ڈاکٹر محمد ادریس کا تعلق مئو ناتھ بھنجن سے ہے۔ کیمیکل انجینئرنگ میں ان کی تحقیق کے نتائج ملکی اور بین الاقوامی جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں جنھیں سائنس کا ذوق رکھنے والوں کے طبقے میں بڑا وقار و اعتبار حاصل ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات و تحقیقات سے سائنس کے کئی در وا کئے ہیں۔ موصوف اپنی گونا گوں خوبیوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے بہت سے ملکی و غیر ملکی سائنسی و تحقیقی اداروں اور کمیٹیوں کو اپنی نمائندگی سے سرسبز کئے ہوئے ہیں۔

دہشت گردی اور مسلمانوں کی تعلیم و معاشرت کو لے کر شبہات کے درمیان گھرے اس ضلع کا ایک چھوٹا سا گانو بندول ہے۔ علامہ شبلی کے حوالے سے اس مقام کی جو حیثیت و خدمات ہیں وہ اہل علم پر روشن ہیں۔ اس کے باشندوں کی اعلیٰ تعلیم اور ہندو بیرونِ ہند میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کا جو امتیاز و وقار ہے اس کی برابری میں یہاں کا کوئی دوسرا گانو اس ضلع میں نہیں ہے۔ نگاہِ عبرت سے دیکھیں تو اس گانو نے ہائی کورٹ کو چیف جسٹس دیا ہے۔ سر اقبال احمد ۱۹۴۰ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے۔ ان کے علاوہ ابوسعد احمد متوفی ۱۹۷۰ء جج کے عہدے پر متمکن تھے۔ انھیں کے لائق صاحبزادے نسیم احمد آئی اے ایس مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے جو اس وقت چیرمین قومی اقلیتی کمیشن حکومت ہند کے عہدے پر فائز المرام ہیں۔ ۱۹۰۳ء میں سول جج کے روپ میں جنید احمد اور سابق آئی جی اسلام احمد خاں کے علاوہ کناڈا میں شفاعت احمد اور انگلینڈ میں مسعود عالم گانو کا نام روشن کر رہے ہیں۔ اسی گانو کے ڈاکٹر اسفر کویت کی وزارت صحت میں ہیں۔ ظفر عالم، صبور عالم اور صبیح عالم حکومت کویت سے متعلق ہو کر انجینئر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں تو اظہر نعمانی پاکستان بجلی بورڈ کے چیرمین ہیں۔ ظفر عالم نعمانی روڈویز میں اے، آر، ایم اور قمر عالم ریلوے حفاظتی فورس میں ایس پی ہیں۔ امتیاز احمد بندول ہی کے ہیں جو پوسٹ ماسٹر جنرل

ہیں۔ان کے علاوہ مختلف میدانوں میں سو سے زیادہ ناموران قوم وملت اس کائنات کا حسن بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں جن کا نام بخوف طوالت ترک کیا جارہا ہے۔

یہ ضلع چھوٹے چھوٹے دیہاتوں پر مشتمل ہے لیکن یہ دہقانی علاقے بھی اپنے سینے میں گنج ہائے گراں مایہ چھپائے ہوئے ہیں۔بغداد و بصرہ،مصر وحجاز، یونان وروما،شیراز وصفاہاں،سمرقند وبخارا کے علوم کی دولت اس دیار کے علمی وفنی تمول کا سبب ہے۔ چریاکوٹ کسی زمانے میں ہندوستان کا یونان تھا۔ یہاں کے علماء کے درس میں سنسکرت شامل تھی،اس کے علاوہ انگریزی، ہندی،سریانی،ترکی،کلدانی، جرمن،فرنچ اور لاطینی زبانیں بھی علمائے چریاکوٹ کی دسترس میں تھیں۔خود سرسید کے جو خطوط مولانا عنایت رسول عباسی چریاکوٹی کے نام لکھے گئے تھے ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین پر نازل کتابوں توریت، زبور، انجیل اور صحف آسمانی کے حوالے سے سرسید کا مرجع علم یہی شخصیت تھی۔ یہ عبرانی کے زبردست عالم تھے۔ سرسید کو عصری درس گاہ قائم کرنے کا تصور بھی انھیں کثیر الجہات عالم کے مکتب کی کرامت تھی۔اقبال سہیل نے بھی واشگاف انداز میں تحریر کیا ہے کہ

> ”سرسید کے ہم عصر بلکہ استاد اور تحقیقات علمی میں ان کے خضر راہ مولانا عنایت رسول چریاکوٹی مرحوم تھے جو اپنے وقت کے بحر العلوم اور بڑے پایہ کے مصنف تھے،سرسید کی خطبات احمدیہ کا بیشتر حصہ دراصل مولانا عنایت رسول کی بے مثل تصنیف بشریٰ سے ماخوذ ہے“۔(۲)

علامہ شبلی کی عبقریت مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کی علمیت وذہانت کا پرتو تھی،مولانا فاروق کی درسگاہ علمی سے مولانا جواد بہاری،اکبرالہ آبادی،مولانا عبدالباری فرنگی محلی،مولانا جمال الدین افغانی،جسٹس محمود، جسٹس سرشاہ محمد سلیمان، جسٹس سرسید عبدالرؤف، مولانا عظمت اللہ فرنگی محلی، مولانا محمد شاہ سلیمان پھلواری،عبدالوہاب بہاری منطقی،مولانا محمد عثمان فلسفی،مولانا احمد حسن کان پوری،اقبال سہیل،مولانا نیاز فتح پوری،حکیم نابینا، ڈاکٹر مختار انصاری اٹھے اور قوم وملت کے افق پر چھاگئے۔علامہ اقبال،مولانا ابوالکلام آزاد،سید سلیمان ندوی، بابائے اردو مولوی عبدالحق،مولانا حمید الدین فراہی،عبدالسلام ندوی، اقبال سہیل، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی،مولانا ضیاء الحسن ندوی،خواجہ عبدالواحد،عبداللہ عمادی،مولوی مسعود علی محویؔ،علامہ سید غلام رسول قوسؔ حمزہ پوری،مولوی بہادر علی،مولوی داؤد بھائی،مولوی عزیز مرزا مرحوم،خواجہ غلام الثقلین مرحوم، سید سجاد حیدر یلدرم،مولوی سید محفوظ علی بدایونی، شیخ محمد عنایت اللہ،مولانا ظفر علی خاں،مولوی ہدایت

اللہ (سی، پی) چودھری خوشی محمد ناظرؔ، مولانا محمد علی جوہرؔ وغیرہ شبلی کی نگاہِ جوہر شناس کی دریافت ہیں۔ مہدی افادی نے اردو کے عناصر خمسہ میں جن پانچ ناموں کا ذکر کیا ہے ان میں سرسید، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد (مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد کو چھوڑ کر) یہ تینوں اعظم گڑھ کے ہی فیض یافتہ ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے مولانا احمد علی عباسی چریا کوٹی کے تلمیذ رشید مولانا نصر اللہ خاں خورجوی سے فیضانِ علم حاصل کیا تھا اس لئے یہ بھی ایک واسطہ سے اسی دیارِ علم کے تربیت یافتہ ہوئے۔ گویا اردو کے عناصر خمسہ کا غالب حصہ اعظم گڑھ کا فراہم کردہ یا تشکیل شدہ ہے۔ جان گلکرائسٹ اردو کا پہلا لغت نگار، قواعد کا مرتب اور اردو لسانیات کا مدون مانا جاتا ہے اس کو بھی مولانا احمد علی عباسی چریا کوٹی، ان کے صاحبزادے مولوی نجم الدین عباسی چریا کوٹی اور مولانا قاسم علی عباسی چریا کوٹی کے خوانِ علم کا زلہ ربا کہا جاتا ہے۔

یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ علی گڑھ کے خوشہ چینوں میں سرسید مرحوم کی شخصیت سے اکتسابِ فیض ونور کرنے والوں کے مقابلہ میں علامہ شبلی نعمانی سے متاثر و مستفید ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جس کے اثرات ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ سے لے کر آج تک تسلسل کے ساتھ باقی ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے علم وعمل کی دنیا میں اپنی فکر ومردم گری کے جولازوال نقوش علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، انجمن ترقی اردو (ہند) شبلی کالج اعظم گڑھ، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، دارالمصنفین اعظم گڑھ کی لوحِ جبیں پر ثبت کئے ہیں۔ آج بھی ان کی تابانی سے تصنیف وتالیف، تنقید وتحقیق، تاریخ وتذکرہ، صحافت وسیاست، معاشرت وتمدن، تعلیم وتعلم کا جہان روشن ہے۔

اردو زبان میں جدید نظم نگاری اور چھوٹے چھوٹے سیاسی وسماجی، قومی وملی، تعلیمی وتمدنی، تاریخی وعمرانی اور اخلاقی واقعات وحادثات کو بنیاد بنا کر شعر کہنے اور قطعات موزوں کرنے کی جو روایت چلی وہ سراسر علامہ ہی کی دین ہے۔ علامہ اقبال، اقبال سہیل، چکبست، احسان اللہ عباسی، محمد احمد اعظم گڑھی اور دوسرے شاعروں کے یہاں شبلی کی آواز بازگشت صاف سنائی دے رہی ہے۔

حقیقت میں اربابِ قلم کے تاثرات کا اجمال واختصار یہ ہے کہ اعظم گڑھ ایک ایسا گہوارۂ علم ودانش اور دیارِ شعر ونغمہ ہے جس کی آغوش میں عظیم دانشور، مفکر، موجد، انجینیر، سائنس داں، صاحبِ تدبیر وفراست، اعیانِ حکومت ودولت، ماہرین سیاست وریاست، موسیقار، گلوکار، رقاص، مصور، معمار، مجسمہ ساز، ظروف گر، صناع، پارچہ باف، نباض، حاذق طبیب، ڈاکٹر، سرجن، ادیب، شاعر، صحافی، تنقید

نگار، پروفیسر، ماہرین ریاضیات ولسانیات، اولیاء، علماء، صوفیاء، مدرس ومعلم، خطیب، مترجم، حاشیہ نگار، غرض کہ علم وفن کی تمام شاخوں کونہال کرنے اورثمر بار بنانے والوں نے آنکھیں کھولیں اورتواتر کے ساتھ ہر دور میں اہم خدمات انجام دیں اورآج بھی مبدأ فیاض کی فیاضی سے یہ سلسلۂ تکمیل کائنات وجہاں سازی جاری ہے۔اعظم گڑھ کے حوالے سے اقبال سہیل کا یہ شعر بچے بچے کی زبان پر ہے۔

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضانِ تجلی ہے یکسر - جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے

انھیں کی نظم کے یہ دوشعر بھی اعظم گڑھ کے تفرد پر روشنی ڈالتے ہیں

اجُدھیا سنگھ نے اگر ہندی ادب کا نام اچھالا ہے - تو سکہ نام شبلی کا عرب سے تابہ ایراں ہے

ہماری فارسی پر اہل ایراں ناز کرتے ہیں - ہراک دیہات اپنا فخر شیراز وصفاہاں ہے

یہ حقیقت بھی ناقابل فراموش ہے کہ کوئی ملک یہاں کے باشندوں سے خالی نہیں ہے۔تعلیم وتعلم کی کارگاہ عہد سازی اورمراحل مردم گری سے آگے جاکر صنعت وتجارت، قانون وعدالت، سائنس وٹکنالوجی اورحکومت وسیاست کی بساط پر بھی یہ ضلع اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا ہے۔ہندوستان کی کوئی یونی ورسٹی، ادارہ، اخبار ورسالہ، اور درس گاہِ فکر وخیال اس کی دانشوری سے محروم نہیں ہے۔ہرتحریک اس خطے کی فکری وعملی سرگرمیوں سے نمو پزیر ہوئی ہے۔بادشاہوں، راجاؤں، نوابوں، جاگیرداروں اور انگریزوں کے نظم ونسق، جنگ وجدل اورتعلیم وتدریس کے صیغے میں اعظم گڑھ کا عمل دخل کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

ہندوستان کی پہلی اور دوسری جنگ آزادی، بھگتی تحریک، تصوف، سماجی اصلاح کی سرگرمی، اسمٰعیل دہلوی اورسید احمد رائے بریلوی کی تحریک جہاد، سید محمد جون پوری کی مہدوی تحریک، اکبر کے دین الٰہی کا غلغلہ، دین الٰہی کی بیخ کنی کے لئے علمائے فحول کی مہم جوئی، جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی، تحریک سرسید، تحریک ندوہ، تحریک جدوہ، تحریک مدح صحابہ، تحریک قدح صحابہ، تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون، سبھاش چندر بوس کی انقلابی تحریک، تحریک مسلم لیگ، تحریک جمعیۃ العلماء، آریہ سماجی تحریک، گئو رکھشنی کی تحریک، مشنری تحریک، تحریک ردِشرک وبدعت، تحریک تحفظ عقائد، تحریک سنیت، تحریک تحفظ ناموس انبیاء علیہم السلام، تحریک مخالفت قادیانیت، تحریک اہل حدیث (سلفیت) کمیونسٹ تحریک، تحریک انسداد فسادات، تحریک بازیابی حقوق، ذات پات کے تشخص کی تحریک، رام مندر تحریک، تحریک تحفظ بابری مسجد، جے پرکاش نرائن کی تحریک، تحریک جماعت اسلامی، آر، ایس، ایس کی تحریک، تحریکِ تحفظ اردو،

ادب کی رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، تحریک جدیدیت، مابعد جدیدیت کی تحریک، تحریک اصلاح زبان، تحریک قیام مدارس ومکاتب، تحریک اصلاح نصاب، تحریک مسلم پرسنل لا، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کی تحریک، اور سماجی انصاف کی تحریک میں یہ ضلع پیش پیش رہا۔

اس ضلع کا خمیر غیرت وعزت نفس کی مٹی سے اٹھا ہے۔ اس نے ہمیشہ شاہوں، راجاؤں، نوابوں، جاگیرداروں، چکلہ داروں، زمینداروں کے ظلم وتشدد کی مخالفت کی ہے۔ اعظم گڑھ کے بانی خاندان نے مغل بادشاہوں سے بھی نبردآزمائی کی، لکھنؤ کے نوابوں سے بھی اس کی نہیں نبھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور برٹش گورنمنٹ کی عوام مخالف پالیسیاں بھی اس کے احتجاج کی زد میں رہیں۔ حکومت اودھ نے مذہب شیعہ امامیہ کی زبردست تبلیغ وتحریص کے مقصد سے اہل سنت کی جاگیروں اور معافیوں کی ضبطی شروع کررکھی تھی۔ جولوگ سرکاری مذہب وعقیدہ قبول کر لیتے تھے انھیں علیٰ حال سابق تمام مراحم خسروانہ حاصل رہتے تھے اور جو اپنے عقیدہ ومسلک سے منحرف نہیں ہوتے تھے ان پر عتاب نوابی نازل ہوکر ان کی تمام مراعات کی منسوخی کا سبب بن جاتا تھا۔ اس ضلع کے راسخ العقیدہ علمی خانوادوں نے اس کارروائی کی شدت سے مخالفت کی۔ اس ضلع نے انگریزوں کی حمایت بھی کی جس کے نتیجے میں انگریز دوست انعام واکرام کے مستحق ٹھہرے اور جو حریت پسند تھے ان سے جینے کے تمام حقوق چھین لئے گئے۔ مومن انصاری اور پسماندہ طبقے انگریزوں کے ظلم وستم کا خاص نشانہ بنے کیوں کہ انھیں میں انگریز دشمنی کی جڑیں مضبوط تھیں۔ ان تمام کے نقوش اعظم گڑھ کی شاعری میں نمایاں ہیں یہ الگ بات ہے کہ اساطیر وروایات، تلمیحات واستعارات کے پردے میں اشعار کہے گئے ہوں اور راست بیانی سے احتراز کیا گیا ہو۔ جس کی وجہ سے محرکات شعری عام نگاہوں سے اوجھل رہ جاتے ہوں۔ لیکن ظلم واستحصال کے خلاف یہاں کے شاعروں نے اپنی احتجاجی شاعری کی لے ہمیشہ تیز رکھی۔ یہاں کی احتجاجی شاعری بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

یہاں کی شاعری میں چکلہ داروں اور محصول کی وصولی کرنے والے زمینداروں، جاگیرداروں، رئیسوں اور ان کے مقرر کردہ حاکموں کی غیر انسانی حرکتوں، تعیش پسندی اور جنسی استحصال کے خلاف بھی شدید جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ اس دیار کے لوک گیتوں کا قدیم سرمایہ جو ضبط تحریر میں نہیں آسکا اور سینہ بہ سینہ چلتا رہا ،اس طرح کے باغیانہ تیوروں اور غم وغصہ کے جذبات بلکہ کف دردہن انداز کلام سے بھرا پڑا تھا۔

تاریخ کے حوالے اور پرانوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ پورا علاقہ کسی دور میں

جنگلوں سے گھرا ہوا تھا جہاں سادھوسنت اور سنیاسیوں نے اپنے اپنے طور پر ذکر و عبادت اور دھیان گیان کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ لوگوں نے اپنے اپنے آشرم اور مٹھ بھی تعمیر کئے تھے۔ اسی لئے اس دیار کے لوگوں کے دلوں اور ان کی معاشرتی زندگی پر آج بھی مذہب کی حکومت اور روحانیت کا غلبہ ہے۔ صوفیوں سنتوں کی تعلیم سے رواداری اور قومی یکجہتی کے جو رجانات پیدا ہوئے انھوں نے یہاں کی معاش و معیشت اور تمدن و معاشرت کو استحکام بخشا۔

وقت بدلنے کے ساتھ اعظم گڑھ کے سیاسی اقتدار کی سمت قبلہ بھی بدلتی رہی ہے۔ اعظم گڑھ کا علاقہ قدیم زمانے سے اجودھیا کے سورج بنسی راجپوتوں کی حدود مملکت میں شامل تھا یہی سبب تھا کہ اسلامی فوج کشی کے وقت اکثر راجپوت راجپوتانہ وغیرہ سے بھاگ کر اعظم گڑھ، فیض آباد وغیرہ میں اقامت گزیں ہوئے چنانچہ اس نواح میں ان کی بستیاں آج بھی موجود ہیں۔ چریا کوٹ میں بھی راج پوتوں کی ایک ذات چیرا قوم تھی۔ اس کی چیرہ دستیوں سے بنارس کے نواح تک کے باشندے اور راہگیر عاجز رہا کرتے تھے۔ یہ دن میں سوتے تھے اور رات میں لوٹ پاٹ کی وارداتیں انجام دیا کرتے تھے ان کے جانوروں کے پانی پینے کے لئے الگ الگ تالاب ہوا کرتے تھے اور ان کے رہنے کے واسطے اپنے اپنے کوٹ (محل) ہوتے تھے۔ یہ قوم بڑی سرکش اور ظالم تھی۔

وقت بدلا تو چندر بنسی راجا پُرورُ وا، راجا نُہش، راجا یایات نے سورج بنسی راجا کو شکست دے کر اس علاقے کو اپنی وسیع سلطنت میں شامل کر لیا۔ گھوسی میں راجا نُہش کے قلعہ کی کچھ نہ کچھ باقیات آج بھی موجود ہیں۔ بڑی ریاستوں کے قیام کے زمانے میں یہ ضلع کاشی اور کوشل ریاست کا حصہ بنا رہا۔ مگدھ کی وسیع حکومت میں یہ علاقہ مگدھ ریاست کے زیر نگیں رہا۔ پھر پربھوکھاری گپت خاندان اور شُک بنس موریا خاندان کے راجاؤں کے ماتحت ہوا۔ موضع کُڑھنی تحصیل گھوسی کی کھدائی میں نکلی تانبے کی تختی کے مطابق یہ ضلع مہاراجا ہرش کے زیر اقتدار رہا اور مَلن راجاؤں کے بھی قبضے میں تھا۔ قنوج (فرخ آباد) کے راجاؤں نے بھی اس پر حکومت کی۔ تحصیل لال گنج کے قصبہ دو بھاؤں میں دستیاب ایک دستاویز کے مطابق ضلع کے اس علاقہ پر مَہڑ راجاؤں کی بھی حکومت رہی۔ اس پر گووند چندر دیو کی بیوی گُوسل دیوی کا نام اور ۱۱۶۴ء کندہ ہے۔ اس طرح ۱۱۸۴ء تک اس علاقے پر قنوج (فرخ آباد) کے راجا جے چندر کا قبضہ و تسلط قائم تھا۔ ضلع کے بعض مقامات پر چیرو راجا اور راج بھر راجاؤں کی عملداری تھی۔ راج بھر راجا گھوسل دیو

نے گھوسی میں قلعہ بنوایا تھا۔ راجہ موہن دیو نے محمد آباد میں قلعہ کی تعمیر کی۔ چریا کوٹ میں دستیاب سکوں کے مطابق چیرو راجا چریا نے قلعہ، تالاب اور مندر کی تعمیر کرائی۔ ۱۱۹۳ء میں محمد غوری نے قنوج (فرخ آباد) کے راجا جے چندر دیو کو مغلوب کیا اور کچھ دنوں کے بعد اسی راجا کے بیٹے راجا ہریش چندر کو اس دیار کی زمام اقتدار سونپ کر واپس چلا گیا۔ سلطان شمس الدین التمش (متوفی ۲۰ر شعبان ۶۳۳ھ/ مئی ۱۲۳۵ء) نے ۱۲۲۶ء میں قنوج (فرخ آباد) پر قبضہ کیا تب سے یہاں دہلی کی حکومت کا قبضہ رہا۔ ۷۷۲ھ/ ۱۳۹۴ء میں جون پور شہر کی بنیاد گزاری کے بعد فیروز شاہ تغلق (جونا شاہ) متوفی ۷۹۹ھ نے اپنے لڑکے ظفر کو جون پور کا صوبیدار مقرر کیا تو اعظم گڑھ اس کے ماتحت ہو گیا۔ شرقی سلطنت کے آغاز ۱۳۹۳ء سے ۱۴۷۶ء تک یعنی شرقی بادشاہوں کے خاتمۂ اقتدار تک یہ ضلع جون پور کا حصہ بنا رہا۔ اسی لئے اس ضلع کے علماء جون پوری کی نسبت سے تذکروں میں یاد کئے جاتے رہے ہیں۔ ۱۴۷۶ء میں سلطان بہلول لودھی نے جون پور کو دوبارہ دہلی کی حکومت میں شامل کر لیا لیکن ۱۵۲۶ء میں مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دینے کے بعد سگڑی کے پاس گھاگھرا ندی پار کر کے اس خطے پر قبضہ کیا۔ ہمایوں کی ہار کے بعد سے اکبر کے زمانے تک اس پر افغان بادشاہوں سلطان بہلول لودھی، ابراہیم لودھی، سکندر لودھی، شیر شاہ سوری، سلیم شاہ سوری اور علی قلی خاں کا تسلط تھا۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر نے افغان سردار علی قلی خاں کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد عبدالرحیم خان خاناں کو ۱۵۹۰ء میں جون پور کا صوبیدار مقرر کیا۔

اکبر کی وسیع حکومت کے ماتحت پورا اعظم گڑھ بیلہا بانس پرگنہ کو چھوڑ کر صوبہ الہ آباد کے ماتحت جون پور سرکار میں شامل تھا۔ آئین اکبری میں اعظم گڑھ میں موجود سبھی پرگنوں کے نام ملتے ہیں، ان پرگنوں کے رقبے اور مال گزاری اور فوجیوں کی تعداد بھی ان میں درج ہے۔ آئین اکبری میں ماہل اور اترولیا کے نام نہیں ہیں جو بعد میں تلہنی نگن اور سرہرپور، فیض آباد سے نکال کر اعظم گڑھ میں شامل کئے گئے ہیں۔ آئین اکبری میں جن پرگنوں کے نام درج ہوئے ہیں وہ یہ ہیں، محمد آباد گوہنہ، مئوناتھ بھنجن، قریاتِ متوپور، گھوسی، سگڑی، گوپال پور، نتھوپور، چکیسر، نظام آباد، دیوگاؤں، چریا کوٹ، کوڑیا۔

عہد جہانگیری میں ابھیمن سنگھ گوتم جو قنوج کے جاگیردار تھے اور معزز گوتم چھتری خاندان سے تعلق رکھتے تھے آگرہ جا کر مسلمان ہو گئے، جہانگیر نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی، اور راجا نادر دولت خاں کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اسی کے ساتھ ۱۶۰۹ء میں اکیس اور بعض روایت کے مطابق چوبیس پرگنوں

کی ریاست بھی عطا کی۔ انھوں نے قصبہ مینھ نگر سے متصل موضع کھجوری میں سکونت اختیار کی، اور مینھ نگر کو راجدھانی قرار دیا۔ اس خاندان میں ایک شاہی فرمان بطور یادگار باقی تھا جس کی نقل شروع انگریزی عملداری میں شامل ہوکر ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں محفوظ ہے۔ اس فرمان کی پشت پر ضمنی عبارت یہ ہے۔

”بر کتاب حسب ضمنی بست ودو پرگنہ نانکاریک لک ۲۵ ہزار ہرگنہ نظام آباد، پرگنہ کوڑیہ، پرگنہ تلہنی، پرگنہ گوپال پور، پرگنہ سگڑی، پرگنہ محمد آباد گوہنہ، پرگنہ گھوسی، پرگنہ چکیسر، پرگنہ نتھوپور، پرگنہ چریاکوٹ، پرگنہ قریات متوپور، پرگنہ بیلہا بانس، پرگنہ دیوگاؤں، پرگنہ مئوناتھ بھنجن، پرگنہ شادی آباد، پرگنہ بحری آباد، پرگنہ پچوتر، پرگنہ سید پور بھتری، پرگنہ ظہور آباد، پرگنہ بھوواؤں ابواب زمینداری سی صدو یک روپیہ“

اصل فرمان کی تصدیق وتوثیق مسٹر ڈبلوئی رابرٹ سن جوائنٹ مجسٹریٹ اعظم گڑھ نے ۱۸۲۶ء میں گورنمنٹ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری کے حکم پر کی اور اس کی ایک نقل فورٹ ویمس کو بھیجی۔ مسٹر تھامسن جو اس ضلع کے پانچویں افسر بندوبست ہوئے انھوں نے بھی اس کی تصدیق ۱۸۳۰ء میں کی۔ شاہی فرمان میں جو ”نقطۂ براستحقاق“ درج ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نادر دولت خاں کو یہ اعزان کی خدمات کی بنا پر دیا گیا ہے۔ ان دستاویزی شہادتوں سے ثابت ہے کہ عہدِ اکبری اور دورِ جہانگیری سے پہلے ہی ان پرگنوں میں انسانی آبادی موجود تھی۔ شہنشاہ ہمایوں کے حدودِ مملکت میں مانک پور ضلع الہ آباد (اب ضلع پرتاب گڑھ) کے چشتیہ سلسلے کے بزرگ حضرت خواجہ مبارک شاہ رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۲ رشوال ۹۶۵ھ نے قاسم آباد کے کھنڈر پر مبارک پور کو اپنے نام سے منسوب کرکے یہاں دوبارہ بزمِ علم ومجلس مذاکرہ اور حلقۂ ذکر ووظائف منعقد ہونے کے اسباب فراہم کئے۔

راجا اعظم خاں بانی اعظم گڑھ اور راجا عظمت خاں بانی عظمت گڑھ کے مورث اعلیٰ ابھیمان (ابھیمن) سنگھ گوتم، اسلامی نام راجا نادر دولت خاں تھے۔ ضلع اعظم گڑھ پر نسلاً بعد نسل اسی نومسلم راج پوت خاندان کی حکومت تھی۔ یہ خاندان مغل بادشاہوں کا باج گزار تھا۔ ۱۷۷۲ء میں سعادت علی خاں نواب اودھ کے وزیر ایلچ خاں نے اس علاقے کو جہاں یار خاں سے چھین کر اودھ کی نوابی میں شامل کرلیا۔ اور یہ ایک چکلہ (ضلع) بن گیا۔ (۳)

محصول کی وصولی چکلہ داروں کے ذریعہ ہوتی رہی۔ ۱۸۰۱ء میں یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی

ملکیت میں آ گیا۔ ۱۸۰۱ء سے ۱۸۳۲ء تک محصول کی وصولی گورکھ پور اور بنارس کے کلکٹر کرنے لگے۔ ۱۸۳۲ء میں اس کو ضلع کی حیثیت حاصل ہوئی اور اس کے پہلے کلکٹر سر تھامسن ہوئے۔ انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے ضلع کلکٹر بدلتے رہے۔ پہلے یہ ضلع چھ تحصیلوں پھول پور، صدر اعظم گڑھ، لال گنج، محمد آباد گوہنہ، سگڑی اور گھوسی پر مشتمل تھا۔

۱۹/نومبر ۱۹۸۸ء/۱۴۰۹ھ کو تحصیل محمد آباد گوہنہ اور تحصیل گھوسی کو الگ کر کے مئو کو نیا ضلع بنادیا گیا۔ اب ضلع مئو چار تحصیلوں مئو صدر تحصیل، محمد آباد گوہنہ، گھوسی اور مدھوبن پر مشتمل ہے۔ اب ضلع اعظم گڑھ میں سات تحصیلیں اعظم گڑھ صدر تحصیل، سگڑی، پھول پور، بوڑھن پور، لال گنج، مینھ نگر اور نظام آباد ہیں اس کے بعد سے اعظم گڑھ کو کمشنری کا درجہ حاصل ہے۔ شہر اعظم گڑھ اور مبارک پور میونسپلٹی بورڈ (نگر پالیکا پریشد) ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ اعظم گڑھ کا شہر جو اس ضلع کا صدر مقام ہے اپنے دوسرے قصبات وقریات اور ملحقات ومتعلقات سے کم عمر ہے۔ اس ضلع کی بہت سی آبادیاں جیسے سرائمیر، نظام آباد، ماہل، مینہ نگر، مبارک پور، گھوسی، چریا کوٹ، مئو، محمد آباد، ادری، ولید پور، سگڑی، کوئریا پار، دیوگاؤں، محمد پور وغیرہ اعظم گڑھ شہر سے قدیم الوجود ہیں۔

اعظم گڑھ کی آبادی دو طرح کے باشندوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصے میں وہ لوگ آباد ہیں جن کے آبا و اجداد کسی دوسرے مقام یا بلاد وامصار سے آئے انھیں ہمارے اطراف میں میر صاحب یا ملکی کہا جاتا ہے۔ ان میر صاحبان کے اجداد کو حکومت وقت کی طرف سے ان کے علم ووجدان یا درویشی وفقر کے صفات کی وجہ سے جاگیریں اور معافیاں ملتی تھیں۔ انھیں کے گھرانے سماج اور اسلامی معاشرہ کے ممتاز خانوادے ہوا کرتے تھے۔ علم و دانش اور عرفان وحکمت کے چراغ ان کے سینوں میں روشن ہوتے تھے اور مساجد و مدارس کے منبر ومحراب، در و بام، وسیع حجرے، کشادہ صحن اور ہوادار برآمدے ان کے علم وفضل کی چاندنی اور شعور وفراست کے نور سے جگمگاتے تھے۔ اس لئے ان کی سماجی حیثیت بلند تھی۔ دوسری ایسی قومیں یہاں آباد ہیں جن کے خاندان کی جڑیں اسی کی زمین میں پیوست ہیں۔ اس آبادی کا بیشتر حصہ پیشہ ور طبقے سے انسلاک رکھتا ہے۔ پیداوار اسی کی محنتوں اور جانفشانیوں کا ثمرہ ہوتی ہے مگر وسائل معاش پر اس کو کوئی تصرف حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے سماجی اور تعلیمی واقتصادی پسماندگی اس کا مقدر ہوتی ہے۔

مشرقی یو پی کے اضلاع میں ضلع اعظم گڑھ کو جو تفردات حاصل ہیں اگر شرقی دور کے جون پور کو علیحدہ کر دیا جائے تو اس باب میں کوئی دوسرا ضلع اس کا سہیم و ہم سر نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہاں کی کوئی ایسی مبسوط تاریخ نہیں ملتی جو اعظم گڑھ کے علمی و تمدنی، صنعتی و حرفی، دینی و ملی، شعری و ادبی، لسانی و فکری، سائنسی و سماجی، اقتصادی و معاشی اور سیاسی و تاریخی کارناموں کو زیر بحث لائے۔ اگر کسی نے کچھ لکھا بھی ہے تو وہ عام لوگوں کی دسترس میں نہیں ہے۔ قاضی محمد مچھلی شہری (۱۲۵۲ھ - ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۲ء) بن مولوی عبدالعزیز (صدر الصدور) کے حالات میں ملتا ہے کہ

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد اعظم گڑھ کے انگریز حاکم بند دیست نے دو روپیہ یومیہ پر تاریخ اعظم گڑھ لکھوانا شروع کرائی.... یہ کام بڑا مشکل تھا۔ قدیم خاندانی شجرے اور پرانے شاہی کاغذات کا پتا لگانا جن کو زبانی روایت سے تطبیق کے بعد اپنے اپنے محل پر لگانا۔ یہ کتاب اتنی مقبول سمجھی گئی کہ اس کے ایک حصے کا ترجمہ انگریزی ہو کر مسٹر جمیسن رابرٹ ایڈ (JAMESON RABERT.ED)) کے نام سے شائع ہوا۔ اردو کا اصل مسودہ خود قاضی صاحب نے تلف کر دیا۔ (۴)

یہ مسودہ اگر ضائع نہ کیا گیا ہوتا اور تمام شجرے، دستاویزات و کاغذات اور خاندانی یادداشتیں محفوظ رکھی گئی ہوتیں تو ان سے بڑے کام کی باتیں معلوم ہوسکتی تھیں۔ اسی طرح ایک جگہ یہ تحریر ملتی ہے کہ

"سرگذشت راجگان اعظم گڑھ کو میر سید علی رضوی ساکن مینہاں (مینہ نگر) پرگنہ نظام آباد نے فارسی زبان میں ۱۸۷۳ء میں لکھا۔ اس کا ایک نسخہ لندن گیا (غالباً انڈیا آفس میں) وہاں سے محمد عبدالعزیز ساکن بھتری سید پور ضلع غازی پور نے طلب کر کے ۱۹۰۷ء میں اردو ترجمہ کیا اور ایک انگریز افسر بند و بست اعظم گڑھ کو پیش کیا اس کا فوٹو مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی نے حاصل کیا"۔ (۵)

ظاہر ہے کہ اس کتاب تک بھی عام لوگوں کی رسائی محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کتاب کے نام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی کتاب کے مقابلے میں اس کتاب کا موضوع محدود ہے۔ پھر بھی اس سے اعظم گڑھ کے واقعات و حادثات اور خصوصیات و تفردات کے کچھ گوشے ضرور سامنے آتے۔

مسلم دور حکومت میں پرگنہ جات میں قاضی مقرر کئے جاتے تھے۔ اس لئے لازماً اُن بائیس پرگنوں میں بھی حکومت نے قاضی مقرر کئے ہوں گے جو مغل بادشاہ محمد سلیم جہانگیر کی طرف سے ابھیمان سنگھ

گوتم (اسلامی نام، راجا نادر دولت خاں) کو ۱۶۰۹ء میں بطور انعام واکرام جا گیر میں عطا ہوئے تھے۔ قاضیوں کی تنصیب کا یہ سلسلہ بعد تک بھی جاری رہا ہوگا لیکن ان میں سے صرف چند کے نام ضمناً ملتے ہیں۔ زیادہ تر کے بارے میں تحریری ریکارڈ خاموش ہیں۔

مومن محی الدین نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۱ء تک انگریزوں کے ظلم واستبداد سے نقل مکانی کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے ہجرت کا ایک بڑا سبب فسادات کو بھی بتایا ہے وہ رقم طراز ہیں کہ

> ''اعظم گڑھ کے انصاری حضرات عدن، حجاز، ملائشیا، انڈونیشیا اور سنگاپور میں جا کر بس گئے اور بڑی تعداد نے برہان پور، دھولیہ، مالیگاؤں، بھیمڑی، بمبئی اور حیدرآباد وغیرہ میں مستقل طور سے سکونت اختیار کرلی۔ ان میں شعراء، ادباء، علماء وفضلا اور حفاظ پیدا ہوئے اور آج بھی مشرقی جنوبی ایشیا میں سنگاپور، فیوجی آئی لینڈ اور فلپائن وغیرہ میں پرانے پرکھوں کی اولاد موجود ہے جو جون پور اور اعظم گڑھ سے ہجرت کر کے ان شہروں اور ملکوں میں بس گئی تھی۔ ویسٹ انڈیز اور افریقہ کے صوبوں میں بھی انیسویں صدی کے مہاجر انصاریوں کے خاندان موجود ہیں''(۶)

لیکن ان مہاجروں کی علمی وادبی تاریخ اور حالات وخدمات سب کے سب پردۂ خفا میں ہیں۔ کاش کوئی مردکار اٹھے اور ان مقاماتِ دور دراز کا تہذیبی دورہ کر کے اس ضلع کی تہذیبی جڑوں کی شناخت اور علمی روایتوں کی بازیافت کا حوصلہ دکھائے تو کچھ پرتیں کھل سکیں۔

ماضی میں نظام آباد اور سرائمیر کو بھی علمی وروحانی مرکزیت ومرجعیت کی سعادت حاصل تھی۔ عبدالقدوس شطاری نظام آبادی سلسلۂ شطاریہ کے بہت عظیم شیخ طریقت اور روشن ضمیر عالم دین تھے جن کے متوسلین ومسترشدین کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ خود ان کے سات بیٹے تھے جو سب کے سب عالم دین اور فاضل علوم متداولہ تھے لیکن ان سب کے حالات وکوائف کا کیا ذکر ان کے نام بھی تاریخ وتذکرہ کے سینے میں محفوظ نہیں ہیں۔

موضع منور پور تحصیل پھول پور کے مولانا باب اللہ جو جون پور میں رہنے کی وجہ سے جون پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ بڑے پائے کے عالم تھے۔ ان کی علمی عبقریت کے بارے میں

نورالدین زیدی نے فرمایا ہے کہ

''درہند ہیچ عالمے پنجۂ علمش برنہ تافت'' (ہندوستان میں کوئی عالم ان کے پنجۂ علم کو نہ مروڑ سکا)

ان کے فیض درس سے بڑے بڑے عباقرۂ علم متمتع ہوئے مگر ان پر بھی گم نامی کی گرد جمی ہوئی ہے۔ زیدی اظہارِ افسوس میں آگے لکھتے ہیں کہ

''لیکن حالات انقلابِ زمانہ تا ایں جارسید کہ اکنوں سالِ وفاتش ونشان قبر ایں چنیں سرمایۂ نازوافتخار دریافت نمی شود وندانم کہ کدام سرزمین آب حیاتش چکید وکجا آں گوہر یکتا غلطید'' (۷) (لیکن زمانے کے الٹ پھیر نے حالت یہاں تک پہنچادی کہ اب اس سرمایۂ نازوافتخار کی تاریخ وفات اورنشان قبر بھی مجھکو معلوم نہیں کہ کس سرزمین پران کا پیمانۂ عمر چھلکا اور یہ دریکتا کہاں گم ہوا)

اس بستی میں شرفائے علم کے خاندان تھے لیکن جب مولانا باب اللہ جیسے نابغۂ روزگار کا یہ حال ہے تو دوسروں کے بارے میں کیا کہا جائے۔

موضع نیگوں کو قلندر پور بلکہ اب پلندر پور کہا جاتا ہے۔ دوسو برس پہلے یہاں خانقاہ آباد تھی اور لوگ علمی زندگی گزارتے تھے مگر اب یہ بھی بے نام ونشان ہے۔ افسوس صد افسوس

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

چریاکوٹ علم وعلماء کا ایک بہت عظیم دبستان رہ چکا ہے مگر اس کی سرگزشت بھی یہی ہے کہ یہاں کی یادداشتیں، خاندانی شجرے، مقدموں کے کاغذات، سرکاری دستاویزات، مخطوطات ونوادرات سارے کے سارے برباد ہوگئے۔ محمد مزمل عباسی دانش چریاکوٹی فرماتے تھے کہ یہاں کا سرمایہ ہر اعتبار سے بڑا قیمتی اور گرانقدر تھا۔ جو وقت کی چیرہ دستیوں سے خود کو نہیں بچا سکا۔ (۸)

انہیں کے استاد گرامی مولانا احمد مکرم عباسی چریاکوٹی اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانۂ طفلی میں بھی (چریاکوٹ میں) سات جید عالم موجود تھے جن سے محفلِ فضل روشن اور بازار درس وتدریس گرم رہتا تھا۔ ان میں سے مولوی علی عباس، مولوی نجم الدین، مولوی عنایت رسول، مولوی محمد فاروق، اور مولوی محمد اعظم سرآمد روزگار تھے'' (۹)

مولانا محمد عاصم اعظمی کا بیان ہے کہ

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستانی مسلمانوں کا علمی زوال شروع ہوا تو دوسرے علمی بلاد وامصار اور قصبات وقریات کی طرح چریا کوٹ کی علمی مجلس بھی پراگندہ ہوگئی یہاں کے خانوادوں نے وقت اور حالات کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جدید علوم وفنون کی جانب سبقت کی تاہم ماضی کی علمی ودینی روایات کو انھوں نے اپنے سینوں سے لگائے رکھا مگر رفتہ رفتہ یہ وابستگی تقریباً ختم ہوگئی اور پھر تقسیم ملک کے بعد رہی سہی علمی وادبی رونق کا بھی خاتمہ ہوگیا۔(۱۰)

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے اپنی تاریخ کی ترتیب وتدوین کے ذوق سے کم ہی آشنا ہوئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ آٹھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا اسی دور میں تاریخ نویسی کی طرف توجہ دی گئی۔ مسلمان تاریخ سے خاص شغف رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے علمی عہدِ شباب میں ہر موضوع پر اتنا لکھا کہ علم وفن کا کوئی گوشہ ان کی نگاہِ تذکرہ نگاری اور تاریخی وتحقیقی بصیرت سے اوجھل نہیں رہ سکا۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان اپنی آمد کے وقت تاریخ وتذکرہ اور سیرت وسوانح کا جو ذوق لیکر آئے تھے اور ان کی پشت پر گزشتہ تاریخ وتذکرہ کا جو عظیم سرمایہ تھا اس کی روایت کو یہ زیادہ آگے نہیں بڑھا سکے کیوں کی ان آنے والوں میں یا عسکری وسپاہی تھے، یا تفسیر وحدیث اور اصول وفقہ کے علماء تھے، یا صوفیائے کرام تھے۔ جو اہلِ قلم تھے ان کا شغف زیادہ تر اسلامی فنون کی کتابیں لکھنے سے تھا۔ اس کے علاوہ علماء میں منطق وفلسفہ، شجرۂ انساب اور بزرگوں کے ملفوظات وارشادات مرتب کرنے کا رجحان عام تھا۔ انھوں نے بزرگوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ان میں فضائل ومناقب کے باب کو کشف وکرامات کے جلوۂ ہزار رنگ سے خوب روشن رکھا۔ اس طرح کی کتابوں میں قدیم وہم عصر علماء ومدرسین، سیاسی وتہذیبی، فنی وفکری، عمرانی واقتصادی واقعات وحالات اور مختلف طبقات کے رجالِ علم ومشاہیر عصر پر مستقل گفتگو یا بحث نہیں ملتی اس کی بڑی وجہ شاید یہ رہی ہوگی کہ اس دور کے علماء وصوفیا اور شعراء وادباء کے کاموں کو کارناموں کی حیثیت نہ دی گئی ہو اور ان کی نگارشات کو عربی وفارسی کے اربابِ کمال کے مقابلے میں کم تر سمجھا گیا ہو۔ اس لئے اس نوع کے فکری وفنی نمونے ضبطِ تحریر میں نہیں آسکے۔ عموماً ہمارے علمی حلقے عربی وفارسی کو اہمیت دیتے تھے اور مقامی ادب، چھوٹی برادریوں کے دیہاتی علوم وفنون کو نظر انداز کرتے تھے۔ ایک سبب یہ بھی ہے کہ نو آبادیوں، چھوٹی بستیوں، نیز دور افتادہ وکم معروف علاقوں میں علم وفن اور شعروادب کے چراغ روشن کرنے والوں سے

اغماض نظر برتا جاتا تھا۔مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا بھی یہی تاثر ہے وہ لکھتے ہیں کہ

''مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے علماء وفضلا ومشائخ کے مقابلے میں دیارِ پورب کے ان بزرگوں کے تذکرے بہت کم لکھے گئے اور جو کچھ موجود ہیں وہ بہت بعد کی کتابوں کے رہین منت ہیں۔اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ لودھیوں نے جون پور کی شرقی سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد بڑی تباہی برپا کی جس سے یہاں کے نہ صرف سلاطین سابقہ کے آثار وعلائم ختم ہوئے بلکہ علماء وفضلا اوران کے کارناموں کو بھی لودھی سلطنت کا سیلاب بہالے گیا۔اوردوسری بات یہ ہے کہ جب دسویں اور گیارہویں صدی میں تذکرہ نویسی کا دورشروع ہواتواس دیار کے اہلِ علم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی''(۱۱)

فارسی اورارد وشاعروں کے جوتذکرے مرتب ہوئے ان کو مرتب کرنے والے بھی ادھر کے نہیں تھے وہ دیارِدوردودراز کے رہنے والے تھے۔اسی لئے ادھر کے بہت کم شاعروں کے نام وکلام شامل تذکرہ ہوسکے۔محمد انصاراللہ نے بھی یہی لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو

''پورب دیس کے آخر زمانے کے شاعروں سے بھی ہمارے تذکرے اور کتب تواریخ خالی ہیں۔عالم گیراورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئی اس علاقے کی کوئی عشقیہ داستان ہنوز ہمیں دستیاب نہیں ہوسکی ہے"۔(۱۲)

اقبال سہیل کو بھی پورب کے اردوخدمت گزاروں کونظرانداز کئے جانے کا شکوہ تھا۔حامد حسن قادری کی تحقیقی کتاب ''داستانِ تاریخ اردو'' شائع ہوئی تو انھوں نے اس کی دل کھول کرتعریف کی۔لیکن انھوں نے قادری صاحب کوبعض اہم فردگزاشتوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ

''جناب مؤلف غالباً مرادآباد کے رہنے والے ہیں،آگرہ میں قیام ہے ان حالات میں مشرقی اضلاع کے اکثر اہلِ قلم یاان کے نتائج افکار کا تذکرہ کرنا محلِ تعجب ہے، نہ قابلِ گرفت۔پھربھی تالیف کی جامعیت متقاضی تھی کہ پورب کے چندمشاہیرادب جنھوں نے واقعتاًاردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے،نظرانداز نہ کئے جاتے"۔(۱۳)

اعظم گڑھ کے شاعروں کی گم نامی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے باشندے سخت جغرافیائی عصبیت میں مبتلا تھے اور حقیقت یہ ہے کہ آج بھی انھیں باہروالوں کی اہم ادبی وفنی

خدمات کوانشراح قلب کے ساتھ قبول کرنے میں خاص قسم کا تکدر وتامل ہے۔اہلِ دہلی نے باہر والوں کی لسانی وشعری حیثیت کوکبھی درخوراعتنانہیں سمجھااور ہمیشہ اپنے سےفروتر قرار دینے کی کوشش کی۔

اہلِ دہلی کے لسانی تعصب کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں کہ

" بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ رعونت اوراستثنا پزیری یعنی EXCLUSIONISM کا یہ رویہ دہلی والوں نے تمام غیر دہلوی اردوادب اورزبان کے لئے شروع ہی میں اختیار کرلیا۔انشا کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ وہ مرشدآباداورعظیم آبادوالوں بلکہ لکھنؤ کے بھی اصل رہنے والوں کواردو کے معاملے میں گنوار سمجھتے تھے۔انشا سے کچھ پہلے (یا کچھ بعد)احد علی خاں یکتا غیر دہلی والوں کوگنوارنہیں کہتے لیکن ان کی بھی نظر میں اردو اگر مستند ہے تومحض دلی والوں کی۔اورمیرؔ نے ان دونوں سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ریختہ کی شاعری وہی ہے جوشاہجہاں آباد کی زبان میں ہو۔(۱۴)

اس کے بعدانھوں نے لکھا ہے کہ

''رعونت اوراستثنا پزیری کارویہ دہلی کی ادبی اورلسانی تہذیب میں بیسویں صدی تک بھی دیکھا جاسکتا ہے۔اٹھارہویں صدی میں تو یہ حال تھا کہ خوددہلی کا وہ ادب جوغزل کے معیاروں سے فروتر دکھائی دیتا ہے (مثلاً روشن علی اوراسمٰعیل امروہوی کے جنگ نامے)اس کا ذکراہلِ دہلی نے اپنے تذکروں میں نہ کیا"(۱۵)

اہل لکھنؤ کی لسانی جغرافیائی تنگ نظری تو مشہور زمانہ ہے۔ یاس یگانہ چنگیزی اورعبدالغفور نساخ جیسے ماہر زبان داں بھی ان کی عصبیت کا شکار ہوئے۔اس لئے لکھنؤ کے رہنے والوں نے جو تذکرے مرتب کئے ان میں ان کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔اردو کی ادبی ولسانی تاریخ کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ دہلی ولکھنؤ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے دوسرے شہروں اورعلاقوں میں بھی اردوشعروادب کا چلن عام تھا۔

محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ

"میں اگرچہ اردو کے میدان میں دکن کی ادبی وتالیفی تحریکات کی اولیت کے دعوے کوتسلیم کرتا ہوں تاہم یہ بھی کہتا ہوں کہ اردوشاعری ہندوستان کے ہرصوبے میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجودتھی۔یہ اور بحث ہے کہ آیا وہ بھاشا کی متبع تھی یا فارسی کی۔۔۔۔لیکن ملک کے ہرصوبے

میں اردو میں رسائل لکھے جانے کا رواج تھا۔۔۔۔لیکن آج یہ حصۂ ادب ہماری نظروں سے کیوں نہیں گزرتا۔اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری وہی نا قابل معافی بے پروائی ہے"۔(۱۶)

ظاہر ہے کہ اعظم گڑھ اور اس کے نواحی اضلاع میں بھی شعر کہے جاتے تھے۔لیکن ان کا ذکر تذکروں میں نہیں کیا گیا وجہ وہی لا پروائی جس کا ذکر محمود شیرانی نے کیا ہے یا جغرافیائی عصبیت نے ان دورافتادہ علاقوں کو کبھی درجۂ استناد میں نہیں رکھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کتابوں کا ذکر کر دیا جائے جن سے اعظم گڑھ تاریخی وتمدنی، عمرانی وسیاسی، تعلیمی وثقافتی کوائف کا علم ہوتا ہے اور علماء وفضلا، ادباء وشعراء، دانشوروں، علمی خانوادوں کے تعلق سے قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور کچھ نہ کچھ شعر وشاعری کے بارے میں بھی اظہار خیال ملتا ہے۔ حیاتِ شبلی سید سلیمان ندوی گزیٹیر اعظم گڑھ۔دیار پورب میں علم اور علماء، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔ تذکرۂ علمائے مبارک پور، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔تذکرۂ علمائے اعظم گڑھ، حبیب الرحمٰن اعظمی۔ تاریخ جیراج پور، ضیاء الرحمٰن اعظمی۔تاریخ بندول، احسن الانساب بنوالعباس چریاکوٹ (قلمی، فارسی) محمد بنی عباسی۔یادداشت چریاکوٹ (قلمی، فارسی) مولوی نجم الدین عباسی چریاکوٹی۔مشاہیر پورہ معروف، مولوی محمد عثمان معروفی۔مشاہیر کوپاگنج، مولوی محمد عثمان معروفی۔تذکرۂ نساجین، یعنی دستکار اہل شرف، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مئوی۔تجلی نور، (فارسی) مولوی نورالدین زیدی۔گنج ارشدی (قلمی، فارسی) شیخ نصرت جمال۔مناقب غوثی (قلمی فارسی) شمس الدین حیدری۔تذکرۂ سخنورانِ مئو، اثر انصاری،۔مئو۔شہر ہنروراں، ڈاکٹر شکیل احمد۔نزہۃ الخواطر (عربی) سید عبدالحئی حسینی۔تذکرۂ علمائے ہند، مولانا رحمان علی۔ذکر فراہی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی۔تذکرۂ علمائے حال، محمد ادریس نگرامی۔قصص الجمیل فی سوانح الخلیل، خلیل الرحمٰن فاروقی۔تاریخ مکرم (قلمی) مولوی احمد مکرم عباسی چریاکوٹی۔تاریخ اعظم گڑھ، افضال اللہ قادری۔محمد پور گاؤں عمر رفتہ سے، خان محمد صادق خان مطبوعہ ۲۰۱۱ء۔شیر وشکر (قلمی) ابوالخیر بھیروی۔شہر ادب، ملک زادہ منظور احمد۔نمود سحر، فضل الرحمٰن شرر مصباحی۔اعظم گڑھ تاریخ کے آئینے میں، مرزا انصار بیگ۔صدرنگ، فیاض گوالیاری۔قمرالزماں مبارک پوری۔اعظم گڑھ کا علمی، ادبی اور تاریخی پسِ منظر، حبیب اللہ۔عکس واثر، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔عظمت کے نشاں، ڈاکٹر الیاس الاعظمی۔مولانا عبدالسلام ندوی، ایک مطالعہ، ڈاکٹر الیاس الاعظمی۔حیات ابوالمکارم، ابوالقاسم عبدالعظیم۔تذکرہ مولانا قاری ریاست

علی بحری آبادی، ڈاکٹر انیس ادیب۔ اقبال سہیل، حیات اور شاعری، ڈاکٹر منور انجم۔ ہمارا گاؤں ہمارے لوگ، رضوان اللہ فاروقی۔ بزمِ شبلی کی آخری شمع، امجد غزنوی، ڈاکٹر فخر عالم اعظمی۔ The Construcation of Commun Alism in Colonial North India. By Gyanendra Pandey- Hamare Hi Lahoo se Bagh-E- Watan Shadab Hai. By Kms Khan قصیدہ نگاران اتر پردیش، علی جواد زیدی۔ مثنوی نگاری، علی جواد زیدی۔ مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ، مومن محی الدین، اعظم گڑھ اور اردو شاعری، حبیب اللہ۔ مدرسہ اشرفیہ سے الجامعۃ الاشرفیہ تک، مفتی عبدالمنان اعظمی۔ مشعل راہ، مولانا محمد عاصم اعظمی۔ شجرۂ طیبہ، مولانا کرار حسین اظہری۔

ان کتابوں میں کہیں مجملاً کہیں مفصلاً باتیں درج ہوئی ہیں مگر کسی میں شعروادب کی آبیاری کرنے والے تمام شاعروں کا ذکر نہیں آیا ہے۔ اگر کسی شاعر کا ذکر آیا ہے تو نمونۂ کلام نہیں ہے۔ ڈاکٹر کبیر احمد جائسی (۱۶ر نومبر ۱۹۳۴ء۔ ۷ر جنوری ۲۰۱۳ء) نے جب ماہنامہ ادیب علی گڑھ کی ادارت سنبھالی تو ۱۹۶۳ء میں عکس بتاں کے کالم کے تحت یہاں کے کچھ شاعروں کے خاکے لکھ کر شائع کئے اور اس طرح انھوں نے اردو شعروادب سے دل چسپی رکھنے والوں کی توجہ اعظم گڑھ کے گم نام شاعروں کی طرف منعطف کرائی۔ کچھ دوسرے رسالوں میں بھی یہاں کے شاعروں کے بارے میں مختلف مضامین شائع ہوئے ہیں مگر ان میں صرف کسی ایک شاعر پر بحث کی گئی ہے۔ البتہ خم خانۂ جاوید، لالہ سری رام دہلوی اور شعرائے اتر پردیش، عرفان عباسی۔ سخن شعراء عبدالغفور نساخ میں یہاں کے کچھ شاعروں کا ذکر ہوا ہے۔ مالک رام نے بھی اپنے تحقیقی مجلہ سہ ماہی تحریر دہلی میں وفیات کا باب کھولا تھا جس کی چار جلدیں تذکرۂ معاصرین کے نام سے آئیں بقیہ جلدیں چھپنے سے رہ گئیں اس میں بھی اس دیار کے شاعروں پر کارآمد مضامین ہیں۔ اس لئے ایک ایسے تذکرے کی ضرورت محسوس ہوئی جس سے یہاں کے شاعروں کے بارے میں کچھ بہتر معلومات فراہم ہوسکے۔

ہر قوم کی ترقیوں کا ایک دور ہوتا ہے۔ چینیوں، یونانیوں، رومیوں، مصریوں، عربیوں اور ایرانیوں کے بھی عروج کا ایک دور آیا تھا۔ آج پوری دنیا مغرب کے زیر نگیں ہے۔ مغرب اپنی تجارت کے فروغ کے لئے مختلف حیلہ سازیوں سے ایشیا میں اپنی تجارتی وتمدنی اور سیاسی منڈیاں

بنا رہا ہے۔ یہ روحانیت، مذہبیت اور احساس مروت سے عاری اور مادیت پرستی وتعیش کوشی کا عادی ہے، جس کے سامنے خاندان، خونی رشتہ، جڑوں کی تلاش اور اپنی جڑوں سے وابستہ رہنے کا تصور یہ سب بے معنیٰ ہے۔ مغربی روش ہمیں اپنی جڑوں سے دور کر رہی ہے۔ یہ کتاب ہمارے ماضی اور حال سے روشناس کرائے گی۔ اسلاف کی سرگرمیوں کی روداد سنائے گی اور گزشتہ نسلوں کے کارناموں پر غبارِ زمانہ کی جمتی ہوئی تہوں کو صاف کر کے ہمیں اپنی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنی روایتی اقدار کو سمجھنے اور اپنی جڑوں سے وابستہ رہنے کا حوصلہ دے گی۔

گردشِ وقت کی آندھیوں نے بہت سے خاندانوں کے افراد کو برگ آوارہ بنا کر دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر کر دیا ہے، بدیس میں ان مہاجروں کی کئی نسلیں گزر چکی ہیں۔ وقت بدلا اور ان کے اچھے دن آئے تو انھیں اپنے اجداد کا وطن بھی یاد آیا۔ ان کے اندر اپنی مٹی کی مہک اور اپنی سرزمین کی خوشبو کی کھوج کی تمنا جاگی اور وہ اپنی جڑوں کی تلاش میں اعظم گڑھ آئے جو یہاں نہیں آسکے ہیں ان کے بھی من میں اپنے اسلاف کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی زبردست خواہشیں کروٹیں لے رہی ہیں۔ اس تذکرہ کی ترتیب میں یہ سوچ بھی کارفرما ہے کہ بہت کچھ ضائع ہو چکا ہے۔ حالات کی دستبرد سے جو بچ گیا ہے اگر اب بھی ان کو محفوظ نہ کیا گیا تو یہ سرمایہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور ہم اپنے مردوں کو دفن کر دینے کے بعد ان کے کارناموں کو بھی قبر کی مٹی میں ملا دینے کے گنہ گار سمجھے جائیں گے اور مستقبل کی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی۔

اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ ۱۹۷۹ء میں عملی شکل اختیار کر چکا تھا اور اس پر کام کی شروعات ہو چکی تھی۔ مگر جعفر لائبریری کے لئے زمین کی دستیابی کے جنون نے زندگی کے تقریباً ۲۵ قیمتی اور بہترین سال ضائع کر دیئے اس درمیان میں اس کی تسوید رکی رہی۔ کارِ جہاں کی درازی سے فرصت کے لمحات میسر آئے تو راقم کی کوشش ہوئی کہ اس دیار میں جب سے عربی وفارسی اور اردو شاعری کا آغاز ہوا اس وقت سے اب تک کے متوفی شاعروں کا تذکرہ مرتب ہو جائے۔ تحقیق آگے بڑھی تو گمان سے زیادہ شعری سرمایہ فراہم ہو گیا اس لئے عربی وفارسی کے الگ الگ تذکروں کی ترتیب کا خاکہ بنانا پڑا۔ اردو شاعروں کی چھ فائلیں تیار ہو چکی ہیں۔ یہ پہلی جلد سخنورانِ اعظم گڑھ کی پہلی فائل (الف) پر مشتمل ہے۔ اسباب ووسائل فراہم ہو گئے تو انشاء اللہ باقی جلدیں بھی ادبی دنیا کی نذر کی جائیں گی۔ بعد میں عربی وفارسی کے اعظمی شاعروں کے الگ الگ تذکرے شائع کئے جائیں گے۔

مقامی ادب کی تلاش وتحقیق پر اس وقت کئی قلم کاروں اور دانشوروں نے توجہ مبذول کی ہے۔ بہت سا مواد تاریخ کے ملبے میں گم ہے۔اس کی بازیافت اور شناخت کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ بہت سے دانشور اردو اور ہندی کی تاریخ زبان وادب کو نئے سرے سے لکھنے کی وکالت کررہے ہیں۔نئی تحقیق نے ماضی کے بہت سے نظریات ورجحانات کی تردید یا تغلیط کردی ہے۔

عموماً تذکرہ نگار شاعروں کے مختصر حالات (بعض مرتبہ صرف ایک سطری) اور نمونۂ کلام اپنے ذوق کے مطابق تذکروں میں شامل کرتے رہے ہیں۔ بعد والوں کو یہ شکایت تھی کہ تذکرہ نگاروں نے تنقیدی نقطۂ نظر سے بہت کم کام لیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی زیادہ تر توجہ سر برآوردہ اور ادبی سماج کے نمائندہ شاعروں پر رہی ہے۔دیہات وقصبات میں جو پیشہ ور طبقہ اپنے ماحول میں اپنے شعری جذبات پیش کرتا تھا اس کے ذکر سے کلیتاً پہلو تہی کیا گیا ہے۔شرفائے ادب کے نزدیک نظیر اکبرآبادی بھی مدتوں قابل اعتنا نہیں سمجھے گئے۔یہ بھی ہوا ہوگا کہ ابتدائی اردو کی بولیوں میں شاعری کرنے والے علماء وشعراء نے خود اپنے کلام کو باعث ننگ وعار سمجھا ہو۔ دل بہلاوے کے طور سے شاعری تو کرلی ہو لیکن اس کو امیر خسرو (۱۲۵۳ء ۔ ۱۳۲۵ء) کی طرح فارسیِ لطیف کے سامنے چنداں لطفے ندارد (بے مزہ) اور غالب کی طرح بے رنگ من است سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی ہو اور نہ ہی اس کو لائق حفاظت سمجھا ہو۔

سخنوران اعظم گڑھ کے موجودہ سلسلۂ تحقیق میں اس پر بھی نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دیہاتوں اور قصبوں کا ادب بھی زیرِ بحث آئے اور وہاں کی اصناف کے شعری نمونے جس حال میں بھی رہ گئے ہیں انھیں محفوظ کرلیا جائے۔

نمونۂ کلام کا وافر حصہ نہ ملنے کی وجہ سے بعض شاعروں کے کلام پر تبصرہ وتجزیہ کا حق ادا نہیں ہوسکا ہے۔کلام دستیاب ہوگیا ہوتا تو کچھ بہتر رائے ظاہر کرنے میں سہولت ہوتی اور فکری وفنی جہت کا جائزہ لینے میں دقت پیش نہ آتی۔اور تاریخی وتمدنی، سیاسی وحرفی، قومی وملی تعلیمی ودینی مدوجزر کی نقشہ گری اور تبدیلی وانحراف کے تصورات وجذبات کی تصویر کشی کچھ اور اچھے طریقے سے کی جاسکتی تھی۔

تحقیق کا یہ کام جب شروع ہوا تھا اس وقت مئو کو علیحدہ ضلع قرار نہیں دیا گیا تھا۔ ۱۹/نومبر ۱۹۸۸ء کو انتظامی نقطۂ نظر سے اس کی تقسیم عمل میں آئی۔ بہت کچھ ابتدائی تحقیقات ہوچکی تھیں اس لئے ان سے دست کش ہونا ممکن نہیں رہا۔اس تذکرہ میں ۱۸۳۲ء مطابق ۱۲۴۸ھ میں انگریزوں کے ذریعہ قرار

دیئے گئے اس ضلع اعظم گڑھ کے ایسے تمام متوفی شاعروں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنھوں نے کسی بھی انداز میں اردو شاعری کی زلفیں سنواری ہیں خواہ ان کی شعری وفکری اور ذہنی وادبی سطح بہت بلند نہ ہو۔اس میں بعض ایسے نام بھی شامل ہیں جو اپنی شاعرانہ حیثیت کے اعتبار سے پست معیاری کی زمین پر ہیں لیکن وہ اپنی کسی دوسری سرگرمی کے سبب باحیثیت یا قابل ذکر ہیں اور اس ضلع کی علاقائی تاریخ سے واقعات کی کڑیوں کو جوڑنے کے لئے کبھی ان کے ذکر واذکار اور حالات وکوائف کی ضرورت پڑسکتی ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں سے بہتوں کے حالات وکلام پردۂ خفا میں ہیں جن کو محفوظ رکھنا بھی ایک تاریخی ذمہ دراری ہے۔ان کی نشان دہی کر دینے کے بعد شاید کوئی مردکار مستقبل میں اٹھے اور اپنی تحقیق وجستجو کے چراغ روشن کر کے اچھے اور بامعنیٰ انکشافات کر سکے۔راقم کے حاشیۂ خیال میں یہ بھی ہے کہ ان ناموں کے حوالے سے بعض تحقیق طلب امور کے دروازوں تک پہنچنے کے راستے نکل سکتے ہیں۔

اعظم گڑھ کا تمدن اپنے تنوع اور رنگارنگی کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کی پہلی تہذیب حبشی النسل انسانوں کی ہے جو افریقہ سے سیر وشکار کرتے اور گھومتے گھامتے یہاں آئے اور بس گئے۔وہ یہاں کے تمدن کے بنیاد گزار بنے۔ان کے بعد مادری تہذیب نے ماں کے تقدس اور اس کے اختیار کو بنیادی اہمیت دی۔آریا قوم اقوام عالم میں تہذیب وتمدن کے امتیازات وتفردات کی وجہ سے تاریخ کا رخ نئی سمتوں میں موڑ دینے کی اہلیت رکھتی ہے۔یہ ایشیائے کوچک سے آئے اور یہاں کی قومی تہذیب کو اپنے علم ودانش اور فلسفہ وتمدن کے زور سے مغلوب کر کے ہر جگہ چھا گئے۔کھانے پینے، کھیتی باڑی، رہنے سہنے، باہمی تعلقات اور سماجی رابطے کی نئی صورتیں پیدا ہوئیں۔آریوں نے مذہب ومعاشرت اور قانون واخلاق کے اصول وضوابط وضع کئے۔بودھ اور جین مذہب نے بھی زبردست طریقے سے یہاں کے اذہان وقلوب پر اپنی چھاپ ڈالی۔ان دونوں تہذیبوں نے لسانی وتاریخی اور مذہبی واخلاقی بنیاد میں مضبوط سنگ وخشت کا اضافہ کیا۔

اس دیار میں مسلمانوں کی آمد تمدن کے لالہ زار میں اثبات بہار تھی۔جس کی وجہ سے صبح چمن نے بھی اپنے رنگ پیراہن بدلے۔چونکہ یہ حکمراں بن کر آئے تھے اس لئے ان کی آمد نے ہندوستانی تہذیب وثقافت پر تاریخی ولسانی ہی نہیں متعدد دوسرے پہلوؤں سے بھی بہت گہرے اور دائمی اثرات مرتب کئے۔ یہ مسلمان ضرور تھے مگر یہ خالص عربی تمدن اور اسلامی مزاج ومذاق لے کر نہیں آئے تھے۔یہ عجم کی سیر کرتے

ہوئے ہندوستان میں خیمہ زن ہوئے تھے اس لئے عجمی تصورات وتہذیب ان کی زندگی پر حاوی تھی۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اس ملک میں مسلمان حکمرانوں نے اسلام کی حقیقی نمائندگی نہیں کی۔ ان کے اصول سیاست میں بقائے اقتدار اور دائرۂ حکومت کی وسعت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

مسلمانوں کے ذریعہ جو تمدن پیدا ہوا اس میں عرب کلچر، ایرانی تہذیب تورانی آداب معاشرت افغانی وترکستانی ثقافت، مغلوں کے تمدنی آثار اور ہندوستانی سنسکرتی کی آب وتاب اور رنگ ونور شامل ہے۔ اس ضلع کے کل نہیں تو بعض مقامات وقصبات اپنے ثقافتی ورثے کے لحاظ سے لکھنوی تہذیب کا مثنیٰ ہیں۔ یہاں کے شعر وادب کے کچھ نمونے لکھنؤ کی ثانویت کی منھ بولتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ لکھنوی تہذیب کا معتدبہ حصہ مغلیہ تہذیب کا عکس واثر ہے۔ خود مغلیہ تہذیب نے ہندوستان کے دیومالائی اثرات کو بڑی چاہت سے قبول کیا لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ اس تہذیب نے اسلامی تہذیب کی وسیع القلبی، احترام انسانیت اور مذہبی رواداری کی ایسی طرح نو ڈالی کہ معاشرتی زندگی اور حکومت وعوام کی خارجی سطح پر بامعنیٰ رابطہ وتعلق کی وجہ سے پرامن شہری زندگی اور مشترک اقدار پر مبنی مشترکہ کلچر وجود میں آیا۔ لکھنؤ کے نوابوں نے بھی اس مغلیہ روایت کو آگے بڑھایا۔ شعر ونغمہ اور رنگ محفل قائم کرنے کے لئے فنون لطیفہ میں نئے نئے تجربات کئے گئے۔ راگ راگنیوں، رقص، سوزخوانی نے خوب ترقی کی۔ قدیم ہندوستانی روایات اور پرانی تہذیب کو نیا لباس ملا، مگر لکھنوی تہذیب اپنے سماجی ومذہبی اشغال، اور رجحان ومزاج کے اعتبار سے ایسے کمزور ڈھانچے پر کھڑی تھی جس میں جدوجہد کی روح نہیں تھی۔ یہ تہذیب روح عمل کے فقدان کے سبب بنیادی ارکانِ مذہب اور خالص اسلامی علوم وفنون سے ذرا منحرف اور غیر شعوری طور پر گریزاں سی رہی ہے جس کے اثرات یہاں کے تہذیبی وادبی بام وسقف پر بھی نمایاں ہوئے۔

تکلف وتصنع اور ظاہر داری وحسن پرستی یہاں کی تہذیبی اقدار کا مزاج بنتی چلی گئی اس تہذیب نے خانقاہ ومساجد اور مدارس کے زہد واتقا کی فضا اور علوم ربانی کے دائرے میں گردش کرتے ہوئے افکار واشغال کو کھیل تماشوں، میلوں ٹھیلوں، جنسی سکون کی تلاش اور شہوانی جذبات کی تسکین کے وسائل کی طرف موڑ دیا۔ شعر وادب زبان وبیان کے چٹخارے اور صنعتوں کے ذائقے کو اہمیت دینے لگے۔ لکھنؤ کے نوابی اثر سے مرثیہ خوب پروان چڑھا اور عزائی شاعری نے داخلیت کے خول سے نکال کر زمین کی وسعتیں ناپنے کا موقع دیا۔ شجاعت، عالی ہمتی، بلند حوصلگی، حق کے لئے سرفروشی، باطل کے سامنے سینہ سپر ہونے

کا جذبہ، خانگی رشتوں کا پاس ولحاظ، اخوت، محبت، مروت، انسانی خدمت، انصاف، عصمت وعفت، ایثاروانکسار، صبر وقناعت، رواداری اور دوسری اخلاقی قدروں کو تابناک بنایا گیا۔ادب کو مارائیت کی گرفت سے آزاد کر کے حقیقت کی کھلی فضا میں سانس لینے کے اسباب فراہم کئے گئے۔اس دور میں لسانی اصلاح کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔عزاداری نے آنکھیں تو ضرور نم کیں اور خونِ جگر سے دامن کو لالہ رنگ بنا کر شہدائے کربلا کو خراجِ عقیدت پیش کیا لیکن علم وفن کے متنوع موضوعات، قرآن وحدیث کے مسائل ومباحث، تاریخ وسیر کی تحقیقات وتدقیقات سے انسلاک رکھنے والے قرطاس وقلم کا قطب نما بدل گیا۔خلوت کدے میں فکری وذہنی مراقبے کے عادی میدانِ خطابت میں شعلہ نوائیوں کے جوہر دکھانے کے شوقین بننے لگے۔کتب خانوں کے میخانے علمی جام وسبو سے آباد تھے لیکن شراب دانش وحکمت کے جرعہ کشوں کے ادھر رخ نہ کرنے کی وجہ سے ویران سے لگنے لگے۔

آج کی تہذیب مغربی تہذیب اور انگریزوں کے لائے ہوئے تمدن کا ملغوبہ ہے۔انگریزی حکومت نے یہاں کی جامد اور ٹھہری ہوئی رود حیات کو زندہ رود میں بدلنے کی کوشش کی۔حکمرانوں، علماء ومدارس اور عام باشندوں پر جو جمود کی کیفیت طاری ہوگئی تھی اس میں حرکتِ عمل پیدا ہوئی جو مادی اعتبار سے خوش آئند ثابت ہوئی مگر اخلاقی وروحانی نقطۂ نظر سے انگریزوں کی تہذیب نے کھوکھلا پن پیدا کر دیا۔

تذکرہ نگاروں سے بعد کے دانشوران اردو کی عام طور سے یہ شکایت ہے کہ تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکرے کو ادبی تاریخ کی شاخ نہیں بنایا اور نہ ہی ان سے تنقیدی اصول ونظریات کی کوئی خاص روشنی حاصل ہوتی ہے۔بعض صاحبانِ نظر تذکروں کی اس قدیم روش سے خوش نہیں ہیں کہ زیادہ تذکرے نام شماری اور شاعروں کی فہرست سازی سے آگے نہیں بڑھ سکے۔اس قسم کے تذکروں میں نہ شعر گوئی کے آداب واصول بیان ہوئے ہیں نہ عروضی اور فنی حیثیت سے اشعار پر نظر ڈالی گئی ہے۔نہ ان میں شخصیت کی پوری تصویر کشی ملتی ہے نہ ان سے شاعروں کے زمانے کی سماجی زندگی، علم اور زبان وادب کی نئی قدروں کی آگاہی ہوتی ہے۔

کریم الدین صاحب طبقات شعرائے ہند (۱۸۲۱ء۔۱۸۷۹ء) نے تذکرہ نگاری پر اپنا تاثر یوں ظاہر کیا ہے

"الا یہ سب تذکرے میری پسند نہیں۔کیوں کہ سب تذکرے ایسی طرح پر لکھے گئے ہیں

کہ کچھ ان سے تسلی نہیں ہوتی اکثر جاے ان میں نام شعراء کا اور کچھ انتخاب اشعار کا لکھا ہے۔ جس کا حال بہت لکھا ہے ان کی پیدائش کی تاریخ نہیں لکھی اور نہ تاریخ وفات کسی کی لکھی ہے اور حالات خانگی ان کے بہت کم لکھے ہیں، بلکہ ان کی تصنیف کا ذکر بھی بہت کم ہے اور یہ بھی بہت لکھا ہے کہ اس شاعر کا دیوان بھی ہے تو شاید اس سے یہ نتیجہ نکلے کہ وہ بڑا شاعر تھا اور یہ امر ان کو چھپانا منظور ہے"۔(۱۷)

ہمارے ایک ناقد و محقق کو یہ بجا شکایت ہے کہ ہمارے تذکرے عام طور پر حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کئے گئے۔ان میں نہ تو شعراء کی شخصیت کی مکمل تصویر کشی ملتی ہے اور نہ ان کے فکر وفن پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ان میں نہ تو شعراء کے مکمل حالات لکھے جاتے تھے اور نہ یہ بتایا جاتا تھا کہ ان کا زمانہ کیا تھا۔(۱۸)

زیر نظر تذکرہ بھی حروف تہجی سے ہے مگر اس کے بھی کچھ اسباب ہیں۔

گارساں دی تاسی (GARCAN DE TASSY) نے اپنی ہندوستانی ادب کی تاریخ کو تاریخی ترتیب سے نہ لکھنے کا جو عذر نامکمل اطلاعات کو بتایا ہے راقم کو بھی وہی مشکلات درپیش ہیں۔اخلاف کی بے التفاتی اور شاعروں کے حالات وکوائف اور اشعار ونمونہ کلام کی کمی نے کتاب کی الفبائی ترتیب پر مجبور کردیا جس کی وجہ سے شعروادب میں دور بہ دور آنے والی تبدیلیوں کا پورا نقشہ سامنے نہیں آسکا ہے۔اگر سارے مواد بیک وقت دستیاب ہوئے ہوتے تو ہر دور کے شاعروں کا تذکرہ الگ الگ جلدوں میں ضرور کیا جاتا اور اس دور کی خصوصیات کلام پر تبصرہ کرنے میں تامل نہ کیا جاتا۔یہاں تو" ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلّی" کی طرح وقفہ وقفہ سے کچھ نئی باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں، کچھ مکمل کچھ نامکمل حالات دستیاب ہوتے رہتے ہیں۔حالات کسی سے،کلام کہیں سے فراہم کرنے کی جد وجہد میں جو بھی جمع ہو گیا ہے انھیں تنکوں سے آشیاں بندی ہورہی ہے۔

اس تذکرہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے والے بھی شائد اس حقیقت سے اغماض نظر نہیں برت پائیں گے کہ اس کی ترتیب وتدوین اور حالات وکلام کی فراہمی میں راقم کو شہروں، دیہاتوں، کتب خانوں، نجی ذخیروں تک رسائی کے لئے کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑے ہیں۔علمی گھرانوں کے اخلاف میں ادب بیزاری اور اسلاف کے کارناموں سے لاپروائی عام ہوتی جارہی ہے۔بعض ایسے افراد خاندان بھی ملے جو اپنے آباواجداد کے نام اور کام سے ناواقف نکلے یہاں تک کہ بعض نے اپنے والد کے احوال وکلام سے

لاعلمی کا اظہار کیا۔ آج کے شاعر بیٹے بھی والد بزرگوار کے کلام کی فراہمی سے زیادہ اپنا ہی کلام سنانے کا ذوق رکھتے ہیں، گویا وہ باپ پر گوئے سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے حضرات مشاہدے میں آئے جو خود ہی ان موضوعات پر کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس وجہ سے انھوں نے اپنے پاس کچھ محفوظ ہونے سے صاف انکار کر دیا جب کہ واقعتاً ایسا نہیں ہے۔ خدا کرے وہ محفوظ رہے اور کبھی سامنے آئے۔

اب تک بہت سا مواد برباد ہو چکا ہے اور بہت کچھ تلف ہو جانے کے قریب ہے کیوں کہ سفالہ پوش مکانوں اور اشراف کی معاشی و بحرانی کیفیت اس علمی وادبی ذخیرے کی حفاظت سے مانع رہی۔ تقسیم ہند اور بسلسلۂ معاش و ملازمت دیہاتوں سے شہروں کی طرف ہجرت کرنا اور دیارِ غیر میں سکونت پذیر ہونا بھی ریکارڈ کے تلف ہونے کا ایک بڑا سبب ہوا۔ پہلے کے لوگ کاغذ کی چٹوں اور خسرہ کھتونی پر یا کتابوں کے خالی صفحات میں بھی کلام لکھ کر ادھر ادھر رکھ دیتے تھے۔ پہلے کے شرفائے علم دوسرے علمی و دینی مشاغل کے پیش نظر اپنی شاعری کو اہمیت بھی نہیں دیتے تھے۔ تفنن طبع اور دل بہلاوے کے بعد انھوں نے اس کی حفاظت کے خیال کو کبھی اپنے دل میں نہیں آنے دیا۔

ہمارے یہاں تذکروں، ادبی تاریخوں اور تنقیدوں پر ادبی مرکزوں کے مشہور و مستند اور معیاری غزل گویوں کی کہی ہوئی غزل پوری طرح حاوی رہی ہے۔ جو شاعر غزل نہ کہتا تھا وہ ادب کے دربار میں بار نہیں پاتا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو کا ابتدائی زمانہ میں صفحہ ۱۱۹ پر لکھا ہے کہ "ہمارے یہاں کی ادبی تہذیب پر دہلوی سامراج قائم ہو چکا تھا... خود وہ دہلی والے یا شمال والے جو غزل کے معیار پر پورے نہ اترتے تھے۔ ادب کی محفل میں داخلہ پانے سے محروم رکھے گئے"۔ دوسری اصناف کو تنقید و تحقیق سے ان کا حق نہیں مل پایا ہے عام رسل ورسائل بھی اپنی اشاعتوں میں غزل ہی کی طرفداری کرتے ہیں۔ لیکن سخنورانِ اعظم گڑھ میں غزلوں کے علاوہ دوسری اصناف کے بھی نمونے دیئے گئے ہیں۔ جن سے کچھ نئی جہتیں روشن ہو سکتی ہیں۔

مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں اعظم گڑھ شہر کو اعظم خاں متوفی ۱۷۱۵ء ابن راجا بکر ماجیت نے ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں اپنے نام پر بسایا۔ اور ان کے چھوٹے بھائی راجا عظمت خاں بن راجا بکر ماجیت نے حدود ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں اپنے نام سے منسوب عظمت گڑھ نامی بستی آباد کی۔ ان دونوں معاصر بستیوں کے نواح میں پہلے ہی سے بہت سے گھرانے مختلف مقامات

ودیار سے آکر بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ ان دونوں بستیوں کے ہندوستانی نقشے پر ابھر آنے کے بعد ان میں یہاں اور اطراف کی بستیوں میں صوفیائے کرام اور علمائے فحول کی آمد و رفت تیزی سے ہونے لگی۔ یہاں علم و دانش کے خیمے بھی گڑتے گئے اور معرکوں میں سیف و علم بھی بلند ہوتے رہے۔ پورا دیار علم و علماء کی وجہ سے بارونق ہوتا گیا۔ اور قرطاس و قلم مملکتِ فکر و نظر بانٹنے لگے۔ عظمت گڑھ کے بارے میں مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی تحقیق ہے کہ

"راجا اعظم خاں بانی اعظم گڑھ کے بھائی راجا عظمت خاں نے حدود (۱۲۶۵ء/ ۱۰۷۶ھ) میں عظمت گڑھ آباد کر کے یہاں اپنی حکومت قائم کی اس کے بعد اس علاقہ میں علماء و مشائخ کی اچھی خاصی تعداد آباد ہوگئی۔ چنانچہ اس دیار میں رشید آباد، انجان شہید، علما پور، چاند پار، علی پور، ظہیر الدین پور، رسول پور کرمینی، بندول، جیراج پور، مہراج گنج، چاند پٹی وغیرہ مسلمانوں کی مشہور بستیاں آباد ہوئیں جن میں علم و علما کی رونق پیدا ہوئی" (۱۹)

اس دیار میں اسلام کی بو سید سالار مسعود غازی (۱۱ر رجب ۴۰۵ھ/ ۱۵ر فروری ۱۰۱۵ء۔ ۱۴ر رجب ۴۲۴ھ/ ۱۰ر جولائی ۱۰۳۳ء) کی تبلیغی و جہادی سرگرمیوں سے پھوٹی۔ انھوں نے خود بھی ان اطراف کی جہادی قیادت کی اور اپنے رفقاء کو اس ضلع کے مختلف مقامات پر دین اسلام کے پیغام کو پہنچانے کے لئے دستے بنا بنا کر بھیجا۔ ان کا ایک قافلہ چندوک گھاٹ دریائے گومتی کو عبور کر کے دیوگاؤں آیا یہاں جن شہیدوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا ان کے مزارات قصبہ دیوگاؤں میں گوشت مارکیٹ کے جوار میں ایک خطیرہ میں اب تک موجود ہیں۔ قافلہ میں شریک رہنے والے مجاہدین کا اگلا پڑاؤ قصبہ محمد پور تھا وہ یہاں لال گنج ہوتے ہوئے پہنچے تھے۔ یہاں بھی سڑک کے کنارے ان کے مزارات ہیں۔ یہاں سے ان مجاہدین اسلام کے قافلے قصبہ نظام آباد میں ورود فرما ہوئے نظام آباد میں ان کے آثار ماضی قریب تک موجود تھے۔ باقی ماندہ حصۂ فوج موجودہ شہر اعظم گڑھ کے اطراف میں فروکش ہوا۔ یہاں سے ان کی ایک جماعت شاہ گڑھ پہنچی۔ مواضعات جموڑی، فخر الدین پور، گجہڑا، قاسم آباد (موجودہ مبارک پور) میں بھی ان کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ موضع گجہڑا کے اتری سرحدی سرے پر اوسروا لے شہید بابا کا مزار قدیم زمانے سے مرجع خلائق ہے۔ اس کے کئی ایکڑ وسیع میدان میں تقریبات عرس ہوتی ہیں۔ ان مجاہدین اسلام کی دوسری فوجی جماعت اعظم گڑھ شہر سے اتر جانب بلریا گنج، جیگہاں اور بھگت پور میں گئی۔ بھگت پور میں ان

کے آنے کے ثبوت ملتے ہیں۔

اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء میں ہے کہ مسعود غازی بہرائچ جاتے ہوئے چند دنوں تک بھگت پور میں رکے تھے۔ سید سالار مسعود غازی کے والد سالار ساہو شہید کا مزار بھی بھگت پور میں موجود ہے۔ مبارک پور کے موضع سریاں کے پاس موضع ملک شدنی میں حضرت ملک شدنی رحمۃ اللہ علیہ آسودۂ راحت ہیں۔ بھگت پور سے غازیوں کا قافلہ مہراج گنج گیا۔ غازی میاں کے حقیقی چچا سید سالار باہو بھی شہادت سے سرفراز ہو گئے جہاں بعد میں ایک شاندار بلند مقبرہ تعمیر ہوا اور اس موضع کو باہو سالار سے موسوم کیا گیا جو ناخواندہ عوام کی لسانی تحریف سے بگڑ کر بابو سالار ہو گیا ہے۔

سید سالار مسعود غازی کے حکم پر ان کے دو رفقائے جہاد ملک طاہر اور ملک محمد قاسم ایک مہم کے طور پر مئو ناتھ بھنجن آئے۔ یہاں ایک سرکش نٹ دریائی سفر کرنے والوں کی مصیبتوں کا سبب بنا ہوا تھا محاذ آرائی میں نٹ مارا گیا۔ یہاں کے باشندوں نے اپنے ان محسنین کو یہیں سکونت اختیار کرنے کے لئے کہا۔ ملک طاہر پورہ اور قاسم پورہ نام کے محلے انھیں دو برگزیدہ بندگانِ خدا کی یاد دلاتے ہیں۔

کوپا گنج میں بھی ایک مقام "گنج شہیداں" کے نام سے مشہور ہے جس سے ثابت ہے کہ کوپا گنج میں بھی غازی میاں کے مجاہدین آئے تھے۔ اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء کے صفحہ ۱۵۷ پر ہے کہ ضلع میں بہت سے شہید واڑے ہیں، یہ وہ جگہیں ہیں جہاں مجاہدین شہید ہوئے اور دفن کئے گئے مگر لوگ ان کے واقعات بھول گئے۔ خلاصۂ تاریخ مسعودی، مولوی محمد صادق مطبوعہ غالب الاخبار ۱۲۸۸ھ میں صفحہ ۷ پر درج ہے کہ ممالک مغربی وشمالی اودھ میں جہاں مقابرِ شہیدانِ ہمراہیانِ غازی میاں کہا جائے اس کو باور کرنے میں تامل نہ کیا جائے۔

ان اطراف میں غازی میاں کے رفقائے جہاد کی کثرت سے شہادتیں ہوئیں اور جہاں جہاں زیادہ تعداد میں شہادتیں ہوئیں انھیں ایک قبر میں دفن کیا گیا اور اس کو گنج شہیداں کا نام دیا گیا۔

شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانی سہروردی متوفی ۷۳۵ھ حضرت سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ (۱۱؍رجب ۴۰۵ھ/ ۱۵؍فروری ۱۰۱۵ء - ۱۴؍رجب ۴۲۴ھ/ ۱۰؍جولائی ۱۰۳۳ء) کے بعد دوسرے ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے دیار پورب میں تبلیغ واصلاح کی تحریک میں گرمی پیدا کرنے کے لئے خاص توجہ فرمائی۔ انھوں نے اپنے تین خلفاء کو باطنی علوم اور روحانی صلاحیتوں سے آراستہ کر کے اس دیار میں بھیجا۔

شیخ رکن الدین کے ایک خلیفہ سید اسد الدین کٹروی ظفر آبادی متوفی ۷۹۳ھ بن شیخ تاج الدین

آفتاب ہند ہیں جنھوں نے پورب کے کئی مقامات پر جہاد کیا انھوں نے سگڑی کے بناوا تالی مقام میں بھی جہاد کیا جس کے نتیجے میں یہاں کا راج بھر قوم کا راجا مسلمان ہو کر ظلم و تعدی سے باز آیا۔ سگڑی تحصیل میں ان کے مکان و مسجد کی باقیات ابھی حال تک پائی جاتی تھیں۔

دوسرے خلیفہ مخدوم شیخ صدرالدین چراغ ہند ملتانی ظفر آبادی (۶۱۰ھ - ۷۹۵ھ) پورب میں آ کر ہزاروں کی رشد و ہدایت کا سبب بنے۔ ضلع مرزا پور کے مقامات بھوئلی، مہدیو پور، پہاڑ دھواں دری، پہاڑ پورو ادری، جون پور کے ملحقات سید پور و مچھلی شہر اور اعظم گڑھ کے مواضعات کھمولی، سرسال، مخدوم پور، منڈیار میں ان کی چلہ کشی کے مکانات ابھی تک یادگار ہیں۔

شیخ رکن الدین ملتانی کے تیسرے خلیفہ شیخ مخدوم ظہیرالدین متوفی ۲۷؍ ذی الحجہ ۷۴۵ھ نے محمد آباد گوہنہ کو اپنا مستقل مرکز اقامت قرار دے دیا۔ ان کے صاحبزادے شیخ جمال الدین نے باپ کی وراثت کو فروغ دیا۔ ان کے بعد شیخ داؤد بن شیخ جمال کو خلافت و ولایت کا خرقہ ملا۔ ان تینوں بزرگوں کی آخری آرام گاہیں محمد آباد کے پچھّم سڑک کی اتری طرف ایک ٹیلہ پر آستانہ روضہ میں ہیں۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہدِ حکومت ۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ میں امیر سید حمیدالدین نے بھی مستقلاً اپنی دعوت کا مرکز محمد آباد گوہنہ کو بنایا۔ یہ سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی متوفی ۸۰۸ھ اور ان کے مرید خاص حکومت شرقی کے قاضی القضاۃ قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۸ھ کے ہم عصر تھے۔ یہ پانچ بیٹوں سید محمد عرف سید بوڈھن، سید محی الدین، سید حسن، سید پھول، سید میراں کے پدر محترم تھے، یہ سبھی صاحب اولاد ہوئے۔ انھیں کے بڑے صاحبزادے سید محمد عرف سید بوڈھن کے نام پر محمد آباد نام پڑا اور تعارف کے واسطے لفظ گوہنہ کو باقی رکھا گیا اور دوسرے صاحبزادے سید محی الدین کے نام پر ٹونس ندی کے شمال میں محی الدین پور ہے۔ سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی بھی بنگالہ کے سفر سے واپس لوٹتے وقت محمد آباد گوہنہ میں ٹونس ندی کے کنارے فروکش ہوئے تھے۔ یہیں کے دورانِ قیام میں ان کے رسالہ مناقب صحابہ پر علماء کی مجلس علمی میں بحث و مباحثہ ہوا تھا۔ (۲۰)

گھوسی اورادری، اعظم گڑھ سے بہت پہلے کی آبادیاں ہیں۔ فیروز آباد شاہ پور، میر پور ادری کے قریب کی بستیاں ہیں۔ احمد شاہ ارزانی یا شاہ ارزاں متوفی ۴؍ ذی الحجہ ۱۰۲۸ھ/ ۲؍ نومبر ۱۶۱۹ء نے بنارس سے سیوان جاتے وقت اثنائے سفر میں مسرولی (مصرولی) مئو (ناتھ بھنجن) اور فیروز آباد میں بھی قیام

فرمایا تھا۔اعظم گڑھ اور مسرولی میں آپ کی چلہ گاہیں بھی ہیں۔عظیم آباد میں مستقل قیام کے دوران بھی اعظم گڑھ اوراس کے اطراف میں حضرت بارہا تبلیغ دین اوراشاعت حق کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔(۲۱) ان کی تشریف آوری اکبر کے دین الٰہی کی بیخ کنی کے لئے تھی۔

ان بزرگوں کی تحریک اصلاح وتبلیغ نے اسلام کی تعلیمات اور ہدایات ربانی کا غلغلہ پورب دیس کے گوشے گوشے میں بلند کر دیا۔اورخلقِ خدا دائرۂ اسلام میں آنے لگی۔دیار پورب میں اسلامی ملکوں سے آنے والے علماء واولیاء کے شانہ بشانہ ایرانی، افغانی، تورانی ہرنسل کے لوگ آ کر آباد ہوئے۔مولانا عاصم کا بیان ہے کہ

"ادری کے بانی حضرت نیک قدم خاں ہیں جوتقریباً آج سے چارسوسال پہلے اقامت گزیں ہوئے۔ان کے بعدافغانوں کے مختلف خاندانوں نے یہاں بودوباش اختیار کی"۔(۲۲)

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

"شیرشاہ سوری اورسلیم شاہ سوری دونوں افغان حکمراں تھے اورانھوں نے افغان کے مختلف قبائل کوشاہی مراعات دے رکھی تھیں۔ان دونوں کے زمانے میں افغانوں کے قافلے جوق درجوق مشرقی یوپی میں آباد ہوئے"۔(۲۳)

مولانا عاصم کی تحقیق کے مطابق مغلوں کے عہد میں ادری میں متعدد افغان خانوادے آباد ہوئے....اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں اس علاقے کے افغان باشندوں کوشاہی جا گیریں اور مراعات سے سرفراز کیا جاتا رہا خصوصاً شاہ جہاں کے دور میں جب مئو کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور شہزادی جہاں آرا بیگم مئوآئی تو پورے علاقے میں باہر سے آنے والے مسلمان پے درپے وہاں آباد ہوئے۔

محمد پور کے مسلمانوں کے مورث اعلیٰ غغر خان کا کر اور پیر خاں کا کر دوحقیقی بھائی ستمبر ۱۰۱۸ء میں افغانستان سے محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ کوچ کر کے سرزمین محمد پور پر دسمبر ۱۰۱۹ء میں آ کر آباد ہوئے اور دھیرے دھیرے اس کو ایک بڑے اور تعلیم یافتہ گانو میں تبدیل کر دیا اس گانو نے سلاطین شرقی اور شیر شاہ سوری کے دور تک کافی ترقی کی کیونکہ اس گانو کے باشندے اور سلاطین وشیر شاہ سوری تینوں افغانی النسل تھے مگر مغل دور میں اس کے عروج کا خاتمہ ہونے لگا اکبر سے شاہ جہاں تک اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لئے ہر افغان گانو کو برباد کرنا شروع کر دیا۔محمد پور کے باشندے بھی مغلوں کے ستم سے محفوظ نہ رہ سکے۔(۲۴)

انگریزوں کے دور تسلط میں انگریز خاندان بھی یہاں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے ۱۸۱۳ء میں آسٹریلین مشن نے اعظم گڑھ میں گیریشن چرچ کی بنیاد ڈالی جو آزادی کے بعد عیسائیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ۲۰۰۷ء میں اس کی ۱۹۴ ویں سال گرہ منائی گئی تھی۔

ان حقیقتوں اور تاریخی شہادتوں کے بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اس ضلع کے دیار وامصار اور دیہات وقریات اور قصبات وملحقات میں بہت پہلے سے مختلف نسل و مذاہب اور پیشہ سے تعلق رکھنے والوں کی ملی جلی معاشرت ہے۔ جو قومیں خلعت اسلام سے سرفراز ہوئیں ان میں سے بعض ایسے لوگ اور خاندان تھے جو مغلوں، پٹھانوں، شیوخ اور دوسرے اونچے خاندانوں میں شادی بیاہ کرنے لگے۔ بعض ایسے تھے جو غیر کفو میں شادی بیاہ کو معیوب نہیں سمجھتے تھے شیخ عبداللہ محمد آباد گوہنہ کے شیوخ میں سے تھے لیکن ماں کسی معمولی خاندان سے تھیں۔

علامہ شبلی نعمانی کے گھرانے میں بھی غیر کفو میں شادی کرنے کا رواج تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی شیخ محمد اسحٰق متوفی اگست ۱۹۱۴ء وکیل الہ آباد ہائی کورٹ کے لڑکے فاروق نعمانی عرف للو نے اپنی والدہ کے بارے میں بتایا کہ وہ غازی پور کی ملکن غیر برادری کی تھیں۔ (۲۵)

اسی طرح مولانا شبلی کے والد کے بارے میں آیا ہے کہ انھوں نے بھی ایک اور شادی غیر کفو میں کی تھی جن سے ایک صاحبزادے محمد مرحوم تھے۔ (۲۶)

ان مخلوط معاشرتوں کی وجہ سے ہندوی جیسی ایک نئی زبان میں تبدیلی ہوئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ نکالا جائے کہ اردو زبان کی پیدائش قوموں کی مخلوط معاشرت کا نتیجہ ہے۔ اردو کے آغاز کا سلسلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے جوڑنا تاریخی اور لسانی طور پر کسی طرح مناسب نہیں ہے کیوں کہ اردو اس سے بہت پہلے وجود میں آ چکی تھی اگرچہ اس کی شکل کچھ اور تھی اور مختلف لوگوں کی زبان وقلم پر اس کے نام بھی کئی ایک تھے۔ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے یعنی گیارہویں صدی عیسوی میں جب مسلمان تواتر کے ساتھ ہندوستان میں سکونت گزیں ہوتے گئے تو اردو کی لسانی صورت گری پر نمایاں فرق پڑا۔ لیکن یہ کہنا اور سمجھنا کہ مسلمانوں کے ساتھ میں آنے والی زبانوں عربی وفارسی، ترکی و پشتو اور مقامی زبانوں کے ملاپ سے اردو بنی ہے یا یہ ایک لشکری زبان ہے سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے جس کی تصدیق تاریخی حوالوں سے نہیں ہوتی۔ یہاں ایک محقق کا حوالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"اردو کوئی لشکری زبان نہیں، نہ ہی کئی زبانوں کا امتزاج ہے بلکہ اس کی جڑیں مغل عہد سے بھی زیادہ پرانی ہیں" (۲۷)

اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کا جنم مغل حکمراں شاہ جہاں کے عہد میں سترہویں صدی عیسوی میں ہوا بے بنیاد تصور ہے جس کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں۔

تاریخی شواہد اس نظریئے کے حق میں ہیں کہ اردو مخلوط زبان نہیں، ہند آریائی زبان ہے۔ اور اس کا جدید دور اپ بھرنشوں کا دور ہے۔ اور اس کو وجود میں لانے والے عام ہندو ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کے نتیجے میں اردو کے وجود پذیر ہونے کے نظریئے کو مقبول عام ہونے کا ایک بڑا سبب اس زبان کا نام اردو ہونا اور اس کا طرز تحریر فارسی رسم الخط بھی ہے۔ زبان کے نام کے طور پر لفظ اردو کے استعمال کے سلسلے میں اہم محقق شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں کہ

"ہماری زبان کے نام کے طور پر لفظ اردو کا استعمال اٹھارہویں صدی عیسوی کے ربع آخر کے پہلے نہیں ملتا۔ زبان کے نام کے طور پر اس لفظ (اردو) کی زندگی غالباً زبانِ اردوئے معلائے شاہ جہاں آباد کی شکل میں شروع ہوئی اور اس سے مراد تھی "شاہ جہاں آباد کے شہر معلیٰ/قلعۂ معلیٰ/دربار معلیٰ" کی زبان۔ ایسا لگتا ہے کہ شروع شروع میں اس فقرے سے ہماری اردو زبان نہیں بلکہ فارسی مراد لی جاتی تھی۔ مرور ایام کے ساتھ یہ فقرہ مختصر ہو کر "زبان اردوئے معلیٰ" پھر "زبان اردو اور پھر اردو رہ گیا"۔ (۲۸)

اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء۔ ۱۷۰۷ء) کے زمانۂ حکومت سے قبل اسی کو ہندی ہندوُی، ہندوِی، گوجری، گجری، دکنی، مسلمانی، ترکامانا، زبان اہل ہند، زبان دہلوی، زبان ہندوستاں، ہندوستانی، گوالیاری اور ریختی کے نام دیئے گئے تھے۔ اردو کے مخلوط زبان ہونے کی تردید میں محمد انصار اللہ نے اپنی تحقیق کی روشنی میں کہا ہے کہ

"صحیح یہ ہے کہ اپنی اصل کے لحاظ سے یہ زبان خالص ہندوستانی ہے اور عوام کی زبانوں پر اس وقت بھی جاری تھی جب مسلمان یہاں آئے مسلمانوں نے اپنی ضرورتوں کے لئے اس عوامی گری پڑی بولی (اُپ بھرنش) کو اختیار کیا اور بالآخر اس زبان کے لفظوں، فقروں اور جملوں کو اپنے طور پر لکھنے لگے۔ اس طرح آہستہ آہستہ مسلمانوں سے سہارا پا کر یہ بولی ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی اس کے لئے وہی رسم خط مقرر ہو گیا جو مسلمانوں میں رائج تھا۔ نتیجہ کے طور پر اس میں

عربی اور فارسی کی مخصوص آوازیں بھی جاری وساری ہوگئیں"(۲۹)

تحقیق کے حوالے اور علم لسانیات کی رو سے یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اردو قدیم ہندوستانی زبان ہے لیکن اس کا نام نیا ہے۔ اردو کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ یہ ترکوں اور منگولوں کی زبان ہے تاریخ سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ بعض تاریخی کتابوں، تذکروں، صوفیوں کے ملفوظات وغیرہ میں ایسے کئی الفاظ ومرکبات، جملے اور مصرعے آئے ہیں جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اردو ترکوں اور منگولوں کے زمانۂ اقتدار سے پہلے ہی عوام میں رائج ہو چکی تھی۔

زبان کے لئے ہندیہ کی اصطلاح کا سب سے پہلا استعمال ۲۷۰ھ/ ۸۸۴ء میں ملتا ہے۔محمود غزنوی کے جانشین مسعود غزنوی کے بالکل ابتدائی زمانے (۴۲۴ھ/ ۱۰۳۳ء) میں زبان بنارس کو ہندوی کا نام دیا گیا ہے۔(۳۰)

رؤف پاریکھ لکھتے ہیں کہ "بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مطابق مسلمان برصغیر میں اردو زبان نہیں لے کر آئے تھے۔عرب، ایران یا کسی اور جگہ سے صدیوں پہلے ہندوستان آنے والے مسلمان اردو نہیں بولتے تھے۔ وہ عربی، فارسی، ترکی اور پشتو وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ وہ افراد جنھوں نے اردو کی تخلیق یا بنیاد رکھی وہ ہندو تھے۔ کیوں کہ اردو اپنی نحوی ساخت اور شکلی اسٹرکچر کے مطابق ہندی جیسی ہے۔۹۹ فیصد اردو فعل ایسے ہیں کہ جن کا تعلق ہندوستان سے ہے"۔(۳۱)

اردو نے افعال کے مادے اور بیشتر اسماء پراکرتوں اور اپ بھرنشوں سے لئے ہیں۔ پراکرت کا زمانہ سنہ ایک عیسوی سے ۱۰۰۰ء تک ہے۔ اردو میں پراکرت سے جو الفاظ داخل ہوئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ پانی، پتھر، گھور، کتا، بیل، باڑی وغیرہ۔

اردو میں رائج چند جامد اسماء کو چھوڑ کر اس کے سارے صرفی ونحوی قواعد سراسر ہندوستانی زبانوں اور بولیوں سے ہی لئے گئے ہیں۔ زبان کی تین بنیادیں اسم، فعل، حرف ہوتی ہیں۔ اسم کی بھی تین قسمیں مصدر، مشتق، جامد ہوتی ہیں۔ اردو کے افعال، مصدر، مشتقات اور حروف سارے کے سارے ہندوستانی ہیں اور اسمِ جامد کا غالب حصہ بھی ہندوستان کی تیرہ زبانوں سے اخذ کردہ ہے۔ صرف چند جامد اسماء عربی، فارسی، ترکی، انگریزی سے ماخوذ ہیں جیسے، تکیہ، قلم، کرسی، کتاب (عربی) بیگم، یورش، یلغار، چقماق، چاپچی (ترکی) بے پناہ رہ گزر، گراں، زبردست (فارسی) مشن، مشین، اسکول، کالج، یونیورسٹی،

نوٹس، (انگریزی) اس طرح کے دخیل الفاظ دنیا کی تمام زبانوں میں ہیں اور دخیل الفاظ کو زبان کا بنیادی ڈھانچہ کوئی سمجھتا البتہ دخیل الفاظ سے سرمایۂ زبان میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اردو زبان کا بنیادی ڈھانچہ ہندوستانی بولیوں سے لیا گیا ہے۔ اس کے تمام مصدر، افعال، صیغے، ضمیریں، علامات زمانہ، حالت فاعلیت ومفعولیت کی علامتیں، حروف عطف واضافت اور دوسرے تمام حروف یہیں کی بولیوں کے ہیں۔ انھیں سامانوں سے زبانوں کی بنیادوں اور جڑوں کی شناخت ہوتی ہے۔ اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اردو ہندوستانی سماج اور قدیم سنسکرتی کی دین ہے۔ یہ تاریخی سچائی بھی ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ علاقائی بولیوں کو ہندوستان کے اعلیٰ طبقات کے لسانی شرفا پسند کرتے تھے کیوں کہ ان کی زبان سنسکرت تھی۔ عوام کا پسماندہ طبقہ اگر مذہبی اشلوکوں یا ویدوں کی عبارتوں کو سن کر بھی یاد کر لیتا تھا تو انھیں سزا کا مستحق قرار دے دیا جاتا تھا۔ مسلم شرفا بھی عربی وفارسی کے دلدادہ تھے۔ مغلوں کے بعد انگریزوں کے ابتدائی دور تک فارسی سرکاری کام کاج کی زبان تھی۔ لوگ مقامی بولیوں اور عوامی زبانوں کے استعمال کو کسر شان سمجھتے تھے۔ خود غالب اپنی اردو شاعری کو بے رنگ من است کہتے تھے۔ حویلیوں، محلوں، درباروں، فوجی چھاؤنیوں تک عام لوگوں کی رسائی مشکل تھی۔ "عام ہے کہ دارالسلطنت میں جہاں فوجی چھاؤنی بھی ہوتی تھی غیروں کے گزر کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے" (۳۲)

اعیانِ حکومت، رئیسوں اور وزیروں کے لئے جو مینا بازار لگتے تھے ان میں بھی عوام الناس کا داخلہ ممنوع تھا۔ یہ صوفی سنت، پیشہ ور اور محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے پسماندہ لوگ ہی تھے جو علاقائی بولیوں سے کام لیتے تھے۔ درباروں اور حویلیوں کے باہر گلی کوچوں، کھیت کھلیانوں، میلوں ٹھیلوں، ناچ گانوں کی منڈلیوں، خانقاہوں، تکیوں، صوفیوں کی مجلسوں، اولیاء اللہ کی صحبتوں میں عوامی بولیوں ہی کا سکہ چلتا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اولیاء اللہ کی اردو خدمات کے تعلق سے رقم طراز ہیں کہ

" جتنے اولیاء اللہ سرزمین ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے وہ باوجود عالم وفاضل ہونے کے (خواص کو چھوڑ کر) عوام سے انھیں کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم وتلقین فرماتے تھے۔ انھوں نے اپنے اس بیان کی تصدیق میں ملک محمد جائسی کی کتاب اکھروتی کے شارح کے اس قول کو نقل کیا ہے کہ

"وگمان نہ کنند کہ ہیچ اولیاء اللہ بہ زبان ہندی تکلم نہ کردو وزیرا کہ اول از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملۃ والدین قدس اللہ سرہٗ بدیں زبان سخن فرمود بعد ازاں خواجہ گنج شکر

قدس اللہ سرہٗ" (اور ہرگز یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ کسی اولیاء اللہ نے زبان ہندی میں کلام نہیں کیا اس لئے کہ اولیاء اللہ کے پہلے ہندوستانی سرخیل خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سنجری رحمۃ اللہ علیہ (۱۴/رجب ۵۳۷ھ۔ ۶/رجب ۶۳۴ھ) نے اس زبان میں بات چیت کی ان کے بعد خواجہ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے اشعار کہے) (۳۳)

اردو کے مولد ماخذ اور آغاز وارتقا کے سلسلے میں ماہرین کے مختلف اقوال ونظریات ہیں مثلاً (۱) اس کی ابتدا سندھ سے ہوئی (۲) پنجاب اس کی زاد بوم ہے (۳) سرزمین دکن اس کی مادر وطن ہے (۴) دہلی اور اس کے نواح میرٹھ میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا قیاس ہے کہ اردو کا ہیولیٰ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔ آثار الصنادید باب ۳ ص ۱۰۵ میں سرسید، دیباچہ باغ وبہار میں میرامن، آب حیات ص ۱۳ مطبوعہ ۱۹۶۷ء عثمانیہ بکڈپو کلکتہ میں مولانا محمد حسین آزادؔ، اردو انسائیکلو پیڈیا ج ۱ ص ۶۴ طبع دوم ۲۰۱۰ء قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی میں فضل الرحمٰن، مقدمہ تاریخ زبان اردو میں مسعود حسین خاں اور دوسرے بہت سے دانشوروں مثلاً مشہور مستشرق سر جارج ابراہیم گریرسن، معروف ماہر لسانیات سونیتی کمار چڑجی، شوکت سبزواری نے اردو کا مولد ومنشا دہلی اور اس کے گردونواح کے علاقوں کو بتایا ہے اور اس کا ماخذ کھڑی بولی کو قرار دیا ہے۔ حافظ محمود شیرانی اپنی معرکۃ الآرا تحقیقی کتاب "پنجاب میں اردو" فوٹو آفسیٹ ایڈیشن ۱۹۸۲ء اردو اکیڈمی لکھنؤ ص ۱۷ میں اردو کا مولد پنجاب کو قرار دیتے ہیں۔ انھیں کے ہم نو ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ، مولوی عبدالحق، حکیم شمس اللہ قادری اور عبدالقادر سروری بھی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ دکنی، قدیم اردو کا روپ نہیں اس کا ارتقا اپنے طور پر علاحدہ ہوا (۳۴) نصیرالدین ہاشمی اردو کا سلسلہ مدراس کے سواحل سے جوڑنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد انصاراللہ نے لکھا ہے کہ بعض محققوں نے اردو کا تعلق دکن کے علاقوں سے جوڑا، اور ایک صاحب نے اس کا سلسلہ پالی سے بھی قائم کرنا چاہا۔ چند سال پیشتر یہ کوشش بھی کی گئی کہ اردو کو دراوڑ بولیوں سے متعلق کر دیا جائے (۳۵) اس کثرت تعبیر کے سبب اردو کی لسانی تحقیق ایک خواب پریشاں کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

اب تک پروفیسر مسعود حسین خاں کے اس نظریئے کو کہ اردو کی پیدائش دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں ہوئی ہے اردو دانشوروں کے حلقوں میں ترجیح حاصل ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا بھی

یہی خیال ہے (۳۶) مگر ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے اپنی حالیہ تحقیقی کتاب تاریخ زبان وادب اردو حصہ اول مطبوعہ دہلی ۲۰۱۲ء میں اردو کے مولد ومنبع اور اس کے ماخذ کے تعلق سے بالکل نیا مگر براہین ودلائل سے مزین نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اردو کا ماخذ اودھی زبان اور اس کا مولد ومنشاخطۂ اودھ ہے۔اب تک جتنے نظریات رائج ہیں ان میں یہ نئی تحقیق بالکل چونکا دینے والی ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ

"میں نے اس تاریخ میں زبان اردو کی ابتدا کے بارے میں ایک بالکل نیا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ یہ محض شوقیہ نہیں ہے۔واقعات اسی حق میں ہیں اور حقائق سے صرف نظر کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہوسکا"(۳۷)

اس سے پہلے اپنی شائع کردہ تحقیق تاریخ اقلیم ادب حصہ اول مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۷۹ء اور اسی کے حصہ دوم مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۸۰ء میں بھی انھوں نے یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی جو مختصر تھی لیکن اب حالیہ تحقیق زیادہ شرح وبسط اور نئی تفصیلات ومعلومات پر مشتمل ہے۔

گنگ وجمن کے دوآبہ کو ہندوستان کی تاریخ وتمدن اور صحیفۂ مذہب واخلاق میں زمانۂ قدیم سے اہمیت حاصل ہے تاریخ فرشتہ کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اودھ پہلا شہر ہے جو ملک ہندوستان میں آباد ہوا۔جغرافیائی حدود میں ہندوستان کی وسعت خواہ کتنی بھی رہی ہو لیکن قدیم تاریخوں میں ہندوستان سے مراد وہی علاقہ تھا جو دہلی سے مشرق میں واقع تھا۔گنگا جمنا کے دوآبہ کے بارے میں اظہر علی فاروقی متوفی ۱۷رمئی ۱۹۸۶ء فرماتے ہیں کہ

"یہ علاقہ عہد عتیق سے تہذیب وتمدن اور علم وفن،صنعت وحرفت اور دستکاری کا مرکز رہا ہے۔آبادی گنجان ہے جو زیادہ تر دیہاتوں میں ہے اور اسی لئے یہاں کے باشندوں کا خاص پیشہ کھیتی باڑی ہے"۔(۳۸)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ

"دوآبۂ اتر پردیش کی بولیوں کا ایک مرکز سمجھنا چاہئے جس سے کوروی (کھڑی بولی) برج، اودھی، روہیلی،قنوجی بولیاں نکلی ہیں اور پوربی حصے میں بھوج پوری اور کاشکا بولیاں ہیں"۔(۳۹)

گنگا کی وادی مشرقی یوپی اور مغربی بہار کے علاقے مدھ دیس یعنی وسط ہند کہے جاتے تھے۔یہی علاقہ ہندومت کا گہوارہ ہے۔اسی علاقے سے بدھ مت اور جین مت بھی نکلے۔تاریخ کہتی ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح کے عظیم مصلح مہاتما بدھ غیر منقسم گورکھپور کے لمبنی میں پیدا ہوئے۔پیر ہوا (کپل وستو) بدھ کے والد

شاکیہ راجا شدھودھن کی راجدھانی تھا یہاں بدھ کا بچپن اور عہد شباب گزرا۔انھوں نے یہیں درویشی اختیار کی۔کشی نگر جو ۱۹۴۶ء تک گورکھپور کا حصہ تھا یہیں ان کی وفات ہوئی اوران کی آخری رسومات بھی یہیں ادا کی گئیں۔اسی علاقے کا فاضل نگر جین مذہب کے بانی مہاویر سوامی کی جائے وفات اور بدھ کی اقامت گاہ تھا۔ اس علاقے کا مذہبی تسلط وغلبہ ترکی تک تھا۔ڈاکٹر ایرکان ترکمان کے حوالے سے محمد انصاراللہ نے لکھا ہے کہ اسلام سے پہلے کے جو (ترکی) متون ملتے ہیں وہ زیادہ تر بدھ مت کے بارے میں ہیں (۴۰)

ہندوؤں کے عام عقیدے کے مطابق بھی ہندوستان سے مراد وہی علاقہ تھا جہاں گائے کی پوجا ہوتی تھی اور گنگا بہتی تھی۔برہمن بھی دوآبہ کو ہندوستان کہتے تھے اور یہیں رہتے تھے جہاں دوب گھاس اور کالے ہرن ہوتے ہیں یہ ان حدود سے نکلنا بھی گناہ سمجھتے تھے (۴۱) خان آرزو بھی جو مولداً اکبر آبادی ہیں اپنے کو ساکن ہند کہتے ہیں" خان آرزو (۱۶۸۷ء/ ۱۶۸۸ء تا ۱۷۵۶ء) نے ۱۷۴۷ء سے ۱۷۵۲ء کے زمانے میں نوادرالالفاظ تصنیف کی یہ دراصل عبدالواسع ہانسوی کی اردو فرہنگ " غرائب اللغات " (مصنفہ تقریباً ۱۶۹۰ء) پر مفصل تنقید ہے جو خود مستقل لغت کی شکل اختیار کر گئی ہے۔نوادر میں خان آرزو نے جگہ جگہ اردو یا اردوئے معلیٰ لکھ کر دہلی مراد لیا ہے۔مثلاً لفظ "چھنیل" پر استدراک کرتے ہوئے خان آرزو لکھتے ہیں کہ

> " ہم لوگ جو علاقۂ ہند کے ہیں اور اردوئے معلیٰ میں رہتے ہیں اس لفظ سے واقف نہیں ہیں"۔(۴۲)

ہندوستان میں وہ سارا ہی علاقہ شامل سمجھا جاتا تھا جو قنوج کی سلطنت کے تحت تھا۔اسی میں کڑا اور مہوبا کے اقطاع بھی تھے۔آلھا اُوْ دَل اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔آج بھی دیہاتوں میں آلھا کو دلچسپی سے گایا اور سنا جاتا ہے۔

اسی علاقے پر راج پوتوں کا پرت ہارا خاندان/ بھوج خاندان قابض تھا جس کی معاشرت اور زبان پنجاب وکشمیر تک اپنا اثر قائم کر چکی تھی۔اسی میں اجودھیا بھی ہے جس کے بانی ہندو عقیدے کے مطابق منو رشی ہیں۔یہیں حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام کی قبر ہے۔ہندوؤں کا اہم مذہبی شہر بنارس بھی یہیں ہے جہاں مسلمانوں کے قدم غازی میاں کے جہاد سے پہلے ہی پڑ چکے تھے۔ بہرائچ ایک مدت سے مسلمانوں کا مرکز عقیدت ہے۔یہاں بادشاہِ وقت بھی آتے اور خیرات کرتے تھے۔ یہاں کتابت کا کام بھی ہوتا تھا اور شروع اسلامی ہند میں یہاں کی کتابت شدہ کتابیں دہلی تک جاتی تھیں۔

ان اسباب نے بھی زبان پورب کے فروغ میں حصہ لیا۔

مسلمان آنے کو سندھ کے سواحلی علاقوں میں آئے مگر تاریخی شواہد اور انسانی تمدن کے سفر ارتقا کے مراحل اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے اردو کا اکھوا اس خطے کی بولیوں میں ظاہر ہو چکا تھا اور اس دیار کے حکمرانوں کی حکومتیں اور زبان وتہذیب دیار غیر غزنی وترکستان، سندھ وقندھار، ملتان وپنجاب اور لاہور تک دراز تھیں۔ جیسا کہ ذیل کی شہادت سے ظاہر ہے۔

علمائے بنارس کا شاندار ماضی، سلام اللہ صدیقی ص ۱۲ کے حوالے سے تذکرہ مشائخ بنارس، مفتی عبدالسلام نعمانی طبع پنجم ۲۰۱۳ء ص ۲۴ حاشیہ نمبر ا میں میر آفرین متوفی ۴۲۱ھ کے ذکر میں ہے کہ سرزمین بنارس میں آپ غالباً پہلے عالم وفاضل اور ولی کامل تھے جو لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے تھے۔ کتاب ریاض التحقیق میں ہے کہ خواجہ میر آفرین اصفہان سے ملتان آئے یہاں آپ نے زبان ہندی سیکھی بعدہٗ دہلی آئے پھر دہلی سے بنارس کا سفر کیا۔ چنانچہ راج گھاٹ کے قریب سکونت اختیار کی۔ اس علاقے میں ماہی گیر اور بادبان کثیر تعداد میں رہتے تھے۔ وہ آپ کی بزرگی سے بہت متاثر تھے۔ ان میں جو ایمان لاتا اسے آپ اپنی خانقاہ میں رکھتے اور اسے پڑھاتے لکھاتے اور پرورش کرتے۔ جو ایمان نہ لاتا اسے بھی اپنی شفقت ومحبت سے نوازتے۔

اگر خواجہ میر آفرین بنارس کی عوامی بولی میں کلام نہ فرما سکتے تو ماہی گیروں، ملاحوں اور ناؤ کھینے والوں کو تعلیم وتلقین کیسے فرماتے جو نہ پنڈت تھے اور نہ سنسکرت ان کی زبان تھی۔ یقیناً معلم ومتعلم میں ہم زبانی ضرور تھی۔

قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے دہلی کی کوئی علمی وادبی یا تہذیبی ولسانی حیثیت نہیں تھی۔ بلکہ تاریخوں میں اس کا نام تک نہیں ملتا۔ مقالات برنی۔ سید حسن برنی ص ۸۸ کے حوالے سے محمد انصار اللہ لکھتے ہیں کہ سنسکرت زبان کا وہ قدیم کتبہ جس میں اس شہر کا نام ڈھلّی لکھا ہوا بتایا گیا ہے غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ۔ ۶۸۵ھ) کے عہد کا ہے۔ اس پر سنبت ۱۳۳۷ درج ہے جو ۱۲۸۰ء یعنی ۶۷۹/ ۶۸۰ھ کے مطابق ہے (۴۳) شمس الدین التمش متوفی ۲۰ رشعبان ۶۳۳ھ/مئی ۱۲۳۵ء وہ پہلا بادشاہ ہے جس نے دہلی کو پایۂ تخت بنایا اس سے پہلے تک دہلی نو آباد شہر اور فوجی چھاؤنی رہا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ مدارس دہلی کے زیر عنوان مولانا ابوالحسنات ندوی (۱۸۹۰ء۔ ۱۹۲۴ء) نے لکھا ہے کہ قطب الدین ایبک نے ۵۸۹ھ میں لاہور کے

بجائے دہلی کو ہند کا دارالسلطنت قرار دیا۔ قطب الدین کا جانشین شمس الدین التمش ۶۰۶ ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس بادشاہ نے خاص دارالسلطنت دہلی میں متعدد مدارس قائم کئے۔(۴۴)

التمش اور سلطان ناصرالدین محمود متوفی ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۶ء نے دیار پورب میں وقت گزارا تھا اس لئے ان کے اثر سے اودھی یا ہندوی کو دہلی میں فروغ ملا۔ سلطان ناصرالدین محمود کے حالات میں طبقات ناصری ۶۵۸ھ/ ۱۲۶۰ء میں لکھی گئی ہے جس کے مصنف منہاج الدین سراج ہیں۔ فارسی زبان میں ہونے کے باوجود اس میں بہت سے ہندوستانی الفاظ بھی آ گئے ہیں۔ جیسے لک، لک (لاکھ، لاکھ) بہار (مدرسہ کا نام) سمندر وغیرہ۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اردو کا مولد دہلی نہیں خطۂ اودھ ہے اور جب دہلی کو دارالسلطنت کا درجہ ملا تو پورب دیس کے باسی وہاں جا کر آباد ہونے لگے انھیں کی زبان بھی وہاں رائج ہوئی۔

خطۂ اودھ کا یادو خاندان تیرہویں صدی عیسوی (ساتویں آٹھویں صدی ہجری) میں دکن کا حکمراں تھا۔ اس کا صدر مقام دیوگیر/ دیوگیری (دولت آباد) تھا۔ عبدالقادر سروری نے لکھا ہے کہ یادو حکمراں دکن کے اصل باشندے نہیں تھے بلکہ وہ شمال سے آ کر یہاں حاکم بن گئے تھے۔ ان کا اصل وطن اودھ تھا۔(۴۵)

عبدالستار دلوی نے بھی لکھا ہے کہ "(دکن کے سادھو سنت اور صوفی) اپنے معتقدات کو مزید جلا دینے کے لئے شمالی ہند تک کا سفر کرتے رہے ہیں جو مذہبی مقامات وشخصیات کا ایک مقدس مرکز رہا ہے۔ چنانچہ وہ شمالی ہند کی سیاحت کے دوران اپنی مقامی اور مادری زبانوں میں شمالی ہند کی اردو کے اثرات لے کر واپس آتے تھے اور ان اثرات کو نئی پروان چڑھتی ہوئی زبان دکنی اردو میں ضم کر کے ایک نئے اسلوب زبان کی تشکیل کا فریضہ ادا کرتے تھے"۔(۴۶)

نصیرالدین ہاشمی اردو کے مولد پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"سندھ، دکن، پنجاب کے خارج ہو جانے کے بعد اب صرف دوآبہ گنگا جمنا باقی رہتا ہے جو اردو کے مولد ہونے کا مدعی ہوسکتا ہے۔(۴۷) آگے چل کر وہ دکنی زبان کی ابتدا کا سرا شمالی ہند کے بادشاہوں علاءالدین خلجی اور محمد تغلق کی فتوحات دکن سے جوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ فاتح جو زبان دکن لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشوونما حاصل کرنے لگی۔(۴۸)

نصیرالدین ہاشمی کو تسلیم ہے کہ دکنی کوئی الگ سے زبان نہیں ہے اس کی ماں خطۂ شمال کی وہی بولی ہے جس کو عام دیسی بدیسی لوگ بولتے تھے۔ دکنی پر مقامی اثرات کا غلبہ ہے اور مقامی اثرات سے

کوئی زبان خالی نہیں۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے مزید تفصیل بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے

"ادبی دکنی کے قواعد اور افعال وضمائر کے تنوع سے اندازہ ہوتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں شمال سے فوجوں کی آمد کے ساتھ ہند آریائی کی ایک بولی نہیں، ایک سے زیادہ بولیاں دکن پہنچی تھیں۔ علاء الدین خلجی نے الہ آباد کے قریب کڑا میں سپہ سالار کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے زمانے میں ۱۳۲۵ء میں دیوگیر پر حملہ کیا۔ اس سے پہلے کچھ صوفی اس نواح میں سکونت گزیں ہو چکے تھے۔ مومن عارف باللہ اور ان کے بہت سے معتقدین اسی دور میں دیوگیر میں آئے اور قلعہ کے سامنے کی پہاڑی کے دامن میں قیام کیا۔ چودہویں صدی کے نصف آخر تک حاجی رومی، شیخ عین الدین گنج العلم، شیخ نصیر الدین نصر اللہ ولی (فرزند وخلیفہ شیخ فریدالدین گنج شکر) حضرت پیر جمنا اور حضرت پیر مقصود وغیرہ دکن آ چکے تھے۔ شمال سے دکن میں پوربیوں کا بڑا ریلا محمد تغلق کے دور حکومت ۷۲۵ھ تا ۷۵۲ھ میں آیا۔ محمد تغلق نے دیوگیر کے پاس دولت آباد ایک نیا شہر آباد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے عالموں اور صوفیوں کی چودہ سو پالکیاں یہاں بھیجی تھیں اور ہر پالکی کے عالم وصوفی کے ساتھ شاگردوں اور مریدوں کا ایک انبوہ کثیر بھی تھا۔ ان میں شیخ نظام الدین اولیاء کے تربیت یافتہ بھی تھے۔ سید یوسف حسینی المعروف راجا یا شاہ راجو قتال متوفی ۷۳۱ھ (پدر بزرگوار حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز سید محمد حسینی)، شیخ برہان الدین غریب، شیخ منتخب الدین زربخش، امیر حسن، علائے سنجری (امیر خسرو کے پیر بھائی اور دوست) شیخ زین الدین خلدآبادی کے نام اردو کے حوالے سے نوواردان دکن میں اہمیت کے حامل ہیں۔ (۴۹)

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی (۶۷۵ھ/۱۲۷۶ء۔ ۷۵۷ھ/ ۱۳۲۴ء) کے فیض یافتہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز سید محمد بن یوسف حسینی متوفی ۸۲۵ھ اپنے پیرومرشد کی وفات کے بعد ۱۳۹۸ء/۸۰۱ھ میں گجرات کے رستے سے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں دکن روانہ ہوئے تو شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بہت سے مرید بھی ان کے ہمراہ ہو لئے اور ۸۱۵ھ میں گلبرگہ میں مقیم ہو گئے۔ (۵۰)

اس لئے تسلیم کیا جانا چاہئے کہ دکن پر مسلمانوں کے اقتدار سے پہلے ہی زبانِ پورب دکن میں پہنچ چکی تھی۔ اور محمد تغلق کے اقتدار کے بعد پوربیوں کے اثر سے رائج ہوئی۔

اس پر بھی توجہ دینی چاہئے کہ ملک پورب سے جوصوفیائے کرام دکن گئے ان میں سے بعض کی عرفیت بھی ہندوی تھی مثلاً بدرالدین نولکھی، کمال الدین کھڑگ پھوڑ، پیر کالے، پیر میٹھے اور پیر جمنا، سید محمد یوسف حسینی المتخلص راجاوغیرہ۔

چشتیہ مشرب کے صوفیائے کرام کی زندگی ومعمولاتِ تصوف میں ہندوستانی قوم کی کشش کے بہت سے سامان تھے۔ راگ راگنیاں، وجدوحال سرودوسماع وغیرہ۔ ہندوستانی ان سے پہلے ہی سے واقف تھے اور پوجا پاٹ میں یہ طریقے رائج تھے۔ تاریخ کی شہادت ہے کہ چشتیہ سلسلے کے بزرگوں نے تبلیغ واصلاح اور تزکیۂ نفس کے لئے جومجاہدے کئے جومراسم جاری کئے اور جوگیوں، بیرائیوں کے جوطریقے اپنائے ان کی وجہ سے اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا۔ انھوں نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں سے اردو کی ابتدائی نشوونما میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (۱۴؍رجب ۵۳۷ھ۔ ۶؍رجب ۶۳۴ھ) کووہی حیثیت حاصل ہے جو پروانوں کے جھرمٹ میں شمع کی ہوتی ہے۔ آپ چالیس رفقاء کے ساتھ ۱۰؍محرم ۵۶۱ھ کواجمیر میں داخل ہوئے۔

آپ کوعوام کے دلوں کو مٹھی میں کر لینے کی خداداد صلاحیت حاصل تھی جومقامی بولی کے بغیرممکن نہیں تھی۔ آپ کی دوسری بیوی ہندوستان کے کسی راجا کی بیٹی تھیں۔ آپ نے ان کا نام امۃ اللہ رکھا تھا۔ (۵۱) حضرت خواجہ نے اپنے ایک خلیفہ کا نام بھی شیخ متّا رکھا تھا جو دوست اور ہم نشیں کے معنی میں آتا ہے۔ یہ سنسکرت لفظ متر کی تخفیفی شکل ہے کیوں کہ جن لفظوں کے آخر میں ساکن "را" ہوتی ہے اس کوقدیم اردو میں حذف کر دیا جاتا ہے۔ یہاں مِت کومتا بنا دیا گیا ہے۔

یہ معلوم ہے کہ سنسکرت زبان سے برہمن عورتیں بھی ناواقف ہوا کرتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ خواجہ کی ہندوستانی اہلیہ محترمہ عربی وفارسی سے نابلد رہی ہوں گی۔ خواجہ ان سے انھیں کی زبان میں کلام کرتے رہے ہوں گے جو یقیناً ہندوستانی تھی۔ شارح اکھروتی کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ خواجہ صاحب بزبان ہندی کلام فرماتے تھے۔

حضرت خواجہ صاحب نے دیار پورب میں بھی اپنے خلفا بھیجے اور اپنے چشمۂ صافی سے اس خطے کوسیراب کیا۔ انھیں میں خواجہ مقیم احمد کابلی تھے جن کو ۶؍صفر ۵۵۶ھ کوخلافت سے سرفراز فرمایا اور

بنارس بھیجا (۵۲) آپ نے بنارس میں اکتیس (۳۱) سال قیام فرمایا۔یہیں آپ کا مزار اور چلہ خانہ بھی ہے۔(۵۳)

اس دیار میں دوسرے خلیفہ روم کے شاہزادے خواجہ قدوۃ الدین عرف قاضی قدوۃ تھے۔ خواجۂ اجمیری کے حکم سے فیض آباد میں قیام پزیر ہوئے۔یہیں وفات پائی۔قدوائیوں کا مشہور خاندان آپ ہی کی اولاد میں ہے۔زبان ہندوی سے واقفیت کے بغیر دیار پورب میں تبلیغ واصلاح کے لئے ان کا قیام بے سود تھا۔

شمس الدین التمش متوفی ۲۰ رشعبان ۶۳۳ھ/مئی ۱۲۳۵ء کے زمانے میں سادات گردیز میں سے دو بھائی سید شمس الدین اور سید شہاب الدین دہلی آئے۔شمس الدین تو میوات چلے گئے مگر شہاب الدین نے بقول مصنف آئینۂ اودھ بحکم باطن مانک پور میں سکونت اختیار کی۔آپ کو منصب سلطانی اور مانک پور کی جاگیر ملی۔ان کی کثرت اولاد کی وجہ سے کئی مواضعات آباد ہوگئے اور سلاطین جون پور کے زمانے میں ان کے خاندان کو ظاہری و باطنی اقتدار حاصل ہوا۔سید شہاب الدین اپنے خاندان میں سب سے پہلے راجا کے لقب سے مشہور ہوئے۔(۵۴) بعد کی نسل میں ناموں سے پہلے راجا یا راجی کا استعمال عام ہوگیا اسی خاندان ذی شان سے قصبہ مبارک پور کے بانی راجا سید مبارک مانک پوری متوفی ۲ رشوال ۹۶۵ھ بھی تھے۔راجا سید حامد شاہ مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ دیار پورب کے بڑے پائے کے بزرگ تھے۔بڑے بڑے علماء ان کے حلقۂ ارادت میں تھے۔انھوں نے سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) سلطان محمود شاہ شرقی (۸۴۴ھ تا ۸۶۲ھ) سلطان حسین شاہ شرقی (۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ) اور سکندر شاہ لودھی (۸۹۴ھ تا ۹۲۳ھ) کا زمانہ پایا تھا۔(۵۵)

راجا کا لقب ظاہر کرتا ہے کہ التمش کے دور میں خطۂ پورب میں ہندوی بول چال میں آچکی تھی تاریخوں سے شہادت ملتی ہے کہ التمش اس دیار میں رہا ہے۔اس کے دور کے جو سکے ملے ہیں ان کی عبارتوں اور تصویروں سے محمد انصار اللہ نے مقالات شیرانی، محمود شیرانی کے حوالے سے یہ تاثر دیا ہے کہ التمش ہندوستانی اساطیر وروایات اور بولیوں سے بڑی حد تک واقف تھا اور اس بادشاہ کی وجہ سے خطۂ پورب کی زبان جنوبی بہار ومشرقی اتر پردیش سے نکل کر دہلی، بنگال اور مالوہ تک پہنچ گئی تھی۔بدایوں میں رضیہ سلطانہ (جلوس ۶۳۴ھ/ ۱۲۳۶ء) کے عہد میں علی مولانا می ایک بڑے پاک باطن درویش تھے۔حضرت خواجہ

نظام الدین اولیاء (۶۳۶ھ/ ۱۲۳۸ء - ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء) بچپن میں علی مولا بدایونی کی خدمت میں لائے گئے تو دیکھتے ہی کہنے لگے "اے مولانا! یہ بداہوسی اس کے بعد فرمایا" جومنڈاسا باندھی سو پاین پَسَری، یعنی اے مولانا یہ بڑا آدمی بنے گا جو بھی سر پر پگڑی باندھے گا اسی کے قدموں پر پڑے گا۔(۵۶)

ہمارے ضلع اعظم گڑھ اور اطراف میں آج بھی مُراٹھا/مُرہٹھا پگڑی کے معنیٰ میں رائج ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے بارے میں حضرت علی مولا رحمۃ اللہ علیہ نے جو پیشنگوئی فرمائی تھی وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی، بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق (خواجہ نظام الدین) سلسلۂ چشتیہ میں عجب صاحب کمال، وسیع مشرب، صاحب دل اور صاحب ذوق بزرگ گزرے ہیں....آپ سماع کے بہت شائق تھے اور ہندی راگ کی بہت سرپرستی فرماتے تھے۔(۵۷)

حضرت نظام الدین اولیاء حضرت فرید گنج شکر (۵۸۵ھ/ ۱۱۸۹ء - ۶۷۰ھ/ ۱۲۷۲ء) کے مرید وخلیفہ تھے جن کے کلام کانمونہ تاریخ زبان وادب اردو حصہ اول، اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، پنجاب میں اردو، اور دوسری کتابوں میں درج ہے۔ حضرت نظام الدین نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی لیکن ان کے اقوال وکلمات جو ان کی دیسی بولیوں میں ہوا کرتے تھے فوائدالفواد مرتبہ امیرحسن سنجری اور سیرالاولیاء مرتبہ امیر خرد میں نقل کئے گئے ہیں۔ سیرالاولیاء میں ہندوی/ اودھی کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کی ایک فہرست محمود شیرانی نے مقالات شیرانی جلد ا ص ۲۷ - ۳۷ میں پیش کردی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے حضرت شیخ کو سماع پسند تھا اور ان کی محفلوں میں قوالی رائج تھی۔ محمد انصاراللہ نے مقالات شیرانی جلد ا ص ۲۹۳ کے حوالے سے فارسی کی یہ عبارت نقل کی ہے:

سلطان الاولیا را پردۂ پوربی بغایت خوش آمدے.....می فرمود کہ ما پیر شدیم و پوربی پیر نہ شد (یعنی شیخ پردۂ پوربی کو بیحد پسند فرماتے تھے۔ کہتے تھے کہ میں پیر ہوگیا مگر پوربی پیر نہیں بن سکا) اس پر محمد انصاراللہ نے حاشیہ میں یہ نوٹ دیا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ ابتدائی عمر سے ہی علاقۂ پورب سے دل چسپی رکھتے تھے چنانچہ مذکور ہے کہ حضرت نے فرمایا تھا کہ میں نے پختہ ارادہ کیا کہ بہار چلا جاؤں۔(۵۸)

حضرت اپنے مریدین ومعتقدین کو نزہت الارواح کا درس بھی دیتے تھے۔ مخدوم زادہ یوسف حسن اسماعیل عباسی چریا کوٹی متوفی ۸۲۲ھ کے بارے میں مصنف بحر ذخار، مولانا وجیہ الدین اشرف نے لکھا ہے کہ

"حضور قطب الاقطاب (نظام الدین اولیا) کی صحبت میں نزہت الارواح کا درس جاری تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی استعداد کے مطابق تشریح کر رہا تھا۔ مرشد نے آپ کی تشریح کو پسند فرمایا اور یہ دوہرا ارشاد فرمایا۔

سات پانچ مل نُز ہابا چیں بول کہیں قیاسی ۔ اُن سبہن میں ساچا بانچے یوسف حسن عباسی (۵۹)

ان ہی مرشد کامل حضرت نظام الدین اولیا کے مرید حضرت امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔ ۱۳۲۴ء) بھی تھے پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے، فارسی، ترکی، عربی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ شاعری کے علاوہ فن موسیقی سے خصوصی شغف تھا۔ قوالی کے علاوہ بہت سے راگ راگنیاں ان کی ایجاد ہیں۔ نظام الدین اولیا نے رسم گاگر شروع کی تو بہت سے گیت لکھے۔ دو سخنے، کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں عوام میں مشہور ہیں۔ مسلمانوں میں دیسی بولیوں میں گیت بنانے اور گانے کا جذبہ حضرت امیر خسرو کی دین سمجھنا چاہئے۔ خدائی رات، رت جگا، چادر گاگر وغیرہ کے گیت انھیں کے گیتوں کا تقلیدی رجحان ہے۔ (۶۰)

حضرت نظام الدین اولیا نے ملک کے اطراف و جوانب میں اپنے خلفا کو بھیجا تھا۔ ان میں خواجہ شمس الدین دھاری کو ظفر آباد ضلع جون پور اور خواجہ مؤید الدین متوفی ۷۲۶ھ کو کڑا مانک پور میں جو سلطان علاء الدین خلجی کے مصاحب اور کڑا کے حاکم تھے بھیجا تھا۔ ان بزرگوں نے اودھ کے خطے میں اودھی کو پروان چڑھایا اور نظام الدین اولیا کے دوسرے خلفا نے ملک کے گوشے گوشے میں ان کی زبان ہندوی کی خوب ترویج کی۔ خلجی دور حکومت ۶۸۹ھ تا ۷۲۰ھ اور تغلق کے عہد حکمرانی ۷۲۰ھ تا ۸۱۶ھ میں صدہا ارباب فضل و کمال دیار مشرق میں موجود تھے جو دہلی سے بنگال، بہار، گجرات، دکن تک اپنے فیوض علم و معرفت کی سوغات بانٹ رہے تھے اور پورا ہندوستان ان کے علم و عرفان سے متاثر تھا۔ علاء الدین خلجی کے دور (۶۹۶ھ تا ۷۱۶ھ) میں کڑا علمی و سیاسی مرکز تھا اس دور کے علماء و فضلاء کی کثرت نے اس دیار پورب کی زبان کو دور دور تک پہنچا دیا تھا۔

شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری (۶۶۱ھ/ ۱۲۶۳ء۔ ۷۸۲ھ/ ۱۳۸۰ء) بڑے پائے کے صوفی و عالم اور ہندوی کے شاعر ہوئے ہیں دیار پورب منیر میں اقامت کی وجہ سے جون پور اور اطراف میں ان کے بڑے تعلقات و اثرات تھے۔ ان کے دادا فاتح منیر محمد تاج فقیہ، والد یحیٰ منیری اور نانا قاضی شہاب الدین پیر جگجوت تھے۔ جگجوت کا لفظ ہندوی ہے جس کا معنی نور عالم ہوگا۔ ان کے ایک خادم خاص

شیخ چولھا ہی قوم اہیر سے تھے۔ان کے زمانے میں اہیر قوم بہت با اقتدار تھی جس کے اکثر افراد نے اسلام قبول کیا۔ان کے تعلقات جوگیوں سے بھی تھے۔صوفیوں اور جوگیوں کے باہمی مراسم اور تبادلۂ خیالات نے ہندوی یا اودھی کے لئے قبول عام کا ماحول بنایا جس سے قومی یکجہتی کی راہیں کشادہ ہوئیں۔بغض ونفرت کے اندھیرے دور ہوئے۔ان کے اقوال واشعار، پنجاب میں اردو،محمود شیرانی،اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام،عبدالحق میں آئے ہیں۔ان کے ایک شعر کو بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

باٹ بھلی پر سانکری،نگری بھی پر دور ۔ بانہہ بھلا پر پاتلا، ناری کر یہہ چھوڑ

(راستہ اگر تنگ ہو،شہر اگر دور ہو،سہارا اگر کمزور ہو اور عورت اگر سیہ کار ہو توان سب کو چھوڑ دینا چاہئے)(۶۱)

شیخ نصیرالدین اودھی چراغ دہلوی (۶۷۵ھ/ ۱۲۷۶ء ۔ ۷۵۷ھ/ ۱۳۵۶ء) کے حالات وملفوظات میں ان کے مرید حمید قلندر نے خیرالمجالس ۷۵۵ھ/ ۱۳۵۴ء میں شروع کر کے پانچ برس میں مکمل کی۔خیرالمجالس کے مطابق شیخ ۴۳ برس میں خطۂ اودھ قصبہ جو اس ضلع بارہ بنکی سے دہلی گئے اور نظام الدین اولیا کے مرید ہوئے۔اس کتاب میں چراغ دہلوی کے بہت سے بول اور جملے آئے ہیں جو اردو کی ابتدائی نشو ونما کے تعلق سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔اسی میں آیا ہے کہ

تو میرا گوسائیں تو میرا کرتار ۔ اس تاپ تھیں چھڈا

(تو میرا مالک اور میری مرادیں برلانے والا ہے، مجھ کو اس بخار سے چھڑا دے)

میں ایک اور جگہ "تو کرتار نیں" بھی آیا ہے۔یعنی تو کارساز نہیں۔

شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کی علمی ودینی حیثیت اتنی مستحکم تھی کہ وہ اوران کے معاصر صوفیائے کرام حکومت گرانے اور بنانے میں اہم کردار نبھاتے تھے چنانچہ فیروز شاہ تغلق تخت نشینی کے لئے تیار نہیں تھا مگر انھوں نے اور دیگر علماء ومشائخ نے زور دے کر اسے راضی کیا۔(۶۲) فیروز شاہ تغلق کو تخت وتاج دلانے میں مخدوم زادہ (یوسف حسن اسمٰعیل عباسی چریا کوٹی) کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔(۶۳) یہ مخدوم زادہ بھی شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کے خواہر زادے تھے(۶۴)

لیکن ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد نے لکھا ہے کہ نصیرالدین چراغ دہلی سے ان کی مخلصانہ رسم وراہ تھی۔(۶۵) معاصر تاریخوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں پورب کے باسیوں کا اتنا سیاسی عمل دخل بڑھ چکا تھا کہ ان کی حیثیت بادشاہ گر کی ہوگئی تھی۔(۶۶) یہ واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کی زبان

اودھی کو بھی عوام وخواص میں مقدس ومؤقر سمجھا گیا ہوگا۔

مولانا بدرالدین حنفی اودھی بعہد علاء الدین محمد شاہ خلجی اودھ کے علماء کبار میں تھے۔ یہاں سے دہلی تشریف لے جاتے اور کئی کئی ماہ تک وہاں مقیم رہ کر وعظ وتذکیر کی خدمت انجام دیتے تھے۔ ان کی مجلس وعظ میں عوام وخواص میں سے ہر طبقہ کے لوگ جمع ہوتے تھے اور بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ (٦٧) شمس الرحمٰن فاروقی نے ابتدائی اردو کا زمانہ ص ۱۰۷ میں لکھا ہے کہ "ہم ایران وترکستان کے تازہ وارد علما کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ انھوں نے فلاں شہر کی جامع مسجد میں وعظ کہا۔ ظاہر ہے یہ مواعظ فارسی ہی میں ہوتے ہوں گے۔ کیوں کہ فارسی کے مقامی طور پر کثیر تعداد میں موجود تھے۔ اسی عہد علائی میں مولانا صلاح الدین سترکھی کا وطن سترکھ (بارہ بنکی) تھا وہ بھی دہلی میں تدریس وافادہ میں مصروف تھے۔ یہیں مولانا نصیرالدین کڑوی درس وتدریس میں مشغول تھے۔ مولانا نظام الدین ظفرآبادی متوفی ۷۳۵ھ بھی اسی دور کے مشہور علماء ومشائخ میں تھے۔ ان علماء نے بھی اس دیار کی بولی کو ذریعۂ اظہار بنا کر فروغ دیا ہوگا۔

سید مخدوم جلال الدین حسین بخاری اُچوّی جہانیاں (۷۰۷ھ/ ۱۳۰۷ء۔ ۸۰۰ھ/ ۱۳۹۸ء) خطۂ اودھ میں آمدورفت رکھتے تھے۔ اپنے وقت کے بڑے صوفی صافی اور عالم وفاضل تھے۔ انھوں نے سید عزالدین مانک پوری (سید حامد مانک پوری کے دادا) کو راجا کہا تھا جب سے اس خاندان کے بزرگوں کے نام کا یہ جزو بن گیا۔ ان کے اہل خاندان سید حسن عسکری کے حوالے سے تاریخ زبان وادب اردو حصہ اول ص ۱۶۹ پر معدن الاسرار، قاضن علا شطاری میں درج ایک جوابی فقرہ یوں نقل ہوا ہے۔ کھندا ہے، پھندا کہاں؟ (یعنی خندق تو ہے لیکن اس کو پار کرنے کے لئے کوئی کمند نہیں)

پروفیسر سید حسن عسکری نے دیار مشرق میں اپنے مورث اعلیٰ کی آمد کا انکار کیا ہے جب کہ مشکوٰۃ النبوۃ قلمی شیخ سید علی موسوی ص ۳۶۴ کی منقول عبارت (٦٨) سے ظاہر ہے کہ مخدوم جہانیاں نے دیار شرق کی سیاحت فرمائی تھی اور سلطان الشرق خواجہ جہاں ملک مسرور متوفی ۸۰۲ھ کے دور سلطنت ۷۹۶ھ تا ۸۰۲ھ میں مانک پور تشریف لائے تھے جو جون پور سے اسّی میل دور ہے۔ عبارت فارسی یوں ہے

"درزمانے کہ مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری سیاحت دیار شرق نمود"

۷۹۶ھ میں خواجہ جہاں سلطان شرق ملک مسرور متوفی ۸۰۲ھ نے دہلی سے سلطان الشرق کا خطاب پا کر جون پور کو اپنا مرکز بنایا۔ تاریخ مبارک شاہی کلکتہ ص ۱۲۸ میں ۷۹۶ھ اور تاریخ فرشتہ میں

۷۷۶ھ ہے۔(۶۹)

اودھی زبان میں چندائن سب سے قدیم مثنوی ہے جس کے مصنف دلمو ضلع رائے بریلی کے ملا داؤد (۱۴۹۲ء) جو شیخ زین الدین خواہرزادہ وخادم خاص شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کے مرید ہیں۔ یہ مثنوی ۷۷۹ھ/ ۱۳۷۷ء میں فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت ۷۵۲ھ/ ۱۳۵۱ء تا رمضان ۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء میں لکھی گئی ہے۔ یہ عشقیہ نظم مسلمانوں میں بہت مشہور ہوئی۔ مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی نے دہلی میں برسر منبر اس کے چند اشعار سنائے اور فرمایا "یہ تمام حقائق ومعانی ذوقی پر مشتمل ہے۔ اہل شوق وعشق کے وجدان کے موافق اور قرآن پاک کی بعض آیات کی تفسیر کے مطابق ہے"۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہی نے بھی اپنے خطوں میں اس کتاب کے بعض شعر موقع بہ موقع نقل کئے ہیں اس کو ملک تھن نے بھی سنا تھا۔

تذکرہ مشائخ بنارس۔ مفتی عبدالسلام نعمانی کی اشاعت پنجم ۲۰۱۳ء میں صفحہ ۲۷ پر آپ کا اسم گرامی تھن ابن ہزبن ہے اور کنیت ابن ملوک۔ محلہ سالار پورہ (بنارس) میں ایک بلند اور وسیع چبوترے پر آپ کا مزار ہے۔ پتھر پر عربی رسم الخط میں یہ دو شعر کندہ ہیں جن کے آخری مصرعہ سے آپ کا سن وفات ۷۸۲ھ برآمد ہوتا ہے۔

ابن ملوک شاہ تھن ابن ہزبن ۔ کہ وصف بندگی او نتواں گفت انساں
حساب عمرش زایام گزشتہ ۔ بسال ہفت صد وہشتہ دوم شعبان (۷۰)

راقم الحروف کے خیال سے ۲ رشعبان ۷۸۰ھ تاریخ وفات ہے۔

اس میں چندا، لورک اور مینا کی کہانی ہے۔ سارے شمالی ہند میں یہ لوک کتھا "چندالور" کے نام سے ہر دل عزیز ہے۔ اس کی کہانی کی کئی شکلیں ملتی ہیں۔ ایک میں چندا ہیروئن ہے اور دوسری میں مینا۔ یہ کہانی اتنی دلکش ہے کہ بلند وبالا پہاڑوں کو پار کر کے دکن میں گولکنڈہ پہنچی۔ یہاں کے مشہور شاعر غواصی نے دکنی میں اس کہانی پر "مینا ستونتی" لکھی۔ مدھیہ پردیش کے گوونڈ اور دوسرے آدی واسیوں میں بھی چندالور، یا مینالور کی کہانی بہت مقبول تھی۔(۷۱)

اس سے پہلے دکن میں بھی کوئی تحریری تخلیق نہیں ملتی۔ یہ مثنوی فیروز شاہ تغلق متوفی ۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء (۷۲) کے وزیر جونا شاہ ملقب بہ خاں جہاں کو منسوب کی گئی ہے۔(۷۳)

بتایا جاتا ہے کہ اس مثنوی کی تصنیف کے وقت ملا داؤد کی عمر ستر برس کے قریب تھی معلوم نہیں

انھوں نے اس کو مکمل کیا تھا کہ نہیں۔ لیکن انھیں کے قریب العہد دوسرے شاعر میاں سادھن نے اسی مضمون کی تکمیل کر کے اس کا نام "میناست" رکھا۔ یہ نظم بھی چندائن کی طرح اودھ سے تعلق رکھتی ہے۔ میناست کے اثرات اپنے زمانے کی ادبیات پر بڑے گہرے اور وسیع دائرے تک قائم ہوئے۔ رسالہ معاصر پٹنہ حصہ ١٦ ص ٦٦ سے ص ٨٣ تک پروفیسر سید حسن عسکری نے "میناست" کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ شیخ قطبن مصنف مرگاوتی نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ بیسئل دیوراسو میں ان کا نام کئی جگہ آیا ہے۔ چتوڑ بھوج داس کی مدھو مالتی میں یہ قصہ شامل ہے اور سادھن کا نام کئی مقامات پر لیا گیا ہے۔ بنگلہ زبان میں دولت قاضی نے میاں سادھن کے قصے کو قدرے اختلاف سے نظم کیا ہے۔ میناست کا ایک شعر یوں ہے

جِی یَرا مورے چاند لے دھرِ ہیں ۔ بِنو جیو ماٹی منہہ پڑِ ہیں

(میری روح تو چاند نکال لے گئی اور بغیر روح کے جسم مٹی میں پڑ جاتا ہے یا دفن ہوجاتا ہے)

واضح ہو کہ چندائن اور میناست میں بنیادی کردار مینا، لورک اور چندا ہیں۔

حضرت شیخ فتح اللہ انصاری اودھی متوفی ٢٦ ربیع الثانی ٨٢١ھ مدفون ماہل ضلع اعظم گڑھ دہلی کے علمائے کبار اور مدرسین عظام میں تھے۔ ان کے بارے میں ان کے خاندان کے ایک عالم مولوی علی حسن ماہلی متوفی ١٢٥٨ھ نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ راقم کے اجداد میں سے ایک بزرگ شاہ فتح اللہ انصاری بن عبداللہ انصاری سلطان تغلق کے دور میں دہلی میں آئے کچھ دنوں وہاں رہنے کے بعد سیر و سیاحت کرتے ہوئے جون پور پہنچے جو ان دنوں سلاطین شرقیہ کا دارالسلطنت تھا۔ یہاں ان کے ارشاد و تلقین کا شہرہ عام ہوا۔ حاکم وقت (ابراہیم شاہ شرقی ٨٠٤ھ تا ٨٤٤ھ) نے پرگنہ ماہل میں چند مواضع بطور جاگیر دیئے۔(٧٤)

قاضی اطہر مبارک پوری نے لکھا ہے کہ ان کا حلقۂ ارشاد و تلقین بہت وسیع تھا۔(٧٥) مولوی غلام سرور لاہوری کے تذکرہ خزینۃ الاصفیا ص ٣٨٠ سے پتا چلتا ہے کہ شیخ فتح اللہ اودھی دہلی میں "کتابہا کہ در ملک خود داشت" کی تعلیم دیتے تھے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد انصار اللہ لکھتے ہیں کہ "اب ان اودھی بزرگ کے "ملک" کی ان کتابوں کا تعین ممکن نہیں جن کا یہ درس دیتے تھے۔ اتنی بات البتہ یقینی ہے کہ ان کے ملک (اودھ) کی زبان کو پایۂ تخت دہلی کے رہنے والے سنتے سمجھتے سیکھتے اور بولتے بھی تھے۔(٧٦)

حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۸۰۸ھ/ ۱۴۰۵ء ہندوستان کے ان سربرآوردہ ولیوں میں ہیں جن کے ظاہری علم وفضل میں کسی کو کلام نہیں اوران کے علوم باطنی کا اعتراف ہر مردولی کو ہے۔ اپنی زندگی میں عوام وخواص کا مرجع تو تھے ہی، وصال کے بعد آج بھی ان کا مرقد انوار اکابر واصاغر کا مرکز عقیدت بنا ہوا ہے۔ ان کے مرید وخلیفہ نظام الدین غریب یمنی نے لطائف اشرفی کے نام سے ان کے ملفوظات کو مرتب فرمایا ہے جو شائع بھی ہو چکا ہے مگر عام طور سے کمیاب ہے۔ سیدوالا کے کچھ ہندوی جملے اس میں درج ہیں۔ وہ اپنے ملنے جلنے والوں کی مقامی بولی کو سمجھتے تھے اور ان سے انھیں کی بولی میں کلام بھی فرماتے تھے۔ محمد انصاراللہ نے اپنی تحقیقی کتاب تاریخ زبان وادب اردو اول میں ان سے منسوب چند جملے شامل کئے ہیں۔

حضرت مخدوم اشرف کے بھانجے اور مرید وخلیفہ نورالعین عبدالرزاق اور شیخ نظام الدین غریب یمنی نے بھی کچھوچھا میں عمر گزاردی۔ بنارس میں بھی ان کے خلیفہ شیخ مولانا عبداللہ صدیقی بنارسی آپ کے حکم سے کچھوچھا سے بنارس آئے۔ دوسرے خلیفہ حضرت شیخ مولانا سعید بنارسی تھے(۷۷) تیسرے خلیفہ شیخ عبداللہ صدیقی بنارسی تھے۔ آپ سے بہت سے غیر مسلموں کو قبول اسلام کی توفیق ہوئی۔ (۷۸) انھوں نے بھی تلقین واصلاح اور عوام کی تعلیم وتفہیم کے لئے زبان ہندوی سے ضرور کام لیا ہوگا۔ کیونکہ ہم زبانی کے بغیر کوئی کسی کے دل میں جگہ نہیں بنا سکتا۔

سید جلال الدین حسین بخاری مخدوم جہانیاں (۷۰۷ھ/ ۱۳۰۷ء۔ ۸۰۰ھ/ ۱۳۹۸ء) کے مریدوں میں شیخ قوام الدین متوفی ۸۱۰ھ/ ۱۴۰۷ء بھی تھے۔ دہلی سے لکھنؤ آئے اور یہیں وفات پائی۔ ان کے ایک خادم خاص شیخ قطب الدین کو لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے خوش ہوکر فرمایا۔ آوا مورا بینا (۷۹)

ملا داؤد مصنف چنداین کے اخلاف میں سب سے زیادہ اہم شخصیت کے مالک شیخ احمد عبدالحق رودلوی (۷۳۰ھ/ ۱۳۳۰ء)۔ ۸۳۷ھ/ ۱۴۳۴ء) ابراہیم شاہ شرقی کے عہد حکومت کے شیخ الوقت تھے۔ ابراہیم کے دربار میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ سے ملاقات ہوئی۔ اثنائے گفتگو میں شیخ عبدالحق نے معرفت وطریقت کی کوئی بات فرمائی۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ ہم اہل ظاہر آپ کے علم الٰہی تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ شیخ نے فرمایا کہ "ارے تو بیچارہ لہریا باشی، ازیں حال وازیں مقال چہ خبر"(۸۰) اس میں "ارے" اور "لہریا" قابل غور ہیں۔ یہ ہندوی کے شاعر بھی تھے۔ ان

کے اخلاف میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے ان کے اشعار اپنی کتابوں انوار العیون فی اسرار المکنون اور رشدنامے میں نقل کئے ہیں۔ان کا ایک واقعہ قاضی اطہر مبارک پوری نے بھی لکھا ہے کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے حکم سے قاضی رضی چارگانو راور ہزار بیگھہ زمین کا پروانہ لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انکار کرتے ہوئے اپنے خادم بختیار سے مخاطب ہو کر فرمایا

کنواں ہوئے تو پاٹوں سمندر کہ پاٹن جائے۔ باراہوئے تو برجوں چھیل کہ برجن جائے (۸۱)

یعنی کنواں ہوتو پاٹ دوں سمندر کس سے پاٹا جائے گا۔ بچہ ہوتو روک دوں مگر جوان کو کیسے روکوں گا۔

کبیر داس متوفی ۸۵۴ھ جون پور بھی آئے تھے جو ضلع اعظم گڑھ کا سرحدی ضلع ہے یوں بھی مگہر اور بنارس جہاں کبیر کی عمر گزری دونوں علاقۂ پورب ہی میں واقع ہیں۔اسی علاقے میں جون پور اور اعظم گڑھ بھی آباد ہیں۔سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے عہد حکومت ۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ میں کبیر نے شیخ رکن الدین متوفی ۸۷۴ھ سے جون پور میں ملاقات کی تھی۔مگر قاضی شہاب الدین دولت آبادی قاضی القضاۃ حکومت شرقی متوفی ۸۴۹ھ کے تلامذہ اور خود قاضی صاحب کی مخالفت کے سبب کبیر زیادہ دنوں تک یہاں نہیں رہ سکے۔(۸۲) کبیر اپنے دور میں مذہبی اعتبار سے کافی متنازع فیہ شخصیت تھے۔مگر ان کے پیرو ہندو مسلم دونوں تھے اور صوفیا کے تذکروں میں ان کا بھی ذکر ہوا ہے۔خزینۃ الاصفیا۔علامہ سرور لاہوری، مرأۃ الاسماء، شیخ عبدالرحمٰن چشتی میں ان کو شیخ تقی بن شیخ رمضان حائک (مدفون قصبہ جھونسی متصل الہ آباد) و شیخ بھیکھ (مدفون مگہر) مرید وخلیفہ شیخ جمال گوجر کا مرید وخلیفہ لکھا گیا ہے۔کبیر فرقۂ ملامتیہ میں تھے۔شاعری میں ان کی بڑی مقبولیت ہے۔قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری میں کافی اونچا مقام رکھتے ہیں۔ہر دور کے دل و دماغ پر ان کے اثرات ملتے ہیں۔ان کا تعلق اسی خطۂ اودھ سے ہے۔

کبیر داس خود کو جولاہا کہتے ہیں۔انھوں نے مذہبی تعصب اور نفرت کے خلاف بڑی جنگ کی ہے۔ان کا ایک شعر ہے

ماٹی کہے کمہار کوں تو کیا روندے موہیں ۔ اک دن ایسا ہووے گا میں روندوں گی توہیں

کبیر کے معاصر اور ہم وطن سنت ریداس/ روی داس تھے اور انھیں کی طرح ان کا بھی کلام دور دور تک مشہور ہوا۔ گروگرنتھ میں کبیر اور رویداس دونوں کے شعر درج ہیں اور ان کے متعلقہ راگ راگنی کا بھی اندراج ہے۔یہ ہندوؤں میں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اودھی شاعری میں نام کمایا ان کا ایک شعر یہ ہے

تمرے بھجن کئے جم پھاسا ۔ بھگتِ ہیت گاوے رودِاسا

حضرت شاہ بدیع الدین قطب مدار (یکم شوال ۲۴۲ھ ۔ ۱۷ر جمادی الاول ۸۳۸ھ) حلب (شام) کے رہنے والے تھے۔ حضرت طیفور شامی سے بیعت تھے سلسلۂ مداریہ انھیں بزرگ حضرت طیفور کی طرف منسوب ہے۔ آپ ہندوستان آئے اور کالپی ضلع ہمیر پور میں قیام فرمایا۔ مگر طبیعت میں سیاحی کا بے پناہ عنصر تھا۔ ہندوستان کے تمام مقامات خصوصاً دیار پورب کی سیر کی۔ حضرت قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ سے بھی مباحثہ رہا بعد میں قاضی صاحب بھی ان کے گرویدہ ہوگئے۔ آپ جوگیوں سے بھی ربط وضبط رکھتے تھے خواص وعوام میں یکساں مقبول تھے۔ مسلم عورتیں جمادی الاولیٰ کو مدار صاحب سے منسوب کر کے مدار کا چاند کہتی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبولیت کی وجہ سے ان کے ذریعہ خطۂ اودھ کی بولی کو بڑا رواج ملا۔ ان کا مزار مکن پور (کان پور) میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔ گیتوں میں ان کا ذکر بہت ہے۔

شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ بن خواجہ خضر جمال الدین فاروقی مانک پوری اپنے دور میں بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ یہ شیخ جمال الدین مانک پوی کے پوتے تھے۔ انھوں نے جون پور میں سات سال تک فقر وفاقہ اور گم نامی میں زندگی بسر کی۔ اس کے بعد وہ قبول عام ہوا کہ جون پور کے سلاطین وامرا تک ان کے نیاز مند ہوگئے۔ انھوں نے سلطان ابراہیم شاہ شرقی، سلطان محمود شاہ شرقی اور سلطان محمد شاہ شرقی کا دور سلطنت پایا تھا۔ ان کے ایک سوبیس خلفاء تھے۔ (۸۳)

محمد انصاراللہ لکھتے ہیں کہ شیخ جمال الدین مانک پوری اور ان کے اخلاف کی زبان اودھی (ہندوی) تھی شیخ نورالدین قطب عالم کے مرید تھے۔ ان کے ملفوظات کو ان کے مریدوں نے جمع کر کے رفیق العارفین نام رکھا ہے۔ ان کے ایک سوا کیس مکتوبات کا مجموعہ انیس العشاق بھی ہے۔ انھوں نے مختلف صوفیا کے اشعار حسب موقع اپنے ملفوظ میں نقل کئے ہیں۔ اپنی دیسی بولی میں خود بھی اشعار کہتے تھے۔ ان کا ایک دوہا یہ ہے۔

کھن پنڈت کھن بادلا کھن بیری کھن میت ۔ کھنۃ ہنسی، کھنۃ روئی یہ ہے ہماری جیت (۸۴)

حضرت قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ کے تلمیذ رشید اور حضرت شیخ فتح اللہ اودھی متوفی ۸۲۱ھ مدفون ماہل ضلع اعظم گڑھ کے مرید حضرت مخدوم خواجہ محمد عیسیٰ تاج جونپوری متوفی

۸۷۰ھ/ ۱۴۶۶ء اپنے وقت کے اجلہ علمائے درس وتصوف میں بے نظیر تھے۔ آپ کے خلیفہ شیخ الاسلام خواجہ مبارک بنارسی کے ذکر میں مذکور ہے کہ ایک بار جب حضرت (خواجہ مبارک) بنارس سے حاضری کے قصد سے نکلے تو پیرومرشد (حضرت محمد عیسیٰ تاج) نے فرمایا "سوندھی باس آوت ہے" جب قریب پہنچے تو فرمایا "بیا اے مبارک سوندھو" اسی دن سے آپ سوندھو کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس کے بعد آپ کے پیرومرشد اسی نام سے پکارا کرتے تھے۔ (۸۵)

شیخ دانیال خضری چشتی متوفی ۸۹۴ھ/ بعمر ۱۱۱ (ایک سو گیارہ) مشائخ جون پور میں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت تھے۔ بلخی الاصل تھے مگر جون پور اور بنارس میں تعلیم وتصوف اور علوم ظاہری کے لئے پیش پیش تھے۔ راجا سید حامد شاہ مانک پوری متوفی ۲۵ر شعبان ۹۰۱ھ کے مرید وخلیفہ تھے۔ صاحب مرأۃ الاسرار کے بیان کے مطابق سلطان حسین شاہ شرقی کے دور میں جون پور تشریف لائے کہتے ہیں کہ ایک ماہ تک ان کی قبر سے مشک کی خوشبو آتی رہی۔ ان کے درس سے فیض یاب ہونے والوں میں خواجہ بندہ گیسو دراز شیخ محمد بن یوسف حسینی جون پوری متوفی ۸۲۵ھ مدفون گلبرگہ اور ان کے بھائی شیخ احمد بن یوسف جون پوری بھی شامل ہیں۔ دونوں بھائی صاحب تصانیف ہیں۔ مؤخرالذکر نے اپنے استاز شیخ دانیال کے ملفوظات مقالات احمد یہ کے نام سے جمع کئے۔ ان کے بارے میں محمود شیرانی رقم طراز ہیں کہ "نویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے اور ایک سو گیارہ سال عمر پا کر ۹۹۴ھ میں رحلت کرتے ہیں۔ ہندی کے اعلیٰ شاعر تھے۔ (۸۶) گنج ارشدی قلمی، شاہ غلام رشید بن شاہ محمد ارشد کے حوالے سے ان کے دو شعر حوالۂ قلم ہیں

جُگ جُگ عمر حضرت جی خواجہ ۔ حضرت بنتی رسول نواجی

دانیال جیو پرگھٹ کنیا ۔ حضرت خواجہ خضر شہ دنیا

انھیں شیخ دانیال کے مریدوں اور شیراز ہند جون پور کے ناموروں میں ایک نام سید محمد مہدی جون پوری (۸۴۷ھ/ ۱۴۴۳ء۔ ۹۱۰ھ/ ۱۵۰۴ء) کا بھی ہے۔ جن کا تذکرہ مختلف کتابوں اور تذکروں میں آیا ہے۔ مثلاً خزینۃ الاصفیا، غلام سرور لاہوری، سوانح مہدی موعود تاریخ محمدی، مرأۃ الاسرار (قلمی) مولانا عبدالرحمٰن چشتی وغیرہ۔ انھوں نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا تھا اس لئے مطعون رہے۔ مخالفت اتنی ہوئی کہ کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں سکے۔ ان کے فرقۂ مہدویہ کے معتقدین ان کی زبان پورب کو مقدس مانتے تھے اور اسی زبان میں کلام وتبلیغ کو پسند کرتے تھے جس کی وجہ سے پورب کی زبان ملک کے گوشے گوشے

میں پہنچی۔ان کے دو دوہرے درج ہیں

چندر کہی تراین کوں،سورج دیکھو آئے ۔ ایسا بھگونت جو بھیٹئے دشت پاپ چھڑ جائے

توروپ دیکھ جگ موہیا چندتراین بھان ۔ انھیں روپ پھنی ہودن پھنی ہون کوہی نہ ہوئے آن (۸۷)

نظام آباد ضلع اعظم گڑھ میں مدفون حضرت شیخ عبدالقدوس شطاری ہیں جو شاہ قدن کی عرفیت سے بھی مشہور ہیں۔ یہ میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ کے مرشد اعظم ہیں۔حضرت شاہ قدن کی ولادت ووفات معلوم نہیں ہوسکی البتہ آپ شیخ قاضی شطاری متوفی ۸۹۲ھ، شیخ شہاب الدین سہرودری جونپوری اور شیخ بہاء الدین عمری چشتی جونپوری متوفی ۹۱۱ھ کے ہم عصر ہیں۔انھوں نے سلسلۂ شطاریہ کے بانی شیخ عبداللہ بن حسام الدین خراسانی متوفی ۸۴۲ھ سے شرف بیعت حاصل کیا پھر حافظ شطاری واسطہ کار خلیفہ شیخ عبداللہ کی صحبت وتربیت میں رہ کر درجۂ کمال پایا۔

شاہ قدن کے سات عالم وفاضل بیٹے تھے۔لیکن ایک دن نماز فجر میں ان سات بیٹوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔انھوں نے خوش ہوکر اپنے ان چہیتے مرید کے حق میں ارشاد فرمایا۔

قدن سات پوت نہ پُتّا ۔ علی سب نعمت لتّا

یعنی شاہ قدن کے سات بیٹوں اور پوتوں میں سے کسی نے کوئی نعمت نہیں پائی بلکہ علی عاشقان نے ساری نعمت لوٹ لی۔

شیخ منجھن چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے۔منجھن نام کے کئی بزرگ ملتے ہیں ایک قاضن علا شطاری متوفی ۹۰۱ھ قاضیِ منیر کے داماد خلیفہ سید علی منجھن شطاری جنھوں نے معدن الاسرار تصنیف قاضن شطاری پر مقدمہ لکھا۔دوسرے حضرت شاہ عالم گجراتی ابن قطب عالم منجھن تیسرے ملا محمود جون پوری متوفی ۱۰۶۲ھ کے اسلاف میں قاضی معین منجھن قاضی جون پور تھے۔میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ کے مرید شیخ منجھن شطاری کمال پوری جن کا ذکر رسالہ عاشقیہ قلمی، شیخ راف ص۵۹ تا ۶۱ میں آیا ہے۔یہ شاہ عالم گجراتی ابن قطب عالم ہونہیں سکتے۔باقی تینوں ایک ہی شخصیت ہوسکتی ہیں۔کیوں کہ ان کا تعلق جون پور سے ہے۔ ملا محمود جون پوری مصنف شمس بازغہ متوفی ۱۰۶۲ھ کا خانوادہ اصلاً جون پوری ہے جاگیر ملنے کے بعد یہ خاندان ولید پور ضلع اعظم گڑھ آیا اس خاندان کے بزرگ حضرت شیخ خضر فاروقی اور ان کے صاحبزادے حضرت شیخ محمد فاروقی متوفی ۸۱۱ھ سلطان ابراہیم شاہ شرقی والی جونپور (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) کے دور میں

دہلی سے جون پور آئے۔ شیخ محمد کی وفات کے بعد سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ان کے صاحبزادے شیخ مشید کو پرگنہ محمد آباد میں قریہ ولید پور وغیرہ کی جاگیر دی اس لئے اس خانوادے کے افراد جونپور سے یہاں آ کر آباد ہوئے جس میں مولانا شاہ ابوسعید ان کے صاحبزادے مولانا شاہ ابوالخیر (۱۰۰۸ھ۔۱۰۵۹ھ) شاہ اسمٰعیل (۱۰۳۴ھ۔۱۱۰۶ھ) قاضی منجھن قاضی جون پور، شیخ بڑے (بڈھن) مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان (۱۱۰۰ھ۔۱۱۷۸ھ) مدفون لہرا مبارک پور اعظم گڑھ، مولانا شاہ ابواسحٰق لہراری متوفی ۱۲۳۴ھ مدفون غازی پور جیسے بڑے علماء وفضلاء ومشائخ پیدا ہوئے۔ اسی خانوادے کے چشم و چراغ ملا محمود جون پوری بھی ہیں۔ یہ خاندان علم وفضل، روحانیت و مشیخیت اور جاہ وجلال میں ہمیشہ سے ممتاز رہا ہے۔ آخری دور میں اس خانوادہ کی مشہور شخصیت سر شاہ سلیمان مرحوم (۱۸۸۶ء۔۱۳/ مارچ ۱۹۴۱ء) تھے۔ (۸۸)

شیخ منجھن کے بارے میں شیر وشکر قلمی میں ابوالخیر بھیروی جو منجھن کے ہم خاندان ہیں لکھتے ہیں کہ " شیخ قاضی منجھن مدتے بالزام حکام منصب قضائے جونپور وقتے دادند وازیں جہت بیشتر اوقات درشہر جون پور بسری بردند"۔ یعنی قاضی منجھن جون پور کے منصب قضاۃ کی وجہ سے جون پور میں زیادہ وقت بسر کرتے تھے۔ یہ ملا محمود جونپوری (م ۱۰۶۲ھ) کے پردادا شیخ محمود کے والد ہیں۔ آپ نہایت متقی وصالح عالم تھے۔ شرعی امور میں سخت دار و گیر فرماتے تھے۔ رسالہ عاشقیہ کے حوالے سے نزہتہ الخواطر میں ہے کہ شیخ منجھن نے طریقہ شطاریہ میر علی بن قوام الدین جونپوری (میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ) سے حاصل کیا اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ ان کا مزار موضع کمال پور ضلع اعظم گڑھ میں ہے۔ منجھن کی شہرۂ آفاق مثنوی مدھو مالتی کو اودھی زبان میں ادبی شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ بہت سے شاعروں نے اس کی اتباع کی اور اس کے قصے کو اپنے رنگ میں پیش کیا۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۹۵۲ھ/ ۱۵۴۵ء ہے لیکن محمد انصار اللہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب یقینی طور سے اس سے بہت پہلے وجود میں آ چکی تھی۔ (۸۹) مدھو مالتی کا ایک شعر ہے

کہا کنور جن روہو ماتا ۔ سَروَن سُنہو ر کچھو کہو جو باتا

حضرت شاہ بدھن شطاری بھٹملہ موضع املہ، تحصیل گھوسی میں رہتے تھے اس کی تصدیق اعظم گڑھ گزیٹیر سے بھی ہوتی ہے۔ یہ بانی سلسلہ شطاریہ شاہ عبداللہ شطاری متوفی ۸۹۰ھ کے پوتے تھے۔ اور خلافت حافظ شطاری سے حاصل کی تھی۔ اپنے دادا کی وفات کے بعد انھوں نے بھی شیخ حافظ شطاری کے

ساتھ بھٹملہ موضع املہ گھوسی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شیخ بدھن کے تعلقات گرونانک (۱۴۶۹ء/ ۸۷۳ھ - ۱۵۵۳ء/ ۹۴۰ھ) سے بہت مستحکم تھے۔ اس کا ذکر گرونانک کی سوانح عمری جنم ساکھی میں ہے۔ حضرت شاہ بدھن کے خلفاء میں اودھی زبان کے مشہور شاعر قطبن جون پوری مصنف مرگاوتی۔ شیخ رزق اللہ مشتاقی "راجن" مصنف واقعات مشتاقی اور شاہ ولی شطاری قابل ذکر ہیں۔ گنج رشیدی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت دیوان عبدالرشید برونوی جون پوری (۱۰۰۰ھ - ۱۰۸۳ھ) حضرت شاہ بدھن (شاہ عبدالعزیز شطاری ساکن بھٹملہ، املہ تحصیل گھوسی ضلع اعظم گڑھ (اب ضلع مئو) کے مزار اقدس پر حاضر ہو کر اویسی طریقہ سے ذکر کی تلقین حاصل کی تھی۔

شاہ بدھن کے تعلقات اور اس دیار پورب کی سکونت اور ان کے مریدوں کی اودھی شاعری اس قیاس کی تقویت کا باعث بن رہی ہیں کہ انھوں نے بھی اظہار خیالات و وسیلۂ جذبات کے طور سے اودھی کو جو اس خطے کی مقبول ترین زبان بن چکی تھی ضرور اختیار فرمایا ہوگا۔

حضرت شاہ ولی شطاری جن کا ایک نام شاہ ولید بھی ہے حضرت مخدوم شاہ حافظ (شطاری) کے پوتے اور حضرت شاہ قاسم کے بیٹے تھے۔ ان کے والد بچپن ہی میں وصال فرما گئے تھے اس لئے انھوں نے اپنے دادا کے خلیفہ شاہ بدھن کی صحبت میں رہ کر سلوک کی تکمیل کی۔ شاہ ولی کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ مستی میں ڈوبے رہتے تھے۔ اور اپنے خیالات کا اظہار دوہوں میں کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک دوہے میں اپنے پیر شاہ بدھن سے وابستگی کا اظہار کیا ہے۔

بدو کی نیا ہیوری رہے چند پہرے چھائی ۔ دانتہ رنگاون پیو کی بَو ئی موند میدائی

(شاہ بدھن کو شیخ بدو بھی کہتے ہیں) (۹۰)

کبیر داس کے معاصر قطبن ہیں جن کا نام قطب بتایا جاتا ہے۔ یہ چشتیہ سلسلے کے شیخ برہان کے مرید تھے۔ ان کی مثنوی مرگاوتی اودھی زبان کا ایک بڑا کارنامہ ہے اس کی تصنیف محرم ۹۰۹ھ/ ۱۵۰۳ء میں ہوئی۔ (۹۱) ان کے پیر حضرت شیخ بڈھن بھی تھے جن کا نام عبدالعزیز بتایا جاتا ہے اور ان کا مزار بھٹملہ موضع املہ تحصیل گھوسی ضلع اعظم گڑھ (اب ضلع مئو) میں بتایا گیا ہے۔

یہ اپنے پیر کی مدح میں کہتے ہیں

شیخ بڈھن جگ ساچا پیرو ۔ نام لیت سدھ ہووے سریرو

پاچھلے پاپ دھوئے سب گئے ۔ چھُڑیں پرانے اور سب نئے

پچھلی سطروں میں کہا جاچکا ہے کہ شیخ عبدالعزیز شطاری جو ملفوظات نگاروں اور مشائخ کے تذکرہ نویسوں کے نزدیک شاہ بڈھن ہیں انھیں ہندی تذکرہ نگار بدو کہتے ہیں۔ یہ بھٹملہ املہ تحصیل گھوسی ضلع اعظم گڑھ (اب ضلع مئو) میں مدفون ہیں۔ ان کے اشعار سردست فراہم نہیں ہو سکے لیکن یہ ہندوی (اودھی) کے شاعر ضرور رہے ہوں گے کیوں کہ ان کے مریدین وخلفا میں قطبن، راجن اور شاہ ولی یا شاہ ولید (جن کے نام پر ولید پور آباد ہے) کے نام شامل ہیں اور تینوں اودھی کے شاعر ہیں۔ ان سے اعظم گڑھ میں تصوف وسلوک کے ساتھ اودھی شاعری کو بھی فروغ ملا اور اس نواح میں ہندو مسلم اتحاد کو نئی راہ ملی۔

شیخ بہاء الدین باجن (۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء۔ ۹۱۲ھ/ ۱۵۰۶ء) اگرچہ گجرات میں پیدا ہوئے اور برہان پور میں وفات پائی لیکن سیر وسیاحت ان کے خمیر میں شامل تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب خزائن رحمت اللہ میں لکھا ہے کہ "این فقیر از طرف سندھ تا خراسان واز طرف دکن تا سیلان مسافرت نمود (یعنی اس فقیر نے سندھ سے خراسان تک اور دکن سے سیلون تک کا سفر کیا۔ گمان غالب ہے کہ یہ اس دیار مشرق شیراز ہند اور اس کے قصبات میں بھی ضرور آئے ہوں گے کیوں کہ یہ صوفیوں اور عالموں کا گہوارہ تھا اور بڑے بڑے لوگ یہاں آنے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ان کے اشعار اس دیار میں بھی متداول تھے اور ملفوظات وغیرہ میں نقل کئے جاتے تھے۔ باجن کا یہ دوہرا ملاحظہ ہو

باجن بھکیاری بکھان کرے گا ۔ ولے اپنی بھیک کارن کچھ کچھ کہے گا

جو کچھ قسمت میں ہے سوہی کہے گا ۔ گداکوں تبوہی براتا رہے گا (۹۲)

برہان بکسن یا برہان بکس، یا بکس خان (بخش خان) نامی کسی شاعر کے متفرق کلام کا ایک مجموعہ دسویں صدی ہجری کے آغاز میں "بیوگ ساگر" کے نام سے مرتب ہو چکا تھا۔ اس مجموعہ کی ایک نقل منیر شریف کی خانقاہ میں دریافت ہوئی ہے جو بقول پروفیسر سید حسن عسکری کسی قدیم نسخے سے جو ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء کا کتابت شدہ تھا تیار کی گئی ہے۔ اس قدیم نسخے کے کاتب نے اپنا نام اور پتا اس طرح تحریر کیا تھا۔" کاتب فقیر حقیر محمد مقیم ساکن تپہ نندانوں خاص، عملہ پرگنہ نظام آباد بہ سرکار جونپور صوبہ الہ آباد" (۹۳)

کاتب نے "بیوگ ساگر" کے بارے میں یہ اطلاع فراہم کی ہے کہ پوتھی "بیوگ ساگر" بہ زبان ہندوی انصرام شدہ، فی التاریخ ذوالقاد (کذا) ۹۱۱ھ، موضع خاص ڈیہہ مالک بہ گانوں نندانوں" (۹۴)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد انصاراللہ ارقام فرماتے ہیں کہ "اغلب ہے کہ اس اقتباس میں کلمہ "خاص" کے بعد لفظ ڈیہہ سہواً ناقل سے چھوٹ گیا ہے یا شاید ناقل نے ڈیہہ کو "عملہ" لکھ دیا ہے۔ واللہ اعلم

۹۱۱ھ میں جون پور کو سلطنت دہلی کے مقبوضات میں شامل ہوئے کئی برس گزر چکے تھے اس وقت اس کی حیثیت محض ایک سرکار کی رہ گئی تھی۔ لیکن الہ آباد کا صوبہ اس وقت تک وجود میں نہیں آیا تھا۔ شہر الہ آباد کو اکبر بادشاہ نے آباد کر کے "الہ آباس" کے نام سے موسوم کیا تھا۔

پروفیسر سید حسن عسکری نے لکھا ہے کہ "صاحب طبقات اکبری بھی" الہاباس ہی لکھتے ہیں لیکن ابوالفضل کے نسخوں میں کہیں کہیں مگر کم الہ آباد کی شکل بھی ملتی ہے۔ عہد اکبری کے ایک سکہ اور ایک کتبہ میں الہ آباد صاف طور پر مندرج ہے (۹۵)

اسی بنا پر پروفیسر سید حسن عسکری کا خیال ہے کہ قدیمی نسخے سے نقل تیار کرنے والے کاتب نے "بیوگ ساگر" کے قدیمی ترقیمہ کو لکھتے وقت اس میں صوبہ الہ آباد کے الفاظ کو اپنی طرف سے اضافہ کر لئے تھے۔ اس جدید کاتب کا زمانہ ان کے خیال کے مطابق عہد شاہ جہانی یا گیارہویں صدی ہجری کے اوائل کا ہوگا۔ یہی جدید نسخہ منیر شریف کی خانقاہ میں محفوظ ہے۔ (۹۶)

اس نو دریافت "بیوگ ساگر" کے ترقیمہ سے ثابت ہے کہ نظام آباد ضلع اعظم گڑھ میں اس دیار مشرق کی پرانی آبادی ہے۔ اور یہاں اودھی شعروشاعری سے عام دل چسپی تھی اور پسندیدہ کتابوں اور اشعار کو محفوظ رکھنے کا رجحان تھا مگر مختلف اسباب سے اس طرح کے ذخیرے ادھر ادھر ہو کر ضائع ہو گئے۔

سید میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ کے والد قوام الدین سوانہ اطراف سرہند کے رہنے والے تھے یہیں میر صاحب کی پیدائش قاضی اطہر مبارک پوری کے اندازے کے مطابق ۸۷۰ھ میں ہوئی ہوگی۔ شیخ قاضن علا شطاری (محمد بن قاضی عالم بن قاضی جمال الدین) متوفی ۳رصفر ۸۹۲ھ، شیخ شہاب الدین سہروردی جون پوری، شیخ عبدالقدوس شطاری نظام آبادی، شیخ بہاء الدین عمری چشتی جون پوری متوفی ۹۱۱ھ سے کسب فیض کر کے درجۂ کمال کو پہنچے یہ مخدوم بندگی جلال الحق قاضی خان ناصحی ظفر آبادی، مخدوم شیخ اَدھّن بن شیخ بہاء الدین جون پوری متوفی ۹۷۶ھ، سید مخدوم غیاث الدین محمد درویش بن ابومحمد محمود ظفر آبادی اور سید اسدالدین ظفر آبادی کے ہم عصر و ہم جلیس تھے۔ ان سے شیراز ہند جون پور کے قریات وقصبات کو بہت فیض پہنچا۔ محمد شمیم خاں محمد پوری نے اپنے مکتوب بنام راقم مورخہ

۲۲/اگست ۱۹۹۳ء میں میر صاحب کے چند ہندی فقرے بھیجنے کا ذکر کیا ہے لیکن وہ ان کو درج نہیں کر سکے۔ پھر بھی اس سے ظاہر ہے کہ میر صاحب بھی ہندوی یا اودھی میں بات کرتے تھے۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ/ ۱۵۳۸ء) بن محمد اسمٰعیل بن صفی الدین غزنوی کا تعلق قصبہ رودولی ضلع بارہ بنکی کے مشہور علمی وروحانی خاندان سے ہے۔ان کے دادا صفی الدین حنفی غزنوی رودولوی متوفی ۸۱۹ھ اپنی علمی وجاہت کی وجہ سے ثانی ابوحنیفہ کہے جاتے تھے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلۂ نسب ملتا ہے۔ انھوں نے دہلی میں اپنے نانا قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ سے تعلیم پائی تھی۔ فتنۂ تیموری کے بعد جون پور آئے۔ یہ حضرت سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی متوفی ۸۰۸ھ سے مرید ہوئے یہ مصنف بھی تھے۔

شیخ عبدالقدوس کی شادی شیخ عارف احمد کی بیٹی اور شیخ احمد عبدالحق رودولوی (۷۳۰/ ۱۳۳۰ء ـ ۸۳۷ھ/ ۱۴۳۴ء) کی پوتی سے ہوئی۔ عبدالقدوس گنگوہی شیخ احمد عبدالحق کے پوتے شیخ محمد کے مرید وخلیفہ ہوئے (۹۷) بتایا گیا ہے کہ ان کے نکاح کے بعد گانے والی عورتوں نے گیت بھی گایا تھا۔ شیخ عبدالقدوس شاعر بھی تھے اور الکھداس تخلص فرماتے تھے یعنی اس کا غلام جس کو دیکھا نہ جا سکے۔

آپ ۸۹۶ھ میں سلطان سکندر بن سلطان لودھی کے ابتدائی عہد حکومت میں رودولی سے شاہ آباد نواح دہلی میں منتقل ہوئے یہاں سے بابر کے مقابلہ میں سلطان ابراہیم لودھی کے قتل جمادی الآخر ۹۳۲ھ سے ایک برس پہلے گنگوہ چلے گئے۔

اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کی اصل زبان اودھی تھی۔ انھوں نے رودولی میں ہی رشد نامہ لکھی جس کا بہت سا کلام محفوظ ہے۔ اس موضوع کی بہترین بحث تاریخ زبان وادب اردو اول ص ۳۴۳ تا ۳۴۶ میں موجود ہے۔ ان کو اپنے بزرگوں اور اپنے دیار کی زبان اودھی سے خاص شغف تھا اور اس زبان کی کتابیں انھوں نے پڑھی تھیں۔ ملا داؤد کی چندابن کا ترجمہ بھی فارسی زبان میں بہت پہلے ہی کیا تھا اس کے اشعار بھی ان کے حافظہ میں تھے جنھیں وقتاً فوقتاً ضبط تحریر میں لایا کرتے تھے۔ نمونہ یہ ہے

دَھن کارن پیّہ آپ سنوارا ۔ بِن دھن سکھی کنت کنھارا

شیخ شاہ محمد غوث گوالیاری (متوفی ۱۵۶۳ء/ ۹۷۰ھ) بن شاہ خطیر الدین کا تعلق قصبہ وپرگنہ ظہور آباد ضلع غازیپور کے جعفری وصادقی خانوادے سے تھا جس کو ظہور آباد کا منصب قضا ومرتبۂ حکمرانی

۱۸۳۲ء تک حاصل تھا۔ان کی پہلی شادی موضع برونہ پرگنہ نظام آباد ضلع اعظم گڑھ میں شیخ احمد صدیقی جون پوری کی دختر سے ہوئی تھی جو شیخ معروف جون پوری اور سید میر علی عاشقان سرائمیری دونوں کے خلیفہ تھے۔شیخ عبداللہ اور شیخ اسمٰعیل دونوں شیخ احمد صدیقی جون پوری کے نواسے اور شیخ محمد غوث گوالیاری کے بیٹے تھے۔ان دونوں کی ماں احمد آباد میں فوت ہوئیں۔ان کی تعلیم گھر پر ہوئی تھی اس کے بعد جون پور میں قاضی صدر جہاں سید اجمل سے علوم وفنون کی تکمیل کی۔سید اجمل شریعت وطریقت کے جامع،علوم ومعارف کے حامل اور ورع وتقویٰ میں بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔شیخ محمد غوث نے تکمیل علوم ظاہری کے بعد مولانا شاہ حمید شطاری کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت کا شرف حاصل کیا اور بارہ تیرہ سال تک چنار کے جنگلوں میں پتیاں کھا کھا کر ریاضت شاقہ کی۔آپ کا اتنا شہرہ ہوا کہ خاندان مغلیہ کے ہمایوں متوفی ۹۶۳ھ بادشاہ دہلی آپ کے مرید ومعتقد ہوئے اور آپ ہی کی دعا سے دوسری بار ہمایوں کو ہندوستان کی سلطنت نصیب ہوئی جس کا ثبوت گلزار ابرار میں ہمایوں کے منقولہ خط سے ملتا ہے۔اکبر بادشاہ نے شیخ محمد غوث کو منصب دے کر بنگالہ بھیجا جہاں ان کی اولاد آباد ہے۔(۹۸)

یہ ۱۵۲۳ء میں گوالیار گئے اور آگرہ میں وفات پائی مگر آپ کی وصیت کے مطابق گوالیار میں دفن کیا گیا۔عمر اسی برس بتائی گئی ہے۔

ڈاکٹر قمر گوالیاری نے اپنی تحقیقی کتاب گوالیار اور اردو زبان وادب میں مختلف حوالوں سے اردو کو گوالیاری کہا ہے جبکہ علاقائی بنیادوں پر اردو کے ابتدائی دور میں متعدد نام پڑے حالاں کہ اس زبان کا مولد ومنشا خطۂ اودھ ہے۔خود محمد غوث گوالیاری بھی غازیپور کے ہیں جو شیراز ہند جون پور کی سرکار میں شامل تھا اور ضلع اعظم گڑھ سے ملا ہوا ضلع ہے۔ان کے دیار وامصار کے عوام میں جو بولی رائج تھی ان بزرگ نے بھی اسی کو اختیار فرمایا تھا۔شیخ عربی وفارسی اور سنسکرت سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ان کی شاعری میں ان کے اثرات ملتے ہیں۔

شیخ سکندر چشتی حضرت شیخ من اللہ عرف ادھن جون پوری متوفی ۹۷۷ھ کے مرید وبزرگ خلیفہ گردانے جاتے ہیں۔عہد طفلی میں شیخ بہار بعد میں نٹھو چشتی جون پوری متوفی ۹۱۱ھ کو بھی دیکھا تھا اور سید میر علی عاشقان سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ کی خدمت سے بھی سلسلۂ عالیہ شطاریہ سے مشرف ہوئے تھے۔میر علی عاشقان کے وصال کے وقت مقام بردہ ضلع اعظم گڑھ میں تھے۔وہیں سے جونپور کا سفر ترک کر کے

سرائمیر لوٹ آئے اور جنازہ میں شرکت فرمائی۔ یہ اودھی کے با کمال شاعر بھی تھے۔ میر علی عاشقان کا جو مرثیہ کہا ہے اس کا ایک بند یہ ہے

آج سنگھ بَن تجیو ۔ آج سورج نانک اوگیو

آج جگت بھیو اندھیارو ۔ آج میراں سید علی جنت کو سدھارو

آج دواو جگ میں پرُ وبھیو (۹۹)

تلسی داس کے معاصر شیخ عثمان زمانیہ ضلع غازیپور کے تھے۔ والد کا نام شیخ حسن تھا اور جہانگیر کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی عشقیہ منظوم داستان چتر اولی دوہوں اور چوپائیوں پر مشتمل ہے۔ اس میں بارہ ماسہ بھی ہے جو بہت زوردار ہے۔ انھوں نے عام مذاق کی نظمیں لکھ کر ہندوی/ اودھی شاعری کو عالم گیر مقبولیت کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ ان کی چتر اولی کا یہ نمونہ ہے

جن پچھوں دس کنہ پیانا ۔ پھلھیں گا سو دیس ملتانا

ہیرے سی ٹھٹہ نگر سوہاوا ۔ بہنگ ہرن سیویں گنجاوا

عبدالرحیم خان خاناں تمام مروجہ زبانوں سے واقف تھے۔ سنسکرت کے عالم تھے انھوں نے جون پور میں حکومت کی تھی۔ ہندی شاعری میں ان کا تخلص رحیمن ہے اور ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ اسی دیار میں نہیں پورے ہندوستان میں ان کی شاعری کا سکہ چلتا ہے۔

قاضی خوب اللہ علمائے جون پور میں بڑی قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے تفقہ فی الدین میں انھیں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ کسی روز قاضی خوب اللہ قاضی ثناء اللہ جون پوری کی ملاقات کے لئے تشریف لے گئے مزاج پرسی اور پرسش احوال کے بعد آپ نے نوکر سے حقہ لانے کے لئے کہا۔ قاضی ثناء اللہ نے چند شعر حقہ کی مذمت میں پڑھا۔ اس کو سن کو قاضی خوب اللہ نے بھی حقہ کی تعریف میں فی البدیہہ ایک فارسی قطعہ پیش کیا جس میں انھوں نے تمبا کو کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (۱۰۰)

شیخ بہاء الدین برناوی شیخ فریدالدین برناوی مہاجر مکہ متوفی ۹۸۷ھ کے پوتے اور جانشین ہیں۔ جاگیر وقریات، انعامات ووظائف، اثاث البیت، اجناس ومتاع، ہتھیار، مویشی گھوڑے وغیرہ کو ترک کر دیا اسی بنا پر آپ خاتم التارکین کہلائے۔ دکن، گجرات، کھمبات جون پور، پٹنہ، بہار، پنڈوہ، سرہند، لاہور، پٹن، اجودھن، ہانسی، حصار وغیرہ کی سیاحت کی۔ اکبر متوفی ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء و جہانگیر متوفی

۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۷ء سے ملاقات رہی۔ موسیقی کے ساتھ ان کا تعلق عشق کی حد تک تھا۔ اور اس فن میں یگانۂ روزگار تھے۔ جکری، خیال اور چٹکلہ، قول وترانہ، سادرہ، دھرپد، بشن پد میں انھوں نے اشعار لکھے ہیں۔ تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ لیکن ہندی میں اکثر لکھتے تھے۔ ساز خیال وساز کھڑس کے موجد ہیں۔ راگ درپن۔ فقیر اللہ اور کتاب چشتیہ میں ان کے حالات واشعار ہیں

اےاے بھائی جیتا مصاف ساہن سرتاج ۔ جس ری تو ملانت نت راج (۱۰۱)

بنارسی داس جین ولد کھڑک سین کا تعلق گوالیار سے تھا لیکن شرقی حکومت کی شہرت کی وجہ سے ان کے والد کھڑک سین بچپن ہی میں اپنی ماں کے ساتھ جون پور آ گئے تھے انھوں نے اکبر وجہانگیر کا زمانہ پایا تھا اس عہد میں درباری زبان فارسی تھی مگر انھوں نے عوامی بولی میں شاعری کی اور بڑا نام کمایا۔ ان کی کتابوں میں بنارسی ولاس، ناٹک سمے سار، اردھ کتھانک، اور نام مالا کوس کے نام ملتے ہیں۔ ان کی زبان پوربی ہے مگر اس وقت فارسی وعربی کے جو الفاظ عوامی بولی میں داخل ہو چکے تھے ان کا استعمال بھی کہیں کہیں ملتا ہے۔ یہ مدھو مالتی ۔ شیخ منجھن اور مرگاوتی قطبن سے بہت متاثر تھا۔ اکبر کی وفات کی خبر جب جون پور پہنچی تو انھوں نے ایک دردانگیز مرثیہ کہا جس کا ایک شعر ہے

اس ہی بیچ نگر میں شور ۔ بھیواُ ونکل چار ہوں اُور

رام چندر شکلا نے اپنی کتاب ہندی ساہتیہ کا آلو چناتمک اتہاس ص ۹۸۔۹۹ میں لکھا ہے کہ جین شاعر بنارسی داس نے اپنی سوانح میں سنبت ۱۶۶۰ (۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء) کے آس پاس اپنی عشق بازی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس زمانے میں ہاٹ بازار میں جانا چھوڑ کر میں گھر میں پڑے پڑے مرگاوتی اور مدھو مالتی نام کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔

تب گھر میں بیٹھے رہین ہاٹ بازار ۔ مدھو مالت مرگاوت پوتی دوی اُچار

اعظم خاں ثانی متوفی ۱۷۷۱ء نے محمود شاہ بادشاہ دہلی متوفی ۱۱۶۱ھ کے حکم سے سنگار درپن ۱۷۸۶ بکرمی میں تالیف کی (۱۰۲) اعظم خاں ثانی کے درباری شاعر ہر جومشرا نے اعظم خانی ستاسائی لکھی جس کے صلہ میں شاعر نے ۱۱۷۹ھ/ ۱۷۷۱ء میں راجا کے بھائی جہاں یار خاں ۵۲ بیگہہ زمین انعام میں پائی (۱۰۳)

اندراوتی، انوراگ بانسری، نل دمن کے مصنف وشاعر عربی وفارسی اور اودھی کے ماہر، تصوف وطریقت کے سالک اور زندہ دل صوفی نور محمد کامیاب متوفی ۱۷۸۰ء سبرحد ضلع جون پور کے باشندے

تھے بعد میں اپنی سسرال بھادوں ضلع اعظم گڑھ میں رہائش اختیار کر لی تھی اور یہیں فوت بھی ہوئے۔ ان کی کتاب انوراگ بانسری بنارس ہندو یونیورسٹی کے ہندی نصاب میں شامل تھی۔ ابوالغوث گرم دیوان موضع لہرا مبارک پور ضلع اعظم گڑھ متوفی ۱۱۸۷ھ سے بیعت وارادت رکھتے تھے۔ اپنے خسر شمس الدین حیدری کی کتاب مناقب غوثی (حالات گرم دیوان) کی تہذیب و تنقیح میں آپ نے بڑی مدد فرمائی اور اس کی عبارتوں کو مقفیٰ و مسجع بنایا۔ اندراوتی ان کی مشہور تصنیف ہے جو ۱۱۵۷ھ میں نظم کی گئی۔ اس کے اسلوب اور زبان دونوں میں پدماوت کی اتباع کی گئی ہے۔ انوراگ بانسری کے چند شعر اس طرح ہیں

دین آپ جگ سرجن ہارا ۔ جن آ کاش بن کھمب سنوارا

جہاں حسنین، بتول سینہا ۔ تہاں سمائی نہ دوسر دیہا

جہاں علی حیدر ہے اسداللہ ۔ وہاں کہاں راچھس پاوے راہ

عربی کا مقولہ ہے "الناس علیٰ دین ملوکہم" یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے طور طریقے پر ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کے ذوق ومزاج کے اثرات ان کی رعایا اور حدود حکومت پر بڑے گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ اس دیار میں ایسے بھی بادشاہ حکمراں ہوئے ہیں جو سیف وعلم کے دوش بدوش لوح وقلم کے بھی شیدائی تھے۔ ان کی فتوحات میں صرف شہر و بلاد ہی نہیں تھے۔ ان کی قلمرو میں علوم وفنون کے میدان بھی تھے۔ خود بھی شاعر تھے اور شاعروں کی سرپرستی بھی فرماتے تھے۔ موسیقی سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ سلطان حسین شاہ شرقی جون پوری (دور حکومت ۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ) متوفی ۹۰۵ھ/ ۱۵۰۰ء نے سترہ راگ ایجاد کئے۔ (۱۰۴) یہ خود بھی عالم وفاضل تھے اور موسیقی میں تحفۃ الہند کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ (۱۰۵)

جیسا کہ معلوم ہے کہ صوفیوں میں موسیقی اور ہندوستانی راگ راگنیوں کا عام چلن تھا۔ سید علاء الدین لاجوری متوفی ۱۴۸۰ء حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز سید محمد بن یوسف حسینی جون پوری متوفی ۸۲۵ھ کے مرید وخلیفہ تھے اور شیراز ہند جون پور کے سر برآوردہ بزرگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ سلطان شاہ شرقی بن محمود شاہ شرقی (مدت حکومت ۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ) کے عہد سلطانی میں موسیقی ہند میں بڑا کمال رکھتے تھے اور فارسی شاعروں میں بھی نمایاں مقام ومرتبہ کے حامل تھے۔ راگ راگنیوں کا شوق وذوق اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کا ہندوی (اودھی) کلام بھی ضرور رہا ہوگا۔ کیوں کہ جو لوگ ہندوستانی موسیقی میں حد کمال کو پہنچے ہوئے تھے وہ اپنے فارسی کلام میں ہندوی کے پیوند بھی لگاتے تھے اسی وجہ

سے جوراگ ہندو مسلم موسیقی کے میل سے پیدا ہوئے ان کو ریختہ کہا گیا اور ایک قسم کی شاعری بھی ریختہ تھی بعد میں چل کر یہ لفظ زبان اردو کے نام کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ عام مسلمانوں میں ہندوستانی بولیوں میں گیت بنانے اور گیت گانے کا جذبہ بہت پرانا ہے۔

”شاہ فیروز جون پوری کا سلسلۂ نسب خاندان سلاطین چغتائی سے ملتا ہے۔ بابر بادشاہ (مدت حکومت ۹۳۲ھ/ ۱۵۲۶ء۔ ۹۳۷ھ/ ۱۵۳۰ء) کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ جب بہلول خاں لوہانی نے شرقی حکومت کو پریشان کیا تو جون پور بھیجے گئے اور یہیں فتح کے بعد حکمران جون پور ہو گئے۔ اقبال احمد جون پوری کا بیان ہے کہ خود بھی شاعر تھے۔ آپ کے زمانۂ حکومت میں شعر و سخن کی محفلیں برابر گرم ہوا کرتی تھیں۔ مقبرہ محلہ سپاہ میں ہے۔(۱۰۶)

محمود شیرازی لکھتے ہیں کہ ”صوفیا کی جماعت نے ہندی موسیقی کی تہذیب و ترقی میں بھی بڑا حصہ لیا ہے۔ جہاں فارسی موسیقی قول و ترانہ کے دلدادہ تھے ہندی موسیقی سے بھی ان کی خانقاہیں خالی نہیں تھیں۔ وہ سنسکرت تک کے نغمات سننے کے عادی تھے“۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی متوفی ۶۶۶ھ اس فن میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ ملتانی دھناسری انھیں کی ایجاد ہے۔(۱۰۷)

اکبر کا بیٹا دانیال ہندی کا قابل شاعر تھا۔ عبدالرحیم خان خاناں فن شعر میں رحیمن تھا اور والی جون پور بنایا گیا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی متوفی ۱۱۶۱ھ ہندی زبان کا شاعر تھا اس کی تصنیفات سے ایک بارہ ماسہ اب تک موجود ہے۔(۱۰۸)

یہاں تک کہ بحث اودھی/ پوربی زبان و ادب کے ارتقا اور ابتدائی نشو ونما سے تعلق رکھتی ہے۔ جس سے ثابت ہے کہ اودھی زبان کا ادب ماضی میں بہت قابل قدر اور موضوعات و مضامین کے اعتبار سے بہت گراں مایہ ہے۔

اس میں بھی کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے کہ اردو زبان موجودہ سنسکرت زدہ ہندی زبان سے قدیم ہے اور اس کا اپنا اسلوب ہے۔ ہندی والے انگریز حکمرانوں کی لسانی پالیسی کے زیر اثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو ہندی کی شیلی ہے۔ یہ تاریخی و لسانی اور تہذیبی و فکری بنیادوں پر نہایت لغو اور سراسر فرقہ پرستانہ جذبات و رجحانات پر مبنی خیال ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ تمام تاریخی و لسانی حقائق و شواہد اس نظریئے کی تائید میں ہیں کہ خود موجودہ ہندی اردو کی شیلی ہے اور اسی نمونے پر اس نئی زبان کا ڈھانچہ

تیار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی تحقیقی کتاب اردو کا ابتدائی زمانہ۔ ادبی تہذیب وتاریخ کے پہلو (اشاعت ۲۰۱۱ء) اور پروفیسر ابومحمد سحر نے اپنی عالمانہ کتاب ہندی/ ہندوی پر ایک نظر اور دوسرے مضامین (اشاعت نومبر ۱۹۹۹ء) میں بالتفصیل بیان کیا ہے۔ ثانی الذکر بروقت دستیاب نہیں اس لئے اول الذکر سے چند حوالے پیش کئے جارہے ہیں آر، ڈبلیو فریزر (R.W.FRAZER) نے اپنی کتاب اے لٹریری ہسٹوری آف انڈیا ص۲۶۵ (A.LITERARY HISTORY OF INDIA. LONDON 1915.P265) میں لکھا ہے کہ

"ادبی ہندی تو محض ایک کتابی زبان ہے جو انگریزوں کے زیر اثر شکل پزیر ہوئی۔ انہوں نے دیسی مصنفوں کو ترغیب دلائی کی عام استعمال کے لئے ہندوستانی کے ایسے روپ میں کتابیں تصنیف کریں جس میں عربی فارسی کے تمام الفاظ نکال کر سنسکرت کے الفاظ دئے گئے ہوں۔ (۱۰۹) اس سے ہندی زبان پر اردو زبان کی اولیت اور فوقیت کے ساتھ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خود ہندی ہی اردو کی شیلی ہے۔

پروفیسر عبدالستار دلوی نے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو کے قدیم ناموں ہندوی، ہندی اور ہندوستانی کی وجہ سے ہندی والے اردو کو ہندی کی شیلی بتاتے ہیں جب کہ اردو ہندی کے مقابلہ میں زیادہ جمہوری، وسیع القلب، فراخ داماں اور روادار زبان ہے مرزا غالب نے اپنے خطوط کے مجموعوں میں سے ایک کا نام عود ہندی اور دوسرے کا اردوئے معلیٰ نام رکھا کیوں کہ ان کے نزدیک اردو اور ہندی ایک ہی زبان تھی جو پورے ہندوستان میں بعض علاقائی تبدیلیوں کے ساتھ بولی جاتی تھی۔" اردو کو ہندی کہنا لسانی استعماریت کی مثال ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد شدت سے ابھری (۱۱۰)

"ڈاکٹر سنیتی کمار چڑجی نے لکھا ہے کہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے، یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ہندی اور اردو ایک ہی زبان مغربی ہندی بولی یا دہلی کی کھڑی بولی ہندوستانی، کے دو روپ ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے اردو اس چیز کی ترمیم شدہ "مسلمانیائی ہوئی" شکل نہیں جو آج ہندی (یعنی سنسکرت زدہ کھڑی بولی) کے نام سے معروف ہے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہی ہے۔ وہ فارسی آمیز ہندوستانی جس نے اٹھارہویں صدی میں مغل دربار کے حلقوں میں فروغ پایا (اور جو اس سے پہلے دکن کے دکنی روزمرہ میں ملتی ہے) .....اسے ہندوؤں نے اپنایا (پھر) انہوں نے دیسی ناگری کو اپنایا اور بڑی گاڑھی سنسکرت آمیز لفظیات کا استعمال شروع کر دیا۔ اور اس طرح انہوں نے آج کی ادبی ہندی کی تشکیل کی۔ یہ کام ۱۸۰۰ء کے آس

پاس ہوا۔اور خاص کر کلکتہ میں۔(۱۱۱)

اسی ہندی کو ڈاکٹر تاراچند نے اپنی کتاب "دی پرابلم آف ہندوستانی ص ۵۷،۵۸ میں نئ اردو کہا ہے۔ان کا اظہار حقیقت یوں ہوا ہے۔

"ایک نئ طرح کی اردو (وجود میں آئی) جس میں اردو فارسی کی جگہ سنسکرت الفاظ رکھ دئے گئے تھے۔ بادی النظر میں ایسا اس لئے کیا گیا کہ ہندؤں کو ان کی اپنی ایک زبان مہیا کی جائے۔لیکن اس اقدام کے نتائج بہت دور تک گئے اور ہندوستان آج بھی زبانوں کی اس مصنوعی تقسیم کے باعث دکھ اٹھا رہا ہے"(۱۱۲)

تاراچند نے یہ بھی لکھا کہ "گزشتہ صدیوں میں کیا ہندو کیا مسلمان، شائستہ سوسائٹی کی زبان اور سارے ملک کی لنگوافرانکا" ہندی" یعنی فارسی آمیز ہندوستانی (کھڑی بولی) تھی نہ کہ وہ جدید ہندی جو سنسکرت آمیز ہندوستانی (کھڑی بولی) ہے (۱۱۳) تاریخ اور لسانی تناظر میں جدید ہندی کا آغاز فورٹ ولیم کالج میں ہوتا ہے جسے بھارتیندو ہریش چندر کے زمانے میں ایک تحریک کی صورت میں سمت اور رفتار ملی (۱۱۴)

دراصل اردو اور ہندی دونوں ہی سیاست کا شکار ہوئی ہیں۔ ورنہ ان کا خاندان، جائے پیدائش، ماحول اور فضا ایک ہے جیسا کہ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ دونوں کے صرفی ونحوی قواعد یکساں ہیں۔حرف عطف واضافت، حروف فاعلیت ومفعولیت کے علاوہ دیگر تمام حروف، ضمیروں، مصدروں، صیغوں اور علامت زمانہ میں کوئی مغائرت نہیں۔روزمرہ بھی دونوں کا ایک ہے۔اردو میں ہندی کے سبھی حروف ہیں البتہ کچھ حروف زوائد بھی ہیں جو عربی وفارسی زبانوں سے آئے ہیں۔ان کی وجہ سے اردو زبان ہر طرح کی آوازوں کا مجمع البحرین بن گئی ہے۔

اردو زبان وادب کے لسانیاتی واسلوبیاتی اور موضوعاتی پہلوؤں پر نظر جاتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ یہ خالص ہندوستانی زبان ہے جس میں علاقائی بولیوں کی مخلوط یا پچ میل کھچڑی جیسی لذت ہے۔اس میں مختلف قوموں، نسلوں، علاقوں، تہذیبوں، زبانوں، عقیدوں اور مذہبوں کا عطر شامل ہے۔اس کی لسانی روپ ریکھا اور اس کی روح جمہوری اور تکثیری مزاج رکھتی ہے۔اسی لئے اس میں رواداری اور قومی یکجہتی پیدا کرنے کی صلاحیت دوسری زبانوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشاعروں اور کوی سمیلنوں کی مشترکہ تقریب میں عوامی مقبولیت کی سوغاتیں اردو شاعری کے حصے میں زیادہ آتی ہیں۔فلموں کا بھی یہی حال

ہے۔ اگر چہ لسانی تعصب کی وجہ سے اردو فلموں کو ہندی کے نام سے منظوری دی جاتی ہے۔ لیکن فلمی نغموں اور مکالموں کی زبان ہندی نہیں ہوتی اردو ہوتی ہے۔ یہ تمام حقیقتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ دلوں پر اردو زبان کا قبضہ ہے اور جو تاثیر اردو میں ہے ہندی اس سے محروم ہے۔ اور شاید ہندی والے اسی خوف کی وجہ سے اردو کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کر رہے ہیں کہ اردو کی ترقی سے ہندی کی مقبولیت و توسیع پر اثر پڑے گا حالانکہ یہ خوف بے معنی ہے۔ وہ اردو کے تکثیری ذخیرے سے استفادہ کر کے ہندی کو وسیع میدان دے سکتے ہیں۔

گریسن کے مطابق ہندوستان میں ۱۷۹ زبانیں اور ۵۴۴ بولیاں بولی جاتی ہیں۔ اعظم گڑھ میں جب مسلمان آئے تو اپنے گھروں میں وہ اپنے اپنے علاقے کی زبانیں فارسی، عربی، ترکی اور پشتو بولتے تھے۔ برہمنوں کی خاندانی اور مذہبی زبان سنسکرت تھی جس تک عام طبقے کی رسائی نہیں تھی۔ قدیم ہندوستان میں عام لوگوں کی بولی پراکرت اور ۵۰۰ ء سے سنہ ایک ہزار عیسوی تک مہداُپ بھرنش تھی۔ مسلمانوں کے اہل علم نے زمانے تک تصنیف و تالیف کے لئے عربی و فارسی کو پسند کیا اور عوامی طبقوں میں رائج زبان کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ صوفیائے کرام جنھیں تبلیغ و اصلاح کے لئے عوام کے قریب آنے کی ضرورت تھی اور بغیر ہم زبانی کے ان کی باتیں دل و دماغ کو متاثر نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے ارشاد و تلقین کے لئے عوامی بولیوں کو اپنے ماضی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ چوں کہ تحریر کی زبان شرفائے معاشرہ سے تعلق رکھتی تھی اس لئے علاقائی بولیوں کا جو ادب تھا وہ ضبط تحریر میں بہت کم آیا۔ اس تاریخی حقیقت سے سبھی واقف ہیں کہ قدیم دور کے پسماندہ طبقات نوشت و خواند سے بے بہرہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عام دلچسپی کے شعری سرمائے کا بحر بے کراں سفینے میں نہیں آ سکا۔ البتہ وہ سینہ بہ سینہ دوسری نسلوں تک منتقل ہوتا رہا۔ لیکن بولیاں جیسے جیسے نکھرتی گئیں بعد کی نسلوں کے لسانی تصرف کا اثر بھی ان پہلے کے لسانی نمونوں اور آثارِ ادب پر پڑتا گیا، جس کی وجہ سے قدیم ادب کا معتد بہ حصہ خود کو الحاقات سے نہ بچا سکا۔

اس وقت اعظم گڑھ میں لکھنے پڑھنے اور بولنے کی زبان ہندی، اردو اور انگریزی ہے۔ انگریزی کا استعمال خال خال دفتروں اور سرکاری کام کاج میں ہوتا ہے۔ اردو کے شرفائے زبان عربی و فارسی کے الفاظ و تراکیب بہ کثرت استعمال کرتے ہیں اور ہندی کا دانشور طبقہ سنسکرت آمیز ہندی لکھتا اور بولتا ہے۔ عوام الناس آسان اردو یا عام فہم ہندی کا استعمال کرتے ہیں۔ دیہاتوں میں بھوج پوری (پوربی) کا چلن عام ہے۔ البتہ عوامی بول چال میں علاقائی لہجے اور تلفظ کی جھلک شامل رہتی ہے۔ مصوتوں، مصمتوں، ہکاری

آوازوں میں کہیں کم کہیں زیادہ فرق محسوس ہوتا ہے۔

یہ کہاوت مشہور ہے کہ "کوس کوس پر بدلے پانی" چار کوس پر بانی" مبارک پور، مینھ نگر، سرائمیر، مئو، گھوسی، محمد آباد، خیرآباد، ادری اور دہری گھاٹ وغیرہ کے لہجے میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ حالانکہ ان مقات کی بولی ایک ہے۔ البتہ بنجاروں اور نٹ برادری کی آپسی بولی بالکل الگ اور دوسروں کے لئے تقریباً نافہم ہے۔ جس کو آدی واسی یا قبائلی بولی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

اس دیار میں سین شین اور عین غین کو عوامی بولی میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہاں کے تلفظ میں ث، ش، ص کو س۔ خ کو کھ۔ ذ، ز، ژ ض، ظ کو ج۔ ع کو الف۔ غ کو گ۔ ف کو پھ۔ ق کو ک۔ ط کو ت۔ ح کو ہ بولا جاتا ہے۔ فیروز کو پھیروج وغیرہ لفظ کے آخر کی دال کو حذف کرتے ہیں جیسے چان (چاند) چانی (چاندی) مان (ماند) کگرونا (کگروندا) پھانا (پھاندنا) مونا (موندنا) چونیہانا (چوندھیانا) بُنی (بوند، بارش) سونھی (سوندھی) مہنی (مہندی)

لام کو "ر" سے بدلنا عام ہے جیسے پھل کو پھر، بادل کو بادر، بجلی کو بجری، بدلی کو بدری۔ موسل کو موسر۔ کاجل کو کاجر۔ کجلی کو کجری، جلنا کو جرنا۔ بال کو بار۔ گھولنا کو گھورنا۔ کھولی (گلی) کو کھوری، سنبھالنا کو سمھارنا، سُتلی کو سُتری۔ سانولا کو سانورا، بلکہ سَنوَرا۔ منگل کو منگر بولا جاتا ہے۔ جن لفظوں میں م کے بعد یا ن کے بعد ب ہوتا ہے وہ "م" مشدد سے بدل جاتا ہے جیسے تمبا کو کو تمبا کھو یا تمّا کو، لمبا کو لمّا، دنبہ کو دمّہ، کھمبا کو کھمّا، اچنبھا کو اچمّھا، دوشنبہ کو دوشمّے، کبھی کبھی ن کے بعد کے ب کو میم غیر مشدد سے بھی بدل دیتے ہیں جیسے تانبہ کو تاما۔ جل کنبا، جل کنبی کو جل کمّا / جل کمّی بولتے ہیں۔

اردو کی معیاری زبان میں "کا" "کی" "کے" حرف اضافت کی صورت میں مستعمل ہے۔ یہاں کی ذیلی اور مقامی بولی میں بھی یہ حرف اضافت ہے مگر علامت مفعولیت یا حالت مفعولیت کے اظہار کے لئے بھی "کے" استعمال ہوتا ہے اور حرف استفہام کے طور پر بھی اس کا عام طور سے استعمال ہے۔ ذیل کے جملے ملاحظہ ہوں۔

اُو کے دے آو (اُس کو دے آؤ) اے کے مار (اس کو مارو) کِے کِے مار کے ہے (کس کو مارنا ہے) کِے آوا ہے (کون آیا ہے) کِے کِے کھائی (کون کون کھائے گا) دیہاتوں میں کِے کَر گھر یا کِہ کَر گھر (کن/کس کا گھر ہے) رائج ہے۔

واحد اسمائے اشارہ یہ ہیں:۔ اُو (وہ) اِی (یہ) اُوہُو (وہ بھی) اِی ہو (یہ بھی) جمع اسم اشارہ:۔اُن ہَن (وہ لوگ) اِن ہَن (یہ سب) واضح ہو کہ اِنْہن کا معنی جلاون یعنی ایندھن بھی آتا ہے۔ واحد متکلم مَہُوں (میں ہوں) ہَمْہنوں (ہم لوگ بھی) ہَم ہَن (ہم سب) اَیہُوں (میں آؤں گا) اَیبَ (ہم سب آئیں گے) ہَمْہَن اَیبَ (ہم لوگ آئیں گے) ہَمْہَن جَیبَ (ہم سب جائیں گے) اُوکھَی ءَ (وہ کھائے گا) اُورَہیٔ (وہ رہے گا) ہَم ہَن رَہیبَ (ہم لوگ رہیں گے) اُنْہَن جَیہَیں (وہ سب جائیں گے) اُوکا (اس کا) اِیکا (اس کا) مُورا (میرا) تُورا (تیرا) تُن ہَن کا (تم سب کا) ہَم ہَن کا (ہمارا، ہم سب کا) اُوکے (اس کو) اے کے (اِس کو) اُمّے یا یُٹّے (اُس میں) اِمّے یا یِہّے (اِس میں) کِٹّے (کس میں)

دنوں اور مہینوں کے نام پر بھی نام رکھنے کا رواج ہے۔ جیسے منگل کی نسبت سے منگرو، بدھ سے بدھو، جمعرات سے جمراتی، جمعہ سے جمن، شبرات سے شبراتی، رمضان سے رمجانی، روزہ سے (روجہ) سے روجن۔عید سے عیدو، بقر عید سے بقر عیدو۔ بارہ وفات سے بفاتی، درگاہ کے مہینہ کی نسبت سے درگاہی۔

اردو میں چھانٹنا منتخب کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے مگر یہاں یہ لفظ اوکھلی میں کسی چیز کو رکھ کر موسل سے اس غرض سے مارنے کے معنیٰ میں مستعمل ہے کہ چیزوں کی اوپری بھوسی وغیرہ صاف ہو جائے، اسی طرح چھانٹنا منتخب کرنے کے معنیٰ میں ہے، یہاں بَرانا استعمال ہوتا ہے۔

اودھی اور بھوجپوری کے الفاظ آپس میں اتنے گھلے ملے اور خلط ملط ہیں کہ یہ دونوں بولیاں ایک دوسرے کے مشابہ لگتی ہیں اسی لئے ماہرین ادبیات ولسانیات کے درمیان ان دونوں بولیوں کے علاقے کی تعیین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اودھی کا علاقہ کھیری لکھیم پور، سیتاپور، ہردوئی، لکھنؤ، اناؤ، رائے بریلی، سلطان پور، پرتاب گڑھ، اجودھیا، فیض آباد، بارہ بنکی، گونڈا، بستی کی تحصیل ہریا، بہرائچ، ڈومریا گنج، جونپور، کراکت کو چھوڑ کر الٰہ آباد، فتح پور، کانپور کے بٹھور، گھاٹم پور پرگنوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اتر پردیش میں بھوج پوری کے علاقے ضلع بستی تحصیل ہریا کو چھوڑ کر، اعظم گڑھ، مئو، گورکھپور، دیوریا، بلیا، غازی پور، بنارس، مرزاپور ہیں۔ جے آر، ریڈ نے ۱۸۷۷ء کی اعظم گڑھ کی بندوبست رپورٹ کے ضمیمے میں بھوجپوری اور اس کی گریمر پر روشنی ڈالی ہے۔(۱۱۵)

پڑھے لکھے لوگ بھی اپنے معاشرے اور گھروں میں اپنی عوامی بولی بولنے سے گریز نہیں کرتے۔ راقم بھی اردو بولتے بولتے اپنی مقامی بولی کے الفاظ نادانستہ طور سے بول جاتا ہے۔

عموماً ترکاری یا سالن کہنے کے بجائے تیّنؔ کا لفظ زبان پر آجاتا ہے۔ چاول مانگنے کی جگہ بھات کا استعمال اضطراری طور سے ہوجایا کرتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد ارقام فرماتے ہیں کہ

(اسکولوں میں تو کم) مگر مدرسوں میں مقامی بولی اب بھی بولی جاتی ہے۔ نہ صرف بچے بلکہ بعض اساتذہ بھی بچوں سے اسی بول چال کا استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے اساتذہ بھی آپس میں اردو کے بجائے موقع ملنے پر مقامی بولی میں گفتگو شروع کردیتے ہیں۔(۱۱۶)

مئو کی بولی کا اپنا ایک الگ لہجہ اور انداز ہے۔ مصوتے اور مصمتے اس بولی کو عجیب بنا دیتے ہیں۔ یہی بولی ادھر کے علاقوں میں مصوتے اور مصمتے کی وجہ سے بدل جاتی ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد لکھتے ہیں

"ضلع کے بنکر علاقوں میں مئو کی مقامی بولی کا چلن ہے۔ گھوسی، کوپا گنج، ادری اور بہادر گنج تک ایک لب ولہجہ ہے۔ خیرآباد، مبارک پور اور جہانا گنج تک جاتے جاتے اس لہجے میں تبدیلی ہوجاتی ہے۔ لفظیات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوتی۔ اعظم گڑھ ضلع کے اکثر گاؤں قصبوں کی بولی اور لہجہ مئو ناتھ بھنجن سے بہت مختلف ہے۔ یہی صورتِ حال گورکھ پور یا غازی پور کے باب میں بھی ہے۔(۱۱۷)

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری علم وفضل اور عربی وفارسی، نیز اردو پر دسترس کے باوجود اپنے وطن کے لوگوں سے اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے جو ان کی قصباتی بولی ہے۔ ڈاکٹر کبیر احمد جائسی (۱۶ر نومبر ۱۹۳۴ء۔ ۷ر جنوری ۲۰۱۳ء) کا بچپن اور نوجوانی کا زمانہ اعظم میں گزرا ہے۔ وہ اودھی کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی زبان پر بھی اس ضلع کی بولی کا اثر پڑا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میرا بچپن اور نوجوانی کا زمانہ بھوجپوری بولنے والوں کے درمیان گزرا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کتابی اردو سے گریز کرتے ہوئے جب بھی اپنی زبان میں گفتگو کی کوشش کرتا ہوں تو بھوجپوری اور اودھی کا ملغوبہ بولنے لگتا ہوں بلکہ بعض بعض اوقات میری اودھی پر بھوجپوری غالب آجاتی ہے"۔(۱۱۸)

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے بھی اعظم گڑھ میں اثر پزیری کی عمر کے ایام گزارے ہیں۔ اور وہ بھی اس ضلع میں بولی جانے والی بولیوں کی دانشورانہ واقفیت رکھتے ہیں۔ یہاں کے دیہاتوں میں استعمال کئے جانے والے لفظوں کے تعلق سے وہ اپنی تحقیق ان جملوں میں بیان کرتے ہیں۔

جن بہ معنیٰ "نہ" حرفِ انکار اور کہس بہ معنیٰ کہا فعل ماضی ہے۔ یہ لفظ اعظم گڑھ کے قرب وجوار کے دیہاتوں میں اب بھی بولے جاتے ہیں۔ اودھی کے ثقہ زبان دانوں کے نزدیک یہ دیہاتی بول چال ہے۔(۱۱۹)

اس دیار میں کثرت سے جو الفاظ استعمال میں آتے ہیں وہ کسی خاص ترتیب کے بغیر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ اس میں مقامی بولی کے وہ الفاظ ہیں جو اودھی، پوربی، اُپ بھرنشوں اور دوسری بولیوں سے آئے ہیں۔

آدی (ادرک) آنھی (آندھی)انہن (ایندھن، جلاون)اَدہن (آگ پر پکانے کے لئے پہلے سے رکھا ہوا پانی) اُدبائن، اُدوائن (چار پائی کسنے کی رسی)اِنارا(کنواں) اُوڑھنی، اُڑھنی (دوپٹا)اَہدی،کاہل (کام چورست)اَگھوڑی، گندا (جس کے بال، ناخن اور مونچھ بڑھے ہوئے ہوں) اُوسانا(بھوسا اور دَانا کو الگ کرنے کے لئے کچلے ہوئے اناج کوٹوکرے میں بھر کر ہوا میں اڑانا) اُہار،(محمل) اُوسر(بغیر بچہ دئے ہوئے گائے یا بھینس)اوکھ/ا یکھ (گنّا)اَوگھڑ(میلے کچلے، گندے کپڑے کا آدمی جس کے بال، ناخن بڑھے اور الجھے ہوں اور کبھی صفائی نہ کرے)بالا،بالی (کان کا زیور)بہلا (بانجھ گائے،بھینس،بکری وغیرہ)بِلّیَا،بلائی،(بلی)بردھ(بیل)بَردھا(بیل) بھدنا(رائج بھدھنا)(ٹونٹی والا لوٹا) بھدنی، بدھنی (ٹونٹی والا چھوٹا لوٹا)بھگونا((کھڑی دیوار کا برتن) بہوری (بھنا ہوا جو) بھوری (کنڈے کے انگارے میں پکائی ہوئی چھوٹی چھوٹی سیب جیسی گول گول روٹی)بھنٹا، بھانٹا(بیگن)پڑوا(بھینس کا نربچہ) پڑیا(بھینس کی مادہ بچہ) پھلوڑی، پکوڑی (پھلکی) تھاری،تھریا (تھالی) جھاپی (ٹوکری) جھنجھر،جھجھر (گھڑا)(جس پر نقش ونگار ہوں)چمٹا(دست پناہ)چندری (چنری)چنھرانا(ناز وادا دکھانا،چورائی،چولائی)چھکرا(بغیر خصی کیا ہوا بکرا)دیگچی،دیچگی (چھوٹا دیگ) چوٹھا (ناز وغمزہ)دوہر(دوپاٹ یا دوتہہ میں سلا ہوا چھوٹا بچھونا)ڈلیا(دَوری)ڈلوا(کاغذ اور گتے سے بنا ہوا برتن جس کی دیوار کھڑی ہو،ڈلیا کو ڈھپنے والا)سگا،سگنا(توتا) سپنی (ایک چھچھلا اور چھوٹا برتن)سانی (بھوسا،کھلی پانی ملا ہوا جانوروں کا چارا) کراوَ(مٹر) کگنا،کنگن (کلائی کا زیور) کرچھل،کرچھلی (ہانڈی کے گوشت یا سالن چلانے والا ایک قسم کا برتن) کھاٹ،کھٹیا (بانس کی بنی چھوٹی چار پائی) کھر (تنکا، گھاس پوس جو سوکھی ہو) کھل (کھرل) گابھ (حمل جانوروں کا) گابھن (حاملہ جانور) گگری (مٹی کا گھڑا) گگرا(لوہے یا پیتل کا گھڑا) گورو (مویشی) گلرّ (گوبر) گوری (کوٹا اور صاف کیا ہوا جو) گہرا(اُپلا،کنڈا) گڑہٹن،گڑہڑ(اپلوں کا ذخیرہ)لٹی(سینکی ہوئی موٹی روٹی)لگّا(ساڑی)رائج لوگا۔لگری (پرانی ساڑی، میلا کپڑا)لہنگا(ساڑی کے نیچے کا استر) مٹیا(ہانڈی جیسا مٹی کا چھوٹا برتن)

بَسّانا (بدبوکرنا) بچوا (لکڑی کا پایہ) مچیا (سُتلی سے بنی ہوئی چوکور بیٹھکی) نمکوڑی (نیم کا پھل) ناند، ناندی (وہ برتن جس میں سانی دی جاتی ہے یا دھوبی جس میں گندے کپڑے کو صفائی کے لئے ڈالتا ہے) ہالی (حال سے بنا ہے بمعنیٰ جلدی) ہانڑی (ہانڈی) دلرانا (دلار دکھانا، شرارت کرنا)

مختلف کیفیات کے اظہار کے لئے الگ الگ الفاظ ہیں۔ جیسے گھبُرانا (منھ پھلانا، منھ لٹکانا) کٹرانا، کرکرانا، (کھاتے وقت چھوٹی کنکری یا مٹی کا دانتوں تلے پڑ جانے کی کیفیت) چُھوانا (دانت پیس کر اور مٹھی باندھ کر غصے کا اظہار کرنا) کَرکَرانا (بلند آواز سے تکلیف پہنچانے والی یا بے مقصد باتیں کرنا) کلکلانا (زخم یا پھوڑے میں مواد ہو جانے پر جلد کے نیچے کی تکلیف جو سہلانے یا کھجلانے سے آرام پائے) بچھلانا (پھسلنا) بربرانا (بڑبڑانا) بھربھرانا (رونگٹے کھڑے ہونا) بِسّانا (شہد کی مکھی، زہریلی چیز، مچھلی کے ڈنک مارنے یا سوئی کی چبھن سے درد کی کیفیت) کرّانا (بچوں کا سونے میں اوپر نیچے کے دانتوں کا ٹکرانا) مکنانا (ناز و غمزہ دکھانا، آمادگی کے باوجود انکار کرنا) چھرچھرانا (نمک یا مرچ کی تیزی و تلخی، جلے کٹے یا زخم میں نمک یا مرچ کے لگنے کی کیفیت، جلد میں خراش کی تکلیف، گھاؤ میں پانی لگنے کی تکلیف) کُلّوانا (کان کی تکلیف جو چھوٹی انگلی کی جنبش سے آرام پائے) مَنسیّانا (من کا سیانا ہونا یعنی شہوانی طور سے خواہش مند ہونا، بہلے رہنا، پوری دلچسپی اور آمادگی کے ساتھ کسی دباؤ کے بغیر کام میں لگے رہنا) کچھ الفاظ عورتوں میں گالیوں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں مثلاً چھتیسا (چھاتی پکڑنے والا، بدفعل، بدکردار) چھتیسی (چھاتی سہلوانے والی، بدکردار) کرجیبھن (کل جیبھن، گالی بکنے والی) کرمونہیں (کل مونہیں، کالے منھ کی یعنی بدکردار) کرونچھی (کالی کلوٹی) کرونچھا (کالے رنگ کا مرد) انگوچھا (گمچھا) مونڑ (کپار) بَناون (غلہ میں سے نکالی ہوئی فاضل چیز) چمارن (چماین) مورا (میرا) تورا (تیرا) بَینا۔ پَہُورا (سسرال، میکے یا رشتہ داری سے آیا ہوا غلغلہ یا مٹھائی) بِینا (ہاتھ سے جھلنے والا پنکھا) اِنکڑا تصغیر اِنکڑی، خزف ریزہ۔ بینا (بُنا ہوا۔ بینا سے اسم مفعول یعنی نکالا ہوا) گُنٹھا (زمین سے نکلا ہوا کنکر) لام، لامے (دور) اُپّر (اوپر) نچے (نیچے) آجا (باپ دادا، مورث اعلیٰ، لکھڑ دادا، دادا کے اوپر مورث اعلیٰ) تَلّا (جوتے) پلہر (میدان، بغیر بویا جوتا کھیت، بنجر) ٹھاؤں (ٹھہرنے کی جگہ) ٹھیاں (جگہ) دَاوَن (دامن) تَلّا (چھت) تلے (پاس، قریب، لاحقہ میں محلے کا ایریا) بھتر (اندر) ڈیٹھارا (انکھیارا) اجوریا (چاندنی، اجالا) اُجیریا (اجالا، بھور کا اجالا) انھیریا (اندھیرا) اَنھرا (اندھا) اُجُری (مٹھی، مُٹھ) نات (رشتہ دار) نتائی (رشتہ داری) ناتی نتنی (بیٹی

کے بیٹا بیٹی) اِہر (ادھر) رکہر (کدھر) بَہر (بہرا، دیہاتی) رہس، ربیس (تھا) کہس (کہا) کہیس (پوربی میں کہا) رہا (تھا) ہَوں (ہوں) تیں (تو) یہ قدیم دکنی اور اردو میں بھی تھا۔ اکوار (گود، آغوش، دونوں بانہیں، پسار کر گود میں لینا یا سینے سے لگانا۔ محاورہ میرے اکوار کا نہیں اسی سے ہے جس کا مفہوم ہے کہ میرے بس کا نہیں) اَکھچ (زیادتی، بھر مار مگر یہ لفظ منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اسی کا ہم مفہوم لفظ بھُگُّھر بھی ہے) چاؤر (بغیر پکا یا چاول) مجت مسجت (مسجد) بھات (پکا ہوا چاول) پیچھ (چاول پکنے کے بعد کا رس جیسا پانی) تہاڑی (مسالہ دار چاول جس میں گوشت وغیرہ ڈالا گیا ہو اور کچھ گیلا بھی ہو) کھُدّی (چاول کا ریزہ) اُدھمچ (شرارت، دھما چوکڑی) کَن (کوٹے ہوئے شاول کے بعد چاول کے اوپر جو تہہ رہ جاتی ہے) اسکت (تساہلی، کاہلی) اسکتانا (تساہلی، کاہلی کرنا) کن کھدی (روکھا سوکھا کھانا) جُرنا (میسر ہونا، نصیب ہونا، فراہم ہونا) اَکھرنا۔ کھَلنا (کسی کھوئی ہوئی کا افسوس کرنا) نہارنا (دیکھنا) گلستاں کے باشندے سب کے سب ہیں پژمردہ۔ ہر کلی ٹٹول آئے۔ سارے گل نہار آئے، نذیر وفراز) دُبدھا (تذبذب، شک) اَدبدانا (شک میں پڑنا، ہر پھر کے وہی کام کرنا) کتوار (گھر کی صفائی کے خاشاک، کورا، کرکٹ) اَٹیا (پتی یا گھاس اور ساگ کی گانٹھ) گورا (کنجشک مادہ کا نر) گوریا (مادہ کنجشک) گھُڑسیاں (پیٹھ پر بٹھانا) گوڑ دھریا (قدمبوسی، پیر پر گرنا) لُگنا (چھپنا) نِگچ (قریب) گراواں (جانور کی گردن کی رسی) کُوَرا (حصہ، میٹھی برابر کر کے حصہ لگانا) راڑ (ستانے کے لئے بہانہ ڈھونڈھنا) سریانا (سھیجنا، ترتیب سے رکھنا) ٹورنا (ٹٹولنا۔ ڈھیر میں سے چھانٹ چھانٹ کر لینا۔ مختلف زاویۂ نظر سے دیکھنا) گھان (حصہ، مرتبہ، دفعہ، کھانا زیادہ پکانا ہوتا ہے تو باورچی الگ الگ برتن میں کئی کئی حصہ کر کے پکاتے ہیں اُسی کو گھان بولتے ہیں) ٹِیکورا (کیری، آم کا کچا اور چھوٹا پھل) پھُسلانا (نرم نرم باتوں سے آمادہ کرنا) مہرانا (مرطوب ہوا سے کسی چیز کا نرم ہو جانا) ڈہرانا (کسی ترکیب اور تدبیر سے اپنے من چاہے راستے پر لانا) ٹِکلانا (بہلانا، پھسلانا، لالچ دے کر آمادہ کرنا)

بھوج پوری بولی عوام میں رائج ہے اور دیہاتوں میں کثرت سے بولی جاتی ہے مگر اس بولی کی حیثیت تقریری ہے تحریری نہیں۔ اس کا کوئی ادب نہیں ہے اور یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ جس بولی میں جتنا ادب ہوگا اس کی اتنی ہی اہمیت ہوگی۔ اس میں نثری کتابیں اور شعری مجموعے نہیں شائع ہوئے۔ بعد کے زمانے میں کچھ لوگوں کی توجہ اس طرف ہوئی تو شعر و نثر کی کچھ کتابیں مطبوع ہوئیں لیکن ایسا محسوس ہوتا

ہے کہ یہ سب ادبی بے مائیگی کی خفت مٹانے کے لئے ہوا۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کے لئے اس بولی کو ذریعۂ اظہار بنانا باعث ننگ و عار تھا۔ اسی لئے بنگال کے رہنے والوں نے اس بولی کو کھوٹّا بھاشا کا نام دیا ہے۔ کیوں کہ بنگال خصوصاً کلکتہ وغیرہ میں بھوج پوری بولنے والے محنت مزدوری اور دربانی کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ اس معمولی کام کرنے کی وجہ سے بنگالی انھیں کھوٹّا کہتے تھے۔

اس بولی کا نام بہار کے ضلع شاہ آباد کے پرگنہ بھوج پور سے منسوب ہے۔ اس کو چھپر ہیا اور پُربہیا کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ضلع بلیا کے پچھمی حصے اور متحدہ اعظم گڑھ کے پوربی حصے کی بولی کو بنگری یا بنگرہیا کہتے ہیں۔ کیوں کہ برسات کے دنوں میں اس علاقے میں گنگا اور گھاگھرا ندی کا سیلاب نہیں آتا۔ اسی جغرافیائی خصوصیت کی وجہ سے اس حصے کو بانگر کا نام دیا گیا ہے۔

بھوج پوری کا علاقہ دوصوبوں پوربی اتر پردیش اور پچھمی دکھنی بہار تک پھیلا ہوا ہے۔ اتر پردیش میں ضلع بستی (بانسی) تحصیل ہریا کو چھوڑ کر) ڈومریا گنج، ضلع اعظم گڑھ، مئوناتھ بھنجن، گورکھ پور، بلیا، دیوریا، غازی پور، بنارس، مرزاپور (سون ندی کے پار جنوبی حصے کو چھوڑ کر) اور ضلع جون پور کی تحصیل کراکت کی سرزمین کو بھوج پوری کا علاقہ مانا گیا ہے۔ صوبہ بہار میں موتی ہاری، چھپرا، آرا (ڈومراؤں) شاہ آباد (بھوج پور اور بکسر) چمپارن کے بعد نیپال اور ہمالہ کی ترائی تک اس بولی کا دائرۂ عمل ہے۔

مغل دور اقتدار سے پہلے بھوج پور کے اُجینی راج پوت حکمرانوں کی حکومت بڑی دور تک پھیلی ہوئی اور مستحکم تھی۔ قنوج بہت بڑا راج تھا۔ جو پرتی ہارا راجپوتوں کے زیر اقتدار تھا۔ اتر پورب میں اتر پردیش کے کوہستانی علاقے سے لے کر دکھن پچھّم میں گجرات اور کاٹھیاواڑ تک، مشرقی پنجاب سے لے کر مغربی بنگال تک اس میں شامل تھا۔ اتر پردیش کے پوربی ضلعے اور جنوبی بندیل کھنڈ کا علاقہ اس میں شامل نہیں تھا۔ اور آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں سندھ کے عرب حکمرانوں کی راجستھان میں پیش قدمی کو روک دینے کی وجہ سے اس خاندان کو شہرت مل گئی تھی۔ (۱۲۰) اس خاندان کو محمد انصاراللہ نے پرت ہارا خاندان اور اظہر علی فاروقی نے اجینی یا اجنیہ راجپوت حکمرانوں کا بھوج خاندان لکھا ہے۔ (۱۲۱) یہ بڑے لڑاکو اور جنگ جو تھے۔ بھوج پور میں یہ لوگ مالوہ (اجین) سے آ کر آباد ہو گئے تھے اور بھوجپور کو اپنی راجدھانی بنالیا تھا۔ اس خاندان کا بااقتدار اور مشہور راجا بھوج گزرا ہے۔ یہ کہاوت آج بھی زبان زد عوام و خواص ہے۔ " کہاں راجا بھوج، کہاں بھوجئ تیلی" (۱۲۲)

دسویں صدی عیسوی کے وسط میں اس خاندان کی حکومت مغربی بہار اور مشرقی یوپی کے مختصر علاقے میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ مگر اس کی بولی آج بھی عوام میں سکۂ رائج الوقت بنی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے عہد وسطی بالخصوص مغربی بہار و مشرقی اتر پردیش کی تمدنی ولسانی تاریخ میں اس خاندان کے حکمراں کا بڑا اہم مقام ہے۔ اظہر علی فاروقی نے لکھا ہے کہ "مغلیہ دور حکومت میں ہی بھوجپوری یا بھوج پور یا تلفظ عوام کی زبان پر چڑھ چکا تھا"۔(۱۲۳)

سیاسی اقتدار والے علاقے کی بولی مثلاً راج دھانی اور مذہبی تقدس رکھنے والے مقامات کی بولی کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اس لئے بھوج پوری کو ہندی اور اردو کے معتبر و مستند علاقوں میں بھی معیاری زبان کی موجودگی کے باوجود ابھی تک لوگ اپنے پروجوں کی تہذیبی ولسانی امانت سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

گریرسن نے بھوج پوری کو چار ذیلی بولیوں میں تقسیم کیا ہے (الف) شمالی بھوج پوری دریائے گھاگھرا کے شمال میں (ب) نگ پور یا سون ندی کے جنوب میں (ج) جنوبی بھوج پوری بیلا، گھاگھرا کے شمال میں (د) مغربی بھوج پوری اعظم گڑھ، بنارس، مشرقی جون پور، مرزاپور اور غازیپور کے مغربی حصے میں (۱۲۴) بولی جاتی ہے۔

اس ضلع میں بہت سے الفاظ عام بول چال میں استعمال کئے جاتے ہیں جنھیں تقریری لفظ کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے لیکن یہ الفاظ تحریروں میں نہیں لائے جاتے کیوں کہ یہ ذیلی زبان کے الفاظ ہیں اور معیاری زبان کے لئے عیب سمجھے جاتے ہیں۔ مبارک پور کی تقریری زبان کے بعض الفاظ یہاں کے مشہور ہزل گو شاعر ظہیر احمد مضطرؔ کے مزاحیہ کلام میں تحریری روپ میں موجود ہیں۔ یہاں کی ذیلی بولی کے بعض الفاظ ایسے ہیں جن کا متبادل معیاری زبان میں یقیناً ہے لیکن مفہوم کی جو ترسیل ان تقریری لفظوں سے ہوتی ہے اس مفہوم کی صحیح ادائیگی یا کما حقہ ترسیل مطالب اردو کی معیاری زبان کے لفظوں سے نہیں ہو پاتی۔ مثال کے طور پر ایک لفظ تتّا ہے اردو میں اس کا متبادل کڑوا، تلخ اور تیز ہے لیکن سرخ مرچ کی تتائی کی جو کیفیت اس لفظ سے ادا کی جاتی ہے وہ دوسرے سے ممکن نہیں۔ اسی قبیل سے چھر چھراہٹ بھی ہے۔ جو مفہوم اس میں ہے وہ کسی اور لفظ میں نہیں ہے۔ ذیلی بولی کے بہت سے الفاظ آلات کی ایجاد، سائنس کی ترقی اور بدلتی ہوئی زندگی کے اثر سے قلیل الاستعمال ہوتے جارہے ہیں۔ ان کے استعمال کی کوئی ضرورت باقی نہ رہنے کی وجہ سے متروکات کے درجے میں پہنچ کر مرنے لگے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی

میں سائنس کے داخلے کی وجہ سے ذیلی بولی کے یہ چند الفاظ متروک ہوتے جارہے ہیں۔

پھارا (گوندھے ہوئے آٹے کی آدھے چاند کی طرح کی تہ میں رکھ کر کھولتے ہوئے پانی کی بھاپ سے تیار ہوتا ہے) ٹِکری (موٹی روٹی جو توا پر پکانے کے بعد آگ پر سینکی گئی ہو) چَیلا (تصغیر چیلی، وہ لکڑی جو جلاون کے کام میں لانے کے لئے چیری گئی ہو) بُوٹا (جو کلہاڑی سے موٹا موٹا تنا یا موٹی موٹی ڈالیوں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہو) پھلٹھا (بانس کو دو چار ٹکڑوں میں چیر کر بنایا جاتا ہے) کُتلما (خشک روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو مسالہ دار بانی یا شربت میں پکا کر تیار کیا جاتا ہے) اَنکتی (گوندھے ہوئے آٹے کے چھوٹے چھوٹے لمبوترے ٹکڑے کو مسالے دار دال میں پکا کر تیار کی جاتی ہے) اِینگستی (انگلی سے مسلی ہوئی روٹی کے ٹکڑے شوربے میں بھگو کر تیار کی جاتی ہے) کھَر مِٹاؤ (صبح کا ناشتہ جو عام طور پر ٹکری، چٹنی اور گڑ کے شربت پر مشتمل ہوتا تھا اور کھیت پر کھیت مزدوروں کو ملتا تھا) ٹانگاں (تصغیر ٹانگی۔ لکڑی چیرنے کا اوزار)

گنے کا رس جب آگ پر پکا کر گاڑھا کر دیا جاتا ہے تو عام طور پر اس کو گُڑ کہا اور بولا جاتا ہے۔ لیکن اس دیار میں گڑ کی مختلف قسموں کو الگ الگ نام دیئے گئے ہیں جیسے گوڑ/گڑ (گنے کا رس آگ پر پکنے کے بعد گاڑھا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد پکانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ نہ بہت رقیق ہوتا ہے نہ بہت ٹھوس) بھیلی (رس کو اتنا پکا دیا جائے کہ وہ پنڈی کی طرح بندھ کر ٹھوس ہو جائے اور استعمال کے لئے اس کو کسی سخت چیز سے پھوڑنا اور توڑنا پڑے) راب (گڑ کی اوپری تری) مَہیا گڑ پک جانے کے قریب ہوتا ہے تو اس پر پھول جیسے زرد زرد بُلبُلے پڑنے لگتے ہیں۔ لذت لے لے کر اس کو کھایا جاتا ہے)

چیز کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے بھی معنی کی تعبیر کے لئے نئے لفظ وضع کئے جاتے ہیں۔ چاوُر (چاول) بغیر پکا ہوا۔ بھات (پکا ہوا) ست کورا (سات کور سے بنا ہے دولہن کے آنے پر گڑ کے شربت میں پکا ہوا چاول) کھُدّی (چاول کا ٹکڑا) کن (دھان کوٹنے کے بعد چاول کے اوپر ایک ہلکی سی بھوسی ہوتی ہے اس سے موٹی روٹی یعنی ٹکری (لٹی) پکائی جاتی ہے۔ پیچھ (نیا چاول پکانے کے بعد جو گاڑھا پانی نکلتا ہے اسی کو کہتے ہیں پہلے کے لوگ اس میں نمک یا گڑ ڈال کر شوق سے استعمال کرتے تھے) کن کھدی محاورہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جیسے آپ شوق سے میرے یہاں قیام فرمائیں "جو کن کھدی" میسر رہے گا وقت پر حاضر ہوگا۔ کھیتی باڑی کے طور طریقے، معاش و معیشت کے وسائل و ذرائع، صنعت

وتجارت کے انداز، گھریلو کام اور خاندانی پیشوں کے بدل جانے سے بھی دھیرے دھیرے لفظوں کی موت ہونے لگتی ہے۔ گانو سے شہروں کی طرف مہاجرت کے اس جدید دور میں تولہ، ماشہ، رتی، زرائی، کُڑائی، گُڑائی، اُوسائی، دَنوائی، ہنگائی، کھرائی، رنگائی، تنائی، پھیرائی، مٹی کمائی جیسے الفاظ کوکون بولے اور سمجھے گا کیوں کہ طرح طرح کی ملازمتوں کے دروازے کھل جانے سے چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں مرتی جارہی ہیں اوران لفظوں کے استعمال کی ضرورتیں معدوم ہوتی جارہی ہیں۔

ٹورنا (ٹٹولنا۔ ڈھیر میں سے چھانٹ چھانٹ کر لینا۔ مختلف زاویۂ نظر سے دیکھنا) گھان (حصہ، مرتبہ، دفعہ، کھانا زیادہ پکانا ہوتا ہے تو باورچی الگ الگ برتن میں کئی کئی حصہ کرکے پکاتے ہیں اُسی کو گھان بولتے ہیں) ٹیکورا (کیری، آم کا کچا اور چھوٹا پھل) پھُسلانا (نرم نرم باتوں سے آمادہ کرنا) مہرانا (مرطوب ہوا سے کسی چیز کا نرم ہوجانا) ڈہرانا (کسی ترکیب اور تدبیر سے اپنے من چاہے راستے پر لانا) ٹِکلانا (بہلانا، پھسلانا، لالچ دے کرآمادہ کرنا)

واحد اسمائے اشارہ یہ ہیں:۔ اُو (وہ) اِی (یہ) اُوہُو (وہ بھی) اِی ہو (یہ بھی) جمع اسم اشارہ:۔ اُن ہَن (وہ لوگ) اِن ہَن (یہ سب) واضح ہو کہ اِنہن کا معنی جلاون یعنی ایندھن بھی آتا ہے۔ واحد متکلم مَہُوں (میں ہوں) ہَمہنوں (ہم لوگ بھی) ہَم ہَن (ہم سب) اَیہُوں (میں آؤں گا) اَیبَ (ہم سب آئیں گے) ہَمہَن اَیبَ (ہم لوگ آئیں گے) ہَمہَن جَیبَ (ہم سب جائیں گے) اُوکھَی ءَ (وہ کھائے گا) اُورَہئَ (وہ رہے گا) ہَم ہَن رَہیبَ (ہم لوگ رہیں گے) اُنہَن جَیہَیں (وہ سب جائیں گے) اُوکا (اس کا) اِیکا (اس کا) مُورا (میرا) تُورا (تیرا) تُن ہَن کا (تم سب کا) ہَم ہَن کا (ہمارا، ہم سب کا) اُوکے (اس کو) اے کے (اس کو) اُمّے یا ہُمّے (اُس میں) اِمّے یا ہِمّے (اس میں) کِمّے (کس میں)

گنے کا رس جب آگ پر پکا کر گاڑھا کر دیا جاتا ہے تو عام طور پر اس کو گُڑ کہا اور بولا جاتا ہے۔ لیکن اس دیار میں گڑ کی مختلف قسموں کو الگ الگ نام دیئے گئے ہیں جیسے گوڑ/گڑ (گنے کا رس آگ پر پکنے کے بعد گاڑھا ہوجاتا ہے اور اس کے بعد پکانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ نہ بہت رقیق ہوتا ہے نہ بہت ٹھوس) بھیلی (رس کو اتنا پکا دیا جائے کہ وہ پنڈی کی طرح بندھ کر ٹھوس ہوجائے اور استعمال کے لئے اس کو کسی سخت چیز سے پھوڑنا اور توڑنا پڑے) راب (گڑ کی اوپری تری) مَہیّا گڑ پک جانے کے قریب ہوتا ہے تو اس پر پھول جیسے زرد زرد بُلبُلے پڑنے لگتے ہیں۔ لذت لے لے کر اس کو کھایا جاتا ہے)

انسانی زندگی کی طرح زبان کو بھی ارتقا پزیر ہونا چاہئے۔ ادبی اور معیاری زبان قواعد کی اسیر ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے یہ اپنے اردگرد کے روزمرہ سے بے گانہ سی بنی رہتی ہے اور اپنے ہر طرح کے استعمال کے جواز کے لئے سندوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ اور بار بار پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے کی وجہ سے زبان ماضی پرست اور روایت پسند ہوجاتی ہے۔ اپنی مقامی بولیوں کے لفظوں کو اپنانے کو حقارت بھری نظر سے دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ نہیں ہو پاتا۔ ترقی پزیر زبانیں اپنی زندگی اور ارتقا کے ثبوت کے لئے بولیوں سے معاشرت نہیں برتتیں بلکہ وہ ندی کی طرح رواں دواں رہا کرتی ہیں۔ گیان چند جین کا خیال ہے کہ

"تقریری روپ سے زیادہ کنارہ کشی اور لغت وقواعد کے زیادہ احترام کے باعث بعض اوقات زبانیں مر بھی جاتی ہیں۔ یعنی ان کا بولنے والا کوئی نہیں رہتا۔ سنسکرت اور عبرانی اس کی مثالیں ہیں"۔(۱۲۵)

بالکل یہی حال اودھی کا بھی ہوا جو اپنے وقت کی ادبی ومعیاری زبان تھی۔ ماضی میں اس کا ادب نہایت وقیع اور ثروت تھا مگر کم استعمال کی وجہ سے یہ قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔

یہاں کی قومیں پہلے ہی سے رقص وسرود اور لوک گیتوں سے مانوس تھیں۔ یہاں تک کہ ان کے مذہبی معتقدات میں بھی ناچ گانے اور باجے کو اہمیت حاصل ہوچکی تھی ان کے کان موسیقی کی آوازوں اور تال سم کے نشیب وفراز سے آشنا تھے اس حقیقت نے یہاں کی شاعری کی روح میں داخلی آہنگ کو داخل کرنے کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔

کوئی بھی موقع ہو، کوئی بھی تقریب یا تفریحی مجلس ہو ہر جگہ شاعری کا عمل دخل تھا۔ شادی بیاہ، بچوں کی پیدائش، ختنہ، بسم اللہ خوانی، نمک چشی کے موقع پر بھی ساز وآواز سے ماحول کو خوشگوار اور مجلس کو بارونق بنایا جاتا تھا۔ ساون میں جھولا اور کیاریوں میں دھان کی روپائی کے گیت اور گانے زندگی پیدا کرتے تھے۔ کھیت کھلیانوں، باغوں، میدانوں، تالابوں، ندیوں کے کنارے دیہاتی بولیوں کی الاپیں اور تانیں گونجتی تھیں۔ دفالیوں کے سہلے، چرواہوں کے برہے، گوالوں کے دوہے، لوک گیت، رانی سرنگا کے قصے میں شامل دلچسپ اور عشقیہ دوہے، آلھا، گئوشاہی اور دوسرے رزمیہ نغمے، روزمرہ کی زندگی اور عوام کی جان بنے ہوئے تھے۔ مندروں میں بھجن، منڈلیوں میں کتھا، نکاح میں سہرا، امام بارگاہوں اور امام چوک پر دہا، زاری، مرثیہ، نوحہ، سلام، مزاروں پر قوالی، خوشیوں اور فتح وکامرانی کی گھڑیوں میں

ناچ گانے اورنغمہ وسرود دل بستگی کا سامان تھے۔ حتیٰ کہ بھکاری، بھکارن اور خوانچہ فروش بھی موزوں صدائیں لگاتے تھے۔ یہ سب دلچسپیاں صرف ضلع اعظم گڑھ کے شب وروز اور یہاں کے سماج میں ہی داخل نہ تھیں۔ بلکہ یہ تمام مشرقی اضلاع میں دل بہلانے کا ذریعہ تھیں۔

یہاں کی شاعری کے ارتقاء میں میلوں، ٹھیلوں، عوامی اجتماعات، تحریکوں اور گانو گھر کے ماحول وواقعات نے بنیاد فراہم کی ہے۔ سید مسعود غازی (۱۵ر فروری ۱۰۱۵ء۔ ۱۰ جولائی ۱۰۲۳ء) کی شخصیت بلاتفریق مذہب وملت ہندوستانی سماج میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ زمانۂ قدیم سے مسلم بستیوں میں ان کے بیاہ کے میلے لگتے چلے آرہے ہیں۔ ان میلوں میں دفالیوں اور مجاوروں کے سہلے، پچرے اور جھگڑے کے علاوہ قوالیوں کے اکھاڑے مشرقی اضلاع میں عوام کی دلچسپی کا خاص مرکز ہوا کرتے تھے۔ مسلم انصاری نے لکھا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب یوپی مشرقی اضلاع میں جنگ ورباب کی "سائری" کی دھوم مچی ہوئی تھی شادی، عقیقہ، ختنہ غرض جو تقریب ہوتی اس کا انعقاد ہوتا تھا۔ یہ "سائری" دراصل مشاعری کا بگڑا ہوا لفظ ہے جسے جہلا نے عام کردیا، اب تغیر زمانہ کے سبب شہروں میں تو بہت کم مگر دیہاتوں میں اب بھی اس کا رواج ہے اور کبھی کبھار مظاہرے ہوتے رہتے ہیں اس کے انعقاد کے وقت "سائری" آنے والوں کی دو پارٹیاں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھتی ہیں جب پروگرام شروع ہوتا ہے تو ایک پارٹی کا سائر اپنے استاد سے اجازت لے کر اپنا کلام سناتا ہے اس کے بعد دوسری پارٹی کا "سائر" اس کے جواب میں اپنا کلام سناتا ہے۔ یہ سلسلہ ساری رات چلتا رہتا ہے۔ آخر میں دونوں پارٹیوں کے استاد بھی اپنا اپنا کلام سناتے ہیں بعد میں ثالث حضرات کے فیصلے کے مطابق فاتح ٹیم کو انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ اس مقابلہ کی خاص خوبی یہ ہے کہ عموماً ابتدا حمد ونعت سے ہوتی ہے مگر اختتام گالی گلوج پر ہوتا ہے۔ میرے پڑوس میں بالے میاں کی شادی کے میلے کے موقع پر اب بھی یہ مقابلے ہوتے ہیں (۱۲۶)

سید سالار مسعود غازی میاں کی یادگار میں جگہ جگہ ہر سال صحبت کے نام سے ایک میلہ لگتا ہے اور ان کا نشان گھمایا جاتا ہے چنانچہ قصبہ کوپا گنج میں بھی اس کا رواج ہے اور نہایت پابندی کے ساتھ ہر سال یہ تقریب منائی جاتی ہے۔۔۔۔ رات بھر قوالی اور گانے کی مجلس گرم رہتی ہے (۱۲۷) مئوناتھ بھنجن میں بھی اس موقع پر محفلیں ہوتی تھیں مئی کے مہینے میں اندھیری رات کی مناسبت سے منگل کے روز مرزا ہادی پورہ میں غازی میاں کا میلہ (صحبت) لگتا ہے۔۔۔۔ ماضی میں عشاء کے بعد شعرخوانی (پچرا) کا پروگرام بھی

ہوتا تھا'' (۱۲۸) اس ضلع میں مبارک پور، بھگت پور وغیرہ مختلف مقامات پر بھی صحبت کے میلے لگتے تھے۔ قوالیاں ہوتی تھیں پچرے گائے جاتے تھے۔ دو پارٹیوں کے درمیان مقابلے ہوتے تھے۔ دونوں طرف کے شاعر سوالیہ اور جوابیہ کلام لکھتے تھے جو برجستہ نگاری اور زود گوئی کی مثال ہوتے تھے۔ غازی میاں کے ان میلوں میں رنگارنگ شاعری کے نمونے عوام کے ذوق کو مہمیز کرتے تھے اور لوگ مختلف موضوعات کے اشعار سے محظوظ ہوتے تھے۔

غازی میاں کے جو میلے ان اطراف میں لگے، بعد میں تعزیہ داری کی جو روایت قائم ہوئی۔ عرس، گاگر، چادر کی جو رسم چلی اور محافل ومجالس کے جو سلسلے شروع ہوئے ان میں خیال، ٹھمری، کجلی، پچرا، بھیروی، دادرا، ہولی، چیتا، بارہ ماسا، ملہار ساونی کڑکھا، عزائی شاعری، اور مدحیہ شاعری کی ترقی کا بہت کچھ سامان موجود تھا۔ یہاں کی شاعری کا ایک معتد بہ حصہ مذہبی رجحانات ومیلانات، روحانی جذبات وواردات اور قومی وملی سوز وساز کا نمائندہ ہے بعد میں سہرا خوانی کی رسم چلی اگر چہ سہرا نگاری بہت قدیم زمانہ سے جاری تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے دور میں استاد ذوق اور مرزا غالب کی معاصرانہ چشمکوں میں سہرا نگاری کو بڑا دخل تھا۔ لیکن اب تک دستیاب کلام سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ان اطراف میں سہرا خوانی اور سہرا نگاری دیگر اصناف کے بعد بام عروج پر پہنچی۔ مبارکپور میں شادیوں اور خوشی کی دوسری تقریبات میں گانے باجے کا بڑا رواج تھا۔ ۱۳۶۴ھ / ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے کہ مولانا حکیم علی حماد صاحب نے مقامی علماء کی ایک میٹنگ کر کے یہ تجویز پاس کرائی کہ علماء گانے بجانے کی تقریب میں نہ شریک ہوں گے نہ نکاح پڑھائیں گے۔ اس کے ایک سال بعد جمادی الثانی ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء میں مولانا علی رشاد نجفی وغیرہ کی براتوں میں پہلی بار سہرا خوانی ہوئی۔ پھلواری، آتش بازی، اور گانے باجے سے یہ براتیں محفوظ تھیں۔ اسی کے بعد املو، خیر آباد، ولید پور وغیرہ میں بھی سہرا خوانی کا رواج ہوا اور اہلِ سنت میں بھی اس طرف توجہ ہوئی۔ محمد آباد، کرہاں، ماہل کے شریف گھرانوں میں بھی سہرا نگاری اور سہرا خوانی کا رواج تھا مگر ان لوگوں کی جو معاشرت تھی اس میں بھانڈوں، رقاصوں، سازندوں، قوالوں مغنیوں کا گزر تو ہوسکتا تھا عام لوگوں خصوصاً پسماندوں کی موجودگی ان رئیسوں اور نجیبوں کے لئے باعث عار ہوا کرتی تھی۔ اس لئے عام لوگوں کی یادداشت میں محفوظ نہیں رہا اور قدامت زمانہ کی وجہ سے وہ تحریری سہرے بھی ناپید ہوگئے۔ فارسی وغیرہ میں یہاں کے شاعروں اور عالموں نے شادی نامے لکھے لیکن اردو کو اس زمانہ میں ایک پامال اور افتادہ زبان سمجھا جاتا تھا اس لئے اس طرح کی وقتی اردو شاعری کی حفاظت

بھی نہیں ہوسکی۔ کچھ لوگ شکاروشکاریات کوبھی موضوع بنا کرفکرسخن کرتے تھے۔ اقبال سہیل نے بھی اس طرح کی شاعری کی تھی جس میں کچھ کچھ طنزومزاح کا رنگ بھی شامل ہوا کرتا تھا۔ان کے صحبت یافتہ حضرات کوبھی کچھ شعر یادرہ گئے تھے جواپنی مخصوص محفلوں میں سن سنا کرمحظوظ ہوا کرتے تھے۔

یہاں تفریحی شاعری کوبھی عروج حاصل رہا۔ جنگ نامے بھی لکھے گئے۔شبلی کی نظم محاربۂ کابل وقندھار،منظومہ ۵/صفر ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ءکوسرفہرست رکھا جاسکتا ہے۔انھیں کے شاگرد اقبال سہیل خاں نے بھی فتح سمرنااور پرچم اسلامیاں جیسی نظمیں لکھ کراستاد کی روایت کوآگے بڑھایا۔کتابیں چھپتی تھیں توان پراعزاء واحباءمنظوم اظہارخیال کرتے تھےجس سے تاریخی قطعات نگاری اور مادۂ تاریخ کی منظوم تخریج کوخاص فروغ حاصل ہوا۔جلوس میلادالنبی،محفلِ میلاد،سیرتِ پاک کے اجلاس،مساجدومدارس کی تعمیر کے لئے چندہ خوانی نیزعرس وقوالی کے حوالے اور چادر،گاگر کےتعلق سےبھی نظمیہ شاعری کوراہ ارتقا تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔اس سلسلے میں ایک حوالہ قابل توجہ ہے۔

’’تہذیبوں کے اس اختلاف میں اتحاداور یک جہتی پیدا کرنے کی دونوں طرف سے بے پناہ کوششیں ہوئیں۔سنت کبیر،حضرت نظام الدین اولیاء،امیرخسرو،شیخ بہاؤالدین زکریا، بابافرید،مخدوم علاؤالدین صابر،بوعلی شاہ قلندر،سماع،بسنت،گاگر،چادرکی رسمیں اور برج بھاشا کی نشوونما انھیں لوگوں کی دین ہے۔(۱۲۹)

یہاں کےلوگ بھگتی تحریک اورتصوف وروحانیت کے دلدادہ توپہلے ہی سے تھےجگہ جگہ مزارات ومقابرکی تعمیرعوامی رجحانات کوظاہرکررہی ہے۔ چادرگاگرکے بنیادی مضامین،عقیدتِ شیخ اوراحترام پیرسے تعلق رکھتے ہیں۔اس طرح کےمنظوم کلام کی حفاظت بھی نہیں ہوسکی جن قوالوں نے اجتماعات میں انھیں پیش کیاان کی آئندہ نسلوں تک وہ بیاضیں نہیں آسکیں یاکسی دوسرے اسباب سے ضائع ہوگئیں۔بعض نے ان کوشاعروں کی نہیں بلکہ خوداپنی ملک سمجھ کردوسروں سے چھپائے رکھا۔اورحکیموں کےمجرب نسخوں کی طرح ان کواپنے سینوں میں رکھ کرقبروں میں لے کرچلے گئے یہاں کی شاعری کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ صرف شرفا تک محدودنہیں رہی اس کی توسیع ہوکرعام پیشہ ورطبقوں تک پہنچ گئی۔ ہرپیشہ اور ہرقوم کےلوگ اس سے وابستہ ہوئے اوراچھی شاعری کےنمونے پیش کئے۔ان میں کوئی بساطی ہے،کوئی پنواڑی،کوئی درزی ہےکوئی صیقل گر،کوئی نداف ہے،کوئی پارچہ باف کوئی شاہ ہے،کوئی حجام،کوئی کاشتکار ہے،کوئی خان،کوئی

مرزا ہے،کوئی دفالی،کوئی قصاب ہےتوکوئی منہارا،توکوئی عالم ودرویش ہے،کوئی ناخواندہ وعامی۔مردوں کے ساتھ خواتین بھی اندرونِ خانہ شعر کہتی تھیں۔

ہر پیشے اور ہر برادری کی شاعری نے ادبی ذوق ومزاج کی آبیاری کی،عوام کے ذہن وافکار میں ادبی رجحانات کی جڑیں مضبوط کیں اور ماحول سازی وشخصیت آفرینی میں نمایاں حصہ لیا۔ان شاعروں نے اپنے سماج، اپنے ماحول، اپنے اہل حرفہ کے مسائل زندگی، جذبات وخیالات، مشاہدات وتاثرات، تصورات وتجربات، رسم ورواج، نفسیات وجنسیات کو بیان کیا اور معاشرہ کو آئینہ دکھایا۔اس کے نتیجہ میں شاعری کی نگارخانے میں سماج کے مختلف طبقات کے عکس درآئے ہیں۔اس لئے یہاں کی شاعری میں بڑا تنوع اور بوقلمونی اور رنگارنگی ہے۔جن کا تنقیدی جائزہ ظاہر کرتا ہے کہ ان سے بہت سی جہتیں روشن ہوتی ہیں اور ایک متوازن نگاہ نقد ونظر رکھنے والے کے سامنے کئی سماجی ومعاشی اور اقتصادی وسیاسی تہیں کھلتی ہیں۔ مگر یہ بات یادرکھنے کے لائق ہے کہ پسماندہ ذاتوں کی شاعری میں زبان وبیان کی صناعی، ملمع کاری اورعبادت آرائی کے بجائے زبان کا کھرداپن، سادگی، راست بیانی اورشعلہ گفتاری کے ساتھ زندگی کی محرومی اورناکامی کے خلاف احتجاجی لہجہ بھی ملتا ہے۔اصلاً اسی شاعری میں ہندوستان کی روح اور رچی بسی مٹی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔اور واقعتاً یہی سچی شاعری کا تمغہ پانے کی اہل بھی ہے۔ظلم وجبر اور غلامی سے انحراف اور احتجاج کے پس منظر میں اس قسم کی شاعری کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔اور اس کو تاریخیت کے عناصر کا حصہ بنا کر انسانی جہت سفر کی شناخت کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔

سید علی جواد زیدی نے مثنوی کے سلسلے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ

’’مثنوی عاشقانہ بھی ہوتی ہے اور عارفانہ بھی، رثائی بھی ہے اور مدحیہ بھی، علوم وحکمت کی بھی نمائندگی کرتی ہے اورتفسیر وحدیث وفقہ کی بھی،لغت بھی اورصرف ونحو بھی،ہجو بھی ہے اورطنز ومزاح بھی،تاریخ بھی ہے اورسیاست بھی،کلام بھی ہے اورفلسفہ بھی، ناقدانہ بھی ہےاورتقریظی بھی،مشفقانہ بھی ہےاورمعاندانہ بھی، سماج کی عکاس بھی ہے اور سماج کی ناقد بھی، مذہبی بھی ہے اورملحدانہ بھی، رندانہ وفاسقانہ بھی ہے اورزاہدانہ ومولویانہ بھی، روایت پرست بھی ہےاورروایت شکن بھی اس میں ہرمذہب اور ہرخیال کی نمائندگی ملے گی اس میں دوسری زبانوں کے خزانے ملیں گے اس میں مختلف اسالیب وبیان ملیں گے۔اس میں بچوں کا بھی ادب ملےگا اورعورتوں کا بھی،غرض یہ بجائے خود ایک انجمن ہےاورایک عالم خیال‘‘(۱۳۰)

بالکل یہی بات اعظم گڑھ کی شاعری کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے مگر اتنے اضافے کے ساتھ کہ یہاں کی شاعری زچہ گیری، عقیقہ وختنہ، شادی بیاہ، عرس وقوالی، مذہبی مناظرے، تیج تیوہار، غازی میاں کے میلے، شہرآشوب، شکایتِ روزگار، انتخابی مہم وغیرہ کے موضوعات کی وجہ سے بھی اپنے اندر بڑا موضوعاتی پھیلاؤ اور تنوع رکھتی ہے۔

اعظم گڑھ کے سخنوروں نے فن شاعری میں اردو کے ان مایۂ ناز اساتذہ سے اکتساب فیض کیا ہے جن کی زبان دانی اور حسن اصلاح کا سکہ سخن شناسوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ چند اساتذہ کے نام درج ذیل ہیں۔

مرزا داغ دہلوی، امیر مینائی، سیماب اکبرآبادی، نوح ناروی، احسن مارہروی، نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ دہلوی جانشین داغ، ناطق گلاؤٹھوی، میر ضامن جلال لکھنوی، بیخودؔ دہلوی، فصاحت لکھنوی، مولانا عبدالاحد شمشادؔ لکھنوی، میرذاکرحسین یاس لکھنوی، ریاض خیرآبای، وسیم خیرآبادی، کمال لکھنوی، سید انور حسین آرزو لکھنوی، نصرتؔ لکھنوی، رازؔ خیرآبادی، جوہرؔ شاہ جہاں پوری، فہیم گورکھپوری، نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی، ابراحسنی گنوری، بیخود کلکتوی، پرویز شاہدی، جگرؔ مرادآبادی، نشور واحدی، میر نواب مونس لکھنوی، مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، محمد ہادی عزیز لکھنوی، آغا قزلباش شاعرؔ دہلوی، ادیب مالیگانوی، احسان دانش،

اس فہرست سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں کے شاعروں نے مختلف اسالیب بیان اور رجحان طبع رکھنے والے اساتذۂ فن سے اکتساب فیض کیا ہے۔ دہلی، لکھنو، رامپور، علی گڑھ، حیدرآباد دکن، کلکتہ وغیرہ اردو کے مراکز سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اعظم گڑھ میں اصلاح کلام پر بھی کام کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ عوام کے نزدیک یہ کام جتنا آسان ہے خواص کی نظر میں اتنا ہی مشکل ہے کیونکہ اصلاح کا مفہوم صرف یہ نہیں کہ زمین سخن درست کردی جائے بلکہ اس کو بلند کر کے آسمان بنادیا جائے، علم لغت، تلفظ، تذکیروتانیث، اصولِ املا، عروض، فصاحت وبلاغت، سیاق وسباق کلام کے اعتبار سے لفظوں کا انتخاب ایک دو لفظوں کی تبدیلی سے مفہوم کی سطح کا ارتفاع، قواعد زبان، علم قافیہ، لفظوں کے قبیلے کی واقفیت، لفظوں کی تخفیف وتسہیل، مؤرد، مہند، معرب، مفرس کے ضابطہ وقانون سے آگاہی، زمانی تغیر سے مفہوم ومعنیٰ کی تبدیلی پر نظر، فصیح وبلیغ، کریہہ

وقبیح کی شناخت کا ملکہ، تاریخی بصیرت، تلمیح واستعارہ کا طریقۂ استعمال اشارات وکنایات کوزبان دینا یازبان کواشارے کارنگ وپیرہن عطا کرنا۔ادبی وفنی اورفکری وسماجی تبدیلیوں کےاثر سے بدلتی ہوئی قدروں کاعرفان ایک معلم سخن کے لئےضروری ہے۔اصلاحِ زبان کےجذبے سےخان آرزو نے جوتحریک شروع کی اس کی روایات کوآگے بڑھانے میں اس دیارِشعرونغمہ نےفنی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔رنگ سخن،صوتی جمالیات اور لہجے کی شائستگی کےعلاوہ کم سخنی وایجاز بیانی کےمعجزے سے ایسی بات کہہ دینا جس کا سراالہام سےمل جائے۔یہاں کےاساتذہ کابڑاکارنامہ ہے۔

ڈاکٹرمجاہدحسین حسینی کی روایت ہے کہ آرزؔو لکھنوی صاحب نے مجھ سے ایک نجی گفتگو میں فرمایا تھا کہ شعراءعموماًشاگرد بناتے ہیں۔مجھےفخر ہے کہ خدا کےفضل سے استاد بناتا ہوں۔(۱۳۱) یہاں کے اساتذۂ سخن نے اس روایت کواستحکام بخشا۔اوراپنی تربیت کےفیض سے تلامذہ کواستادانہ جوہر سے آراستہ کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔علامہ شبلی،شاہ نثارحسین نثار برونوی،اقبال سہیل،عبدالرفیع متین عباسی، جرم محمدآبادی، برق اعظمی،شمیم کرہانی، فضاابن فیضی، احسن سمبھی، کیفی چریاکوٹی،محمدشبلی شیدؔا خیرآبای،مولاناسیدعلی میاں کاملؔ محمدآبادی،شوکت اعظمی دیوگامی،محمدضمیرقدسیؔ مئوی،فیض الحسن فیض مئوی، مولاناغلام عباس صاحب عباسؔ مبارکپوری،مولانااسلم جیراج پوری،مولاناعبدالسلام ندوی شمیمؔ، ناطق اعظمی،اخترمسلمی،ایازاعظمی،منشی حبیب اللہ حبیبؔ مبارکپوری،محمدزماں صاحب زماںؔ مبارکپوری،ایوب مبارکپوری، وفامحمدآبادی، یہ چندوہ نام ہیں جنھوں نے اعظم گڑھ کودبستانی اندازاوررنگ سخن عطاکیا، سیدعلی جوادزیدی نے دہلی اورلکھنو کےاسکول کومفروضہ قرار دیا ہےاس موضوع پران کی کتاب بھی آچکی ہےلیکن وہ اس بات کےمعترف ہیں کہ میراخیال تھا کہ اترپردیش میں بیسویں صدی میں اگراردوکاکوئی ادبی اسکول ہوسکتا ہےتواسےعلی گڑھ اسکول یااعظم گڑھ اسکول کانام دیناہوگا۔(۱۳۲)

یہاں کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں کےشاعروں نےایک ہی کلام میں مختلف زبانوں کےمخلوط مصرعے کہے ہیں اوراس طرح کلام ذولسانی سہ لسانی یاچہارلسانی ہوگیاہے۔قوالیوں کے اکھاڑوں سے وابستہ شاعروں نےبھی اس طرح کی شاعری کی ہےانھوں نے اپنےحریف کے لئے جواب میں مشکلات پیداکرنے کےخیال سےمخلوط زبانوں کی شاعری کےتجربات کئے ہیں۔ بندہ علی شاہ، مولاناعبدالرحمٰن آزادمئوی۔مولاناشبلی خیرآبادی، اظہرحسین اظہرؔمبارکپوری، فدامحمدآبادی، مولانااحمدمکرم

عباسی، مولانا محمد اعظم عباسی جلالی چریا کوٹی، برق اعظمی، ثاقب اعظمی وغیرہ کے نام خاص طور سے لئے جا سکتے ہیں۔ یہاں پھول، چڑیا وغیرہ پر ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں تمام پھولوں کے نام، رنگ وبو اور خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ چڑیا والی نظم میں تمام چڑیوں کے نام گنائے گئے ہیں اور چڑیوں کے بارے میں دلچسپ پہلو پیش کئے گئے ہیں۔قوالی کے شاعروں کے کلام میں موضوعات کے اعتبار سے بہت تنوع ہے مقامی رنگ تمدن ومعاشرت کے علاوہ زمینی حقائق اور موسموں کے مزاج، ہندورسم ورواج،لڑائی جھگڑے، کھیل تماشے، سیاسی ووطنی تحریکوں کو بنیاد بنا کر شاعری کو زندگی کا عکاس بنایا گیا ہے البتہ زبان وبیان پر توجہ نہیں کی گئی ہے۔

ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب کوٹھے کو شعر وادب، اصلاح زبان وبیان، تہذیب وتمدن اور آداب معاشرت کی درسگاہ سمجھا جاتا تھا اور اچھے گھرانوں کے بچے شائستگی، زبان کی صفائی، برجستہ جوابی، آدابِ مجلس کی تعلیم اور مرتبہ شناسی کے لئے طوائفوں کے یہاں بھیجے جاتے تھے۔رقص وسرود کی محفلوں اور طوائفوں سے گانے سننے کے ذوق نے بھی شاعری کی راہیں ہموار کیں۔چونکہ اس زمانے کی طوائفیں زبردست شعرفہم اور ادبی شعور کی مالک ہوا کرتی تھیں۔مسلم انصاری نے لکھا ہے کہ ''نصف صدی پیشتر طوایفوں سے ربط وضبط رکھنا رئیس گھرانوں کے لئے باعثِ فخر تھا چنانچہ ریاض خیر آبادی کی طرح ولایت گورکھ پوری بھی کوٹھے والیوں سے میل جول رکھتے تھے'' (۱۳۳) مشرقی اضلاع کے علاوہ یہ شوق برصغیر تک پھیلا ہوا تھا۔صفی لکھنوی، (۱۸۶۲ء۔جون ۱۹۵۰ء) نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ ''رنڈیوں کے یہاں جانا برا نہیں ہے مگر انہیں گھر میں بٹھالینا شرفا کے نزدیک عیب ہے''

سید اعجاز حسین سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونی ورسٹی نے بھی اپنی سوانح عمری میں ایک جگہ طوائفوں سے زبان وادب اور شعر وسخن کے نکات سیکھنے کے بارے میں لکھا ہے۔طوائفوں کی زبان دانی، بلند ادبی مذاق اور شائستگی وشستہ مزاجی اپنے دور کی ایک مسلمہ حقیقت تھی۔زندہ رود میں حوالہ نمبر ۵۲ کے تحت حاشیہ میں لکھا گیا ہے کہ بقول شورش کاشمیری شرفاء طوائف کو ایک ثقافتی ادارہ سمجھ کر اس کے یہاں جاتے تھے (۱۳۴) اس لئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس دیارِ مشرق میں خصوصاً شہر اعظم گڑھ کے کوچۂ شباب و رباب قالین گنج میں ایسی طوائفیں ضرور رہی ہوں گی جن کی نواسرائیوں میں سخن سنجیاں اپنا حسن ظاہر کرتی رہی ہوں گی مگر اس بازار حسن وشباب اور محفل چنگ ورباب کے شعری آثار راقم کو نہیں مل سکے۔

اکبر کے دور سے لالہ برادری کو زمین داری کے جملہ علوم وفنون میں بڑی مہارت حاصل تھی

دفتروں، عدالتوں میں ان کا اچھا خاصا عمل دخل تھا۔ ان کا طرز معاشرت مسلمانوں سے بالکل ملتا جلتا تھا۔ وضع داری، خوش پوشی اور خوش کلامی میں اس برادری کو درجۂ تفوق حاصل تھا۔ مغلوں کے عہد سے دفتروں میں فارسی رائج تھی، ہندوستان کی پہلی تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد تک جب انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا، فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ مشرقی اضلاع میں عوام کی بولی اردو ضرور تھی مگر شرفائے علم میں اس کا رواج عام نہیں تھا۔ لالہ برادری کی شادی بیاہ کی تقریبات میں براتیوں اور گھراتیوں کے الگ الگ شعری خیمے لگ جاتے تھے اور رات میں دونوں طرف سے فارسی و اردو میں خوب خوب دادِ سخن دی جاتی تھی اور جب سوال و جواب و جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو شعر فہموں اور سخن شناسوں کے ذوقِ ادب کی سیرابی کا پورا سامان فراہم ہو جاتا۔ مسلم انصاری نے منشی سنت لال عنبر گورکھ پوری کے حوالے سے عنبر کے صاحبزادے شیوسرن لال سریواستوا کا اپنے سوال کا یہ جواب درج کیا ہے کہ

''میرے خاندان کی یہ دیرینہ روایت ہے کہ جب کسی بچہ کی ابتدائی تعلیم کا پروگرام بناتے تو ایک چھوٹی موٹی تقریب کرتے اور کسی ماہر تعلیم مولوی کی بامعاوضہ خدمات حاصل کرتے اور بچے کو تعلیم و تربیت کے لئے اس کے حوالے کر دیتے۔ ہم اور ہمارے سب بچوں کی تعلیم اسی طرح ہوئی ہے۔ (۱۳۵)

صدر اجلاس کے کاسٹنگ کے ایک ووٹ سے ہاری ہوئی اردو کا اب یہ حال کر دیا گیا ہے کہ اردو گھرانوں کی تین نسلیں لسانی حیثیت سے گونگی اور بہری ہوگئی ہیں۔ لالہ برادری کے خاندانوں میں کئی پشتوں سے جو شعری روایتیں قائم تھیں ان کی کوئی یادگار اخلاف خاندان سے فراہم نہیں ہو پاتی بلکہ زیادہ تر افراد خاندان اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ کاغذات کے انبار گانو کے تالاب یا کنویں میں ڈال کر گھر کو شدھ کر دیا گیا۔ ملازمت کے تعلق سے یہ لوگ شہروں کے باسی ہوگئے یہ بھی معدومی و مفقودی کا سبب بنا۔ ورنہ اس ضلع میں لالہ برادری کی خدمات کا قیمتی حصہ اس تذکرہ کا عنوان بنتا جس کا مرتب کو بے پناہ درد ہے اور بار بار علامہ اقبال کا یہ قول یاد آتا ہے کہ ''قومیں شاعروں کے دلوں میں جنم لیتی ہیں لیکن سیاست دانوں کے ہاتھوں نشوونما پاتی ہیں اور مر جاتی ہیں'' (۱۳۶)

واقعی ہندوستانی سیاست کے ایوانوں اور گلیاروں میں نفرت کا ماحول پیدا کرنے والوں نے اردو کی بہت سی اہم برادریوں کو اردو والوں سے چھین کر ان کے کارناموں پر گمنامی کا پردا ڈال دیا۔

اعظم گڑھ کے شہر و دیہات میں نشستوں کا بہت رواج ہے زین العابدین عابدؔ جون پور کے

تھے لیکن وکالت کی وجہ سے یہیں قیام فرماتے تھے ان کی بیاض میں کلام سنانے کا مقام اور تاریخ بھی درج ہے اس بیاض کے صفحہ ۳۵ / پر یہ عبارت ثبت ہے ''غزل مشاعرہ اعظم گڑھ شیخ حبیب اللہ صاحب وکیل واقع ۱۴ / اگست ۱۸۸۴ء یوم پنجشنبہ صفحہ ۶۱ / پر یہ مرقوم ہے ''غزل غیر طرح مشاعرہ محمد شبلی بندولی منعقدہ ۷ / ستمبر ۱۸۸۸ء مکان مولوی شبلی بندولی''

اس سے پتا چلتا ہے کہ علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ اور مولانا شبلی دونوں باپ بیٹے اپنے ذوق ادب کی تسکین کے لئے نشستوں کا اہتمام کرتے تھے۔ علامہ کے سوانح نگار و تلمیذ رشید سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ'' اردو شاعری کا تو ان دنوں عام چرچا تھا خود اعظم گڑھ میں مشاعرے کرتے، غزلیں پڑھی جاتیں واہ واہ کا شور بلند ہوتا'' (۱۳۷) اقبال سہیل کے دور میں بھی سلسلۂ نشست جاری تھا۔ افکار سہیل میں بعض واقعات کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ ماہل، نظام آباد، دیوگاؤں، سمبھی، چریا کوٹ، کوئریا پار، محمد آباد گوہنہ وغیرہ میں مختلف مواقع کی محافل ومجالس اور شعری نشستوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ عبدالرب شمیم صدیقی کی قلمی بیاض میں مقام نشست، تاریخ نشست اور مصاریع طرح کا اندراج ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعظم گڑھ میں طرحی وغیر طرحی مشاعروں اور نشستوں کا بڑا پاکیزہ رواج تھا۔ علی جواد زیدی نے اپنی سوانح ''یادوں کی رہ گزر'' میں جو بالاقساط ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ میں شائع ہوتی رہی ہے محمد آباد اور کرہاں کی شعری تقریبات کا ذکر کیا ہے۔ اس قسم کے پروگراموں میں کون کون شاعر شرکت کرتے اور کیا کیا سناتے تھے اگر اس کا بھی کچھ ذکر مل جاتا تو پردۂ گم نامی میں پڑے بہت سے شاعروں کا سراغ ملتا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ایک وہ دور بھی تھا جب محمد آباد گوہنہ اور کرہاں کے سادات گھرانے میں شاعروں کی اتنی بڑی تعداد تھی کہ صرف انھیں سے پوری رات کا مشاعرہ چلایا جاسکتا تھا۔ خورشید احمد سابق مدیر نامہ نیا دور لکھنؤ نے راقم کو کرہاں کی ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ محمد آباد اور کرہاں میں بیک وقت کل سولہ شاعر تھے جو مختلف تقاریب کے حوالے اور مختلف مواقع کی مناسبت سے شعر وسخن کے متعدد رنگ اور زاویۂ نگاہ کے شعری نمونے پیش کرنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہا کرتے تھے۔

مشرقی تہذیب کی تربیت یافتہ معاشرت میں پردے کا خاص اہتمام تھا۔ جن تعلیم یافتہ گھرانوں میں خواتین مذاق سخن سے آشنا تھیں اور شعر گوئی ان کے مزاج کا حصہ بنی ہوئی تھی وہ شعر کہہ کے اپنی پختہ شعوری کا اظہار کرتی تھیں مگر ان کے اشعار زنانخانے سے نکل کر محرموں کی بھی سماعت تک نہیں

آ پاتے تھے۔ جن گھروں کی تہذیب زنانخانے میں نرگس کے پھول کا پودا لگانا بے حیائی جانتی ہو، شادی کے جوڑے جن قینچیوں اور سوئی دھاگے کی مدد سے تیار کئے جاتے تھے ان کو اور کپڑوں کے کترن کو بھی مردوں کی نگاہ سے چھپایا جاتا ہو اس تہذیب کو کیسے یہ گوارا ہوتا کہ شاعرات کے اشعار دہلیز سے نکل کر نامحرموں کی محفلوں تک پہنچیں۔ بہنوں، گھر کی بڑی بوڑھیوں اور سہیلیوں کو ہی کسی طرح ان کا علم ہو پاتا تھا۔ لیکن ایک جرم کی طرح چھپایا جاتا تھا۔ خان بہادر نواب سر مزمل اللہ خاں شروانی رئیس بھیکم پور کی صاحبزادی زاہدہ خاتون شروانیہ (متوفیہ ۲ر فروری ۱۹۲۲ء بعمر اٹھائیس سال) نواب احمد اللہ خاں شروانی اور نواب رحمت اللہ خاں شروانی کی ہمشیرہ تھیں اردو میں شعر کہتی تھیں۔ خاتون، سخن گو، نادرہ خاتون، ز، خ، ش کے فرضی ناموں سے مشہور جریدوں جیسے زمیندار، کہکشاں، تبلیغ نسواں، مرشد، خاتون، نظام المشائخ، عصمت، ستارۂ صبح، شریف بی بی، استانی، پردہ نشیں میں چھپتی تھیں۔ یہ تھا پردے کی سخت پابندی کا احترام کہ وہ اپنا کلام اپنے اصل نام سے نہیں بھیجتی تھیں۔ مجرم عابدی صاحب نے بھی محمد آباد گوہنہ کے رئیس گھرانوں کے سلسلے میں ایک بار اسی قسم کے احوال کا ذکر فرمایا تھا۔ اس تہذیب کے نمائندہ مرد شاعر ناظم جعفری کی موت کے بعد بھی حیا کا جب یہ عالم ہے کہ

یہ سوچ سوچ کے شرمندگی سی ہوتی ہے ۔ کفن پہننے سے پہلے لباس اترے گا

اس شعر کے آئینے میں ہم شریف گھرانوں کی نسوانی حیا کے پس منظر کو بہتر طور سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس بزم تذکرہ میں اگر شاعرات کی کم نمائندگی ہے تو مرتب سے شکایت نہیں ہونی چاہئے۔

اعظم گڑھ میں جتنے شاعر ہوئے ہیں ان کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ بہت کم شاعروں کے شعری مجموعے منصۂ شہود پر آئے۔ بڑی دشواری یہ بھی ہے کہ یہ سبھی کسی ایک جگہ نہیں، مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں اور مختلف لائبریریوں کی زینت ہیں۔ جو دَوَاوِین چھپ نہ سکے ان کا انتشار بھی ہندوستان کے اہم شہروں سے گزرتا ہوا پاکستان کے مختلف مقامات تک پہنچا ہے۔ بہت سے برسات کی قہر سامانی، اخلاف کی ناقدردانی اعلیٰ گھرانوں کی نقل مکانی، حالات کی ستم رانی اور بعد کی نسلوں کی اردو سے ناواقفیت کے نتیجے میں ضائع ہو گئے۔ جو مخطوطہ کی شکل میں ہیں ان میں سے سب کا علم نہیں اور جن کا علم ہو سکا ہے راقم کے محدود وسائل ان سے استفادہ میں رکاوٹ ہیں۔ دہلی، رام پور، لکھنؤ، بنارس، علی گڑھ، پٹنہ، حیدرآباد، بھوپال، کلکتہ اور بمبئی کی لائبریریوں میں بہت کچھ خزانہ ہوگا لیکن موجودہ حالت میں

وہاں تک رسائی بھی ممکن نہیں ہے۔ پرانے اخباروں، رسالوں، دینی مدارس کے ترجمانوں میں بھی بہت ہیرے موتی ہیں راقم ان کا خواب تو دیکھ سکتا ہے مگر ان کی تعبیر کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔

اس سچائی کے باوجود یہ دعویٰ تو ضرور کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں جتنے شاعروں کا تذکرہ آیا ہے وہ کسی ایک کتاب میں یکجا نہیں مل سکتا۔ بعض تو بالکل نئی تحقیق کے زمرے میں ہیں۔ اس نقش اول میں مختلف نوعیت کی خامیاں اور کمیاں بھی ہیں جن کا راقم کو شدت سے احساس ہے، کہیں حالات ہیں تو کلام نہیں، کلام ہے تو حالات نامعلوم، بہتوں کی ولادت و وفات کا اندراج نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تاریخ وسنہ بھی ہزاروں احتیاط کے باوجود صحیح نہ ہوں۔ یہ سب آئندہ کی تحقیق اور اہل علم کی توجہ ارزانی کے لئے اٹھا رکھا گیا ہے۔ کیونکہ بقول کالیداس گپتا رضا" مگر حق یہ ہے کہ ان حضرات میں سے بیشتر پر اگر اتنا بھی نہ لکھا جاتا تو گویا اب ان کا کوئی نام لیوا ہی نہ رہ جاتا" (۱۳۸) واقف کاروں خصوصاً اہل خاندان اور متعلقین کی رہ نمائی سے اگر کوئی نئی بات ہوئی تو وہ راقم کے لئے باعث شکریہ ہوگی۔

حواشی:

(۱) روزنامہ انقلاب، وارانسی ایڈیشن ۱۱ر مئی ۱۹۱۴ء
(۲) داستان تاریخ اردو اور یوپی کے مشرقی اضلاع کے کچھ اہل قلم۔ مشمولہ افکار السہیل، مرتبہ شوکت سلطان، علی حماد عباسی ص ۸۶
(۳) حیات شبلی۔ سید سلیمان ندوی، ۱۹۹۳ء ص ۵۴ و اعظم گڑھ گزیٹر ۱۹۳۵ء ص ۳۹
(۴) تراجم علماء حدیث ہند۔ ابو یحییٰ نوشہروی۔ ناشر الکتاب انٹرنیشنل نئی دہلی ص ۳۴۲
(۵) دیار پورب میں علم اور علماء۔ قاضی اطہر مبارک پوری طبع دوم ۲۰۰۹ء ص ۴۹۰
(۶) مومن اصاری برادری کی تہذیبی تاریخ۔ مومن محی الدین۔ مارچ ۱۹۹۴ء ص ۸۵۹
(۷) تجلی نور۔ نورالدین زیدی ظفر آبادی ص ۹۲۔ ۹۳
(۸) دانش مرحوم نے راقم کو اعظم گڑھ کی ایک ملاقات میں یہ بات بتائی تھی
(۹) حکمت بالغہ جلد دوم
(۱۰) روداد دارالعلوم قادریہ چریا کوٹ ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۸۹ء ص ۴۔ ۵
(۱۱) دیار پورب میں علم اور علماء، مقدمہ طبع اول ۱۹۷۹ء ص ۱۸، طبع دوم ۲۰۰۹ء ص ۴۶
(۱۲) تاریخ اقلیم ادب حصہ دوم مطبوعہ ۱۹۸۰ء ص ۶۵

(۱۳) افکار سہیل۔شوکت سلطان۔علی حماد عباسی۔مطبوعہ اگست ۱۹۵۷ء ص ۸۵
(۱۴)اردو کا ابتدائی زمانہ شمس الرحمٰن فاروقی ص ۱۱۸)
(۱۵)ایضاً
(۱۶) مقالات شیرانی دوم ص ۹۶۔۹۷ بحوالہ اردو کا ابتدائی زمانہ ص ۱۱۸
(۱۷)دیباچہ طبقات شعرائے ہندا کاڈمی ایڈیشن ۱۹۸۳ء یو پی اردو اکیڈمی لکھنؤ)
(۱۸)(محمود الٰہی۔مقدمہ طبقات شعرائے ہند تالیف کریم الدین یو پی اردو اکیڈمی لکھنؤ ایڈیشن ۱۹۸۳ء)
(۱۹)(مشائخ جین پور۔مشمولہ ماہنامہ برہان دہلی۔مئی ۱۹۸۴ء ص ۲۶۴)
(۲۰) لطائف اشرفی اردو جلد اول،مترجم مولانا عبدالحق پرتاب پوری،باردوم ۱۹۹۰ء ص ۳۲
(۲۱) احوال وافکار۔مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی مطبوعہ دسمبر ۲۰۰۹ء ص ۱۵
(۲۲) ایضاً ص ۲۰
(۲۳) ایضاً ص ۲۲
(۲۴)(محمد پور گاؤں عہد رفتہ سے)خان محمد صادق خان
(۲۵) ذکر فراہی۔شرف الدین اصلاحی دائرۂ حمیدیہ سرائمیر ۲۰۰۱ء ص ۸۲۳
(۲۶) حیات شبلی۔سید سلیمان ندوی مطبوعہ ۱۹۹۳ء اعظم گڑھ ص ۶۷
(۲۷) اردو کی تشکیل اور دیگر متعلقہ امور،رؤف پاریکھ مشمولہ روزنامہ انقلاب وارانسی ایڈیشن ۱۴ر ستمبر ۲۰۱۴ء ص ۸
(۲۸) اردو کا ابتدائی زمانہ۔شمس الرحمٰن فاروقی۔طبع دوم مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۱ء ص ۱۶
(۲۹) تاریخ اقلیم ادب،اول محمد انصار اللہ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۷۹ء ص ۹
(۳۰) تاریخ زبان وادب اردو،اول۔محمد انصار اللہ ص ۱۸
(۳۱) اردو کی تشکیل اور دیگر متعلقہ امور۔رؤف پاریکھ مشمولہ روزنامہ انقلاب وارانسی ایڈیشن ۱۴ر ستمبر ۲۰۱۴ء ص ۸
(۳۲) تاریخ اقلیم ادب اول محمد انصار اللہ مطبوعہ ۱۹۷۹ء ص ۹)
(۳۳)اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔مولوی عبدالحق۔انجمن ترقی اردو ہند دہلی مطبوعہ ۱۹۷۹ء جدید ایڈیشن ص ۸)
(۳۴) اردو انسائیکلو پیڈیا جلد اول۔فضل الرحمٰن،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی طبع دوم ۲۰۱۰ء ص ۴۵
(۳۵) تاریخ اقلیم ادب اول۔محمد انصار اللہ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۷۹ء ص ۸
(۳۶)اردو کا ابتدائی زمانہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۱ء دیباچہ ص ۹)
(۳۷) تاریخ زبان وادب اردو،اول۔محمد انصار اللہ مطبوعہ دہلی ۲۰۱۲ء
(۳۸)اتر پردیش کے لوک گیت پہلا ایڈیشن ۱۹۸۱ء دہلی ص ۸۶)

(۳۹) ایضاً ص ۸۷
(۴۰) تاریخ زبان وادب اردو، اول۔ محمد انصار اللہ مطبوعہ دہلی ۲۰۱۲ء ص ۱۲
(۴۱) ایضاً ص ۲۵
(۴۲) (نوادرالالفاظ۔ سراج الدین علی خاں آرزو، مرتبہ سید عبداللہ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی ۱۹۹۲ء (۱۹۵۱ء) ص ۲۱۴ بحوالہ اردو کا ابتدائی زمانہ۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۰۱۱ء ص ۱۸)
(۴۳) تاریخ زبان وادب اردو، اول۔ محمد انصار اللہ، مطبوعہ دہلی ۲۰۱۲ء ص ۱۲
(۴۴) (ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۲۰۱۴ء ص ۲۲)
(۴۵) علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد ا ص ۱۳۳
(۴۶) دکنی اردو، عبدالستار دلوی طبع اول ۱۹۸۷ء مقدمہ ص ۸)
(۴۷) ترقی اردو بیورو نئی دہلی مطبوعہ ۱۹۸۵ء ص ۳۶
(۴۸) ایضاً ص ۳۷
(۴۹) دکنی زبان۔ عبدالقادر سروری مشمولہ دکنی اردو، مرتبہ عبدالستار دلوی ۱۹۸۷ء ص ۳۲۹ تا ۳۳۲ سے مستفاد)
(۵۰)(اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، مولوی عبدالحق، اشاعت ۱۹۷۹ء دہلی ص ۱۹۔ ۲۰ / اپنے لفظوں میں)
(۵۱) خزینۃ الاصفیا۔ غلام سرور لاہوری ص ۲۶۲
(۵۲) سوانح وملفوظات حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، مطبوعہ آزاد پریس دہلی ص ۵۴
(۵۳) تذکرہ مشائخ بنارس۔ مفتی عبدالسلام نعمانی، طبع پنجم ۲۰۱۳ء
(۵۴) دیار پورب میں علم اور علماء۔ قاضی اطہر مبارک پوری بار دوم ۲۰۰۹ء ص ۲۳۱۔ ۲۳۲ ملخصاً
(۵۵) ایضاً طبع اول ۱۹۷۹ء ص ۲۱۸
(۵۶) خیرالمجالس۔ حمید قلندر، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ص ۱۹۱ بحوالہ تاریخ زبان وادب اردو اول ص ۱۰۱
(۵۷) اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، مولوی عبدالحق۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۷۹ء ص ۱۵
(۵۸) تاریخ زبان وادب اردو حصہ اول حاشیہ ا ص ۱۳۹
(۵۹) بحر ذخار، فصل اول، موج اول (قلمی) بحوالہ احسن الانساب بنوالعباس چریا کوٹ (قلمی) محمد نبی عباسی
(۶۰) اتر پردیش کے لوک گیت۔ اظہر علی فاروقی ص ۱۰۳۔ ۱۰۴ ملخصاً
(۶۱) تاریخ زبان وادب اردو، اول، محمد انصار اللہ۔ طبع اول دہلی ۲۰۱۲ء ص ۱۶۷
(۶۲) دیار پورب میں علم اور علماء، قاضی اطہر مبارک پوری، طبع اول دہلی ۱۹۷۹ء ص ۳۵
(۶۳) علمائے چریا کوٹ، معتصم عباسی آزاد، مشمولہ سہ ماہی اسلام اور عصر جدید نئی دہلی اپریل ۱۹۷۳ء ص ۴۰

(۶۴) بحرِ ذخار، وجیہہ الدین اشرف وخزینۃ الاصفیا مولانا غلام سرور لاہوری
(۶۵) علمائے چریا کوٹ معتصم عباسی آزاد مشمولہ سہ ماہی اسلام اور عصر جدید نئی دہلی اپریل ۱۹۷۳ء ص ۷۳
(۶۶) پنجاب میں اردو۔محمود شیرانی ،فوٹو آفسیٹ ایڈیشن ۱۹۸۲ء حاشیہ ص ۵
(۶۷) دیار پورب میں علم اور علماء، قاضی اطہر مبارک پوری ص ۲۹
(۶۸) دیار پورب میں علم اور علماء۔قاضی اطہر مبارک پوری طبع اول ۱۹۷۹ء ص ۲۱۴ وطبع دوم ۲۰۰۹ء ص ۲۳۳
(۶۹) حیات شبلی سید سلیمان ندوی مطبوعہ ۱۹۹۳ء حاشیہ ص ۹
(۷۰) تذکرۂ مشائخ بنارس، مفتی عبدالسلام نعمانی، طبع پنجم ۲۰۱۳ء ص ۲۷، اضافہ مفتی عبدالباطن نعمانی
(۷۱) اردو انسائیکلوپیڈیا جلد اول، فضل الرحمٰن، کاؤنسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ص ۲۹۰
(۷۲) مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے فیروز شاہ تغلق کی وفات ۷۹۹ھ میں بتائی ہے (دیار پورب میں علم اور علماء ص ۳۵)
(۷۳) معاصر حصہ ۷ا بحوالہ تاریخ زبان وادب اردو، اول، محمد انصار اللہ، ۲۰۱۲ء ص ۱۷۷
(۷۴) تذکرہ صبح وطن، نواب محمد غوث خاں، مطبع کشن راج مدراس ۱۲۵۹ھ ص ۵۷
(۷۵) دیار پورب میں علم اور علماء طبع اول ص ۶۶ (۴
(۷۶) تاریخ زبان وادب اردو۔محمد انصار اللہ۔طبع اول ۲۰۱۲ء ص ۱۷۳)
(۷۷) تذکرۂ مشائخ بنارس۔مفتی عبدالسلام نعمانی ص ۲۵)
(۷۸) ایضاً ص ۴۴
(۷۹) تاریخ زبان وادب اردو، محمد انصار اللہ طبع اول ۲۰۱۲ء ص ۲۷
(۸۰) دیار پورب میں علم اور علماء، قاضی اطہر مبارک پوری، طبع اول ۱۹۷۹ء ص ۱۷۱، طبع دوم ۲۰۰۹ء ص ۱۹۰
(۸۱) ایضاً ص ۴۸
(۸۲) دیار پورب میں علم اور علماء قاضی اطہر مبارک پوری طبع اول ۱۹۷۹ء ص ۱۸۰ ونزہۃ الخواطر۔ عبدالحیٔ لکھنوی ج ۳ ص ۶۹ وسہ ماہی شیراز ہند جونپور جولائی تا ستمبر ۲۰۱۴ء ص ۷۴)
(۸۳) دیار پورب میں علم اور علماء، قاضی اطہر مبارک پور، طبع اول ص ۲۱۶ تا ۲۱۸ ملخصاً)
(۸۴) تاریخ زبان وادب اردو اول محمد انصار اللہ طبع اول ۲۰۱۲ء ص ۲۶۹
(۸۵) تذکرہ مشائخ بنارس مفتی عبدالسلام نعمانی، طبع پنجم ۲۰۱۳ء ص ۳۳)
(۸۶) پنجاب میں اردو، محمود شیرانی، فوٹو آفسیٹ ایڈیشن ۱۹۸۲ء ص ۱۱۶
(۸۷) اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۷۹ء ص ۲۸)
(۸۸) دیار پورب میں علم اور علماء، قاضی اطہر مبارک پوری، طبع اول ۱۹۷۹ء ص ۲۸۸۔۲۸۹

(۸۹) تاریخ زبان وادب اردو اول، محمد انصار اللہ ص ۲۸۱
(۹۰) مکتوب محمد شمیم خاں محمد پوری بنام ڈاکٹر حبیب اللہ مورخہ ۲۸ر جولائی ۲۰۰۹ء
(۹۱) اردو انسائیکلو پیڈیا۔ فضل الرحمٰن کاؤنسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ص ۲۹۰)
(۹۲) پنجاب میں اردو، محمود شیرانی، فوٹو آفسیٹ ایڈیشن ۱۹۸۲ء ص ۱۵۶
(۹۳) معاصر حصہ ۴ ص ۹۲ بحوالہ تاریخ زبان وادب اردو، اول، محمد انصار اللہ، دہلی، ۲۰۱۲ء ص ۲۲۲
(۹۴) ایضاً ص ۹۳ بحوالہ سابق ص ۲۲۳
(۹۵) ایضاً ص ۹۳ بحوالہ سابق ص ۲۲۳
(۹۶) ایضاً ص ۹۵ بحوالہ سابق ص ۲۲۳
(۹۷) دیار پورب میں علم اور علماء، قاضی اطہر مبارک پوری، طبع اول ۱۹۷۹ء، حاشیہ ص ۱۷۱
(۹۸) جامع الکلم صوفی عبدالنبی شطاری قلمی نسخہ ص ۱۰۴۰ مملوکہ محمد شمیم خاں محمد پور اعظم گڑھ بحوالہ تذکرہ مشائخ بنارس عبدالسلام نعمانی طبع پنجم ۲۰۱۳ء ص ۱۱۴۔ ۱۱۵ سے مستفاد)
(۹۹) رسالہ عاشقیہ (قلمی) شیخ عارف، حقیقت (۶۵) ص ۱۲۳، از مکتوب محمد شمیم خاں محمد پوری بنام راقم مورخہ ۲۲راگست ۱۹۹۳ء
(۱۰۰) تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیائے جون پور، سید اقبال احمد جون پوری، طبع اول جنوری ۱۹۸۸ء ص ۲۰۶
(۱۰۱) پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی، پہلا عکسی ایڈیشن لکھنؤ ۱۹۸۲ء ص ۱۷۶ تا ۱۷۸ کی تلخیص)
(۱۰۲) پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی، پہلا فوٹو آفسیٹ ایڈیشن ۱۹۸۲ء ص ۱۱۴
(۱۰۳) دیار پورب میں علم اور علماء، قاضی اطہر مبارک پوری ص ۶۵
(۱۰۴) پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی، فوٹو آفسیٹ ایڈیشن ۱۹۸۲ء ص ۱۱۹ وحیات شبلی ص ۵۴
(۱۰۵) حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، مطبوعہ ۱۹۹۳ء ص ۵۴
(۱۰۶) تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیائے جون پور، جنوری ۱۹۸۸ء ص ۱۰۷)
(۱۰۷) پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی، فوٹو آفسیٹ ایڈیشن ۱۹۸۲ء ص ۱۱۴
(۱۰۸) ایضاً ص ۱۱۹
(۱۰۹) بحوالہ اردو کا ابتدائی زمانہ ص ۴۸، ۴۹)
(۱۱۰) دکنی اردو۔ عبدالستار دلوی، مقدمہ ص ۱۲
(۱۱۱) بحوالہ اردو کا ابتدائی زمانہ) ص ۵۱)
(۱۱۲) بحوالہ ایضاً ص ۵۰)
(۱۱۳) ایضاً ص ۵۹ اور اسی کتاب کا باب دوم حاشیہ ۶ ص ۴۱)

(۱۱۴) دکنی اردو۔عبدالستار دلوی ۱۹۸۷ء ص ۱۰)
(۱۱۵)اتر پردیش کے لوک گیت ۔۱۹۸۱ء اطہر علی فاروقی ص ۲۳۵)
(۱۱۶) مئو،شہر ہنروراں ۔ڈاکٹر شکیل احمد،مطبوعہ ۲۰۱۲ء ص ۲۲۶
(۱۱۷) مئوشہر ہنروراں ۔ڈاکٹر شکیل احمد مطبوعہ ۲۰۱۲ء ص ۲۲۵)
(۱۱۸) عبدالسلام ندوی ایک مطالعہ،کبیر احمد جائسی ص ۱۱
(۱۱۹) تاریخ اقلیم ادب اول،محمد انصاراللہ ص ۶۱
(۱۲۰) تاریخ زبان وادب اردو،محمد انصاراللہ،طبع اول دہلی ۲۰۱۲ء،ص ۴
(۱۲۱) اتر پردیش کے لوک گیت،اظہر علی فاروقی،طبع اول دہلی ۱۹۸۱ء ص ۲۱۰
(۱۲۲) اوپر کی دونوں کتابوں اور دوسری تحریروں میں بھوجئی کی جگہ گنگوا تیلی درج ہے جو درست نہیں۔رشید حسن خاں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے
(۱۲۳) اتر پردیش کے لوک گیت،اظہر علی فاروقی،طبع اول دہلی ۱۹۸۱ء ص ۲۱۲
(۱۲۴) بھوج پوری ادب کا تعارف،فضل امام رضوی ص ۱۵ بحوالہ عام لسانیات،گیان چند جین ص ۸۶۷
(۱۲۵) عام لسانیات،گیان چند جین،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی ۱۹۸۵ء ص ۷۰
(۱۲۶) دبستان گورکھ پور،مسلم انصاری،مطبوعہ ۱۹۹۷ء ص ۱۶۳
(۱۲۷) تذکرۂ مشاہیر کوپا گنج،محمد عثمان معروفی ص ۲۵،۲۶
(۱۲۸) مئو۔شہر ہنروراں ڈاکٹر شکیل احمد ص ۳۳
(۱۲۹) اتر پردیش کے لوک گیت،اظہر علی فاروقی،طبع اول دہلی ۱۹۸۱ء ص ۲۶۳
(۱۳۰) مثنوی نگاری،علی جواد زیدی،طبع اول ۱۹۸۴ء ص ۲۵
(۱۳۱) اجالے کا سفیر،قسیم اعظمی ص ۸
(۱۳۲) افکار سہیل،شوکت سلطان،علی حماد عباسی،مطبوعہ اگست ۱۹۵۷ء ص ۲۳
(۱۳۳) دبستان گورکھ پور،مسلم انصاری،مطبوعہ ۱۹۹۷ء ص ۵۲۸۔۵۲۹
(۱۳۴) زندہ رود،جاوید اقبال،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۴ء حاشیہ ص ۲۲۳
(۱۳۵) دبستان گورکھ پور،مسلم انصاری،مطبوعہ ۱۹۹۷ء ص ۳۳۳
(۱۳۶) زندہ رود،جاوید اقبال،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۴ء ص ۲۳۲
(۱۳۷) حیات شبلی،سید سلیمان ندوی،مطبوعہ ۱۹۹۳ء ص ۹۸۔۹۹
(۱۳۸) ماہنامہ آجکل،دہلی،فروری ۱۹۸۳ء ص ۴۳

آثم ۔مولوی سید محمد محمد آبادی

۱۲۵۵ھ ـــــ ۴؍شعبان ۱۳۲۶ھ سہ شنبہ

فقہ جعفریہ کے مشہور عالم سید احمد علی مجتہد (۱۲۰۶ھ۔۱۷؍ربیع الاول ۱۲۹۵ھ) کے خلف رشید اور علی میاں کامل (۱۸؍ذی الحجہ ۱۲۵۱ھ۔۲۸؍ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ/ ۳؍فروری ۱۹۰۵ء) کے برادر تھے۔عربی و فارسی علوم میں لیاقتوں کے مالک ہونے کے ساتھ اردو اور فارسی میں نغز گوئی کی روایت سخن کو بھی آگے بڑھاتے تھے اگرچہ لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی مگر اپنے وطن محمد آباد گوہنہ میں سکونت پزیر رہے۔اور حکمت و طبابت کو بطور معاش اختیار فرمایا تھا۔اچھی لیاقتوں اور ادبی بصیرتوں کے حامل تھے۔اپنے علم و فضل کی وجہ سے شرفا میں عزت و احترام رکھتے تھے۔۷۱ برس کی عمر میں وفات پائی۔صفی لکھنوی نے فارسی میں قطعۂ تاریخ موزوں کیا تھا جو محمد آباد گوہنہ کے قبرستان میں ان کی لوح مزار پر کندہ ہے۔آخری شعر جس سے ہجری مادۂ تاریخ برآمد ہوتا ہے یوں ہے۔

مصرع تاریخ فوتش ریخت از کلک صفیؔ ۔ مولوی سید محمد رفت ازیں دارِ سپنج (۱۳۲۶)

یہ تاریخ گوئی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔زبان و بیان پر عبور تھا۔جو کچھ کہتے سوچ سمجھ کر اور علمی و فنی انداز میں کہتے تھے۔ان کا غیر مطبوعہ دیوان مرتب صورت میں اخلاف کے پاس موجود ہے۔سید علی جواد زیدی کا بیان ہے کہ اس میں دو فارسی اور دو اردو قصیدے ہیں، فارسی قصائد میں ایک قصیدہ واجد علی شاہ کی مدح میں ہے اردو میں ایک قصیدہ حضرت علی کی مدح میں اور دوسرا ملکہ وکٹوریہ کی ساٹھ سالہ جوبلی منعقدہ ۲۱؍جون ۱۸۹۷ء کے موقع پر لکھا گیا تھا۔واضح ہو کہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے ملکہ وکٹوریہ کو انتقال اقتدار کا جشن بڑی شان وشوکت کے ساتھ منایا گیا تھا۔(۱) ملکہ وکٹوریہ ۲۴؍مئی کو پیدا، ۲۰؍جون ۱۸۳۷ء کو تخت نشین، یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو قیصرۂ ہند بنیں، ۲۰؍جون ۱۸۸۷ء کو اول جوبلی جشن ہوا۔(۲)

آثم کے خیالات میں گہرائی ہے اور ان کو شعر گوئی کا اچھا سلیقہ معلوم ہے، انہوں نے عام روش سے ہٹ کر اپنی فکری بلندی کے سہارے شاعری میں نئے امکانات روشن کرنے کی

کوشش کی ہے۔ راقم نے مختلف قبروں پر ان کے مادہ ہائے تاریخ دیکھے ہیں۔ انہوں نے مولانا جان محمد مبارک پوری کا جو مادۂ وفات فارسی میں لکھا ہے وہ قبرستان شاہ کے پنجہ میں نصب ہے۔

راقم کو ذیل کا قصیدہ، سلام اور غزل سید علی جواد زیدی کی کرم فرمائیوں سے حاصل ہوئی ہے ان کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل ہے۔ آثم نے قصائد میں زور بیان وزورِ تخیل سے نئے در کھولے ہیں۔ ان کے یہاں عجز بیان نہیں ہے۔ لفظوں کا ذخیرہ ان کی دسترس میں ہے جس لفظ کو جہاں چاہتے ہیں رکھ دیتے ہیں اور پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ یہی اس کا اصل مقام ہے۔ ان کی ذہنی جودت اور فکری پرواز مضامین کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتی ہے اور موتی کی طرح لفظوں کی لڑیوں میں پرو دیتی ہے۔ ان کے سلام میں غزل کا رنگ شامل ہے یوں بھی سلام میں غزلیہ رنگ وآہنگ کا ہونا عام سی بات ہے۔ غزل کی ریزہ کاری سے سلام کو فائدہ پہنچا ہے۔

غزلوں میں آثمؔ نے طرز قدیم باقی رکھی ہے اور قدماء کا احترام کیا ہے۔ ان کے اسلوب و انداز میں اپنی روایات کے ذخیرے سے استفادہ کرنے کی زبردست خواہش موجود ہے انہوں نے اپنی شاعرانہ طبیعت کے بھی جوہر دکھائے ہیں۔ لفظوں میں روانی، مضمون میں نازک خیالی، زبان میں گھلاوٹ، انداز میں برجستگی و بے ساختگی ان کے غزل کے حسن کو دوبالا کر رہی ہے۔

نمونۂ کلام

یداللّٰہی سے ثابت منزلت ہے دست حیدر کی — بڑھا پائے مبارک کا شرف دوشِ پیمبر سے
لقب ہے بوتراب اس واسطے مشہور دنیا میں — زمیں باتیں کیا کرتی تھی اکثر شب کو حیدر سے
ملی زوجہ وہ جس کا مرتبہ قرآں سے ثابت ہے — عبارت آیۂ تطہیر ہے، زہرا کی چادر سے
کرم سے یا علی تیرے، ہراک سائل ہے مستغنی — نکلتا ہے گدا منھ پھیر کر باب تونگر سے
تمنا ہے علی کے روضۂ اقدس پہ جب پہنچوں — سنوں آواز طبتم فادخلواھا حلقۂ در سے
آج کس بات کی شادی ہے تہ چرخ کہن — تہنیت کی جو صدا ہند سے پہنچی لندن (۳)

قصیدہ

ولادت سے علی کی کیا شرف کعبہ نے پایا ہے — یہ وہ گھر ہے خلیل اللہ نے جس کو بنایا ہے
رجب کی تیرھویں کا ذکر لکھنا ہے مگر اس کو — قلم کوثر کے پانی سے زباں کو دھو کے آیا ہے

لبالب کر دے ساقی بادۂ اطہر سے ساغر کو ہوا چلتی ہے ٹھنڈی، میکدے پر ابر چھایا ہے
رہے آباد میخانہ، رہے گردش میں پیمانہ مبارک میکشو! خم لے کے ساقی آج آیا ہے
عرب کی سرزمیں کو جہل سے طاہر کیا اس نے اسی مولود نے رسم و رواج کفر اٹھا یا ہے

سلام

تمنا ہے، مری فریاد بھی اک دن رسا ہوکر خدا کے عرش تک پہنچے غریبوں کی دعا ہوکر
کیا ہے کارِ صیقل اس پہ خونِ گرمِ مشرک نے چمک پیدا ہوئی تیغِ دو پیکر میں جلا ہوکر
زیارت سے نجف کی ہو کے فارغ یہ ارادہ ہے کروں قصدِ خراساں، کاظمین و کربلا ہوکر
قیامت تھی حرم سے رخصتِ ماہ بنی ہاشم چلے جس دم علم دارِ شہِ کرب و بلا ہوکر
یہ کل کی بات ہے آثمؔ کو میخانے میں دیکھا تھا سنا ہے آج کعبہ کو چلا ہے پارسا ہوکر

غزل

خزاں کے جور سے باندھے ہوئے منقار بیٹھے ہیں نوا سنجان گلشن مثل ماتم دار بیٹھے ہیں
توقف اک ذرا لازم ہے تم کو قافلے والو اجل سے مل کے ہم آتے ہیں بس تیار بیٹھے ہیں
نہ نکلے آشیاں سے بے محابا بلبلِ شیدا کمیں گاہوں میں صیادانِ بد کردار بیٹھے ہیں
گئی پیری کے آنے سے وہ اب غفلت جوانی کی اجل سے کہہ دو اب آئے کہ ہم ہشیار بیٹھے ہیں
فلک نے کردیا معمورۂ دنیا کو ویرانہ خرابی کا زمانہ ہے، در و دیوار بیٹھے ہیں
تماشا دید کے لائق ہے ہنگامہ ہے گلشن میں بہار آئی ہے، دیوانے سر دیوار بیٹھے ہیں
نہ اتنا خاکساروں کو ستائے کہہ دو گردوں سے لیے سینے میں ہم بھی آہِ آتش بار بیٹھے ہیں
کبھی خالی نہ دیکھا میکدے کو بادہ خواروں سے گئے جب چار پی کر، چار آئے، چار بیٹھے ہیں
قفس کے رہنے والوں کو تعلق کیا نشیمن سے ہوئی مدت کہ ہم چھوڑے ہوئے گلزار بیٹھے ہیں
ہوس جینے کی اب باقی نہیں گردوں کے ہاتھوں سے اجل آئے کہیں، مرنے پہ ہم تیار بیٹھے ہیں
اذیت سے نہیں خالی، زمانے میں جسے دیکھا جہاں گل تھے وہاں پہلو میں دو اک خار بیٹھے ہیں
تاسف کیوں ہے اپنے حال پر اتنا مجھے آثمؔ جو کامل ہیں زمانے میں وہی بیکار بیٹھے ہیں

حواشی:

(۱) تلاش وتعارف۔حنیف نقوی۔پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ءص ۱۷۱

(۲) فرہنگ آصفیہ۔سیداحمد دہلوی ج ۴ ص ۴۰۳

(۳) حیات وکلام قصیدہ نگاران اتر پردیش۔علی جواد زیدی۔باردوم ۱۹۸۳ء

آثمؔ-مولانا علی ارشاد نجفی مجتہد مبارک پوری

۱۱رذیقعدہ ۱۳۴۵ھ/ ۲۱؍مارچ ۱۹۲۶ء ـــــ ۱۳رمحرم ۱۴۰۸ھ/ ۸رستمبر ۱۹۸۷ء

مولانا علی ارشاد نجفی ابن مولانا علی حماد ابن مولانا علی سجاد محلہ شاہ محمد پور نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر اپنے والد ماجد سے پائی۔مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے احیاء العلوم میں داخل کیے گئے اس کے بعد انھوں نے مدرسہ باب العلم مبارک پور قائم شدہ ۲۱؍مارچ ۱۹۲۹ء/ ۹رشوال ۱۳۴۷ھ میں درجہ ششم میں داخلہ لیا۔ مدرسہ کے داخلہ رجسٹر کے اندراج کے مطابق ۱۰؍اپریل ۱۹۴۰ءکو آپ کا داخلہ درجۂ ششم میں ۱۲؍برس کی عمر میں ہوا۔اس حساب سے آپ کی ولادت ۱۹۲۸ء میں قرار پاتی ہے مگر مولانا نے خود مجھ سے اپنی ولادت ۱۹۲۷ء میں بتائی تھی۔جب کہ ان کے لڑکے مولانا احسان عباس قمی مبارک پوری نے ریکارڈ دیکھ کر ۱۹۲۶ء لکھی ہے۔ایک سال کے بعد ۱۳؍مارچ ۱۹۴۱ءکو بغرض تعلیم مدرسہ ناصریہ جون پور تشریف لے گئے۔وثیقہ عربی کالج فیض آباد میں بھی نصاب تعلیم کی تحصیل کی۔جامعہ جوادیہ بنارس کے اساتذہ سے کسب فیض کر کے فخر الافاضل کی سند ۱۹۴۸ء میں حاصل کی ۱۹۴۹ء میں حوزۂ علمیہ نجف اشرف عراق میں داخل درس ہوکر ماہرین علوم اسلامیہ سے استفادہ کیا اور ۱۹۵۴ء میں سند اجتہاد کے مستحق قرار پائے۔درس نظامی کے علاوہ آپ نے جوادیہ میں رہ کر ۱۹۴۲ء میں مولوی، ۱۹۴۳ء میں عالم الہ آباد بورڈ اور ۱۹۴۶ء میں دبیر کامل لکھنؤ یونیورسٹی کے امتحانات بھی پاس کیے اور ۱۹۴۹ء میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے فاضل الطب کی اعلیٰ سند حاصل کی۔

زمانۂ قدیم یعنی میاں صاحب جان محمد متوفی ۱۹؍ربیع الاول ۱۲۹۵ھ سے مولانا کا خاندان علم وعلماء کا مرکز اور حکمت وطبابت کا گہوارہ ہے۔یہ خاندان مبارک پور میں خاندان واحدی کے نام سے مشہور ہے۔اس کے مورث اعلیٰ میاں جی عبدالواحد ابن میاں صاحب جان محمد محلہ شاہ محمد پور

کے رہنے والے تھے اس خاندان کی خصوصیات میں یہ ہے کہ علم الادیان اور علم الابدان کی روایتیں چھ پشتوں تک قائم رہیں۔ اس روایت کا اختتام مولانا حکیم سلمان احمد مبارک پوری (ستمبر ۱۹۳۵ء۔ ۲۷؍مارچ ۱۹۸۳ء) کی ذات پر ہوا۔ میاں جی عبدالواحد عالم دین ہونے کے علاوہ طبیبِ حاذق بھی تھے۔ ان کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں ابھی حال تک قلمی کتابیں موجود تھیں جو امتدادِ زمانہ کا شکار ہوتی گئیں۔ اس خانوادۂ علمی کے ارکان اپنی علمی وجاہت وصلاحیت کو پردۂ خفا میں رکھتے تھے۔ جو بھی خدمات تھیں انھیں صلہ وستائش سے بے پروا ہو کر انجام دیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کے نام اور کام پر گم نامی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مولانا کے اسلاف کی ایک فہرست پیش کر دی جائے۔ میاں صاحب جان محمد عرف بڑے مولانا متوفی ۱۹؍ربیع الاول ۱۲۹۵ھ، مولانا حکیم عبدالواحد ابن میاں صاحب جان محمد متوفی ۲۵؍ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۴؍مارچ ۱۹۰۴ء، مولانا محمد ابراہیم بن مولانا عبدالواحد متوفی ۴؍ربیع الاول ۱۳۱۴ھ، میاں صاحب حکیم یار علی بن عبدالواحد متوفی ۱۳؍صفر ۱۳۳۸ھ مطابق ۶؍نومبر ۱۹۱۹ء، مولانا حکیم علی سجاد بن حکیم مولانا یار علی (۱۳۰۵ء۔ ۱۳۸۶؍۱۹۶۷ء) مولانا حکیم علی حماد بن مولانا علی سجاد (۱۳۲۵ھ؍۱۹۰۷ء۔ ۱۳۷۳ھ؍۱۹۵۴ء)، مولانا علی ارشاد نجفی۔

اس خاندان کے علماء وحکماء کی کئی نسلوں نے مبارک پور کو اپنے علم دین اور فن طب سے فائدہ پہنچایا ہے۔ اس خاندان کو مبارک پور کی سرداری بھی حاصل تھی۔ مولانا حکیم علی سجاد اباً عن جدٍ محلہ پورہ صوفی کے سردار تھے۔ ان کے بڑے اثرات تھے۔ حکیم علی سجاد صاحب بڑے بیدار مغز زمانہ شناس اور درد قومی کی تڑپ رکھنے والے عالم دین تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء میں اپنی قوم کے اہل علم واہل ثروت کے ساتھ مل کر انجمن حیدری اور مدرسہ باب العلم کی تاسیس فرمائی تھی اور وہ اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے تھے، انھوں نے اپریل ۱۹۳۴ء میں ایک لائبریری بھی قائم کی تھی۔

مولانا علی ارشاد صاحب زہد وتقویٰ اور علمِ دین میں ممتاز تھے۔ فقہ جعفریہ کی تمام جزئیات اور اصول اجتہاد میں فقید المثال اور فائق المرتبت عالم ہونے کے ساتھ عربی وفارسی اور اردو زبانوں پر بھی ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ وہ ایک بہت کامیاب اور اچھے شخصیت ساز سراپا علم مدرس ومعلم تھے۔ انہیں کتب درسیہ وعلوم رسمیہ پر عبور حاصل تھا۔ بڑے ہی دقاق اور نکتہ رس صاحب علم تھے۔ ان کی تعلیم

وتدریس سے کئی علاقے فیض یاب ہوئے۔ مدرسہ جعفریہ رستم پورہ گجرات میں معلم کی حیثیت سے ۱۵؍برس تک مقیم رہے۔ مالیگاؤں کے مدرسہ حسینیہ میں تقریباً پانچ سال تک انھوں نے تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ اپنے عہد ساز افادۂ علمی سے اپنی مادر علمی وثیقہ عربی کالج کو بھی شہرت کے پر لگادیئے۔ مدرسہ باب العلم مبارک پور کے دوبار پرنسپل ہوئے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۵ء دوسری بار اکتوبر ۱۹۷۷ء تا اپریل ۱۹۸۰ء اس ادارہ کے سربراہ تعلیم (صدر مدرس و پرنسپل) کے عہدے پر منتخب کیے گئے انھوں نے اپنی تدریسی وابستگی کے زمانے میں باب العلم کے تعلیمی معیار کو درجۂ ششم سے بلند کر کے عربی فارسی بورڈ الہ آباد کے مولوی، منشی، عالم، کامل تک پہنچایا۔ ۱۹۶۱ء میں باب العلم میں تعلیم نسواں کا اجرا کرایا جواب تک قائم ہے۔ مولانا ہی کے دور معلمی میں ۲؍۳؍اپریل ۱۹۸۰ء کو باب العلم کا جشن زریں بھی منعقد ہوا تھا۔ جس میں ہندو بیرون ہند کے علماء ومہمانان کرام نے شرکت کی تھی۔ ان کے دور میں مدرسہ کا تعلیمی ماحول بہت ساز گار اور ثمر بار رہا۔ ان کی نگرانی میں طلاب عموماً اچھے ڈویژن سے کامیاب ہوتے رہے۔ خود مدرسین وطلبہ کا درسی جائزہ بھی لیتے رہتے تھے۔ بڑے غیرتمند، خوددار، جرأت منداور بیباک تھے۔ لگی لپٹی باتوں سے بیزار اور بنا کسی اندیشۂ سود وزیاں کے دوٹوک باتیں کرنے کے عادی تھے۔ احقاق حق اور بلاخوف ملامت اظہارِ خیال ان کا شیوہ تھا۔ سیرت اہل بیت اور درس گاہ کربلا کے روحانی فیض یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ مصلحت اندیشی کو عشق کے خام ہونے کی علامت تصور کرتے تھے۔ اسی لیے ان کے یہاں عملاً دین ودیانت کی بڑی پاسداری تھی۔

علمائے شیعہ خطابت منبر ومسجد اور امام بارگاہوں میں لذت تقریر کی شیرینی بانٹنے کے مقابلے میں قرطاس وقلم کے منصب سے عموماً اعراض کرتے ہیں۔ مگر مولانا تصنیف وتالیف کے ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ ان کے معاشی حالات اور مکروہات زمانہ نے انھیں یکسوئی کے لمحات میسر نہیں ہونے دیئے۔ وہ گھر کے تنہا ذمہ دار اور کفیل ونگراں تھے۔ ان کا زیادہ وقت معاشی مسائل پر قابو پانے اور زندگی کو پٹری پر لانے میں گزرتا تھا اس لیے انھیں پوری دل جمعی سے پرورش لوح وقلم کے مواقع نہیں ملے۔ ورنہ ان کی طبیعت میں بڑی تیزی، قلم میں بہت روانی اور زبان وبیان پر پوری دستگاہ حاصل تھی۔ انھوں نے جو کچھ بھی سپرد قلم کیا ہے اس سے ان کی علمی بلوغت، لسانی عبقریت، اور خداداد صلاحیت کا احساس ہوتا ہے۔

ان کے آثار قلم میں وصیت نامہ، روداد مدرسہ باب العلم اور شعلۂ طور ہیں ان کے علاوہ آپ نے کئی ایرانی علماء کی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں ایران کی بین الاقوامی اندیشۂ اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے تو سازمان تبلیغات اسلامی (تہران) کی فرمائش پر رہبریت درحکومت اسلامی ورابطہ آں باقوائے سہ گانہ کے نام سے ایک فارسی کتابچہ لکھا جو اسی ادارہ کی طرف سے شائع ہو کر کانفرنس میں تقسیم ہوا۔ عقیقی بخشائشی کی تالیف اہل بیت اطہار کا اردو ترجمہ ۱۴۰۵ھ میں اہل بیت اطہار کے مختصر سوانح حیات کے نام سے سازمان تبلیغات اسلامی تہران نے شائع کیا۔

مولانا شاعر بھی تھے۔ آثم تخلص کرتے تھے۔ فارسی اور اردو ان کی جولانگاہ فکر تھی۔ مختلف اصناف مثلاً قصیدہ، نوحہ، سلام، سہرا وغیرہ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ خاص طور سے محفلوں کے لئے قصائد کہنے میں زیادہ لطف محسوس کرتے تھے۔ ان کا جو بھی سرمایۂ شعری محفوظ رہ گیا ہے وہ ان کے صاحبزادے مولانا احسان عباس صاحب کی تحویل میں ہے۔

مولانا کا کلام دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کو شعر گوئی سے فطری مناسبت تھی مگر انھوں نے بھی دوسرے علماء کی طرح اس کو صرف ایک ذوقی مشغلہ بنا کر برتا اور کبھی رشتۂ انہماک نہیں رکھا۔ اگر وہ اس طرف مستقل متوجہ ہوئے ہوتے تو ان کی ذہنی جودت، سرعت انتقالِ ذہنی، ان کی علمیت وبصیرت سے شاعری کو بھی بہت وافر حصہ ملا ہوتا۔ ان کے دوسرے اشغال اور معاش ومعیشت کے جنجال نے ان کو الجھائے رکھا اور تاعمر انھیں فراغ وفراغت کے لمحات میسر نہیں ہونے دیئے کہ یکسو ہو کر علمی وتصنیفی خدمات انجام دے سکتے۔ ان سب معاشی پریشانیوں اور وقت کی کمی کے باوجود انھوں نے مکروہاتِ زمانہ کے چنگل سے کچھ رستگاری حاصل کر کے دین وملت اور علم وفن کی جو خدمت کی وہ بھی اپنی کیفیت کے اعتبار سے کم وقعت واہمیت نہیں رکھتی۔ مولانا کے حالات وکوائف پر نظر ڈالنے کے بعد ان کی مشغولیاتِ علمی ودینی کا وزن محسوس نہ کرنا کتمانِ حق اور بڑی علمی خیانت تصور کی جائے گی۔

آثمؔ نے اپنی شاعری میں خیال وفکر اور اسلوب وادا کے اعتدال وتوازن کو برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے مواد کے ساتھ طرز پیشکش میں بھی ندرت کے پہلو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی شعریت اور تاریخیت میں بھی قابلِ تعریف حد تک موافقت ومقاربت کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ اپنے شعری شعور کو تاریخی شعور سے اس طرح ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ کلام کا حسن دوبالا

ہوجائے اور پڑھنے والے کا ذوق واقعات وحسنِ شعری دونوں سے حظ اٹھائے بغیر نہ رہ سکے۔ائمہ اطہار کی سیرت واخلاق اور واقعات وحادثات پر ان کی بڑی عمیق نگاہ تھی اور ان کے مطالعہ میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی تھی اس لئے وہ جس پہلو کو بھی اٹھاتے اس کا حق ادا کر دیتے۔ان کے کلام میں اخلاقی پہلو نمایاں ہیں اسی طرح درد کی دولت سمیٹنے کا وافر جذبہ بھی موجود ہے۔وہ لفظ ومعنیٰ کے رشتوں میں کچھ نئی معنویت، کچھ مثبت ابعاد، کچھ گہرے تلازمات پیدا کرنے کے لئے راہیں تلاش کرتے رہتے تھے اسی لئے ان کے یہاں تکرار واقعات کے باوجود فرسودگی اور پائمالی کا احساس نہیں ہوتا۔کلام کی تازگی، بیان کی شگفتگی، فکر کی ندرت، خیال کی بلندی وطہارت، اسلوب کی صناعی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔مواقع اور تاثرات پر ان کا ذوق سخن اور مذاق شعری تحریک پاتا تھا۔ان کے مذہبی قصائد میں عقیدت کی چاندنی اور محبت کی خوشبو ہے۔انھوں نے اپنی مذہبی حس کو حسن شعری اور رنگینی افکار کا عناں گیر بنایا ہے وہ لفظوں کو برتتے ہیں تو اس میں اپنے شعور کی جوت جگا دیتے ہیں۔ان کی مذہبی علوم سے واقفیت نے انھیں شعریت وصداقت کے درمیان قدر اشتراک کی تلاش میں بڑی مدد پہنچائی ہے۔

نمونۂ کلام

آج پھر جوشِ محبت کار فرما ہوگیا ۔۔۔ دل میں پھر صحرا نوَردی کا ارادہ ہوگیا
عشق قربانی طلب مجھ ناتواں سے جب ہوا ۔۔۔ گھر سے بے گھر ہو کے میں مہمانِ صحرا ہوگیا
خیر مقدم کو بیاباں کے بگولے اُٹھ پڑے ۔۔۔ محوِ پابوسی ادب سے خارِ صحرا ہوگیا
دشتِ غربت، امتحاں کی سخت منزل، الاماں ۔۔۔ دشمنِ جانِ حزیں سارا زمانہ ہوگیا
جب بڑھا شوقِ لقا تو سختیاں بھی بڑھ گئیں ۔۔۔ خانہ زارِ دشت میرے خوں کا پیاسا ہوگیا
میرے حالِ زار پر نمناک تھی چشمِ حباب ۔۔۔ پانی پانی میری مجبوری پہ دریا ہوگیا
ناگہاں آوازِ ہاتف آئی کیوں ہے مضطرب ۔۔۔ شاد ہو! تیرا درِ مقصد ہویدا ہوگیا
شاد ہوکر منقبت میں اک نیا مطلع سنا ۔۔۔ فضلِ ربانی سے تجھ پر فضلِ مولا ہوگیا
بیتِ زہرا اُج رشکِ طورِ سینا ہوگیا ۔۔۔ نورِ حق چمکا دوعالم میں اُجالا ہوگیا
قوتِ بازوئے شبّر، نورِعینِ مرتضیٰ ۔۔۔ رونقِ افروزِ جہاں دِلبندِ زہرا ہوگیا
ہوگیا جلوہ نما وہ ورثہ دارِ انبیاء ۔۔۔ جس کے دم سے دینِ حق کا بول بالا ہوگیا

تہنیت دینے ملائک، حور و غلماں آ گئے
آج یثرب رشکِ فردوسِ معلّٰی ہوگیا
اک زمانہ سے جو فطرس تھا گرفتارِ عتاب
اُس کے حق میں سبط پیغمبر مسیحا ہوگیا
مَس کیا اُس نے جونہی گہوارۂ شبیر کو
پا گیا وہ بال و پر، غم کا مداوا ہوگیا
تھے نبی سجدے میں اور پُشتِ نبی پر تھے حسین
رُتبۂ معراج کہئے! کس کا اعلیٰ ہوگیا
خود امام اور چار جانب سے اماموں کا حصار
محورِ چرخِ امامت ماہِ زہرا ہوگیا
ہے تری بے مثل قربانی کا صدقہ اے حسین
تا قیامت، پرچمِ اسلام اونچا ہوگیا
چین میں ہے جو بھی ہے تیرا محب
اور جو ٹکرایا وہ عالم میں رسوا ہوگیا
اپنے آثمؔ پر بھی ہوجائے کرم کی اک نظر
میرے مولا! وہ بہت بے حال وخستہ ہوگیا
تعالیٰ اللہ کیا ہے طالعِ بیدار زینب کا
گھرانہ ہے مکمل مطلعِ انوار زینب کا
خواتین جہاں آئیں اور اس در سے سبق سیکھیں
نمونہ ہے برائے زندگی کردار زینب کا
بھتیجوں پر خوشی سے کردیا قربان بیٹوں کو
بھلا سکتی نہیں دنیا کبھی ایثار زینب کا
پھرایا اشقیا نے در بدر بے مقنع وچادر
مگر تطہیر کا پردہ تھا پردہ دار زینب کا
نہ ہوں کیوں محوِ حیرت اہلِ کوفہ اس فصاحت پر
سراسر حیدری تھا لہجۂ گفتار زینب کا
دلوں میں انقلابی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے
کچھ اس انداز کا خطبہ تھا آتشبار زینب کا
رسن بستہ کھڑی تھی بے ردا دربارِ ظالم میں
نہ مونس تھا، نہ کوئی ناصر وغمخوار زینب کا
ہلا دیں جس نے قصرِ ظلم و بے دینی کی بنیادیں
وہ تھا خیبر شکن خطبہ سر دربار زینب کا
مصائب شام وکوفہ کے نہایت صبر سے جھیلے
رہا شکوہ سے بے گانہ لبِ اظہار زینب کا
شہنشاہِ نجف! ہو اک نگاہِ لطف اِس پر بھی
کہ ہے آثمؔ بھی اک ادنیٰ سا خدمتگار زینب کا
محفل سجی ہوئی ہے عروسِ بہار کی
آمد ہے گلستاں میں کسی گلعذار کی
وہ گلعذار، روحِ چمن، جانِ گلستاں
جس سے ہے عطر بیز فضا لالہ زار کی
نَرجس کا پھول، امام زماں، جانِ عسکری
علت ہے وہ جہاں کے بقاء وقرار کی
ہیں لنگرِ زمین وفلک اور ہے عناں
قبضہ میں ان کے گردشِ لیل ونہار کی
مشکل کشائی کرتے ہیں پردے میں رہ کے بھی
مشہور ہے جہاں میں حکایت انار کی

کب آئیں گے حضور! خدارا بتائیے — حالت بری ہے اب تو دلِ بے قرار کی
آجائیے کہ اب تو دم آنکھوں میں آگیا — حد ہوگئی خدا کی قسم انتظار کی
للّٰہ اب تو پردۂ غیبت اٹھائیے — ظلم وستم سے پُر ہے فضا روزگار کی
آبِ رواں پہ آکے مصلّٰی بچھائیے — تقدیر پھر سے جاگ اٹھے جوئبار کی
کوفہ سے تابہ سہلہ جماعت کا ہو قیام — طاقت نہ ہو کسی میں صفوں کے شمار کی
ہے نہرواں کے بعد سے پیاسی نیام میں — آجائیے کہ پیاس بجھے ذوالفقار کی
آئی صدا ہم آئیں گے، پابند ہے مگر — آمد ہماری مصلحتِ کردگار کی
ہم خود بھی منتظر ہیں کہ اذنِ خدا ملے — اعداء کے خوں سے پیاس بجھے ذوالفقار کی
آثمؔ کچھ اور روز ابھی انتظار کر — مدت ابھی ہے باقی ترے اِختبار کی

آزؔ-قاضی حافظ حکیم محمد احمد کوئریا پاری

ان کی شخصیت کی کئی روشن اور تابناک جہات تھیں۔علم وادب، دین ودیانت، حکمت وطبابت میں نامور تو تھے ہی سماجی حیثیت بھی بلند تھی۔موضع کوئریا پار ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نسبت نسبی حاصل تھی۔فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔آذوقۂ معاش کے طور پر طبابت بھی کرتے تھے۔شاعری میں حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے۔عزیز الرحمٰن فاروقی نے انھیں نواب مرزا خان داغ (۱۸۳۱ء-۱۹۰۵ء) کا شاگرد ہونے کی اطلاع دی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے پہلے استاد داغ دہلوی رہے ہوں اور بعد میں انھوں امیر مینائی (۱۸۲۶ء-۱۳؍اکتوبر ۱۹۰۰ء) سے تلمذ حاصل کرلیا ہو۔قادرالکلام، صاحب فن اور زود گوشاعر تھے انہیں مزاحیہ اور سنجیدہ دونوں انداز میں کہنے کی صلاحیت حاصل تھی۔غزلوں کے ساتھ موضوعاتی نظموں کو بھی شاداب کرتے تھے۔حمد ونعت میں بھی درک حاصل تھا۔مختلف ہیئت میں کہتے تھے اور ادبی وفنی اسلوب میں کہتے تھے۔

حکیم صاحب کے بارے میں مولوی عزیز الرحمن فاروقی (مارچ ۱۹۰۲ء-۱۹۹۳ء) مجھے اپنے

مکتوب ۲۵ رمئی ۱۹۸۰ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

''حکیم محمد احمد آز کوئریا پاری حکیم مولوی محمد اصغر کوئریا پاری کے پھوپھی زاد بھائی تھے ان کے دادا مولانا قاضی تراب علی محلہ قاضی پورہ قصبہ گھوسی کے رہنے والے تھے۔آز کے والد قاضی محمد اسماعیل نے کوئریا پار میں قیام کرلیا تھا۔میں تیرہ چودہ سال کا رہا ہوں گا ان کے یہاں جایا کرتا تھا اور کسی کسی مجلس میں ان کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔کچھ دل چسپ اشعار گانو کی سیاست کے بارے میں لکھا تھا۔اندازاً ان کا انتقال ساٹھ سال کی عمر میں ہوا۔غالباً وہ مرزا داغ کے شاگرد تھے۔ان کا ایک پوتا مشہود احمد عثمانی کراچی کا کمشنر ہے اس کا پورا خاندان بالکل شروع میں پاکستان چلا گیا''۔

بڑے خوش کلام اور چلبلی طبیعت کے مالک تھے۔دبستان امیر مینائی مرتبہ عرفان عباسی:ص ۵۵ ۔مطالعۂ امیر ص ۵۹۴ اور خم خانۂ جاوید لالہ سری رام دہلوی ج ۱ ص ۲۵ پر ان کے احوال و اشعار ہیں۔ ان کتابوں سے ان کے بارے میں کچھ نئی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔

کسی نے مطبع فیض محمدی لکھنؤ سے ایک کتاب ''جولاہے نامہ'' چھپوائی تھی جس میں مومن انصاری برادری کی ہجو کی گئی تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی سماجیات کا مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ کچھ تو انگریزوں کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی اور کچھ شرفائے انجاب کی ہندوستانی برادری واد سے تاثر پزیری کے نتیجے میں مسلم طبقات کے درمیان ذات پات پر مبنی زبردست تنازعات پیدا ہوگئے تھے۔فقہ کے مسئلہ کفو سے گزر کر مقدمہ بازی تک کی نوبت آ گئی تھی۔ چنانچہ ایک مقدمہ شرافت ورذالت ۱۹۳۸ء نعمت اللہ انصاری بنام قاضی تلمذ حسین بن تصدق حسین گورکھ پور کی عدالت میں دائر کر دیا گیا تھا جس کے بارے میں مسلم انصاری گورکھ پوری نے لکھا ہے کہ

''قاضی تلمذ حسین گورکھپوری (۱۸۸۰ء۔۱۹۴۶ء) موصوف گورکھ پور کی ممتاز علمی شخصیتوں میں سے ایک تھے اور ان کے روابط برصغیر کے سبھی ادباء وشعراء سے تھے مگر اس کے باوجود ان سے بر بنائے ضد بزعمِ انا ایک ایسی لغزش سی ہوگئی جس نے ان کی ساری

خوبیوں کو پسِ پشت ڈال دیا اور ملک گیر پیمانے پر رسوائی سے ہم کنار کر دیا۔ وہ تھا ایک مقدمہ شرافت اور رذالت جو ڈسٹرکٹ جج گورکھ پور کی عدالت میں ایک طویل عرصہ تک زیرِ سماعت تھا جس میں انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تماشائیوں میں ایک میں بھی تھا، جو لطف لینے ہر پیشی کے موقع پر جاتا تھا"۔(۱)

یہ علی گڑھ کے ایم اے (تاریخ) میں سند یافتہ، گورنمنٹ جبلی کالج بھوپال کے قائم مقام پروفیسر، ندوہ کے صدر مدرس، دارالترجمہ عثمانیہ یونی ورسٹی سے منسلک رہ کر ۲۱ کتابوں کے مترجم، ادیب وشاعر اور صحافی تھے۔ تلمذ تخلص تھا بہت ممکن ہے کہ جلاہے نامہ انھیں کی منظوم ہو۔

اس کتاب جولاہے نامہ کے جواب میں ''رد جولاہے نامہ'' کے نام سے آزؔ نے ایک بہت اچھا مسدس لکھا تھا جو ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء میں مطبع احسانیہ گورکھپور سے کتابی شکل میں طبع ہوا تھا۔ سرخ کاغذ کے پتلے ٹائٹل پر ''لقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین '' آیۃ مبارکہ لکھی ہے۔ ٹائٹل کے دوسرے صفحے پر ایک مناجات ہے جو مؤثر اور دل پذیر ہے اس کے بعد سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا ہے۔ ابتدا میں ایک حمدیہ اور نعتیہ بند ہے۔ اس مسدس کے اختتام پر شعراء کے متعدد قطعات تاریخ طبع ہیں۔ پھر تین غزلیں بھی ہیں۔ آخری ٹائٹل جو سرخ کاغذ کا تھا وہ پھٹ گیا ہے۔ اس مسدس میں مومن انصاری برادری کی متنوع علمی وحربی خدمات اور دینی وسماجی خصوصیات کو منظوم پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور ان کی دیگر اخلاقی وتمدنی کیفیات اشعار کے ذریعہ ابھاری گئی ہیں مسدس کی خوبی یہ ہے کہ یہ اس زمانے میں لکھی گئی ہے جب انصاریوں کو شرفائے انجاب کی محفلوں میں نہات رذیل سمجھ کر پائے حقارت سے ٹھکرادیا جاتا تھا۔ عثمانی ہوتے ہوئے بھی آزؔ نے انصاریوں کے مذہبی تصلب، قدر وقیمت اور عزت ومکرمت کے اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے یہ اس دور کے مزاج واصول کو دیکھتے ہوئے بڑی جرأت کی بات ہے جو احقاق حق کے باب میں ان کی عزیمت واستقامت، مثبت سوچ اور نگاہ عدل کا ثبوت ہے۔ اظہار بیان کے اعتبار سے بھی مسدس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ کہیں پر کف دردہن یا اشتعال انگیز شاعری کی جذباتی کیفیت ابھرنے نہیں پائی ہے۔ شاعر نے بڑی فن کاری کے ساتھ پورے

مسدس کو سطحی جذباتیت کا شکار ہونے سے اپنے فن پارے کو بچالیا ہے۔ اپنی بات نرم لہجے اور افہام و تفہیم کے انداز میں اس طرح کہی ہے کہ ا'' از دل خیزد بر دل ریزد'' والا معاملہ پیدا ہو گیا ہے۔ مسدس کے مطالعہ سے آزؔ کی قادرالکلامی روانی و برجستگی اور شاعرانہ جودت طبع اور مفکرانہ ذوق طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے مطالعہ کے وقت محسوس ہوتا ہے کہ شاعر بے پناہ سماجی و سیاسی اور تمدنی شعور رکھتا ہے۔ قرآن اور اسلامی تعلیمات پر بھی اس کی عمیق نظر ہے۔ ان کی ایک نظم "راست گفتار" کے عنوان سے یکم فروری ۱۸۹۷ء کے ہفتہ وار اخبار ''لبرل'' اعظم گڑھ میں چھپی ہے۔ یہ ۱۸۹۷ء/ ۱۳۱۵ھ کے رمضان کے بارے میں آمد رمضان کے عنوان سے ہے جو قحط کے دنوں میں پڑا تھا۔ آزؔ نے اس میں مزاحیہ انداز اختیار کیا ہے۔ ردجولا ہے نامہ کے چند بندیوں ہیں۔

نمونۂ کلام

دیکھو تو جولاہوں کو ذرا آنکھ اٹھا کر — بچے تلک ان لوگوں کے لاتے ہیں کما کر
وہ عیب کسی کا بھی نہیں دیکھتے جا کر — کرتے ہیں بسر عیش میں، نوکر ہیں نہ چاکر
ضائع ہو کہیں ان کی وہ اوقات نہیں ہے
جو بات ہے ان میں وہ خرافات نہیں ہے

نازل ہے مصیبت جو کہیں ایک کے سر پر — تو جتنے ہیں گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں مضطر
ٹل جائے بلا، فکر یہ ہونے لگی گھر گھر — چندے کا فراہم ہوا حاجت سے سوا زر
وہ زور ہے ان میں کہ اگر بات پہ اڑ جائیں
غالب ہے کہ دم بھر ملک الموت سے لڑ جائیں

آپس میں جو پڑ جاتی ہے انصاف کی حاجت — ہوتی نہیں جانے کی عدالت میں ضرورت
سر پنچ جو ان کا ہے، اسی کی ہے حکومت — جو اس نے دیا حکم ، وہ ہے حکمِ عدالت
دل دفتر تجویز ، زباں اہل سر رشتہ
کیا خوب عدالت ہے، نہ کاغذ، نہ نوشتہ

شادی کے لیے ان میں منادی ہوئی اول — حاضر ہو ہر اک مجلس تفہیم (۲) ہے واں کل
ممکن ہے کہ اس وقت کہیں جائے کوئی ٹل — یا کوئی بناوٹ سے کرے آنے میں چھل بل

طے ہوچکیں جب خوب طرح باہمی باتیں
تانے گئے تنبو ، ہوئیں استادہ قناتیں
علمائے زماں، حافظ قرآں بھی یہی ہیں   مومن بھی یہی اور مسلماں بھی یہی ہیں
بندہ بھی یہی تابع فرماں بھی یہی ہیں   اسلام کی دولت کے نگہباں بھی یہی ہیں
نائب ہیں یہ محبوب خدا وند جہاں کے
حقدار یہی لوگ ہیں حوران جناں کے

(آمدرمضان)

گھومتی ہے ملک میں کیا رو بکاری ان دنوں   حضرت رمضاں کی آئی ہے سواری ان دنوں
کس طرح تسبیح خوانی ہوگی اور ہوگا قیام   قحط کی زنجیر ہے پاؤں میں بھاری ان دنوں
پیاری پیاری صورتوں سے کرتے ہیں رمضاں سوال   کیا ہوا رخ، کیا ہوئیں آنکھیں کٹاری ان دنوں
جولبیں گوہر فشاں تھے ہائے ان کو دیکھئے   ان پہ ہیں فریاد و نالہ، آہ وزاری ان دنوں
پیٹ میں آنتوں کو بھی (اب تو) نہیں ہوتا قرار   بڑھ گئی دو ہاتھ دل سے بے قراری ان دنوں
قحط نے سکہ چلایا نام سے اپنے تمام   دل سے رخصت ہوگئی یاروں کی یاری ان دنوں
حضرت رمضان ! کیا ہو میہمانی آپ کی   صورت عنقا ہے سحری، آفطاری ان دنوں
کچھ نہ تھا تو دودھ ہی پر آپ فرماتے گزر   پر نہیں ملتی کوئی بکری دودھاری ان دنوں
جایئے اب آپ عید الفطر کو بھی بھیجئے   آبرو رکھ لیجے صاحب اب ہماری ان دنوں
آزؔ تم نے قحط کی تصویر کیسی کھینچ دی   مرحبا کیا ہی طبیعت ہے تمہاری ان دنوں
ہماری فکر سے مضموں کمر کا بندھ نہیں سکتا   وہاں زورنزاکت ہے، یہاں نازک خیالی ہے
کہا صبح شب وصل اس پری نے دیکھ کر دل کو   نہیں ہے قابل قدر اب کہ ارمانوں سے خالی ہے
مِسی آلودہ لب میں رنگ ہے کچھ مسکرانے کا   گھٹا چھائی ہوئی ہے آج بجلی گرنے والی ہے
سنورنے میں کوئی تو سر چڑھا، پس پس گیا کوئی   سرافرازی ہے پھولوں کی، حنا کی پائمالی ہے
دماغ آزؔ اور ایسے مضامیں نازک وعالی   امیرؔ لکھنوی کا فیض، یہ نازک خیالی ہے
دل کے بچنے کی اب کیا کوئی تدبیر نکالے   سینے پہ چڑھے بیٹھے ہیں دل چھیننے والے

ہم ہاتھ ملیں خون دل آنکھوں سے بہا کر ہے ہاتھ کہ بوسے ترے ہاتھوں کے حنا لے
اے آزؔ نہ بے دل ہو غم عشق بتاں میں کھاتے ہیں یوں ہی ٹھوکریں سب چاہنے والے

حواشی:

(۱) دبستان گورکھ پور۔ مسلم انصاری مطبوعہ ۱۹۹۷ء ص ۱۷۳

(۲) پنچ پوچھی (پنچ بجھی) کی طرف اشارہ ہے۔ ہماری انصاری برادری میں جب شادی کا ارادہ ہوتا ہے تو آج بھی خاندان اور پڑوس کے بڑے بوڑھے اصحاب الرائے کو بلاکر ان کے سامنے ارادہ بیان کیا جاتا ہے۔ مدعو کئے جانے والوں کی تعداد بتائی جاتی ہے، جو انتظام گھر میں رہتا ہے اس کو بتایا جاتا ہے۔ اس پر لوگ رائے دیتے ہیں اور انتظامی امور انجام دینے کے لیے تقسیم کار کے خیال سے مناسب افراد کو منتخب کر کے ذمہ داریاں تقسیم کر دیتے ہیں۔

آزاد-مولانا ابوالنعمان عبدالرحمن مئوی

۱۲۹۵ھ ـــ ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸

مولانا عبدالرحمن بن عبدالرزاق ایک زبردست عالم دین اور عربی وفاسی نیز اردو کے زود نگار ادیب وشاعر تھے۔ یوں تو آزاد اور عتیق دونوں تخلص اختیار کیا تھا لیکن آزاد کے تخلص نے زیادہ شہرت پائی۔ مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں تعلیمی مراحل طے کیے آپ کے اساتذہ میں مولانا فاروق چریا کوٹی، مولانا عبداللہ غازی پوری اور مولانا عبدالرحمن بقا غازی پوری کے نام نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جامع العلوم کان پور گئے اور وہاں مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا احمد حسن کے خرمن علم کے خوشہ چیں ہوئے۔ سند فراغ کے بعد مولانا نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوکر سماعت حدیث کا شرف پایا۔ تحصیل علوم کے بعد ۱۳۱۴ھ میں دربھنگہ کے کسی مدرسے میں مسند درس بچھائی پھر آسنسول اور کلکتہ کے مدارس میں غلغلۂ تعلیم بلند کیا۔ ہیضہ کی بیماری میں ان کا گھر تباہ ہوگیا تو وطن مئو لوٹ آئے۔ اس کے بعد ان کے پانو میں خانگی مسائل کی زنجیر کچھ ایسی پڑی کہ پھر باہر قدم نہیں نکال پائے۔ لیکن تصنیف وتالیف کا بہت پاکیزہ ذوق پایا تھا اس لیے اپنی یادگار قلم میں کئی مطبوع ونامطبوع کتابیں چھوڑیں۔ ترجمہ طبقات ابن سعد (نامکمل)

تفسیر القرآن (نامکمل) بحر الفرائض، قصیدہ بانت سعاد آپ کی علمی یادگاریں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی معنوی اولادوں میں تلامذہ کی کثیر تعداد ان سے فیض یاب ہوئی۔ جس نے علوم دینیہ کی خوشبو اقطاع عالم میں پھیلائی اور ان کے لیے صدقۂ جاریہ کے اسباب بہم پہنچائے۔

مولانا کی علمی عبقریت اپنے اقران و امثال میں فقید النظیر سمجھی جاتی تھی۔ یہ تینوں مشرقی زبانوں کے مزاج و آہنگ اور ان کے اسلوب و طرز نگارش کے اداشناس ہی نہیں تھے بلکہ ان زبانوں پر انہیں خداداد ملکہ بھی حاصل تھا۔ یہ اپنے دور کے علماء و صلحاء اور اکابرین علم کے بڑے معتقد اور ان کے کارناموں کے زبردست معترف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی اہم علمی و دینی یا سماجی شخصیت کے انتقال کی خبر انہیں حاصل ہوتی تو ان کا وجود لرز اٹھتا اور ان مرحوم افراد کی خدمات ایک ایک کر کے انھیں یاد آنے لگتیں۔ انہوں نے بے شمار قطعاتِ تاریخ عربی و فارسی اور اردو میں کہے ہیں اگر انہیں جمع کر کے شائع کر دیا جائے تو اس سے ہماری ادبی و علمی اور دینی و تہذیبی تاریخ کے بہت سے مٹتے ہوئے نقوش تابندہ اور تر و تازہ ہو جائیں گے۔ مولانا عبدالرحمن کی ذکاوت علمی، ثقاہت شعری اور ذہانت لسانی نے قدیم علوم و فنون کے بہت سے گوشوں کو روشن کیا ہے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے کاروان تاریخ و تمدن کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش میں اعلیٰ صفات کی حامل شخصیتوں کے ایسے مرثیے کہے ہیں جن سے زیر عنوان ممدوح شخصیت کے ذہنی و فکری افق روشن و تابندہ ہو جاتے ہیں اور ان کے اشعار سے ممدوح کی شخصیت کے ظاہری و باطنی خد و خال نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کے وفات نامے اپنے دور کی علمی و ثقافتی اور تعلیمی و تنظیمی سمت و رفتار کا مرقع ہیں۔ انہیں جزئیات نگاری اور باطنی و ذہنی ارتعاشات کی صورت گری کا فن بہت اچھی طرح معلوم تھا اور انہیں برتنے کا بھی اچھا سلیقہ آتا تھا۔ انہوں نے اپنے شعری کینوس میں جن شخصیتوں کی صورت کشی کی ہے وہ جمالیاتی اور ادبی و شعری نقطۂ نظر سے بھی خاصے کی چیز ہے۔ انہوں نے بعض دفعہ تو قلم برداشتہ منظوم تاثرات اس طرح بیان کیے ہیں کہ پختہ گوئی و کہنہ مشقی اور روانی و سنجیدگی کے تمام جلوے سمٹ آئے ہیں ان کی قادر الکلامی اور وسیلۂ اظہار پر ان کی دستگاہ اپنے ہم عصروں میں مسلمہ تھی۔

مولانا آزاد تینوں مشرقی زبانوں اردو، فارسی اور عربی میں خوب دادِ سخن دیتے تھے۔ لیکن وہ فنی قیود سے آزاد تھے۔ جیسے بعض حروف کے سقوط کو روا سمجھتے تھے۔ ہندی و عربی اور فارسی واردو لفظوں کے درمیان عطف و اضافت کے قائل تھے۔ وہ ادب کی فنی اقدار سے لاپرواتھے اور اپنے اصول کے پابند تھے اور بس۔ انھوں نے جن رجال علم کے خوان علم سے لقمے اٹھائے تھے ان کے علمی کمالات کے پرتو تھے اور صدیوں کے علم وادب کی وراثت کو سنبھالے ہوئے تھے۔

انہوں نے مولانا حمیدالدین فراہی (۶ر جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ/ ۱۸ر نومبر ۱۹۶۳ء —— ۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء/ ۱۹ر جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ) کی وفات پر عربی و فارسی اور اردو میں کئی قطعات تاریخ کہے تھے جن میں یہ اردو قطعہ بھی شامل تھا۔

اٹھ گیا ہائے آج دنیا سے　　　تھا جو چرخ کمال کا تارا
رونق بزم عالمان کرام　　　شمع پر نور محفلِ صلحا
اس کے اندوہ زا وفات کا سال　　　ہائے گل ہوگیا چراغِ ولا
۱۳۴۹ھ

آپ نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں الگ الگ اور مشترکہ دولسانی وسہ لسانی قصائد بھی ایک بحر اور ردیف و قافیہ میں لکھے ہیں۔ مولانا محمد جونا گڈھی کی تفسیر محمدی کی اشاعت پر ۳۵ر اشعار پر مشتمل ایک اردو تقریظی قصیدہ کہا تھا جو ''اخبار محمدی'' دہلی جلد ۱۳ شمارہ ۳ تاریخ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کے صفحہ ۳ پر چھپ چکا ہے۔ مطلع ہے:

ادھر بھی اک نظر اے ساقی صہبائے عرفانی　　　پلادے بادۂ قرآں نشاط افزائے روحانی

اپنے فرزند عزیز ''عبدالباقی'' کی وفات پر یہ قطعہ کہا تھا جو ہنوز نامطبوعہ ہے

جسد باقی عزیز نور بصر　　　گو کہ دنیا سے بے نشان ہوا
ہے یہ تاریخ اس کے بختاور　　　جنت الخلد میں مکان ہوا
۱۳۴۱ھ

ولہٗ علیہ:

موت عبد الباقی کی میرے لیے　　　باعث رنج والم دن رات ہے

عیش دنیا بے مزہ ہے اب مجھے　　موت اس کی ''ھاذم اللذات'' ہے
۲　۳　۹　۱　ء

ولہٗ علی ابن ابن اخیہ

ابن ابن الاخ بھی پرسوں چل بسا　　جو کرے اللہ سب منظور ہے
فکر تھی تاریخ کی حُب سے کہا　　آخرت محمود، بل مغفور ہے
۱۰ + ۱۳۳۱ ـ ۱۳۴۱ھ

ولہٗ علی وفاۃ الشیخ المحدث شمس الحق عظیم آبادی:

ہر طرف چھاگئی نکبت کی سیاہی کیسی　　گر پڑا کوہِ الم ہائے یہ کیسے یک دم
روتے روتے ہوئیں بے نور ہماری آنکھیں　　صدمہ سے چور ہے ہر شخص کوئی زیادہ کوئی کم
علم دنیا سے اٹھا، ڈوب گیا سورج حق　　کیوں نہ کہرام مچے، کیوں نہ ہو گھر گھر ماتم
سر اعداء کو اڑا کر گئے وہ سوئے جناں　　یعنی شارح ابی داؤد محدث عالم
۱۳۲۹ھ

قَدْ صَنَفَ التَفْسِيْرَ مَوْلٰنا الَّذِي　　هُوَبَحْرُ عِلْمٍ صَاحِبُ الْعِرْفَانِ
مُتَكَلِّمٌ وَمُنَاظِرٌ وَمُصَنِّفٌ　　وَمُحَدِّثٌ وَمُفَسِّرُ الْقُرْآنِ
فَمُبَشِّراً قَدْ قُلْتُ فِي تَارِيْخِهِ　　تَفْسِيْرُ فُرْقَانٍ بِحَقٍ بَيَانٍ
۱۳۵۴ھ

كِتَابُ مُحَمَّدٍ بُسْتَانُ عِلْمٍ　　وَمَرْوِيَاتُهُ اَشْجَارُ عَدْنٍ
وَتَحْقِيْقَاتُهُ اَثْمَارُ فَضْلٍ　　وَتَدْقِيْقَاتُهُ اَزْهَارُ غُصْنٍ
۱۳۵۴ھ

ادھر بھی اک نظر اے ساقی صہبائے عرفانی　　پلادے بادۂ قرآں نشاط افزائے روحانی
ہوئی قرآں سے تجدید خطاب شرف انسانی　　یہی وہ نور ہے جس سے خدا کی ذات پہچانی
فصاحت میں، بلاغت میں، مبانی میں معانی میں　　بلا شک ہے کلام اللہ ہی بے مثل ولاثانی
ضیاء بخشی زمانے کو کچھ ایسی نور قرآں نے　　بنا روشن ضمیر، انساں ہر اک فردِ مسلمانی
مٹایا جس نے دنیا سے ضلالت کے اندھیرے کو　　یہی وہ نورِ برحق ہے یہی وہ نور عرفانی

تھی استعداد جس میں جتنی اتنا فیض اسے پہنچا
وگر نہ عام تھا سارے جہاں پر لطف قرآنی

یہ وہ دریا ہے جس کی تہ میں وہ نایاب گوہر ہیں
کہ جن کے سامنے بے آب ہیں لعل بدخشانی

ہے گویا ہر ورق اک تختۂ آئینۂ روشن
ہر اک آیت سے ہیں جلوہ نما انوارِ یزدانی

حروف ایسے کہ سلکِ نور میں موتی پروئے ہیں
بنایا ہر سطر کو جس نے عقد نور ربانی

یہی نور مبیں اک ہادیِ راہِ شریعت ہے
اسی کی روشنی پھیلانے آیا مہرِ فارانی

وہ جس کا مرتبہ پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ ہے
وہ جس کی شان سبحان الذی اسریٰ سے پہچانی

وہ جس کی ذات خود تفسیر تھی قرآن کی گویا
وہ جس کی ساری باتیں تھیں یقینا وحیِ ربانی

چمک اٹھے ستارے بن کے افلاک معانی پر
ہوئی اس طرز پر اصحاب کی تعلیمِ قرآنی

صحابہ باخبر تھے فقہِ دینی کے معارف سے
انہیں اچھی طرح معلوم تھے اسرار فرقانی

چمک انوار سنت کی ہے آثارِ صحابہؓ میں
حقیقت میں یہی انوار ہیں تفسیر قرآنی

تفاسیر کلام اللہ گو اعلیٰ سے اعلیٰ ہیں
مصنف جن کے گزرے ہیں، ہیں سب اعلام حقانی

مگر تفسیر وہ جس کی بنا آثار وسنت ہو
وہ تفسیروں میں ہے صرف ایک ہی تفسیر قرآنی

مصنف جس کے تھے ابن کثیر اک ماہر قرآں
وہی ہے ساری تفسیروں میں اک تفسیر لاثانی

وہی ابن کثیر اسلام کے حافظ عماد الدین
زمانہ کو مُسَلَّم جن کا ہے فخر ہمہ دانی

ضیاء پاشی سے اس تفسیر کے محروم تھی اردو
عرب ہی میں تھا نور افشاں وہ مہر علم ربانی

ضرورت ترجمانی کی تھی ایسے صاف لفظوں میں
جسے ہر ایک اردو داں سمجھ جائے بآسانی

سپہر معرفت کا ہے مہِ کامل جو دہلی میں
رخ روشن سے ہیں جس کے عیاں انوار ایمانی

وہ جس کا کام ہے یکسر مطابق عین سنت کے
وہ جس کے نام میں ہمنامی محبوب ربانی

ہے تحریر اتنے زوروں کی شگاف کلک سے گویا
چڑھی جاتی ہے سطح کاغذی پر موج طغیانی

ہر اک تقریر کو سنتے ہی بھر لیتا ہے دامن کو
کچھ ایسی ہوتی ہے طرز بیاں میں گوہر افشانی

شریک وعظ ہوتے ہی ہوئے جاتے ہیں سب بیخود
بھرا ہے اس کے لفظوں میں کچھ ایسا کیف وجدانی

وہ ہمنام پیمبر ابن ہمنام خلیل اللہ
محمد بن براہیم اِمامِ شرعِ ربانی

اسی کے کارناموں میں یہ تفسیر مترجم ہے
کہ جس کے وصف ہیں پہنچے ہوئے تا ظل سبحانی

کھلے ہیں غنچۂ مضمونِ قرآں خندہ زن ہوکر صبائے سنت و آثار کی ہے یہ گل افشانی
یہی تفسیر ہے وہ جس کو نسبت ہے محمدؐ سے وہ موتی ہے ترستا ہے جسے خود ابر نیسانی
یہ ہے وہ باغ عالم میں گل خوش رنگ و تازہ بو کہ جس پر کرتے ہیں مرغان جنت بھی غزل خوانی
یہ وہ تفسیر ہے مداح جس کا سارا عالم ہے اسی کی کرتے ہیں حور وملائک بھی ثنا خوانی
اگر اس کو خریدیں گوہر نایاب کے بدلے تو پھر بھی قابل رشک اس کی ہو بے شبہ ارزانی
مترجم کو خدا محفوظ رکھے سب حوادث سے مدام اس کی مدد کرتی رہے توفیق ربانی
کہی فرط خوشی میں میں نے بھی تاریخ کیا اچھی چھپی ہے آج یک عالی بیاں تفسیر قرآنی (۱)

۱۳۵۴ھ

حواشی:
(۱) بشکریہ مولانا ابوالقاسم عبدالعظیم مئوی

آزادؔ-مولانا محمد ادریس رحمانی

۲رجنوری ۱۹۱۶ء ــــ ۶رمئی ۱۹۷۸ء

نام کے بجائے مولانا ادریس آزاد رحمانی اپنے تخلص سے ہی مشہور تھے۔آپ کی شخصیت کے کئی پہلو تھے وہ عالم دین اور مفتی شرع متین ہونے کے ساتھ اچھے مدرس، ماہر صحافی، بہتر سیاست داں اعلیٰ پائے کے منتظم و منصرم، اداروں کے بانی اور مصنف وشاعر تھے۔ان کے اساتذہ میں ان کے ماموں عبدالغفار، مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری، مولانا محمد احمد مئوی، مولانا عبداللہ شائق مئوی، مولانا شیخ عبدالرحمن، مولانا محمد احمد مئوی ناظم فیض عام، مولانا نذیر احمد املوی، شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری جیسے اساطین درس اور رجال علم کے نام ملتے ہیں۔ان کی تعلیم مختلف مدارس میں ہوئی۔تدریس کا سلسلہ بھی دراز رہا اور متعدد مدارس کو آپ سے شرف تعلیم حاصل ہوا۔ سادہ مزاج، کریم النفس، تکبر وادعائیت سے دور، اہل علم میں متواضع اور خلیق، کثیر المطالعہ اور دیندار و متدین تھے۔فتویٰ نویسی میں ان کی صلاحیتیں خوب ظاہر ہوتی تھیں، تدریس میں ایسا کمال حاصل تھا

کہ معمولی ذہن کا طالب علم بھی سبق کو اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔خبروں کی تلخیص سے بھی تعلق رکھتے تھے اورمحدث میں اس کی اشاعت ہوا کرتی تھی۔

تصانیف میں الخلیفۃ الخامس ،مجموعۂ اشعار،سبحۃ الباری من ورد فی صحیح البخاری، نبی کی نماز، الآیات البینات فی رد الشرک والبدعات، ترجمہ تیسیر العزیز الحمید،شرح القرأۃ الرشیدہ، عصمت الانبیا، الموازنہ بین ابی بکر و علی، تاریخ دارالعلوم (نامکمل) کے نام لیے جاتے ہیں۔ان کے علاوہ مختلف رسائل وجرائد میں ان کے مضامین کی اچھی خاصی تعداد ہے جن کو ضخیم کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔مولانا پندرہ روزہ ''الہدیٰ'' دربھنگہ کے مدیر ہوئے تو اس کے دوخاص نمبر دارالعلوم احمدیہ سلفیہ نمبر ۱۹۵۵ءاور امام بخاری نمبر ۱۹۵۶ء شائع کیے۔صوت الجامعہ بنارس کے بھی مدیر ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ء تک رہے۔

آزاد اردو کے اچھے شاعر تھے اور ان کی شاعری کی بڑی دھوم تھی۔اس فن میں سائلؔ دہلوی، بیخود دہلوی (ا)اور مولانا اسلم جیراج پوری سے استفادہ کیا تھا۔مدرسہ رحمانیہ دہلی کے ایام طالب علمی ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔انہوں نے اپنی شاعری میں اسلامی جذبات اور مذہبی خیالات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔غزل و نظم دونوں پر قدرت حاصل تھی۔غزلوں میں تغزل کے ساتھ عصری مسائل اور قومی و ملی درد کا بھی اظہار ہوا ہے۔انہوں نے لفظوں کے استعمال میں سیاق وسباق کا خاص خیال رکھا ہے اور اس باب میں اپنی شعوری بیداری اور ادبی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ان کا کلام مختلف اخبار ورسائل کی زینت ہوا کرتا تھا۔بڑے زود گو شاعر تھے،طنزیہ و مزاحیہ رنگ میں بھی کہہ لیتے تھے۔مذہبی سرگرمیوں کو نظم کا لباس پہنایا کرتے تھے۔ان کے یہاں ماضی کو یاد کر کے حال کو سنوارنے کے ساتھ عصری زندگی کا مرثیہ بھی ملتا ہے۔یہ سلف صالحین کے زمانے سے اپنے دور کا تقابل کر کے مسلمانوں کی زبوں حالی کا نوحہ و ماتم بڑے درد بھرے انداز میں کرتے ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں اسلاف کے کارناموں پر روشنی ڈال کر ان کی اتباع پر مسلمانوں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ان کے یہاں لفظوں کے برمحل استعمال کی پختہ شعوری کے ثبوت اور اسلامی حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ان کے دور میں ان کی شاعری کا اہل علم کی

مجلسوں میں بڑا چرچا اور شعر و شاعری سے تعلق رکھنے والوں میں خاص اثر تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے دور میں غواص آفاقی کے نام سے سیاسی افسانے لکھا کرتے تھے۔ قوالوں کو گانے کے لیے اپنا کلام دوسرے نام سے لکھ کر دیا کرتے تھے۔ مولانا آزاد رحمانی کی شاعری کو ان تمام مقامات پر حسن قبول حاصل تھا جہاں مساجد و مدارس کی تعمیر کے سلسلے میں چندے ہوا کرتے تھے اور ان چندوں کی فراہمی کے لیے خوش الحان نظم خوانوں کی ٹولیاں چندے کی نظمیں پڑھا کرتی تھیں۔ ان چندوں میں آزاد رحمانی کی نظمیں بڑے ذوق وشوق اور خاص توجہ سے سنی اور پسند کی جاتی تھیں۔ مولانا اس موضوع کی نظموں میں عہد صحابہ اور سلف صالحین کے تاریخی واقعات اور چندہ دینے کے سلسلے میں ان کے کردار وایثار کی ایسی مرقع کشی کرتے تھے کہ جذبۂ داد و دہش دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ مولانا اپنی نظموں میں صدقات وخیرات کے تعلق سے قرآن واحادیث اور تذکرہ وسیر کی کتابوں میں مذکور سخاوت وفیاضی کی سچی داستانوں کے حوالے شامل کرکے ان کو خاصے کی چیز بنادیا کرتے تھے۔ ان میں اللہ نے برجستگی، زود گوئی اور خوش گوئی کی بڑی صلاحیت رکھی تھی اس لیے ان کے موضوعاتی اور وقتی کلام بھی دلچسپ اور لائق توجہ ہوا کرتے تھے۔

نمونۂ کلام

ٹکراتی ہے جب میری نظر ان کی نظر سے
اٹھتا ہے دھواں قلب سے، پہلو سے، جگر سے

ہم نے یہ چمن خون سے سیراب کیا ہے
تب بوئے وفا آتی ہے ہر برگ وثمر سے

اے اہل چمن ہم کو نظر سے نہ گراؤ
ہم وہ ہیں کہ لڑ سکتے ہیں طوفاں سے شرر سے

میں ان کو تصور میں بہت دیکھ چکا ہوں
پردے میں بھی رہ کر نہ چھپے میری نظر سے

اف دل کی لگی بجھتی نہیں لاکھ بجھاؤ
کیا کام نکل سکتا ہے اک دیدۂ تر سے

نہ جانے کون سی منزل ہے آگے
کہ گھبرایا ہوا کچھ کارواں ہے

مآلِ زندگی پر کیوں نظر ہو
یہ بار زندگی ہی جب گراں ہے

محبت ہو کہ ہو ترک محبت
رہینِ منتِ سود و زیاں ہے

جوانی کے پیچھے جوانی لٹادی
کہ عہد وفا آج پھر یاد آیا

نگاہوں نے قدم چوم ڈالے جنوں کون سا آج پھر یاد آیا
دیر و حرم کا فاصلہ اور اتنا مختصر جلوہ فروش کعبہ میں دیکھو صنم ہوئے
دو گھونٹ کا اثر ہے کہ سجدے میں گر پڑے رندوں سے بڑھ کے کس طرح اہل حرم ہوئے
زندگی وقف ستم اپنی رہی اے دوستو! چوٹ کھا کر دل پہ کب تک مسکرایا جائے گا
چشم پرنم، چاک داماں ، زندگی تصویر غم جشن آزادی بہر صورت منایا جائے گا
ہم نے مانا توڑ سکتے ہیں طلسم ہر ستم تم پہ خنجر دوستو کیسے اٹھایا جائے گا
مری نگاہ کا حاصل نہ پوچھئے مجھ سے ارم کے حسن کو جا کر سنوار آیا ہوں
نہیں ہے منزل ہستی میں بھی قرار مجھے یہ وہ جگہ ہے جہاں بے قرار آیا ہوں
نظر میں جن کی کبھی طور کی تجلی تھی ترس رہے ہیں وہی آج اک کرن کے لیے
کبھی سجائے تھے تاروں سے بزم جو اپنی نہیں ہے شمع بھی اب ان کی انجمن کے لیے
ترے ہی لطف کا آزادؔ کو سہارا ہے کرے گا تو ہی عطا سوز علم وفن کے لیے

اتباع رحمۃ للعالمین

حرم والو، حرم کے نور سے خالی جبیں کیوں ہے؟ ید بیضا کا جلوہ آج زیر آستیں کیوں ہے؟
جہاں والوں کو بخشا تھا مسرت کا جہاں جس نے وہ مرد پاک باطن آج خود اندوہگیں کیوں ہے؟
طلوع صبح سعادت جن کی پیشانی سے ہوتی تھی سعادت سے انہیں کی آج کل خالی جبیں کیوں ہے؟
کبھی اہل حرم تم تھے وقار ملت بیضا تمہیں سے آج آزردہ مگر دین متیں کیوں ہے؟
تمہارے واسطے گردوں سے لے کر جو پیام آیا کہو! بے گانہ تم سے آج وہ روح الامیں کیوں ہے؟
حرم آباد تھا جس کی جبینِ شوق سے کل تک حرم سے دیر میں وہ بندۂ حق اب مکیں کیوں ہے؟
کبھی مشہور تھے جو اس جہاں میں فاتح عالم انہیں مردان حق پہ تنگ آخر یہ زمیں کیوں ہے؟
حرم والو! خدا کے واسطے اب یہ راز سمجھاؤ کہ برہم آج تم سے لطف رب العالمیں کیوں ہے؟
نتیجہ ہے یہ اے آزادؔ اس خرماں نصیبی کا کہ چھوٹی اتباع رحمۃ للعالمیں کیوں ہے؟

طنزیہ

لڑ لیا کرتے ہیں تفریحاً ، یہ ناچاقی نہیں
فرض بیوی پر میاں کا آج کچھ باقی نہیں
دل نے چاہا تو دوا ک بچے خوشی سے جن دیئے
بیویوں میں یہ مرض اب ورنہ آفاقی نہیں
شمع خانہ بن کے رہ جانا ہے نادانی کی بات
گھٹ کے مرجانا گھروں میں فرض اخلاقی نہیں
مل ہی جائے گی کہیں سے کچھ نہ کچھ جنس وفا
غم ہو کیوں؟ شوہر کی الفت اب اگر باقی نہیں

اٹھ کے دکھلا دے زمانے کو جلال حیدری
قوت بازو سے کر دنیا پہ پھر اب سروری
قسمتیں رقصاں ہوں غیروں کے اشارے پر ترے
قوت ایماں تری دنیا کو پھر حیراں کرے
اٹھ کے ناموس شریعت کی نگہبانی تو کر
جذبہ ایماں سے ملت کی چوپانی تو کر
دل میں تیرے ولولہ ایثار کا ہو موج زن
تا کہ ہر آتش کدہ کو تو بنا ڈالے چمن
اٹھ کے ہر دل میں فروزاں شمع ایمانی کرو
مشعل اسلام سے سینہ کو نورانی کرو
تیری مظلومی کی آہوں میں اثر ہوگا ضرور
ہو اگر کاشانۂ ایمان تیرا رشک طور
ہم نوا بن جائے گا تیرا زمانہ تو اگر
کرلے پیدا خالد و حیدر، عمر کا سا اثر (۲)
بنائے جارہے ہیں جام و ساغر میری مٹی سے
مجھی سے پھر بھی مے خانے کی زینت ہونے والی ہے

حواشی:

(۱) ان کے ہم وطن مولوی قرأۃ العین فائق انصاری بکڈ پو کے مالک نے بیخود دہلوی کی شاگردی کے بارے میں راقم کو بتایا تھا۔
(۲) اخبار محمدی یکم اکتوبر ۱۹۳۷ء

آزاد - عبدالرحیم

ــــ ۱۹۵۳ء (حیات)

اعظم گڑھ شہر میں اسی زمانے میں بہت سے متحرک شاعر تھے۔ عموماً تمام مشاعروں اور طرحی نشستوں میں ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ان کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کبیر احمد جائسی (۱۶/نومبر ۱۹۳۴ء ــــ ۷/جنوری ۲۰۱۳ء) نے ڈاکٹر شباب الدین

صاحب کو بتایا تھا کہ "۱۹۵۰ء۔ ۱۹۵۳ء کے آس پاس اعظم گڑھ کے نواح میں چھوٹے چھوٹے مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ علامہ اقبال سہیلؔ، مرزا احسان احمد بیگ، یحیٰ اعظمی صاحب تو ان مشاعروں میں شرکت نہ کرتے البتہ امینؔ اعظمی، منیف اعظمی، رحمت الٰہی برق، ایک غیر مسلم شاعر شیداؔ صاحب(۱) امجد علی غزنوی، حاجی عبدالغفور خستہؔ اور عبدالرحیم آزادؔ وغیرہ کے دم قدم سے یہ مشاعرے آباد تھے"(۲) ان کے مزید حالات وکلام تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملے۔

حواشی:

(۱) وشوناتھ پرساد شیداؔ اعظمی (۱۹۰۳ء۔ ۱۸؍ستمبر ۱۹۸۳ء) کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) شبلی کالج کا مایہ ناز فرزند، کبیر احمد جائسی۔ مرتبہ ڈاکٹر شباب الدین۔ باراول ۲۰۱۰ء ص۹۶

آزار - منشی غلام علی مبارک پوری

۔۔۔۔ ۱۸۹۹ء میں زندہ تھے

مبارک پور کے رہنے والے تھے تلاش معاش میں برہان پور چلے گئے تھے اور وہیں سے اپنا کلام خدنگ نظر لکھنؤ کو اشاعت کی غرض سے بھیجا تھا جو اردو کے مشہور صحافی نوبت رائے نظر کا نہایت مقبول جریدہ تھا۔ اس رسالے میں شائع ہوجانا خاص وقعت وشہرت کا باعث تھا

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے پہلے اوراس کے بعد مسلمانوں کی نقل مکانی کے بہت سے مذہبی، سیاسی، تکوینی اور معاشی واقتصادی اسباب تھے۔ انگریزوں کے خلاف اصل جہاد مسلمانوں نے کیا، علماء نے فرنگی حکومت کے خلاف فتوے دیئے اس لیے جن لوگوں کے بارے میں انگریزوں کو ذرا سا بھی شبہ ہوتا تھا کہ ان کا بغاوت سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہے یا کسی حریت پسند مردمومن کے قرابتدار یا اہل تعلق ہیں تو انہیں ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ قید کر کے طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں یا انہیں شہید کر دیا جاتا تھا۔ کاروبار کو تباہ کر دیا جاتا تھا۔ عموماً حیاکت پیشہ لوگوں پر زیادہ مشق ستم کی گئی۔ اس لیے جنوب کی طرف نقل مکانی کرنے والوں کی اکثریت بنکر برادری کی تھی۔ ۱۸۱۳ء، ۱۸۴۲ء، ۱۸۹۳ء، ۱۸۹۴ء، اور ۱۹۰۴ء میں بڑے بڑے فرقہ وارانہ فسادات

ہوئے، ۱۸۹۳ء میں گئو رکھشنی کی جارحانہ تحریک نے ضلع کے ۳۹ مقامات میں اپنا منفی اثر دکھایا۔ مئو کا فساد اس سال کا سب سے بڑا فساد تھا۔ ۱۸۰۴ء سے ۱۸۳۸ء تک باری باری اور ۱۸٦۸ء، ۱۸۷۸ء، ۱۸۹٦ء اور ۱۸۹۷ء میں سخت قحط پڑا اور اس ضلع کی ترقی کا سب سے بڑا دشمن بنا۔ ۱۸۰۳ء، ۱۸۰۴ء، ۱۸۹٦ء، ۱۸۹۷ء، ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں بہت بڑا طاعون آیا جس میں سیکڑوں گھر ویران ہوگئے۔ معاش ومعیشت کے بحران کی وجہ سے ملک کے دوسرے شہروں کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی یہاں کے باشندوں نے بودوباش اختیار کی۔ کچھ لوگ سوداگری کے سلسلے میں اور بعض حضرات تعلیم وتعلم یا بہی کھاتا لکھنے کی غرض سے بھی جنوب میں گئے۔ ان کے ساتھ منشی کا لفظ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یا تو یہ معلم پیشہ رہے ہوں گے یا حساب نویس وحساب داں۔

نمونۂ کلام

کیوں تری زلف سیہ پر شیفتہ دل ہوگیا — کیا اسے سوجھی کہ پابند سلاسل ہوگیا
دودِ آہِ آتشیں نکلا جو بل کھاتا ہوا — بولے وہ یہ الفت گیسو میں کامل ہوگیا
داغ عشق روئے تاباں! رفتہ رفتہ دیکھنا — خود کہیں گے وہ کہ یہ اب ماہِ کامل ہوگیا
جان لی بانکی ادا نے، دل لیا انداز نے — اک جگر تھا وہ بھی نذر تیغ قاتل ہوگیا
کس سے پوچھوں حال اے وحشت تو ہی آگاہ کر — کس پری رخسار کے بس میں مرا دل ہوگیا
دیکھئے آزاد کب ہوتا ہے بند زلف سے — بیٹھے بیٹھے شیفتہ آزآر کا دل ہوگیا(۱)

حواشی:

(۱) خدنگ نظر لکھنؤ جون ۱۸۹۹ء ص ۳ مدیر نوبت رائے نظر

آزرؔ-محمد نسیم جے راج پوری

۶/مارچ ۱۹۴۰ء — ۷/اکتوبر ۱۹۸۰ء

آزرؔ عبدالباقی جیراج پوری کے نہایت ذہین وفطین اکلوتے صاحبزادے تھے۔ لاڈ پیار میں پرورش وپرداخت اور تعلیم وتربیت پاکر کار جہاں بانی اور جہاں بینی کے لائق ہوگئے تھے۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ۱۹۵۷ء میں بی ایس سی، جامیہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے ۱۹۵۹ء میں ڈی ایڈ، اور بمبئی ٹریننگ کالج سے ۱۹۶۴ء میں بی، پی، ایڈ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۶۱ء میں پونا (مہاراشٹر) میں اسسٹنٹ ٹیچر کے عہدے پر ان کی تقرری ہوئی ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۰ء تک پونا ٹریننگ اسکول میں رہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں بھیونڈی ٹرانسفر ہوا وہاں پر ایڈ منسٹریٹیو آفیسر (A.o.) کی حیثیت سے برسر کار تھے۔ انھوں نے درسی کتاب بھی لکھی تھی جو داخل نصاب تھی، ان کی شادی مولانا عبدالسلام ندوی (۱۸۸۳ء۔۱۹۵۶ء) کی پوتی عفت بنت اخلاق احمد موضع علاء الدین پٹی سے ہوئی تھی جن کے بطن سے تنویر محمد نسیم، فرخ محمد نسیم، عشرت محمد نسیم، صہبا محمد نسیم چار اولادیں پیدا ہوئیں۔ ماشاء اللہ یہ چاروں درس وتدریس کے پیشے سے ہی منسلک ہیں۔ اہلیہ ابھی حیات ہیں اور سبکدوش ٹیچر کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

والد کی وراثت میں شعر وسخن کا نکھرا ہوا ذوق بھی ملا تھا۔ نظمیں اور غزلیں کہتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کے خوشہ چیں ہونے کی وجہ سے ذہن وفکر میں کشادگی اور سماجی شعور میں بالیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ جو کچھ لکھتے تھے اپنے دور کے ادبی رجحانات وافکار سے استفادہ کرتے ہوئے سپرد قلم کرتے تھے۔ ان کا کلام ان کے زمانے کے اخبارات ورسائل کی زینت ہوا کرتا تھا مگر تلاش بسیار کے باوجود ان کے اشعار دستیاب نہ ہو سکے۔

شاعر وادیب اور صحافی نیاز جیراج پوری (پ ۲۱رمئی ۱۹۶۰ء۔ ازروئے سند ۱۵رفروری ۱۹۶۰ء) نے راقم کو بتایا کہ جب گانو میں آتے تو اپنی نظمیں اور غزلیں سناتے تھے۔ انھوں نے ان کی ایک بیاض بھی دیکھی تھی جس میں سو سے زائد نظمیں اور غزلیں تھیں۔

آسی۔عبدالباری مبارک پوری

۱۹۴۵ء ـــــ ۲۸ر ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ/مئی ر۱۹۷۶ء جمعرات بوقت مغرب

ان کا مسقط الراس محلہ پورہ صوفی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ تھا۔ شجرہ یوں ہے عبدالباری آسیؔ بن محمد یٰسین بن شکر اللہ بن فقیر حسن۔ گھریلو مکتب میں ختم قرآن کیا۔ اردو کی ابتدائی تعلیم محلہ

کے مدرسہ دار التعلیم میں حاصل کی اور پرائمری کے کورس کو احیاء العلوم مبارک پور میں پڑھ کر مکمل کیا فارسی کی کریما جلی، گلستاں، بوستاں اخلاق محسنی کے بعد عربی کی ابتدائی کتابوں کے درس میں یہیں کے اساتذہ سے استفادہ کیا۔

بہت سرگرم اور فعال شخصیت رکھتے تھے۔ نو جوانوں کا ایک حلقہ قائم کر لیا تھا انہیں کے تعاون سے ناخواندوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ۱۹۷۱ء میں تنظیم نو کے نام سے ایک شبینہ مدرسہ جاری کیا تھا جس میں ۲۵ر طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے یہ خود ہی مدرس بھی تھے اور اس کے مہتمم و منتظم بھی، یہ شبینہ اسکول ان کی وفات کے بعد اگست ۱۹۷۶ء میں بند ہو گیا۔ وفات کی رات میں ۱۱ر بجے قبرستان شاہ کے پنجہ میں تدفین عمل میں آئی۔

بہت ذہین اور طباع تھے مشاعروں کے انعقاد میں عملی دلچسپی لیتے تھے۔ شاعری بھی کرتے تھے ان سے شاعری کی دنیا میں بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ کلام روایتی انداز کا ہوتا تھا۔ اپنے ہی محلہ کے ایک معمولی شاعر حاجی محمد عمر عامرؔ مبارک پوری سے مشورہ کرتے تھے۔ قدیم المریض تھے اور دق کی بیماری لاحق تھی۔ لکھنؤ وغیرہ کا بہت علاج کیا مگر ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' والا معاملہ تھا۔ افاقہ نہیں ہوا۔ عین جوانی میں ہنگامۂ زندگی سے منھ موڑ لیا۔ راقم الحروف سے بڑا اخلوص رکھتے تھے۔

نمونۂ کلام

عجب میکدے کا ہے قانون ساقی — کوئی تشنہ لب ہے کسی کو دوبارہ
تو آج کھول در میکدہ کو اے ساقی — کہ شیخ پینے پلانے کی بات کرتے ہیں
قفس میں کاٹ کے یہ لوگ بال و پر میرے — چمن میں مجھ کو اڑانے کی بات کرتے ہیں
مانا کہ آج غالبؔ و میرؔ و ظفرؔ نہیں — ایسا بھی تو نہیں ہے کہ اہل ہنر نہیں
چپکے سے کہہ دیا ہے ستاروں نے شمع سے — میری شب جدائی کی شاید سحر نہیں

آسیؔ اعظمی - بادشاہ حسین

ان کا کلام ماہ نامہ الواعظ لکھنؤ میں شائع ہوا ہے۔انجمن رفاہ المومنین رجسٹرڈ کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ان کی قومی وملی خدمات کے یادگار نقوش اس انجمن کے جریدۂ حیات پر ثبت ہیں۔مذہبی حس کے مالک اور پاکیزہ مذاق شاعری رکھتے تھے۔نوحے،قصیدے، سلام وغیرہ ان کی بلند ذوقی اور دینی اصناف سے شغف کی گواہی دیتے ہیں۔ان کا کلام محبت اہل بیت اطہار کے ترجمان رسالوں اور مناقب خاندان رسالت وامامت کے نقیب جریدوں کی زینت ہوا کرتا تھا۔اشعار سادہ اور آسان زبان میں کہتے تھے جس میں نثر کی سیسلاست اور روانی زبان پر ان کی مضبوط گرفت کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ان کے نوحے آسان زبان وبیان کے باوجود اپنی غمنا کی،حزن وملال اور درد وکرب کی وجہ سے خاصے کی چیز ہوا کرتے ہیں جنھیں پڑھ یا سن کر آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوجاتے ہیں اور شہیدان کربلا کے سینہ فگاروں پر ایک خاص کیفیت غم طاری ہوجاتی ہے۔ان کے بین بھی اپنی ایک علاحدہ ادبی شناخت رکھتے ہیں۔گریہ وزاری اور آہ وبکا ان کے نوحوں کے اہم عنصر ہیں۔انھوں نے غم واندوہ کی فضا بندی میں بھی فن کی جمالیاتی قدروں کی طرف سے اغماضِ نظر نہیں کیا اور فن کے تقاضوں پر پوری توجہ رکھی۔

نمونۂ کلام

پیاسے ہی اطفال سرور رہ گئے ۔۔۔ پانی کی خاطر بلک کر رہ گئے
پانی دریا سے جونہی لائے بریر ۔۔۔ مشک پر ہاتھ رکھ کر رہ گئے
کھل گیا منھ مشک کا یکبار گی ۔۔۔ بہہ گیا پانی تڑپ کر رہ گئے
لوٹتے تھے نم زمیں پر ہائے ہائے ۔۔۔ بوند پانی کو ترس کر رہ گئے
خالی کوزوں کو لئے اطفالِ شہ ۔۔۔ ہائے پانی پانی کہہ کر رہ گئے
جب دکھائی خشک اصغر نے زباں ۔۔۔ پھیر کر منھ کو ستمگر رہ گئے
حرملہ بدبخت نے مارا وہ تیر ۔۔۔ ہائے بیدم ہوکے اصغر رہ گئے

سامنے بہتی رہی نہر فرات اور تم پیاسے ہی دلبر رہ گئے
دیکھ لی آسیؔ نے معراج حسین یوں تو زیر تیغ سرور رہ گئے (۱)

حواشی:

(۱) الواعظ لکھنؤ ذبح عظیم نمبر۔ستمبر اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۱۸۶

آوارہ - مولوی محمد یوسف مبارک پوری

۱۹۰۵ء ـــــ ۷؍ستمبر ۱۹۶۶ء بدھ

حاجی کریم بخش اشرفی محلہ حیدرآباد کے نیاز احمد کے بیٹے تھے۔ نیاز احمد کے دو بیٹے خدا بخش اور حاجی کریم بخش اشرفی تھے وہ پیشہ پارچہ بافی سے منسلک تھے۔ حاجی کریم بخش کے تین بیٹے محمد شفیع سوداگر، محمد عمر اور مولانا محمد یوسف تھے۔ حاجی کریم بخش کی دو اولادا ناث بھی تھیں۔ کریم بخش اشرفی سید علی حسین شاہ اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ مولانا محمد یوسف انصاری بھی انھیں سے بیعت تھے اور مولانا کو خلافت بھی عطا ہوئی تھی۔

مولوی محمد یوسف انصاری بن حاجی کریم بخش محلہ حیدرآباد مبارک پور کی ابتدائی تعلیم مولانا نعمت اللہ مبارک پوری (متوفی ۱۳۶۲ھ) اور مولانا شکراللہ مبارک پوری (متوفی ۱۳۶۱ھ) کے ذریعہ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں ہوئی۔ اس کے بعد مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد میں جاکر کتب درسیہ کی تکمیل کی یہیں ۱۹۲۴ء میں الہ آباد عربی وفارسی بورڈ سے فاضل کا امتحان ۱۹؍برس کی عمر میں پاس کیا۔ سند فاضل میں جو ۱۶؍اپریل ۱۹۲۵ء کو جاری کی گئی ہے۔ ان کی عمر ۱۴؍سال درج کی گئی ہے تکمیل تعلیم کے اسی سال ۱۹۲۴ء میں مولانا محمد یوسف انصاری کی شادی پورہ دلہن میں ہوئی۔ کسی اختلاف کی وجہ سے نکاح باقی رہنے کے باوجود میاں بیوی پوری عمر ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے۔

صفر ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۸ء تک پونہ میں مدرس رہے۔ پھر ۱۹۲۸ء میں بمبئی چلے گئے۔ زندگی کا بیشتر حصہ بمبئی میں گزارا وہاں سنی جمعیۃ العلماء کے سکریٹری تھے۔ مدتوں تک سب سے الگ تھلگ رہے اور مختلف اخبارات میں مترجم اور کالم نویس رہے۔ خاتون کے نام سے ایک ہفتہ وار بمبئی

سے جاری کیا تھا(۱)۔بمبئی کے خلافت اخبار کے کالم نویس اور مدیر معاون بھی رہے۔اس اخبار کو ہمیشہ قدآور صحافیوں کی خدمات حاصل تھیں۔ یہ اخبار تحریک خلافت اور مولانا محمد علی جوہر کا ترجمان تھا۔اسی تعلق سے خلافت بلڈنگ بمبئی میں برسر کار تھے۔سر عبدالکریم سلک مل امیر ناتھ کے مالک عبدالکریم سیٹھ کی مالی اعانت سے ۸/دسمبر ۱۹۴۰ءکو ہفتہ وار ترجمان بمبئی کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ یہ ان کا ہفت روزہ اخبار تھا جس کی دھوم دور تک تھی۔ یہ ہفتہ وار ان کی ادارت میں پرنسس بلڈنگ بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ان کی صحافت پر روشنی ڈالتے ہوئے مومن محی الدین نے لکھا ہے کہ

''انھوں نے جواردو صحافت کی روایات قائم کیں ان کے اثرات مالیگاؤں، دھولیہ، برہان پور، بھیونڈی اور بمبئی وغیرہ میں محسوس کیے گئے۔ بیرون بمبئی کے سیاسی اکابر خلافت تحریک کے زمانے میں بمبئی آ کر بس گئے تھے۔ان میں دھولیہ کے اثر بن یحییٰ انصاری، مالیگاؤں کے مولانا محمد یحییٰ زبیر، مولانا عبدالحمید نعمانی، مولانا محمد یوسف انصاری وغیرہ تھے"(۲)

اس سے پہلے انہیں کے بارے میں اپنی اسی کتاب مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ کے صفحہ ۸۹۴ پر وہ لکھ چکے ہیں کہ

برادری کی دوسری ممتاز شخصیت مولوی محمد یوسف بن حاجی کریم بخش انصاری مبارک پوری جو برہان پور اور بھیونڈی سے بھی تعلق خاطر رکھتے تھے اور مولانا شوکت علی کے زمانے میں خلافت اخبار سے منسلک تھے رئیس احمد جعفری کے ساتھ اخبار کے نائب مدیر بھی رہے بعد میں اپنا اخبار ترجمان پرنسس بلڈنگ بمبئی سے نکالا''۔

مولانا کی شخصیت مبارک پور میں کم رہنے کی وجہ سے اہل وطن کے سامنے اجنبی جیسی تھی۔ یہاں کے کم لوگ ان کی علمیت وصلاحیت اور تحریکی حیثیت سے واقفیت رکھتے تھے۔مبارک پور کے باشندوں کے لیے بظاہر یہ کوئی گمنام مبارک پوری ضرور تھے لیکن برہان پور، بمبئی اور بھیونڈی کے ارباب بصیرت کے نزدیک ان کی بلند قامتی اور علمی وتحریکی سرگرمیوں کا ایک وزن واعتبار تھا۔ صحافت ، سیاست اور تحریک خلافت نے مبارک پور کے اس گم گشتہ ماہ کنعان اور یوسف بے کارواں کو اپنی زمانہ ساز اور عہد آفریں جولانیوں سے منسلک کر کے صوبہ مہاراشٹر کی کارگاہ مردم

گری کا زمانہ شناس مرد کار بنا دیا تھا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی ان کے تعلیمی وسیاسی، علمی وتمدنی اور ادبی وفکری اثبات بہار کی گواہ بنی ہوئی ہے۔ یہ مقامی مدرسہ دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کے سرگرم رکن بھی نامزد رہے ہیں۔ راقم کو ان کے بھتیجے حاجی شفیق احمد اشرفی کے توسط سے اخبار کا ایک تراشہ ملا ہے جس میں ان کے انتقال کی خبر محمد ایوب انصاری برہان پوری کی جانب سے شائع کی گئی ہے اس تراشہ میں اخبار کا نام اور تاریخ وصفحہ درج نہیں ہے مگر اس سے مرحوم کے حالات وتخصصات کے متعلق نادر معلومات فراہم ہوتی ہے۔ عبارت یہ ہے

''حلقۂ متعلقین واحبّاء میں یہ خبر باعث رنج والم ہے کہ جناب مولانا محمد یوسف انصاری مبارک پوری ناظم دارالیتمیٰ ودارالعلوم صمدیہ بھیمڑی کا انتقال ۷ر ستمبر ۱۹۶۶ء بروز بدھ شام کے سوا سات بجے ہو گیا۔ آپ پر جمعہ کے دن بتاریخ ۲ر ستمبر (۱۹۶۶ء) فالج کا حملہ ہوا تھا جس سے جانبر نہ ہو سکے۔

مرحوم ایک علم دوست، خلیق وملنسار شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ایک عرصہ تک روزنامہ خلافت والہلال کے جوائنٹ اڈیٹر رہے۔ ماسوا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی بمبئی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بحیثیت معلم دارالعلوم للت پور، انجمن اسلام اسکول پنچ گن، عبدالستار شعیب اسکول بمبئی، وکٹوریہ جوبلی ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ ماٹنگا بمبئی میں بھی علمی خدمات انجام دی ہیں۔ تقریباً آٹھ سال قبل دارالیتمیٰ ودارالعلوم صمدیہ بھیمڑی میں ناظم مقرر ہوئے اور آخر عمر تک خدمت کی۔

دارالعلوم صمدیہ کی نسبت سے اہلیان بھیمڑی سے مولانا مرحوم کے کافی مراسم تھے۔ اس وجہ سے آپ کو سرزمین بھیمڑی میں سپرد خاک کیا گیا۔ جنازہ میں کافی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔

جناب سیٹھ عبدالشکور صاحب، جناب سیٹھ محمد ایوب پنجابی صاحب، نیز امین سردار وحسن مقادم صاحبان نے مولانا کی علالت سے لے کر وفات تک کافی حصہ لیا اور تمام کاموں کو بخیر وخوبی انجام دیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور جملہ متعلقین واقرباء اور پس ماندگان کو صبر کی تلقین عطا فرمائے۔ آمین۔ سوگوار محمد ایوب انصاری برہان پوری''۔

مولانا عربی وفارسی اور اردو زبانوں پر دسترس رکھنے کے ساتھ انگریزی زبان سے بھی

واقف تھے۔ وہ سادہ دل، کم گو، خاموش طبع، سادہ مزاج اور سادہ لوح قسم کے عالم تھے۔ زمانہ شناس ہونے اور علم کی مختلف شاخوں میں کمال رکھنے کے باوجود وہ مذہبی تصنع اور دکھاوے سے کوسوں دور تھے۔ وہ عام لباس پہنتے تھے۔ ہجوم میں ہوتے تھے تو کوئی ان کی سادگی کی وجہ سے ان کی علمیت و شخصیت کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ وہ عام مولویوں کی طرح حرام وحلال کا ورد نہیں کرتے تھے۔ ان کی ساری توجہ باطنیت اور مغز پر ہوتی تھی۔ مدرسہ صمدیہ کے سامنے بڑا وسیع صحن تھا۔ اسی میں بچوں کے کھیلنے، پتنگ اڑانے، لٹو نچانے، کشتی لڑنے کا انتظام تھا۔ وہ پیچ لڑانے، لٹو پر لٹو مارنے اور کھیل میں بازی لگانے سے روکتے تھے۔ کیونکہ بازی کو اسلامی شریعت کے منافی سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔ رام پوری ٹوپی پہنتے تھے۔ صبح کو کباب منگاتے اور اسی سے ناشتہ کرتے تھے مگر ہمیشہ اس میں لانے والے کے لیے حصہ بچا دیا کرتے تھے اور اصرار کر کے اس کو کھلاتے تھے۔ وہ بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف تھے۔ اپنے گرد مصنوعی پرہیزگاری کا حصار نہیں رکھتے تھے۔ تربیت کا ایک خاص ملکہ رکھتے تھے صمدیہ کی نظامت کے دور میں اگر مدرس غیر حاضر رہتے تو ان کی جگہ خود درس دینے لگتے تھے ان کے ۱۹۵۷ء کے بہت کم عمر شاگرد لطیف جوہر نے پونے سے موبائل پر راقم کو بتایا ہے کہ

"وہ نئی سوچ اور مثبت فکر رکھنے والے ناظم و مدرس تھے۔ ان کی تعلیم سے ذہن میں بالیدگی پیدا ہوتی تھی اور چھپی ہوئی صلاحیتوں میں بیداری آتی تھی۔ وہ اپنی قوم کی ترقی و فلاح کی راہیں تلاش کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ طلبہ کو تعلیم کا مناسب ماحول ملے اور آنے والے دور کے تقاضوں کے تحت رجحان سازی کی سچی لگن پیدا ہو اس کی تدبیریں وہ سوچتے رہتے تھے۔ لطیف جوہر نے بتایا کہ ۱۹۵۷ء میں مولانا عبدالمصطفیٰ اعظمی بھی صمدیہ کے بہت اچھے مدرس اور کئی صلاحیتوں کے حامل عالمِ دین تھے مگر شعور کی ناپختگی کے زمانے میں بھی مجھ پر جو اثر مولانا محمد یوسف کا پڑا ہے اور جس کی وجہ سے ابھی تک وہ میری یادوں کا روشن چراغ بنے ہوئے ہیں اس درجے تک میں مولانا اعظمی کا اثر قبول نہیں کر پایا۔ ان کی ماڈرن سوچ اور وقفے وقفے سے موقع و محل کی مناسبت سے ان کی تربیت کو میں ابھی تک بھول نہیں پایا ہوں۔ ان کی ہدایات آج عملی دنیا میں میری سب سے اچھی رہنما ہیں"۔

مدرسہ صمدیہ لطیف جوہر کے زمانے (۱۹۵۷ء) میں چھوٹا سا ادارہ تھا مگر تعلیم فاضل تک ہوتی تھی۔ کئی اچھے اساتذہ تعلیم و تعلم میں مصروف تھے۔ چندہ شاید ہی کسی سے لیا جاتا رہا ہو۔ طلبہ کو کھانا، کپڑا، جوتا، چپل اور بہت کچھ مدرسے کی طرف سے مفت مہیا کیا جاتا تھا۔ کھانا بہت اچھا ہوتا تھا۔ جوتے کے لیے چمڑا خرید کر جوتا ساز کو مدرسے میں ہر طالب علم کے ناپ کے لیے بلایا جاتا تھا اور سارا خرچ مولانا محمد یوسف کے عمزاد بھائی صمد سیٹھ برداشت کرتے تھے۔ صمد سیٹھ کے ایک ہی لڑکے محمد یونس کے نام سے تھے۔

مولانا یوسف سیاسی نظریئے میں مسلم لیگ سے متفق تھے اور اس کے سرگرم رکن تھے اس سے پہلے وہ خلافت میں تھے۔ یہ برہان پور کے مشہور مخیر اور متمول شخصیت سیٹھ حاجی محمد یعقوب انصاری کے عم زاد بھائی تھے۔ یہ مولانا موصوف کی سرگرمیوں میں معاونتِ مالی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ یوسف انصاری نے تحریک آزادی میں تندہی کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ وہ تقریریں بھی کرتے تھے مگر یہ تقریریں سیاسی زیادہ اور مذہبی کم ہوا کرتی تھیں۔ بڑی انجمن ساز شخصیت کے مالک اور اصابت رائے رکھنے والے تھے۔ غیرت وخودداری ان کے خمیر میں شامل تھی اسی لیے اپنے فیصلے پر اٹل رہا کرتے تھے۔ واقعات کا اثر زیادہ دنوں تک ان کے دل ودماغ پر چھایا رہا کرتا تھا۔ وہ شگفتہ مزاج اور مزاحِ ملیح سے آشنا طبیعت رکھنے کے باوجود زودرنج تھے۔ آوارہ بمبئی کے نام سے فکاہی کالم لکھتے تھے۔ قلم میں شوخی اور شوخی میں بھی سوچنے اور سمجھنے کے کئی پہلو اور زاویئے پیش نظر رکھتے تھے۔ ان کے مزاح میں اثبات حیات اور تعمیر زندگی کا عنصر شامل تھا وہ شوخی تحریر سے اصلاح وفلاحِ انسانیت کا کام لیتے تھے۔ ان کا جذبۂ جہاں سازی ان کی فکاہی تحریروں سے بھی عیاں تھا۔

انھوں نے ترکی سلاطین کی ایک مختصر تاریخ بھی لکھی تھی جس کے کچھ حصے رسالوں میں چھپے تھے۔ اس کے دیباچہ میں جو قلمی ہے ترکی سلاطین کی مکمل اور مفصل تاریخ لکھنے کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں: ''اگر یہ تصنیف مقبول ہوگئی اور خدا نے توفیق بخشی تو اس کے بعد ترکی سلاطین کی مکمل ومفصل تاریخ پیش کی جائے گی''۔ قلمی نسخہ ان کے بھتیجے سلطان احمد کے پاس تھا جس کو راقم نے دیکھا

تھا۔ مگر اب بتاتے ہیں کہ سلطان کے بیٹوں کے پاس وہ نہیں ہے۔ الاصلاح ہفتہ وار بمبئی کی ۱۶؍مئی ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں اس کتاب کے کچھ حصے سلطان مراد اور سلطان عبدالحمید تک چھپے ہیں۔

مولانا موصوف ادیب وصحافی اور مرد سیاسی کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ آورہ تخلص کرتے تھے۔ راقم کو ترجمان ہفتہ وار بمبئی کے چند شمارے ملے تھے جن میں ان کے گیت اور کچھ اشعار تھے۔ توقع ہے کہ ترجمان کے دوسرے شماروں میں بھی مزید اشعار چھپے ہوں گے۔ دستیاب اشعار سے ان کی خوش گوئی، ہجر وفراق کی آہِ سرد، عشق ووصال کی خواہش اور ان کے رنگ غزل کا کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ زبان صاف اور شائستہ لچکی کی نمائندہ ہے۔ غزلوں کے اشعار میں فکری پہلو شامل کیے گئے ہیں اور زندگی کی تلون مزاجی وتغیرات زمانہ پر بھی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ زندگی کے حسن وجمال کو فرد کی عمر کے حساب دوش وفردا کے پیمانے سے ناپ کر ایک فیصلہ سنایا گیا ہے۔ دم صبح چاند کے پھیکے پن کی وجہ طلوع آفتاب سے پہلے کا سپیدۂ سحری ہے۔ اور یہ بھی ایک حسن آرا ہے۔ صبح وشام روز شب اور فرد کی حیثیت آنی جانی ہے۔ مگر کائنات کے حسن کا تسلسل کائنات کے باقی رہنے تک ہے۔ انسان آتا جاتا رہے گا مگر کائنات اپنے حسن کے ساتھ قیامت تک باقی رہے گی۔ فرد کی زندگی سے اس کا کوئی ربط نہیں البتہ اس سے فرد کی زندگی کا رشتہ ضرور ہے۔

نمونۂ کلام

من میں ٹیس اٹھت ہے ہائے
نیناں مورے نیر بہائے
بیا کل من ہے کچھ نہ سہائے
اسی کو کہتے ہیں پریت شاید اسی کو کہتے ہیں پریت

اٹھا ہے طوفاں من کے اندر
باڑھ پہ آئے جیسے سمندر
ٹوٹ گیا اف من کا مندر
اسی کو کہتے ہیں پریت شاید اسی کو کہتے ہیں پریت

مانو کوئی دل میں بست ہے
شوخ ہے ناہیں دھیر دھرت ہے
اپنے چھل سے رام کرت ہے
اسی کو کہتے ہیں پریت شاید اسی کو کہتے ہیں پریت (۳)

تجھ کو آنا ہے تصور میں تو اس شان سے آ ۔۔۔ ہر تصور ترا دیدار میں شامل ہوجائے
صبح دم چاند پڑ گیا پھیکا ۔۔۔ حسن کا اعتبار کون کرے (۴)

حواشی:

(۱) تذکرۂ علمائے مبارک پور قاضی اطہر مبارک پوری۔ باراول جون ۱۹۷۴ء ص ۲۸۴

(۲) مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ۔ باراول مارچ ۱۹۹۴ء ص ۹۰۴

(۳) ہفتہ وار ترجمان بمبئی ۲۲ر فروری ۱۹۴۱ء

(۴) ایضاً ۱۶ر مارچ ۱۹۴۱ء

ابوذرؔ/ احمدؔ- سید احمد علی عرف ابوذر کرہانی

تخمیناً ۱۸۸۶ء ــــ ۱۹۷۶ء (۱)

سید علی جعفر ذکاؔ رئیس موضع کرہاں ضلع اعظم گڑھ کے چھوٹے صاحبزادے اور اردو کے مشہور شاعر ونقاد، ادیب ومحقق سید علی جواد زیدی (۱۰ر مارچ ۱۹۱۶ء۔ ۶ر دسمبر ۲۰۰۴ء) کے حقیقی ماموں تھے۔ لغت، منقبت، سلام ومرثیہ کے علاوہ دوسری اصناف سخن سے دلچسپی نہیں تھی۔ چند غزلیں بھی کہی تھیں۔ کلام کی تدوین کی کوشش نہیں کی اور نہ اس کی اشاعت سے دلچسپی رکھی۔ اس لیے بیشتر کلام ضائع ہوگیا۔ قصائد میں احمد اور ابوذر دونوں ہی تخلص استعمال کرتے تھے (۲)۔ ان کے تعلق سے دوسری جگہ زیدی صاحب ارقام فرماتے ہیں۔

"حضرت میر شمس الدین عرف میر شمسی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے اور اطراف کے بڑے رؤسا میں شمار تھا۔ شعر وشاعری خاندانی ورثہ تھا۔ دادا سید باقر حسین جمیلؔ اور والد سید علی

جعفرؔ ذکا بھی شاعر تھے اور ان کے منجھلے بھائی سید محمد رساؔ بھی۔ کتب بینی اور شاعری، زمینداری کے علاوہ یہی دو مشغلے تھے۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ اور سلام سب کچھ کہا ہے۔ مقاصدوں اور مشاعروں میں شریک بھی ہوتے تھے لیکن اپنے کلام کی اشاعت کی پروانہیں کی اور بہت سا کلام دستبرد زمانہ سے ناپید ہو چکا ہے۔

شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے لیکن کبھی کبھی سید زکی حسین عرف عارف محمدآبادی مرحوم کو دکھالیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بیسیوں برس زندہ رہے لیکن پھر کسی کو کلام نہ دکھایا"۔(۳)

سید علی جواد زیدی نے احمدؔ کے چھ سلام سید خورشید احمد کرہانی سابق مدیر نیا دور لکھنؤ کی وساطت سے حاصل کر کے شائع کرائے ہیں اس کے بارے میں مدیر سرفراز نے اپنے نوٹ میں لکھا ہے کہ (سلام نمبر ۶) کسی غلط فہمی کی بنا پر احمد کرہانی سے منسوب ہو گیا ہے۔ دراصل یہ سلام دولہا صاحب عروجؔ مرحوم کا ہے۔

ابوذر میاں کو دینی اداروں کے قیام سے بھی ایک خاص قسم کی دل چسپی تھی۔ انھوں نے مدرسہ باب العلم مبارک پور کی تاسیس (۲۱ر مارچ ۱۹۲۹ء ۹ر شوال ۱۳۴۷ھ) میں اپنی خاص دل چسپی کا اظہار فرمایا تھا اور انہوں نے ہر موقع پر دل کھول کر اس کی مالی معاونت پوری عمر تک فرمائی تھی۔ آخری عمر تک وہ اس ادارہ کے مربی اور کرم گستر تھے اس کے دینی اجلاس میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ ان کی زمینداری مبارک پور کے دیہاتوں تک تھی۔ اس سلسلے میں بھی کبھی کبھی ان کا ادھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔

سید ابوذر مشرقی تہذیب و شرافت کی یادگار تھے۔ وہ مذہبی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے لیکن مذہبی تنگ نظری ان کو چھو تک نہ گئی تھی۔ مذہب کو وہ بالکل ذاتی اور انفرادی چیز سمجھتے تھے۔ اس لیے انسانیت اور رواداری کو فوقیت دیتے تھے۔ یہ اگرچہ جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ تھے اور سرکار انگلشیہ کی حمایت کو خاندانی وجاہت کے لیے مناسب سمجھتے تھے لیکن تحریک آزادی کی انقلاب آفریں سرگرمیوں کے وہ دل سے قدرداں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بھانجے علی جواد زیدی کو قومی و وطنی سرگرمیوں سے کبھی منع نہیں کیا بلکہ قید سے رہائی پر اجلاس تبریک کے انعقاد کو

پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔جس کا ذکر زیدی صاحب نے اپنی سرگزشت" یادوں کی رہ گزر" میں بھی کیا ہے۔

ابوذر نے مذہبی شاعری کی طرف بطور خاص توجہ دی۔ان کی یہ توجہ نہ رسمی تھی نہ کسی مصلحت اندیشی کا شکار تھی۔ان کی توجہ کا بنیادی سبب یہ تھا کہ انکا طبعی میلان ہی دین و مذہب کی طرف تھا۔انہیں مشرقیت، انسانیت، رواداری، مشرقی اقدار اور دینی موضوعات سے شروع ہی سے غایت درجہ کی دل چسپی رہی ہے۔اگرچہ ان کی شاعری نے اپنے عہد کی عام روش سے گریز اور مروجہ اسالیب سے کبھی انحراف نہیں کیا۔پرانی ترکیبیں،تشبیہیں، علامتیں،تلمیحیں، استعارے، محاورے اور لفظ استعمال کرنے میں وہ کسی تکدر کا شکار نہیں ہوئے اس کے باوجود ان کا کلام اپنے اندر ایک خاص چاشنی رکھتا ہے۔زبان نہایت شستہ، رواں، اور اشراف وانجاب سخنوری کے خاندان کی تربیت یافتہ ہے۔بعض اشعار تو سہل ممتنع کی نظیر بن گئے ہیں۔ان کی شاعری ہماری شعری ولسانی روایات اور تہذیبی وتمدنی ثمرات ونتائج کا ایک قابل قدر حصہ ہے۔جب ہم ان کی شاعری کا مطالعہ اپنے تہذیبی وقومی اور فکری وفنی پس منظر میں کرتے ہیں تو ایک بے نام سی لذت اور ایک خاص قسم کے روحانی، انبساط و اہتزاز کا احساس ہوتا ہے۔ابوذرؔ جیسے باکمال شاعر دیہات اور وسائل سے محروم دور افتادہ بستیوں میں رہے مگر انہوں نے اپنے علم ومطالعہ، ذہانت وذکاوت کے سہارے علم وادب اور شعر وحکمت کی مشاطگی جس بلند ذوقی اور کمال متانت سے کی وہ بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔آج کی دنیا ایک قطبی ہے۔الکٹرانک مشینوں نے جغرافیائی وسعتوں کو سمیٹ کر تمام عالم کو ایک گانو میں تبدیل کرکے رکھ دیا ہے۔ایسے دور میں ابوذر جیسے ذہین وطباع اور روشن فکر کے حامل فنکار کے کمالات کا احساس وعرفان آسان نہیں لیکن جو نگاہیں ماضی کی گرد کی تہوں کو ہٹا کر حقائق ودقائق کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں ان سے ان قریاتی شاعروں کی بلند قامتی اور فکری اصابت وصلابت پوشیدہ نہیں۔

نمونۂ کلام

کام آئی آل احمد کی ولا میرے لیے　　بہر بخشش اک ذریعہ بن گیا میرے لیے

دیکھنا ہاتھوں میں ہوگا میرے دامان علی / حشر میں بن جائے گا یہ رہنما میرے لیے
پھر گیا آ کر فرشتہ موت کا امسال بھی / رحم کھا کر کی مسیحا نے دعا میرے لیے
رک گئی جا کر دعا باب اجابت پر مری / آئے گی وقت معین پر قضا میرے لیے
جی میں یہ تھا اڑ چلوں میں یثرب وشہر نجف / ناتوانی بن گئی زنجیر پا میرے لیے
کیوں اٹھاتا اے ابوذرؔ آخر احسانِ مسیح / کربلا کی خاک ہے خاک شفا میرے لیے
ہر اک لوحِ لحد تفسیر ہے آباد دنیا کی / نہ جانے کتنی تاریخیں لیے شہر خموشاں ہے
سفر در پیش ہے اے ناشناس منزل و جادہ / مہیا کر لے زادِ راہ تو منزل بھی آساں ہے
تصور کے اندھیروں سے نہ گھبرا روشنی کر لے / محبت مصطفیٰ کی، آل کی، شمع فروزاں ہے
خدا کے فضل سے دنیا میں ہم نام ابوذرؔ ہوں / مرے ساغر میں موجِ بادۂ عرفان وایماں ہے

سلام ترانہ (۱)

جب پڑی ضرب شہ تشنہ دہاں بالائے سر / اشقیا سمجھے گرا کوہِ گراں بالائے سر
کیوں نہ ہو حر جری بشاش وخنداں وقت مرگ / ہے حسین ابن علی سا قدر داں بالائے سر
پیشوائی کے لیے آیا ہے رضواں خلد سے / مروحہ جنباں ہیں حوران جناں بالائے سر
مثل سبزہ خواب میں گزری بہار زندگی / تب کھلیں آنکھیں جب آ پہنچی خزاں بالائے سر
چین سے مدفن میں سوئے آکے باغ دہر سے / شورِ قمری ہے نہ بلبل کی فغاں بالائے سر
کس قدر ہوتی ہے غربت کی بھی حسرت ناک موت / دوست پہلو میں نہ کوئی مہرباں بالائے سر
قبر تک مشکل سے پہنچایا احبّا نے مجھے / تھا گناہوں کا جو اک بارِ گراں بالائے سر
کہہ رہی ہے یہ سفیدی موئے سر کی اب تو جاگ / دھوپ آ پہنچی ہے او غفلت نشاں بالائے سر
لے چلے احمدؔ نہ ہم دنیا سے کچھ زاد سفر / ہاں گناہوں کا ہے اک بار گراں بالائے سر

سلام (۲)

پیش حمد جو مسلم ہو سلام ایسا تو ہو / بے سخن خوش ہوں علی جس سے کلام ایسا تو ہو
گلستانِ نظم کا ہاں انتظام ایسا تو ہو / بلبل سدرہ چہک اٹھے کلام ایسا تو ہو
ہو چکی تھی کشتی دیں کفر کے دریا میں غرق / پار بیڑا کر دیا حر کا، امام ایسا تو ہو

پی چکا ہوں وہ مئے حب علی روز ازل کیف جس کا تا ابد یکساں ہے، جام ایسا تو ہو
وقتِ رحلت زانوئے شبیر پر تھا حر کا سر سر بلند اتنا تو ہو ، عالی مقام ایسا تو ہو
یا علی کہتے ہی آساں مشکلیں سب ہوگئیں اسم اعظم کا اثر جس میں ہو نام ایسا تو ہو
جب در خیبر اکھاڑا شور تھا بالائے عرش دست خالق با زوئے خیر الانام ایسا تو ہو
پہلے روکا حر نے شہ کو ، ہوگیا پہلے نثار اس طرح بدنام ہوکر نیک نام ایسا تو ہو
وقت رحلت شیعوں کو آتے ہیں لینے کو علی خلد کی جانب سفر کا اہتمام ایسا تو ہو
شکر ہے احمدؔ ! ہوئی آسان مشکل نزع کی پنجتن بالیں پہ آئے ، اختتام ایسا تو ہو

(سلام ۳)

نمازیں صبح کی پڑھ پڑھ کے سب انصار بیٹھے ہیں کمر باندھے،لگائے جنگ کے ہتھیار بیٹھے ہیں
لیے داغِ غمِ شہ دل میں ماتم دار بیٹھے ہیں سلامی ! ہے وہ ماتم کہ سبھی خونبار بیٹھے ہیں
حبیب ابن مظاہر گو جھکے ہیں ضعف پیری سے مگر کھینچے جوانوں کی طرح تلوار بیٹھے ہیں
کہا عباس سے شہ نے نہ جاؤ نہر پر بھائی لعیں ساحل پہ سب آمادۂ تکرار بیٹھے ہیں
دم رحلت کسی نے اور بھی توقیر یہ پائی دھرے زانو پہ سر حر کا شہ ابرار بیٹھے ہیں
کہا بانو نے زینب سے ہوا کچھ آپ پر ظاہر پئے رخصت شبیہ احمد مختار بیٹھے ہیں
جواں بھائی کے مرنے سے چلا جاتا نہیں شہ سے کمر پکڑے زمیں پر سید ابرار بیٹھے ہیں
لٹا کر لاشئہ ، اکبر کہا شبیر نے رو کر چلے تم خلق سے، جینے سے ہم بیزار بیٹھے ہیں
بپا ہے حشر مجلس میں عزاداروں کے رونے سے شہِ مظلوم کا ماتم ہے سب خونبار بیٹھے ہیں
بھلا کیوں کر نہ مشکل نزع کی آساں ہوا ے احمدؔ سرِ بالیں وصیِ احمدِ مختار بیٹھے ہیں

(سلام ۴)

خلیل آگ میں ہیں لالہ زار کون کرے یہ لطفِ خاص بجز کرد گار کون کرے
پیوں گا خم سے بس اب انتظار کون کرے سوالِ ساغرِ مے ، بار بار کون کرے
علم ہے تیغ علی رو پہ وار کون کرے حسین غیظ میں ہیں آنکھ چار کون کرے
پسر سے کہتی تھیں زینب شبِ دہم دیکھوں تاسّیِ اب وجد اختیار کون کرے

کہا یہ سن کے محمد نے عون سے چلئے سحر کے ہونے کا اب انتظار کون کرے
کہا یہ بھائی سے حر نے چلو سوئے شبیر ٹھہرنا شاق ہے اب انتظار کون کرے
ہزار شکر کہ آئے علی لحد میں مری زمیں کو حکم نہیں ہے فشار کون کرے
علی کے رتبہ اعلیٰ کو کوئی کیا جانے جو بے شمار ہے اس کا شمار کون کرے
یہ ذوالجناح سے کہتے تھے شہ بہ حسرت و یاس حسین رہ گیا تنہا سوار کون کرے
پڑے ہیں لاشۂ شہدائے کربلا افسوس کوئی نہیں ہے سپرد مزار کون کرے
خیالِ اصغرِ ناداں میں کہتی تھی بانو لحد میں آج اکیلے ہو پیار کون کرے
ملا ہے رتبۂ مداحِ علی صد شکر خدا کے فضل کا احمدؔ شمار کون کرے

(سلام ۵)

نہیں رکھتے ہیں سر بستۂ اہلِ کرم توڑے لٹا دیتے ہیں حق کی راہ میں عالی ہمم توڑے
سراعدائے دیں حیدر نے یوں مثل صنم توڑے ملی مہلت نہ اتنی بھی تڑپ کر کوئی دم توڑے
اگر خارِ رہِ کرب وبلا ہاتھ آئے انساں کو تو یہ سمجھے کہ دنیا میں گل باغ ارم توڑے
جہاں میں یہ شرف جز مرتضیٰ کس کو ہوا حاصل کہ دوش مصطفیٰ پہ چڑھ کے کعبے میں صنم توڑے
لڑے عون و محمد واہ کیا کیا فوجِ اعداء میں صفیں الٹیں، نشاں چھینے، سرِ اہلِ ستم توڑے
لقب دست خدا کا ہے اسی کے واسطے زیبا درِ خیبر کو جو دو انگلیوں سے بے الم توڑے
ستم ہے اے فلک اعدا تو ہوں سیراب دریا سے عطش سے اصغرِ بے شیر گہوارے میں دم توڑے
کہا شہ نے بہن سے یہ بھی لکھا تھا مقدر میں علی اکبر سا بیٹا سامنے آنکھوں کے دم توڑے
بس اب اے احمدؔ شیریں بیاں تو روک لے خامہ کہ نامی شاعروں نے اس زمیں میں بھی قلم توڑے

حواشی:

(۱) سید علی جواد زیدی نے سرفراز لکھنؤ کے ذبح عظیم نمبر ستمبر و اکتوبر ۱۹۸۴ء میں صفحہ ۶۰ پر ان کے مختصر حالات میں سال وفات ۱۹۸۰ء لکھا ہے اور راقم کو جو سلام بھیجا ہے اس میں اپنے قلم سے ۱۹۷۸ء درج کیا ہے مگر قصیدہ نگاران اتر پردیش طبع دوم ۱۹۸۳ء میں صفحہ ۷۸ پر ولادت ۱۸۸۶ء اور وفات ۱۹۷۶ء کی لکھی ہے۔

(۲) قصیدہ نگاران اتر پردیش سید علی جوادزیدی۔طبع اول ۱۹۷۸ء ص ۶۹ وطبع دوم ۱۹۸۳ء یو پی اردو اکیڈمی لکھنؤ ص ۸۷۔

(۳) علی جواز یدی احمد کرہانی کے چھ سلام۔مشمولہ سرفراز لکھنؤ ذبح عظیم نمبر ستمبر واکتوبر ۱۹۸۴ء ص ۶۰

ابوالحسن - مولانا ابوالحسن مئو

۱۲۹۶ھ — ۱۳۶۱ھ

اپنے اشعار میں کبھی ابوالحسن اور کبھی ابوالحسنات تخلص فرماتے تھے۔نعتیں اور مذہبی شاعری ان سے منسوب ہیں۔مئوناتھ بھنجن کے علمائے فحول میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔آپ کے درس سے کثیر تلامذہ نے استفادہ کیا تھا۔ان کے پڑھانے کا ایک خاص معیار ومزاج بھی تھا اور عبارت کی تفہیم کا وہ اچھا سلیقہ بھی رکھتے تھے۔اسی کے ساتھ سہ لسانی شاعر بھی تھے مگر اپنی شاعرانہ حیثیت کو ثانوی درجے میں رکھتے تھے اور اس باب میں کوئی ادعا یا تعلّی ان سے منسوب نہیں ہے۔والد کا نام شیخ عبداللہ (متوفی ۱۳۳۷ھ) تھا۔یہ شیخ صاحب ایک اہل اللہ اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔مشہور ومعروف بزرگ عارف باللہ حضرت چاند شاہ ٹانڈوی کے مرید اور فیض یافتہ تھے۔

مولانا ابوالحسن کے دو اور بڑے بھائی مولانا عبدالغفار مئوی متوفی ۱۳۴۱ھ اور مولانا ابوالبرکات مئوی متوفی ۱۳۳۲ھ۔عالم باعمل اور ذوق سخن سے آشنا تھے۔یہ تینوں بھائی تعلیم وتدریس اور وعظ وتلقین کے کار مردم سازی سے وابستہ تھے۔مولانا ابوالحسن نے گھر پر رہ کر ابتدائی تعلیم مکمل کی۔پھر اپنے بڑے بھائی مولانا عبدالغفار سے مدرسہ انوار العلوم تو انگر ضلع بلیا میں جملہ علوم وفنون میں درک پیدا کیا۔سند فراغ کے بعد مختلف مدارس اسلامیہ میں مسند درس کو رونق بخشی۔جامعہ مفتاح العلوم مئو میں ایک مدت تک ناظم رہ کر طلبہ کو اپنے فیضان علمی سے بہرہ مند کیا۔قصبہ لار ضلع بلیا میں مدرسہ مفیض العلوم قائم کر کے اس کی ترقی واستحکام کی راہیں ہموار کیں۔انہیں مشاغل کے ساتھ حفظ قرآن کی دولت بھی حاصل کی تھی اور ہر سال رمضان میں تراویح بھی پڑھاتے تھے۔انہیں سلوک ومعرفت سے بھی حصہ ملا تھا، اعظم گڑھ کے مشہور مرشد حضرت حافظ حامد حسن کوہنڈوی کے سلسلۂ اصلاح وتربیت میں

داخل تھے۔مولانا اشرف علی تھانوی سے بھی خلافت واجازت پائی تھی۔ اہل اللہ اور علماء وصلحاء سے انہیں بڑا تعلقِ خاطر تھا۔زمانہ تدریس میں مولانا انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (۱۲۹۲ھ-۵۲-۱۳ھ) کی خدمت میں حاضر ہوکران سے سماعت حدیث کی سعادت حاصل کی تھی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دور میں علماء کے تمغۂ امتیاز میں جن علوم وفنون کو اہمیت حاصل تھی مولانا ابوالحسن کو ان علوم دینیہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ مولانا فتویٰ نویسی، علم الفرائض اور تفقہ فی الدین میں تخصص کے درجے پر فائز تھے۔دارالعلوم دیوبند کی تحریک اصلاح وتجدد دین کی سرگرمیوں سے متاثر تھے اور جہاں بھی رہے رد بدعات ورسوم میں پیش پیش رہے۔رد وابطال میں ان کی کئی تصانیف ہیں۔ تین بار حج وزیارت کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔اورحضرت مولانا عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکی مصنف تفسیر اکلیل علی مدراک التنزیل سے حزب البحراور دلائل الخیرات کی سند بھی پائی تھی۔

ان کی تصانیف میں ضیاء الایمان ،الفرائض ،الجواب والمحمود اور ایک منظوم رسالہ جو حمد ونعت اور نصائح پر مشتمل ہے طبع ہو چکی ہیں۔مولانا سہ لسانی شاعر بھی تھے۔عربی وفارسی کے ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔سو برس پرانی اردو میں تفریح کے طور پر شعر گوئی کرتے تھے۔ اس ذوق شعر خوانی میں فنی وشعری اور جمالیاتی اقدار کی شمولیت ان کا مطمح نظر نہیں تھا بلکہ انھوں نے شاعری کو تبلیغ اخلاق ونصائح اور دینی ومذہبی جذبات کی ترسیل وابلاغ کا ذریعہ بنایا تھا اور مسلم معاشرہ میں دینی وایمانی حرارتیں پیدا کرنا ان کی غرض وغایت تھی۔ان کا کلام آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا۔ ان کے اخلاف میں ان کے مخطوطات ومطبوعات موجود ہیں۔ مجھے نمونے کے یہ چند شعر مولانا ریاض الحق قاسمی کی توجہ ارزانی سے ملے ہیں۔

نمونۂ کلام

آپ کی ذات ہے واللہ مجسم رحمت — فکر امت میں اے آنسو کے بہانے والے
اے حبیب عربی، سید والا نسبی — آپ ہیں بندوں کو اللہ سے ملانے والے
سو سلام آپ پہ نازل ہوں ہزاروں صلوات — اور صحابہ پہ کہ ہیں راہ دکھانے والے

بے چین ہے دل میرا لیجئے خبر اے رسول خدا ، اے رسول خدا
جز آپ کے ہے نہیں کوئی در، اے رسول خدا ،اے رسول خدا
ہوں عشق میں سرگرداں حیراں،آنکھوں سے ہجر میں ہے اشک رواں
سینے میں ہے دل ششدر مضطر اے رسول خدا، اے رسول خدا
ہے در پہ ابوالحسنات کھڑا جس در پہ بھکاری شاہ و گدا
دکھلا دو ذرا روئے انور اے رسول خدا، اے رسول خدا

ابھی ہے منظرِ خوش ،کل چمن رہے نہ رہے — بہار سنبل و ریحاں ، سمن رہے نہ رہے
یہ گل کی تازگی و عند لیب کے نغمے — بقد سرو یہ قمری مگن رہے نہ رہے
پڑھو درود ، کرو کچھ تلاوت قرآں — زبان منھ میں ، زباں پر سخن رہے نہ رہے
مشام جاں کو معطر بہ بوئے عشق کرو — کہ کوئے عنبر و مشکِ ختن رہے نہ رہے
جو سانس آتی ہے جاتی ہے تو غنیمت جان — کہ کل حیات تری بوالحسنؔ رہے نہ رہے

ابوالفضلؔ-محمد احسان اللہ عباسی چریا کوٹی ثم گورکھپوری

۱۸۶۵ء/ ۱۲۸۲ھ ـــ ۷؍مارچ ۱۹۲۸ء ۱۴؍رمضان ۱۳۴۶ھ(۱)

مولانا احسان اللہ عباسی والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ مولانا فاروق چریا کوٹی سے عربی وفارسی کا درس حاصل کیا تھا۔ سرسید احمد خاں غازی پور میں صدر الصدور تھے اور وہ احسان اللہ عباسی کے خاندان کے علماء سے بہت متاثر تھے۔ مولانا بیک وقت عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، عبرانی کے علاوہ زبان کلامی وفارسی کی قدیم زبان جس میں ژند اور اوستا کی قدیم کتابیں ہیں ان سب سے واقف تھے (۲)۔ احسان اللہ عباسی سرسید کے مدرسۃ العلوم کے پہلے طالب علم تھے انہوں نے یہاں پانچ سال تک رہ کر تعلیم حاصل کی تھی۔ یہیں سے مڈل پاس کیا اور ماضی میں اچھے نمبر لائے۔ علی گڑھ نے ان کی ذہنی وفکری نشوونما میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ اسی زمانے میں ان کو تصنیف وتالیف کا ذوق بھی پیدا ہو گیا۔ تصنیف وتالیف کے ساتھ ترجمہ بھی کرنے

لگے۔ انھوں نے علم ریاضی کے موضوع پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے۔ علی گڑھ سے تکمیل کر کے ۱۸۸۰ء میں گورکھپور آئے۔ یہیں شادی ہوئی مگر وقتاً فوقتاً چریا کوٹ آتے جاتے رہے۔ ان کی کئی شادیاں ہوئی تھیں اور کثیر الاولاد تھے۔ گورکھپور سے مختاری کا امتحان پاس کیا اور بانس گاؤں میں مختار ہوئے پھر پرائیویٹ طور سے وکالت پاس کی۔ گورکھپور میں وکالت شروع کر دی۔ وکیل اور ادیب کی حیثیت سے خوب شہرت پائی۔ ۱۹۴۰ء تک کافی عزت وحترام حاصل کر چکے تھے۔ فالج کے سخت حملہ میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔

احسان اللہ عباسی بڑے عالم وفاضل اور بیدار ذہن کے ادیب تھے۔ کافی دور بیں نگاہ پائی تھی۔ وقت کی نبض پر انگلی رکھتے تھے اور زندگی کے ادا شناس تھے۔ مطالعہ میں ضروری جگہ نظر پڑتی تھی۔ پوری کتاب پڑھنے کے عادی نہیں تھے۔ زندہ دل اور بذلہ سنج تھے۔ فیروز احمد نے اپنی کتاب احسان اللہ عباسی حیات اور کارنامے میں ان کی بذلہ سنجی اور زندہ دلی کے کئی واقعات لکھے ہیں۔ حق گوئی و بے باکی کے ساتھ ساتھ بلند ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ فارسی پر پوری طرح حاوی تھے نکتہ سنج ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ مگر انہیں اس کا کبھی ادعا نہیں رہا بلکہ ایک جگہ اپنی تالیف ''نشتر سخن'' میں لکھا ہے کہ: ''میں شاعر نہیں اور قلم سے کبھی ایسا مصرع نہیں نکلا جو زبانوں پر رواں ہوجائے''، لیکن فیروز احمد نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ اعتراف منکسرانہ ہے مولانا نے شعر بھی کہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے اشعار سے مطمئن نہ تھے چنانچہ ''الاسلام'' کے دیباچہ میں ایک سو ایک اشعار پر مشتمل مرثیہ قصیدے کی ہیئت میں ہے(۳)۔ محمد مزمل دانش چریا کوٹی متوفی ۹/اگست ۱۹۸۷ء جوان کے نواسے ہیں راقم سے بیان کرتے تھے کہ شاعران سے اصلاح بھی لیتے تھے۔

عباسی صاحب کو سیاست سے بھی یک گونہ دلچسپی رہی اور مضمون لکھ کر اس کا اظہار کرتے تھے۔ ان پر علی گڑھ تحریک کے اثرات گہرے تھے۔ یہ بیک وقت مورخ، ناول نگار، ماہر قانون، سیاست داں، مترجم قرآن اور سوانح نگار تھے۔ باستثنائے چندان کی ہر کتاب میں اصلاح معاشرہ کی روح ملتی ہے۔ اوہام پرستی، شرک و بدعت اور غیر ضروری مراسم مروجہ کے خلاف آواز

اٹھایا کرتے تھے۔ان کی قلمی یادگاروں میں مندرجہ ذیل کتابیں ہیں۔

الاسلام، المجاہد، تاریخ الاسلام، ترجمہ قرآن مجید، زاہدہ، (ناول) تاریخ حکمائے یونان، سوانح حضرت مجدد الف ثانیؒ، محسنۃ الارامل، نشتر سخن، (انتخاب اشعار اردو و فارسی) فکر دنیا (صنعت وحرفت) زبان اردو (کتابچہ) شرح ایکٹ ہائے قبضہ آراضی و مالگزاری (قانون کے موضوع پر) فسانہ دل پذیر ترجمہ(LAMPS ' TALE)۔

ڈپٹی نذیر احمد کے بعد یہ دوسرے مصنف تھے جنھوں نے ناولوں کے ذریعہ عورتوں کے مسائل اور ان کے حقوق پر قلم اٹھایا اور مصلحین قوم وملت کو آئینہ دکھایا۔ان کی کتاب تاریخ الاسلام اپنے زمانے کی مشہور ومقبول کتاب تھی علی گڑھ کے نصاب میں شامل تھی، مشاہیر وقت سید امیر علی، بدرالدین طیب جی اور مولانا فاروق چریا کوٹی وغیرہ نے اس کی تعریف کی تھی (۴)۔ان کے ناول زاہدہ کے بارے میں اخبارات صدائے ہند اور مشیر ہند نے لکھا ہے کہ زاہدہ کے مصنف نذیر احمد سے بازی لے گئے۔(۵)

احسان اللہ عباسی کو قدرت کی طرف سے بڑی صلاحیتیں انعام میں ملی تھیں اور انھوں نے بھی اپنی صلاحیتوں اور قلم کی توانائی کا استعمال عبادت سمجھ کر کیا۔ سر سید بھی ان کی ذہنی وفکری کارگزاریوں اور علمی وجاہتوں سے متاثر تھے اور انہیں قدر واعتراف کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ان کی وفات پر سید سلیمان ندوی نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "استاذنا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی کے شاگرد تھے اور ان چند مستثنٰی علماء میں تھے جنہوں نے اس عہد میں جب انگریزی کفر سمجھی جاتی تھی انگریزی تعلیم حاصل کی چنانچہ علی گڑھ کالج کے ان طلبہ میں تھے جو اس کے سب سے کم دیر پا مشرقی شعبۂ علوم میں داخل تھے۔ مرحوم وکالت کے ساتھ ہمیشہ مذہبی اور تاریخی تالیف وتصنیف میں مصروف رہتے تھے" (۶)۔

احسان اللہ عباسی نے مسلمانان ہند کی حالت زار کے عنوان سے ایک پرتاثیر مثنوی اپنی کتاب ''الاسلام'' کے باب پنجم فصل ہفتادوششم (۷۶) میں شامل کی ہے جس میں اشعار کی تعداد ایک سو ایک ہے جو صفحہ ۷۷۰ تا ۷۷۵ پھیلی ہوئی ہے۔مثنوی اول سے آخر تک درد میں ڈوبی ہوئی

اور تاثیر و تاثر سے بھری ہوئی ہے۔ بحر رواں اور مترنم ہے۔ غنائیت و شعریت سے بھر پور ہے اور اردو کے معتبر شعراء حالیؔ، محسن کاکوروی، اقبال اور شبلی نعمانی کے طرز ادا، اسلوب نگارش اور منہاج فکر سے مستفاد ہے۔ مگر تتبع کم ہے اور اپنی راہ آپ نکالنے کا حوصلہ زیادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس لیے اس مثنوی سے عباسی کی شاعرانہ انفرادیت پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ درحقیقت یہ مثنوی ان کی شعری شناخت کا بہت معتبر حوالہ ہے۔ الفاظ کا استعمال اور تشبیہ و استعارہ کا انتخاب کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ نئی معنویت اور تکثیریت کی خوبی پیدا ہوگئی ہے۔ انھوں نے لفظوں کے استعمال میں لغوی تلفظ اور لسانی شعور سے کام لیا ہے۔ اشعار اور الفاظ و تراکیب کے آبشار میں حُزنیہ لے اور المیہ کیفیت شعر و شاعری کا نیا منظر نامہ تشکیل دے رہی ہے بہت سے اردو شاعروں نے اپنے روشن ماضی سے اپنی محبت اور لگاؤ کا ثبوت فراہم کیا ہے مگر عباسی اپنے ماضی سے یوں ہی بلا جواز وابستگی نہیں رکھتے ان کی نظر میں اپنی تاریخ اور تمدن کے صدیوں کے جلوے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو جوش دلا کر اسلاف کی وراثت اور ان کی مملکت فکر و نظر کی بازیابی کے لیے ابھار رہے ہیں۔ ان کے نالۂ نیم شبی اور فغان سحر گاہی میں مرد خدا کی بصیرت و فراست کا نور شامل ہے۔ مثنوی میں عروج و زوال انسانی اور اقوام و مِلَل کے اخلاق و سیرت کے فضائل و رذائل کا فلسفیانہ تجزیہ اور حکیمانہ محاکمہ بھی پیش کیا گیا ہے اور کمال یہ ہے کہ فلسفہ دانی اور فلسفہ بیانی میں کہیں شعریت کے تقاضوں اور فن کے مطالبوں سے بے نیازی و بے اعتنائی کا ہلکا سا تاثر بھی نہیں پیدا ہونے دیا گیا۔ اس مثنوی میں انگریزی سامراج کے ابتدائی اور وسطی دور کا مسلم معاشرہ اپنی حقیقی تصویر کے ساتھ موجود ہے۔ جہالت، بےعملی، روحانیت سے خالی خانقاہی زندگی، مسجد و مدرسہ کی بے ذوقی، قبر پرستی، مزاروں کی قبہ سازی، نکاح بیوگان سے نفرت و دوری، عورتوں پر مظالم، جائداد میں عورتوں کی ترکہ سے محرومی، مہمان نوازی سے بیزاری، تجارت و معیشت سے دوری، سفر سعادت و حصول علم سے بے رغبتی، تاریخ و آثار اور سیر ارضی سے بے نیازی و تساہلی، نتیجے میں درس عبرت و موعظت سے محرومی کا نوحہ و ماتم اس مثنوی کی روح ہے۔ مثنوی کا ایک ایک شعر دل و دماغ کو زبردست چوٹ پہنچاتا ہے۔ اس کو پڑھ کر دل میں زندگی کو کامیاب و کامراں بنانے کی سچی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اور عہد

رفتہ کو آواز دینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

یہ مثنوی کمیاب ہو چکی ہے اس لیے اس کو مکمل صورت میں درج کیا جا رہا ہے تا کہ اس قومی وشعری دستاویز کی تجدید ہو جائے۔اس لئے راقم مولانا محمد افروز قادری کا تہ دل سے ممنون ہے۔

مسلمانانِ ہند کی حالت زار

یا ابا الفضل! رسول عربی کی امت
نفس سرکش کی مقلد ہے خدا کی قدرت

بندۂ خاص تھے ہم موردِ الطاف تھے ہم
یوں جدا رہتی نہ تھی ہم سے خدا کی رحمت

دن برے آئے تو مت بدلی ، زمانہ بدلا
اپنی نیت نہ بدلتی تو نہ ہوتی یہ گت

راہ ٹیڑھی جو چلے اس کا نتیجہ دیکھا
دیکھئے اور دکھاتی ہے ابھی کیا قسمت

چھوڑ دی پیرویِ دینِ محمدؐ ہم نے
جاہ ودولت نے ہمیں چھوڑ دیا ، یا قسمت

اپنے مذہب کا پتہ ہی نہیں چلتا ہم کو
کون معبود ہے اور کیا ہے ہماری ملت

ہم نہ مومن ہیں، نہ کافر ، نہ مجوسی ، نہ یہود
دہر یہ ہونے سے ہم کو ہے بظاہر نفرت

پارسی ہیں ، نہ مسیحی ، نہ کوئی اور طریق
ہم کو آتش کدہ اور چرچ سے بھی ہے نفرت

بت پرستوں کے مقلد ہیں دلوں میں لیکن
منھ سے انکار ہے ، انکار میں از حد شدت

اپنی آنکھوں سے لگاتے تو ہیں قرآں کو ضرور
اس کے احکام سے لیکن ہے سراسر وحشت

یا تو مجموعۂ احکام سمجھتے ہی نہیں
یا نہیں جانتے قرآن کی اعلیٰ عظمت

یوں تو پڑھ لیتے ہیں اک رات میں قرآن تمام
ضد ہے مفہوم سے ،لفظوں سے بظاہر رغبت

پیر جیلاں سے ہے اس طرح حکایت منسوب
پوچھی اک روز مریدوں نے صحابہ کی صفت

حضرت قدوۂ جیلان نے یہ ارشاد کیا
تم اگر دیکھتے اصحاب نبی کی صورت

یہی کہتے کہ جماعت ہے یہ دیوانوں کی
یہی کہتے کہ نہیں ہے یہ نبی کی امت

اور وہ دیکھتے تم کو تو تحیر ہوتا
کہتے کفار سے بھی ان کی ہے بدتر حالت

آخری دور مغل میں تھا تبر جیسا ہند
اس زمانہ میں تھی ویسی ہی عجم کی حالت

دن دکھائے یہ جہالت نے انہیں آخر کار
ہوئے کفارِ مغل وارث تخت ودولت

سندھ سے قاہرہ تک کفر کا آوازہ تھا
کعبۃ اللہ میں تھے نام کو اہل سنت

شانِ معبود کہ کفار مسلمان ہوئے
اور پھر ان سے ہوئی دین کو اپنی عزت

شرک کا نام مٹا دور معاصی گزرا
نور اسلام نے دنیا سے مٹائی ظلمت

کچھ دنوں تک رہی پابندی احکام رسولؐ
کچھ دنوں تک رہی اسلام کی اچھی حالت

رفتہ رفتہ ہوئی پھر اس میں خرابی پیدا
رفتہ رفتہ ہوئی پھر اس میں نمایاں نکبت

چھا گئیں آ کے جہالت کی گھٹائیں ہر سو
چھا گئی دیکھتے ہی دیکھتے کیسی ظلمت

جس طرف دیکھئے ادبار و فلاکت طاری
نہ ترقی ، نہ وہ اقبال ، نہ علم و دولت

جہل ہی جہل ہو پھر کیوں نہ ہو کمزور خیال
علم کے ساتھ گئی ساری دماغی قوت

جہل وادبار و فلاکت کا ہے واحد مفہوم
علم و اقبال وتمول کی ہے یکساں صورت

جہل اک نام ہے اخلاق کی کمزوری کا
اور تعلیم کا حاصل ہے صفاتی قوت

عبرت اے دیدۂ بینا کہ ہوا ہے کیا حال
مگر افسوس کہ تجھ میں تو بھری ہے غفلت

کتنے ہم بڑھ گئے تھے جب کہ نہ تھے ہم کچھ بھی
کس قدر گھٹ گئی ہے بڑھ کے ہماری ہمت

سارے ملکوں میں برا ملک ہمارا افسوس
سارے عالم میں برائی کی ہماری شہرت

ساری قوموں سے بری قوم ہماری اے وائے
سب کی قسمت سے بری آج ہماری قسمت

واہ رے ہند کی اقلیم ترا کیا کہنا
تیری قوموں کا عروج اور وہ ان کی رفعت

انہیں قوموں میں تھی اک قوم مسلمان جو آج
ظلِ ذلت کو سمجھتی ہے فروغ غرت

کوئی درجہ نہیں بے شرمی و گمراہی کا
جس کی تکمیل میں قاصر ہو ہماری ہمت

بت پرستی کے جو دشمن تھے انہیں کی اولاد
بت پرستی کو سمجھتی ہے شعار ملت

بھولی توحید کو ہے قومِ مسلماں افسوس
ہیں اگر ہم میں موحد تو بشانِ ندرت

دیوتا ہند میں دس تھے۔ تو مسلمانوں نے
کردیے بیس یہ ہے شرک کی ان کے حالت

ہائے انصاف کرے کوئی موحد ہم میں
یا یہ عیسائی کہ تثلیث ہے جن کی ملت

منھ سے کہتے ہیں خدا تین ہیں لیکن دل میں
یہ سمجھتے ہیں کہ سب میں نہیں خالق کی صفت

اور ہم لوگوں میں وہ جہل کہ خالق ہے ہیچ
روح کو مردوں کے حاصل ہے یہ دست قدرت

بخش کے ساتھ عمر، زید ، بکر کی ترکیب
نام ہی سے ہے عیاں قوم کی پوری حالت

کوئی غازی کہیں بچتا ہے، کہیں کوئی شہید
کم کہیں پیر و پیمبر سے خدا کی طاقت
پیر و شاہ صفی قوم کے اعلیٰ افراد
ہند میں آئے تو ان کی بھی نبی کیسی گت
گنبد و قبر پرستی سے تھی نفرت پہلے
اب اسی کو وہ سمجھتے ہیں شعار ملت
شرم ہم کو ہے نبی کی ، نہ خدا کا ڈر ہے
کفر سے، شرک سے، مملو ہے ہماری بدعت
گھر میں بیوائیں چھپے چوری جو چاہیں کرلیں
عقد کا نام کہیں آئے تو آئے شامت
پردہ داری سے ہے مقصود نہ ہو پردہ دری
ایسے پردوں سے دبا ہے کہیں زورِ فطرت؟
ہوں جو لوہے کے گھڑے ٹیڑھے تو سیدھا کردیں
دیکھ لو آنکھ سے تم بھیگے چنوں کی طاقت
دانے بارود کے قلعوں کو اڑا دیتے ہیں
دمدمے کیسے ہی مضبوط ہوں آئے شامت
کونپلیں کھیت کے ڈھیلوں کو ہٹا دیتی ہیں
دانے دانے میں ہے پوشیدہ نمو کی قوت
پھاڑ کر پیٹ زمیں کا نکل آئیں شاخیں
روکنے سے کبھی رکتا نہیں زور فطرت
فرض کرلو کہ ہزاروں میں کہیں ہیں دو چار
ایسے گھر جن میں کم آتی ہے گنہ کی نوبت
ایک کا موردِ الزام بھی ہونا ہے بہت
منھ دکھائے نہ کبھی قوم جو ہو کچھ غیرت
قوم کی رسم نے مجبور کیا خاطی کو
قوم کے فعل سے پہنچی یہ گنہ کی نوبت
کامیابی بھی اگر تم کو ہوئی فرض کیا
رہ گئی عفت وعصمت کی سراسر عزت
تو بھی سمجھو کہ ہوا کام یہ تم سے کیسا
ہائے وہ کام سراسر جو خلاف سنت
مرد و زن کی کبھی رکنے کی نہیں یکجائی
جان لو خوب کہ اس پر ہے مدارِ خلقت
آفرنیش کے قوانین بدل دے کوئی
غیر ممکن ہے ، نہیں اتنی کسی میں قدرت
آفرنیندۂ عالم کو بڑھانا مقصود
ہائے افسوس گھٹا نے کی تمھاری نیت
چاند پر خاک نہ ڈالو، کہ غلط ہے کوشش
خاک بر سر تمھیں رکھے گی تمھاری ذلت
یہ لڑائی تو ہے اللہ سے توبہ توبہ
اس کے احکام سے، آئین سے تم کو نفرت
کج روی تم میں جہالت کی ہے کیا کام چلے
کام آ ہی نہیں سکتی ہے کبھی الٹی مت
اس شرافت سے رذالت ہی کہیں بہتر ہے
اچھے اچھوں سے رذیلوں کی ہے اچھی حالت
ان کی بیوائیں کریں عقد ہیں عصمت سے
ان کی بیوائیں رہیں قید اٹھائیں ذلت

اپنے دستور سے پابند یہ عصمت کی زمیں
جن گھروں میں کہ ہو قرآن وہاں یہ حالت

یہی اطوار رہے اور جو کچھ دن قائم
کیا عجب ہے جو رذیلوں سے ہو بدتر حالت

ناز جس بات پہ اسلاف کو تھا آج وہی
فہم و دانش میں ہمارے ہے ہماری ذلت

عورتوں پر جو مظالم ہیں وہ لاتحصیٰ ہیں
بڑھتی ہی جاتی ہے جور وستم کی شدت

عورتوں کے جو ہیں مرقوم حصص قرآں میں
ناخوش اس پر ہے رسول عربی کی امت

وہ تو اترا نہیں قرآن زباں میں ان کی
کیا غضب تھا سمجھ جاتے اس کی آیت

ہر جگہ اپنی جہالت کا اثر دکھلاتے
اور کھا جاتے یہ توریت کی ہر اک آیت

کفر ہے کفر کہ قرآن کو اچھا نہ کہیں
یا یہ سمجھیں کہ ہے قرآن خلاف حکمت

کہے اللہ کہ دختر کو پسر سے دو نصف
یہ کریں عشر کے دینے میں بھی سو سو حجت

عشر بھی دیتے ہیں دس بیس میں دو چار کہیں
ورنہ کہہ دیتے ہیں لڑکی کو نہیں ہے رغبت

ان کو ترکہ کی ریاست کی نہیں کچھ پروا
گو کریں بنت نبی باغ فدک پر حجت

لڑکیاں ہوں کہ وہ بہنیں شرفا کا ہے یہ قول
ان کو ہے مال زر وسیم سے از حد نفرت

بعض ایسے ہیں کہ ان کا ہے شعارِ مذہب
غصب اور ظلم پہ تسبیح میں پڑھنا لعنت

قول یہ اور عمل یہ کہ عیاذاً باللہ
شیر مادر کی طرح بہنوں کی حق سے رغبت

کم ہیں وہ لوگ کہ لیں کام جو تاویلوں سے
بہت ایسے نہیں تاویل کی جن کو حاجت

کیسے کیسے شرفا ان میں معزز ممتاز
خود بھی وہ جانتے ہیں آپ کو فخر ملت

ناز اس فعل پہ جو فعل کہ قرآں کے خلاف
حق منصوص کے دینے میں ہے کیا کیا حجت

کوشش اس کی کہ نہ دے قوم سے کوئی حصہ
کہ نہیں دخت ونسا کو ہے کچھ اس کی حاجت

باپ ماں کی جو یہ حالت ہو تو بھائی ناحق
کیوں ہو بدنام کہ انساں ہے حریص الخلقت

سیر چشمی کے سبق بھول گئے ہیں ہم سب
بخل و اسراف سے ہے دل کو ہمارے رغبت

کوئی مہمان جو آجائے تو گھبرا جائیں
ہم کو مہمان کی صورت ہے قضا کی صورت

دم نکل جائے جو آئے کوئی مہمان کبھی
وقف ہے کھیل تماشہ کے لیے سب دولت

کہے اللہ کہ وعدے کرو ایفا اپنے
اور وعدوں کی نہ ہو دل میں ہمارے عزت

ہوئے محتاج کہ تھے مستِ مئے جامِ غرور
آیا ادبار کہ تھی علم و ہنر کی قلت
جہل ونخوت سے سروکار ہے ہم کو بالکل
اور تعلیم وتعلم سے نہیں کچھ نسبت
نہ تو غیرت ہے نہ ہمت نہ حمیت ہم میں
کمپٹیشن میں ٹھہرنے کی یہی ہے صورت؟
کرلیا آکے توکل نے گھر اپنا ہم میں
ہوگئی کسب معیشت سے ہمیں جب نفرت
نہ سفر کرنے کا ہے شوق نہ غم روزی کا
نہ تجارت سے تعلق ہے نہ شوق محنت
ہم کو کچھ فکر نہیں کل کی کہ ہم کیا ہوں گے
جانتے ہی نہیں دنیا کی ہے اب کیا حالت
جھوٹ سچ ہے جو بزرگوں کی کمائی باقی
ہوتی جاتی ہے وہ سب نذر بساط عشرت
ہائے کیا ہوگیا وہ خُلق وہ ہمدردیِ قوم
ہائے کیا ہوگئی آخر وہ محبت الفت
یا وہی ہم تھے کہ تھے رونق بزم تمکیں
یا وہی ہم ہیں کہ، ہیں نقش بساط نفرت
یا وہ سطوت کہ چمکتے تھے بسان خورشید
یا یہ حالت کہ ہیں اب شمع سحر کی صورت
یا وہ سرگرمی تحصیل کہ اللہ اللہ
یا یہ در ماندگیِ شوق کہ عبرت عبرت
یا اسی ہند میں تھے تاجِ سرِ اہلِ غرور
یا یہیں ٹھوکریں کھاتے ہیں خدا کی قدرت
نہ وہ اسلام نہ اب وہ بَرَکاتِ اسلام
بسترِ عیش پہ ہے قوم کو خواب غفلت

حواشی:

(۱) وفیات مشاہیر اردو- بشارت علی خاں فروغ ص ۱۲ پر وفات اگست ۱۹۲۸ء لکھی ہے جو غلط ہے۔ اور اسی کتاب کے ص ۲۴ پر احسان اللہ گورکھپوری بن عزیز الدین کے تحت سال ولادت و تاریخ وفات درست ہے۔

(۲) احسان اللہ عباسی حیات اور کارنامے مؤلف فیروز احمد جون ۱۹۷۶ء ص ۲۹ بحوالہ بشریٰ مقدمہ مولانا عنایت رسول عباسی چریاکوٹی ص ۲۲۔

(۳) احسان اللہ عباسی۔ حیات اور کارنامے۔ فیروز احمد۔ جون ۱۹۷۶ء ص ۴۴

(۴) علمائے چریاکوٹ معتصم عباسی آزاد۔ مشمولہ سہ ماہی اسلام اسلام اور عصر جدید نئی دہلی اپریل ۱۹۷۶ء ص ۹۲،

(۵) ایضاً

(۶) معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۲۸ء۔ شذرات ص ۸۲

اثر انصاری - ابوبکر مئو ناتھ بھنجن

۱۹۲۳ء ___ ۷؍جنوری ۲۰۰۵ء

ابتدائی تعلیم دارالعلوم مئو میں حاصل کی ہائی اسکول جیون رام انٹر کالج سے اور انٹر میڈیٹ کرسچین کالج الہ آباد سے کیا۔ اس کے بعد زندگی کے جہاد معاش میں شامل ہو گئے۔ کچھ دنوں تک ملازمت کی اس کے بعد آبائی پیشہ حیا کت سے تعلق رکھنے والا کاروبار کیا۔ معاشی، سیاسی، علمی ودینی سرگرم زندگی گزاری تحریکی مزاج کی وجہ سے کبھی سکون سے رہنا پسند نہیں کیا۔ اپنی جولانیوں کے لیے مختلف شعبہ ہائے زندگی کو منتخب کیا۔

اردو کے معروف شاعر، صاحب طرز نثر نگار، علمی ودینی بصیرت کے حامل انسان تھے۔ ان سے کئی کتابیں یادگار رہیں۔ وہ تحریک آزادی کے بیباک سپاہی ہونے کی وجہ سے سیاسی حلقوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے خاندان میں علمی و مذہبی روایات قائم تھیں۔ دادا مولانا سلطان احمد عالم دین تھے انہوں نے تحریک دیوبند سے متاثر ہوکر اس کی دینی ومذہبی اور اعتقادی روایات کی دورافتادہ علاقوں تک توسیع وتنصیب کی غرض سے دارالعلوم مئو کی بنیاد ڈالی۔ والد صفاؔ انصاری خوش فکر اور نغز گو شاعر ہونے کے ساتھ خلافت تحریک کے زبردست حامی اور مولانا محمد علی جوہر کے عقیدتمند تھے۔ اثر انصاری نے خاندان کی علمی وسیاسی وراثت کو ترقی دی جب یہ جیون رام ہائی اسکول میں ہائی اسکول کے نصاب تعلیم کی تکمیل میں مصروف تھے اسی وقت ۱۹۴۲ء کی تحریک شروع ہوگئی تو انہوں نے حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہوکر اپنے رفقائے درس کو لے کر اندیشۂ سود وزیاں سے بے نیاز ہوکر انگریزوں کے خلاف زبردست احتجاج، جلسے جلوس اور نعرہ بازی شروع کردی۔ انگریزی پولس نے عوام پر گولی چلادی جس کے نتیجے ان کے ہم سبق دکھنتی رام بڑھئی کی فوت ہوگئی۔ مگر جذبۂ آزادی کی گرمی اور ملک سے انگریزوں کے تسلط کو ختم کرنے کی مہم میں کہیں سے کوئی کمی نہیں آئی۔ اثر کے ساتھ جن رفیقان تعلیم نے تحریک آزادی میں حصہ لیا ان میں مارکنڈے سنگھ جو بعد

میں دہلی کے لیفٹنٹ گورنر ہوئے۔ ماسٹر حبیب اللہ اعظمی جو آگے چل کر لکھنؤ کے حسین آباد انٹر کالج میں پرنسپل کے عہدے پر ممتاز کیے گئے۔ خیرالبشر انصاری جنھوں نے کمیونسٹ تحریک کو اپنی دھڑکنوں سے زندہ رکھا اور مئو اسمبلی حلقہ کی پانچ برس تک نمائندگی کی اور ماسٹر ہری ہر سنگھ سابق استاد ڈی اے وی کالج مئو کے نام سرفہرست ہیں۔ اثر ۱۹۵۲ء میں مئو شہر کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے اس کے علاوہ مئو کے تمام قومی و رفاہی اور علمی و ادبی محاذ ان کی سرگرمیوں کا محور بنتے رہے۔ بزم ادب مئو کے بانیوں میں آپ بھی شامل تھے۔ ایک عرصہ تک بزم ادب اور دانش کدہ اردو لائبریری کے صدر، مدرسہ دارالعلوم مئو کے نائب ناظم اور اسی مدرسہ کے شعبۂ نسواں کے انچارج بھی رہے۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک مئو میونسپل بورڈ میں بحیثیت ممبر احترام کی نظر سے دیکھے گئے۔

ان کا پہلا مجموعہ کلام ''کم و کیف'' ۱۹۷۴ء میں، دوسرا شعری مجموعہ ''افکار پریشان'' ۱۹۸۰ء میں، تیسرا مجموعہ کلام ''زبان غزل'' ۱۹۸۷ء میں، چوتھا شعری مجموعۂ نظم ''آئینہ در آئینہ'' ۱۹۹۰ء میں پانچواں ''مجموعہ پیراہنِ گل'' ۱۹۹۶ء میں اور نعتوں کا مجموعہ نوائے سروش ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ اثر انصاری ایک صاحب طرز نثر نگار اور بہترین انشا پرداز بھی تھے۔ ان کی نثری تصانیف میں ''تذکرہ سخنوران مئو'' سفر حج کے شب و روز، اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی اور دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز قابل ذکر ہیں۔ انھیں اردو زبان و ادب کی خدمت کے اعتراف میں امتیاز میر اور توصیفی سند سے نوازا گیا ہے۔

اثر انصاری نے خود کو زندہ و تابندہ ادبی و شعری اور دینی و سیاسی تحریک و ثقافت سے وابستہ رکھا اور زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیا۔ انھوں نے قدیم و جدید روایات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے نئی شعریات سے استفادہ کرنے کے لیے اپنی قدیم روایات کی جڑوں سے لاتعلقی کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے یہاں فکر و خیال، لفظ و معنی اور اسلوب و بیان، تشبیہ و استعارہ، علامت نگاری و پیکر تراشی کا بحران یا کسی نئی کشمکش و اضطراب کا مسئلہ کھڑا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک دلکش اعتدال و توازن کی فضا ملتی ہے۔ ان کے کلام سے ان کی ذہنی بالیدگی

اورشعور کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔

نمونۂ کلام

یہ نہ سوچو کہ چلائے گئے پتھر کتنے
دیکھنا یہ ہے سلامت ہیں ابھی سر کتنے

پیاس پھر پیاس ہے شعلوں سے کہاں بجھتی ہے
خشک ہو جائیں گے آنکھوں کے سمندر کتنے

خود جنھیں اپنی بصیرت کا اجالا نہ ملا
گم اندھیروں میں ہیں ایسے مہ و اختر کتنے

سر بلندوں سے کہو سر ذرا نیچا کرلیں
خون میں ڈوبتے جاتے ہیں قد آور کتنے

جب سے کم مائگیِ علم کا ادراک ہوا
کھلتے جاتے ہیں مری فکر کے جوہر کتنے

بحر الفاظ و معانی میں اترنے والو
تہ نشیں ہوگئے ساحل کے شناور کتنے

ہم نہیں وقت کے دھاروں کے تعاقب میں اثرؔ
ہم نے دیکھے ہیں کڑے وقت کے تیور کتنے

تاجداری کی تمنا شہر یاری کی ہوس
آدمی کو کھا گئی سرمایہ داری کی ہوس

اپنی بربادی کی منزل پر کھڑی ہے زندگی
دیکھئے کیا گل کھلائے وضع داری کی ہوس

مسکراؤ کہ روشنی پھیلے
رات بے چین ہے سحر کے لیے

جا بجا ذوق جستجو نے مرے
نقش چھوڑا ہے راہبر کے لیے

مجھ کو دیکھو ، مجھے سمجھو، مری فریاد سنو
نقش ہوں صفحہ ہستی پہ گواہی کی طرح

پوچھتی پھرتی ہے گلشن کا پتہ موج نسیم
ٹھوکریں کھاتی ہے بھٹکے ہوئے راہی کی طرح

زندگی حادثۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
غم بھی ہے سلسلۂ لامتناہی کی طرح

مشعل علم ذرا اور بلندی سے جلاؤ
دور تک فہم وبصیرت کا اجالا جائے

صورتیں فرشتوں کی ، خصلتیں درندوں کی
یہ صفت بھی رکھتا ہے صرف آدمی تنہا

خود اپنے عیب پہ ٹکتی نہیں کسی کی نگاہ
جو اپنا عکس نہ دیکھے وہ آئینہ کیا ہے؟

بہت عزیز ہے مجھ کو اثاثۂ تہذیب
میں ایسی جنس گراں مایہ گھر میں رکھتا ہوں

یہ روز وشب کا فلسفہ بس اک ذراسی بات ہے
وہ ہنس پڑے تو صبح ہے میں رو پڑا تو رات ہے

کبھی جو میرے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ آ گیا
گماں ہوا کہ میرے بس میں ساری کائنات ہے

مقام حسن اور بھی سوادِ رہ گزر میں ہیں
مہ و نجوم و کہکشاں تو سامنے کی بات ہے

مجھے مٹا نہ سکی گردش زمانہ بھی
جبین وقت پر ابھری ہوئی کرن ہوں میں

مجھے پڑھو کہ ہوں میں شاہ کار حرف وغزل
خود اپنے طرز نگارش کا بانکپن ہوں میں

فاصلہ صدیوں کا لمحوں میں کہاں طے ہوگا
دوستو! قافلۂ عمر رکا ہو تو کہو

مہکی مہکی سی ، بہکی بہکی سی
بوئے گل بھی شراب کی سی ہے

جس کو پڑھ کر سمجھنا مشکل ہے
زندگی اس کتاب کی سی ہے

اثرؔ-مولانا محمد نعمان قادری اعظمی

۳؍جولائی ۱۹۳۸ء ـــــ ۲۹؍فروری ۲۰۰۸ء؍۲۱؍صفر ۱۴۲۹ھ

فرزندان اشرفیہ میں بڑے متحرک ، فعال اور جدو جہد کرنے والے عالم دین تھے۔ دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم کے لائق ترین اساتذہ حضرت مولانا حافظ عبدالعزیز مرادآبادی (۱۸۹۴ء۔۱۹۷۶ء) مولانا مظفر حسن ظفرادیبی (۱۹۱۶ء۔۲۰۰۶ء) مولانا عبدالرؤف بلیاوی (۱۹۱۲ء۔۱۹۷۱ء) مولانا مفتی عبدالمنان اعظمی مبارک پوری (۱۹۲۵ء۔۲۰۱۲ء) مولانا محمد شفیع اعظمی مبارک پوری (۱۳۴۴ھ۔۱۹۹۱ء) وغیرہ کی خدمت میں رہ کر درس نظامی کی تکمیل فرمائی اور ۱۰؍شعبان ۱۳۸۱ھ؍۱۷؍جنوری ۱۹۶۲ء کو فاضل کی سند فراغ لے کر چراغ مصطفوی کی روشنی پھیلانے کے اہل قرار پائے۔ کارِمعلمی کا آغاز جبین پور ضلع اعظم گڑھ کے مدرسہ انوارالعلوم سے ہوا۔ ۱۵؍اگست ۱۹۶۴ء کو دارالعلوم تدریس الاسلام بسڈیلہ گئے۔ ۱۹۷۳ء تک یہاں پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد جامعہ امدادالعلوم مٹہنا میں صرف ایک برس تک بسلسلۂ تدریس مختصر قیام رہا۔ تیس برس تک جامعہ اسلامیہ روناہی (فیض آباد) میں ۱۹۷۴ء سے ۳۰؍جون ۲۰۰۳ء تک بحیثیت صدرالمدرسین شاندار مدرسی کی۔ رٹائرمنٹ کے بعد دارالعلوم ضیاءالاسلام ہوڑہ، دارالعلوم جائس ضلع رائے بریلی اور جامعہ حنفیہ بستی میں درس وتدریس سے منسلک رہے۔ آخری برسوں میں مؤخرالذکر درس گاہ کے صدرالمدرسین رہے اور وفات پائی۔

مولانا درس و تدریس میں خاص مہارت رکھتے تھے وہ درسی کتابوں کے اسرار و رموز اور نکات علمی کی واقفیت رکھتے تھے۔ اپنے شاگردوں کے سوالات علمی کے جوابات بہت خوبی اور سنجیدگی سے دیا کرتے تھے۔ اور وہ نفس مسئلہ کو طلبہ کے دل و دماغ میں اس طرح واضح کر کے اتار دیتے تھے کہ طلبہ میں پھر کسی طرح کی آشفتگی یا پریشاں خاطری باقی نہیں رہتی تھی۔ ان کے زیر درس تلامذہ مطمئن ہوجاتے تھے۔ مولانا میں انتظام وانصرام اور تعلیم و تربیت کی زبردست صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان کی علمی و دینی اور تعلیمی وتدریسی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۳ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ اور ۲۰۰۱ء میں حکومت اتر پردیش کی طرف سے سند توصیف حاصل ہوئی تھی۔

مولانا جہاں ایک جید عالم دین اور بے مثال مبلغ و مدرس تھے وہیں ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ شاعری کا وصف آپ کو ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والد منیر اعظمی اقبال سہیل کے ارشد تلامذہ میں تھے اور غزل، نعت، قصیدہ، قطعہ وغیرہ کے اچھے اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے ایک بھائی سرمدؔ دیوگامی بھی شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے دوسرے بھائی ابوعبیدہ خاں عبدہٗؔ اعظمی (۱۹۳۶ء۔ ۱۹۹۵ء) کی شاعری کی دھوم بڑی دور تک تھی۔ ان کے کئی چھوٹے بڑے مجموعے اشاعت کی منزلوں سے گزر کر ادبی حلقوں میں ان کی شہرت کا سبب بنے۔

مولانا محمد نعمان خاں اثرؔ تخلص کرتے تھے اور نعت و منقبت سے ذوق رکھتے تھے۔ ان کا نعتیہ کلام مدارس دینیہ کے طالب علم دینی اجلاس اور مذہبی اجتماعات میں پڑھتے تھے۔ مگر کلام ناپید ہے ان کے بیٹے مولانا نوخیز کو بھی اپنے پدر بزرگوار کے فرمودات کی جمع و تلاش سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ ورنہ ان کے شعری اثاثہ کی بازیابی کوئی ایسا مشکل امر نہیں ہے کہ حاصل نہ ہوسکے۔ کیونکہ جنھوں نے انھیں دیکھا ہے ان کے دلوں میں مولانا کی یادیں ابھی تازہ ہیں اور ان سے متعلق افراد ان کے سانحۂ ارتحال کو ابھی تک بھولے نہیں ہیں۔ ان کی نعتیں پیش کرنے والے طالب علم اب مدرس ضرور ہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ دو چار اشعار کی روایت نہ کرسکیں۔ یا کہیں تحریری صورت میں موجود نہ ہو۔

انھوں نے اپنے بھائی ابوعبیدہ خاں عبدہٗؔ کے آٹھ سالہ چہیتے بیٹے جاوید انوار کی وفات (۲۶؍جولائی ۱۹۶۶ء۔) پر ایک رثائی رباعی کہی تھی جو یوں ہے۔

ہر چند کہ دل میں ہے جدائی کا الم راضی برضائے حق تعالیٰ ہیں ہم
دربار الٰہی میں دعا ہے یہ اثرؔ انوار پہ ہو بارش انوار کرم(۱)

حواشی:

(۱) داغ فراق۔مرتبہ اسلم سہیل جون پوری۔مطبوعہ ۱۰رنومبر ۱۹۶۶ء ص ۱۷

اثرؔ۔ماسٹر عبدالعزیز اعظمی

—— ۲۷رجون ۱۹۹۸ء

جہاناگنج ان کا مسقط الراس تھا۔کئی مقامات پر تعلیم وتدریس کی خدمات انجام دیں۔ان کی اردو بہت اچھی تھی فن عروض میں بھی کافی مہارت تھی۔عمر کا آخری حصہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں گزارا۔جامعۃ الرشاد میں اکاؤنٹنٹ کے عہدہ سے منسلک تھے۔متاہل زندگی گزاری اور اپنے پیچھے اولادیں بھی چھوڑیں۔تقریباً سبھی مروجہ اصناف سخن میں فکر کرتے تھے اور حمد ونعت،غزل، سہرا، چندہ،موضوعاتی نظمیں کہتے تھے۔خصوصی طور سے نعت نگاری سے شغف رکھتے تھے۔مدرسہ جانے کے لئے گھر سے نکلے اور راستے میں حادثے کا شکار ہوگئے اور جائے حادثہ پر ہی فوت ہوگئے۔اپنے کلام کی کاپیاں پاس ہی رکھتے تھے اور حادثے کے وقت بھی پاس ہی تھیں اس لئے ضائع ہوگئیں۔مکمل کوئی کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔ان کے صاحبزادے ظہیر احمد نے اپنی یادداشت سے تین شعر لکھوائے ہیں۔لیکن یہ اشعار بھی اسقام سے خالی نہیں۔زبان وبیان بھی عالی ہے۔

حمد بے حد تری اے خالق اکبر تنہا جلوہ گر تو ہی دو عالم میں ہے داور تنہا
تو نے ہی برتری موسیٰ کو دیا اے مولیٰ محوِ دیدار کیا طور کے اوپر تنہا
بارشِ نور جہاں ہوتی ہے ہردم اے اثرؔ کملی والے کا ہے وہ روضۂ اطہر تنہا

اثیمؔ - عبدالقوی اعظمی

گاندھی جی کے سانحۂ قتل پر ان کی ایک نظم ’’آہ! مہاتما گاندھی‘‘ کے عنوان سے ہفتہ وار

انصار بہرائچ کے شمارہ یکم ربیع الثانی ۱۳۶۷ / ۱۲ر فروری ۱۹۴۸ء کے صفحہ ۶ر پر مولانا قاضی اطہر مبارک پوری مدیر انصار نے شائع کی ہے۔ گاندھی جی کا قتل دراصل ہندوستان میں فرقہ وارانہ یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی موت تھی۔ جو ہندو فرقہ پرستی کے احیاء کے لیے کیا گیا تھا۔ اس قتل کے پیچھے ہندوستان کے پہلے وزیر داخلہ اور فرقہ پرستوں کے آئیڈیل سردار پٹیل کی گاندھی جی کی سکورٹی سے چشم پوشی کا خاص دخل تھا کیوں کہ اس زمانے میں خیر سگالی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے گاندھی جی کے جو عملی اقدامات خصوصاً فسادات کے خلاف مرن برت وغیرہ تھے پٹیل اس کو پسند نہیں کرتے تھے(۱)۔ اس سانحہ پر اردو کے بیشتر شاعروں نے مرثیہ کہا اور خوب کہا چوں کہ ضلع اعظم گڑھ آزادی کی پہلی لڑائی ۱۸۵۷ء سے ہی ہندو مسلم یگانگت کا نقیب تھا اور تحریک آزادی اور رہنمایانِ آزادی سے اس ضلع کو ایک انس خاص تھا اس لیے یہاں یہ حادثہ زیادہ شدت سے محسوس کیا گیا۔ اثیم کا مرثیہ اسی اجتماعی غم اور علاقائی سوگ کی نمائندگی کر رہا ہے۔

نمونۂ کلام

وہ گاندھی جو تدبر اور سیاست میں یگانہ تھا
وہ گاندھی جس کا قائل ملک تھا سارا زمانہ تھا

وہ گاندھی جس نے ملک ہند کو آزاد فرمایا
وہ گاندھی جس نے دائم ہند والوں کا بھلا چاہا

وہ گاندھی جو محب قوم تھا اور ملک کا لیڈر
وہ گاندھی جو کہ صلح و آشتی کا تھا جواں پیکر

وہ گاندھی جس کو ملک وقوم سے سچی محبت تھی
وہ گاندھی جس کی باتوں میں حقیقت تھی صداقت تھی

وہ گاندھی ملک میں جو غم رسیدوں کا سہارا تھا
وہ گاندھی جو سبھوں کی آنکھ کا تابندہ تارا تھا

بجرمِ حق اسی کا قتل ہو، یہ کیا قیامت ہے
اثیم ایسا بھی ہوتا ہے زمانہ میں، حقیقت ہے

حواشی:

(۱) روزنامہ راشٹریہ سہارا، ۱۶ر جولائی ۲۰۱۰ء ص ۲، عزیز برنی کی خصوصی تحریر

اجلالؔ- پروفیسر اجلال احمد

۸/اگست ۱۹۳۳ء ـــــ ۱۳/(۱) دسمبر ۲۰۰۹ء

ان کا آبائی وطن کوئریا پار تھا مگر ان کے والد اقبال احمد صاحب نے اردلی بازار میں مکان بنالیا تھا اس لیے ان لوگوں کی رہائش وہیں منتقل ہوگئی تھی۔ اقبال احمد محکمہ پولس میں داروغہ تھے اور وہ ایک محنتی، فرض شناس اور ایمان دار افسر ہونے کی حیثیت سے کافی مقبول تھے۔ اجلالؔ صاحب بھی تہذیب وشرافت کا مجسمۂ محاسن اخلاق کا مجموعہ، کم سخن، صبر وتحمل اور ایثار وقربانی کی تصویر، قناعت پسند، مستغنی مزاج، کسیر النفس، بے ریا، خوش اطوار وخوش گفتار، پیکر حلم ومروت اور سراپا اخلاص انسان تھے۔ انہوں نے شبلی کالج اعظم گڑھ میں تقریباً نصف صدی تک نہایت ناموری کے ساتھ انگریزی استاذ کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں، ان کا علم ایسا زندہ تھا کہ جب وہ لکچر دیتے تو سبق کے تمام متعلقات روشن ہوتے جاتے، پڑھنے والوں کے ذہن کی گرہیں ان کی آواز کے زیر وبم سے کھلتی جاتیں۔ طالب علموں پر ان کی علمیت کی بڑی گہری چھاپ تھی یہ اپنے شاگردوں میں علمی نکات تک رسائی حاصل کرنے کی سچی تڑپ پیدا کردیتے تھے۔ اور اپنے تلامذہ کے ہر سوال کا نہایت واضح جواب دیا کرتے تھے جن سے ان کے علم وآگہی میں اضافہ ہوتا تھا۔

ان کے تعلیمی مراحل کے سلسلے میں اتنا معلوم ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا تھا اور علی گڑھ سے ایل، ایل، بی کے امتحان میں بھی میں کامیابی حاصل کی تھی۔ انہیں انگریزی زبان و ادب پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ شکسپیر وغیرہ پر ان کی بحث قابل رشک ہوتی تھی۔ انگریزی زبان کے لغات ومصطلحات علمی وادبی میں ان کی بہترین معلومات کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا تھا۔

شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے خالصۃً لوجہ اللہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کو اپنی خدمات پیش کردی تھیں۔ اس مدرسہ کے دیگر کام جو انگریزی زبان سے متعلق ہوا کرتے تھے انہیں سے ان کا انسلاک تھا اور ان مصروفیات کو بھی وہ بڑی خندہ پیشانی سے سر کرلیا کرتے تھے، انہوں نے بعض محنتی اور غریب طالب علموں کو بغیر حق المحنت کے رضا کارانہ طور پر

امتحانات کی تیاریاں کرا کر سند یافتہ بھی بنا دیا ہے۔ وہ بڑے جوہر شناس معلم تھے۔ طالب علموں کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ پاتی تھیں۔ ان کی توجہات سے کتنے خزف پارے اور سنگ ریزے لعل و جواہر بن کر علمی دنیا میں نمایاں ہوئے۔

اجلال صاحب کو اردو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ انہوں نے اردو میں اچھی غزلیہ شاعری کو اس دور میں استحکام بخشا جب ترقی پسندوں کی تحریک نے نظم نگاری کے سیلاب میں غزل کو تنکے کی حیثیت دے ڈالی تھی۔ اجلال کی فکر میں تازگی کا جوہر ہے ان کے کہنے کے انداز میں ایک نیاپن موجود ہے۔ وہ اپنی فکر سخن میں کچھ نئے پہلو بھی ابھارتے ہیں۔ کہنے کا سلیقہ بہت پیارا اور اشاریت و ایمائیت کا حسن لیے ہوئے ہے۔ وہ بھری بزم میں راز کی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اپنے دور کے اسلوب بیان اور عصری معنی بندی و بلند خیالی سے استفادہ کا ذوق رکھتے تھے اسی لیے ان کے کلام میں ایک ادبی حسن اور تازہ کاری جا بجا ملتی ہے۔

شاعر کی حیثیت سے کم لوگ انھیں جانتے تھے ان کی وفات کے بعد ایک بیاض ملی ہے جس میں کچھ غزلیں ہیں جو بے مقطع ہیں۔ یہ بیاض پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی تحویل میں ہے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ یہ کلام کس کا ہے۔ مگر ان کے نام سے ان کا جو کلام شبلی کالج کے میگزین میں شائع ہوا ہے اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اجلال صاحب شاعر تھے اور یہ ان ہی کا کلام ہے۔ یہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد صاحب کے بہنوئی اور مولانا محمد نعیم صدیقی ندوی اعظمی کی اہلیہ کے سب سے بڑے بھائی تھے۔

(نمونۂ کلام)

تمہاری بزم طرب سے میں دور ہوں لیکن — دیئے امید کے اب بھی کوئی جلاتا ہے
کہ جیسے لے کے سہارا حسین یادوں کا — تھکے تھکے سے قدم راہرو بڑھاتا ہے
اگرچہ دل سے بھلانا تمھیں نہ تھا آساں — مگر خیال سے اپنے بھلا چکا تھا میں
مرے لبوں کو وہی تلخ جام دینے کو — نہ جانے کس طرح پھر آ بسے مرے دل میں
ابھی تو دیکھ رہی ہے حیات خواب حسیں — ہجوم شوق سے جلوؤں میں ہم نہ کھو جائیں
مگر جو کاش کہیں تم سنوار دو ہم کو — تو پھر حیات کے گیسو بھی خود سنور جائیں (۲)

جنوں سے کہہ دو نئے طرز اختیار کرے ادائے نو کہ جسے حسن خود بھی پیار کرے
وہ اک نظر کہ تغافل بھی ہے تمنا بھی بھلائے دل تو کسے، کس کا اعتبار کرے
نکھر رہی ہے شب انتظار وعدوں سے سحر سے کہہ دو ابھی ان کا انتظار کرے
ہیں ان کے جلوے حقیقت بدوش افسانے یہ دل فریب نظر کا نہ اعتبار کرے
تری طلب ہے مرا حاصل حیات مگر وہ خواب جس کو حقیقت نہ شرمسار کرے
ہمیں تھے جس نے بنام جنوں چھپا ڈالا وہ داغِ دل جو دلِ لالہ داغدار کرے
اُدھر ہے وعدۂ فردا، اِدھر درازیٔ شب نہ جانے کب ہو سحر، کون انتظار کرے(۱)

حواشی:

(۱) ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ جنوری ۲۰۱۰ء ص ۴۳ پر یادرفتگاں کے تحت آہ پروفیسر اجلال احمد کے زیر عنوان نعیم احمد صدیقی ندوی نے ان کی وفات ۱۴ر دسمبر ۲۰۰۹ء کی شب میں لکھی ہے جبکہ یہ تاریخ تدفین ہے جو اجلالؔ کے فرزند اکبر ڈاکٹر سہیل احمد کی تصدیق شدہ ہے

(۲) شبلی نیشنل کالج میگزین اعظم گڑھ ۱۹۵۸ء۔۱۹۵۹ء ص ۱۰۷

(۳) شبلی نیشنل کالج میگزین، اعظم گڑھ سالانہ نمبر ۱۹۶۰ء ص:۶۵

اچڑم - مرزا عبدالرحمن مئوی

تقریباً ۱۹۰۳ء ـــــ ۱۹۶۳ء

بڑے ذہین وطباع اور شوخ طبع تھے۔سادہ گفتگو میں بھی بذلہ سنجی، طنز ومزاح کی رنگینی اور خوش طبعی شامل رہا کرتی تھی۔عام لوگوں کے لیے ان کی پر لطف باتوں میں دل چسپی اور دل بستگی کا بڑا سامان رہتا تھا۔اردو فارسی کی مکتبی تعلیم تھی مگر اپنی جودت طبع اور سرعت ذہنی کی وجہ سے کافی باصلاحیت معلوم ہوتے تھے۔اور اسی خوبی کی وجہ سے رنگ محفل جما دیتے تھے۔

انہوں نے شاعری میں مولوی محمد یوسف رسآ اور مولانا عبداللہ شائق سے استفادہ کیا تھا۔ سنجیدہ ومزاحیہ دونوں رنگ میں کہتے تھے۔اور خوب کہتے تھے سنجیدہ غزلوں میں احقرؔ تخلص کرتے

تھے۔ رجحان طبع کی رنگینی اور شوخ مزاجی کی وجہ سے ان کی شاعری کا محور زیادہ تر ہزل ہوا کرتی تھی۔ بڑے لطیف انداز میں مزاح کا رنگ پیدا کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ مشاعروں میں انہیں دلچسپی اور توجہ سے سنا جاتا تھا۔

انہوں نے سادہ وسہل اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ ان کے یہاں فکر وخیال اور تشبیہ واستعارہ کی پیچیدگی نہیں ہے۔ سامنے کی بات عموماً اس انداز سے کہتے ہیں کہ سننے والے کو کسی قسم کی ذہنی ورزش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ غزلوں میں قدیم اساتذہ کا اِکہرا اور راست انداز بیان ہے جو عام فہم وشعور کی سطح کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔

نمونۂ کلام

بڑھی ہے قیس میں کچھ اس قدر وحشت بیاباں کی
کہ مجنوں لے کے بھاگا ساڑیاں لیلیٰ کی اماں کی

الٰہی ان کے آنچل میں کسی دن آگ لگ جائے
جلاتے ہیں دیا میں روز بتی میرے داماں کی

وہ اچڑم کو سمجھ کر اہل دل، یوں ٹوٹ پڑتے ہیں
بگڑ جاتی ہے نیت جس طرح دولت پر انساں کی

ایک پر ایک شبِ وصل گرے پڑتے ہیں
ایک ہنگامہ بپا ہے مرے ارمانوں کا

لایا ہے خط کے ساتھ وہ پیغام لاجواب
اونٹوں کی بھی لگام کف نامہ پر میں ہے

فیشن ہے بال چہرے کا گو صاف کردیا
دھوکا نہ کھایئے گا یہ مادہ بھی نر میں ہے

اچڑم تو اٹھ کے طیش میں ڈھونڈھے کہاں کہاں
کم بخت جب رقیب بھی خالہ کے گھر میں ہے

وہ کہتے ہیں کہ غیروں سے ملائیں گے نہ چونچ اپنی
مگر ہم کو یہ ان کا چونچلا معلوم ہوتا ہے

مری تربت پہ جب وہ شوخ آیا تو کہا ہنس کر
کہ اس میں تو وہی مٹی ملا معلوم ہوتا ہے

چلا آتا ہے پھر صیاد لے کر بانس گلشن میں
ہمیں خطرے میں اپنا گھونسلا معلوم ہوتا ہے

اڑائی وصل کی شب ان سے بے پر کی تو وہ بولے
یہ اچڑم تو بڑا ہی پر کٹا معلوم ہوتا ہے

اتنے بوسے لیے جن کی کوئی تعداد نہیں
چلو اچھا ہوا گنتی جو انہیں یاد نہیں

دخترِ رز ہے تو حسیں پر ہے بتِ ہرجائی ہے
خاص انگور میاں کا کوئی داماد نہیں

اس درجہ پائجامہ کو اونچا نہ کیجئے
اپنے ازار بند کو رسوا نہ کیجئے

اس طرح روز وعدۂ فردا نہ کیجئے
باتوں میں اپنا کام نکالا نہ کیجئے

کالی گھٹا اٹھی ہے بہار آئی شیخ جی اس حال میں تو رندوں پہ برسا نہ کیجئے
جاتا رہا نمک بھی جوانی کے ساتھ ساتھ اب پھیکے پھیکے نخرے بگھارا نہ کیجئے
منھ سے تو کہہ رہے ہیں کہ آئیں گے ہم ضرور آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں بھروسا نہ کیجئے
اک طرف جوتی ہے، اک ہاتھ میں کفگیر ہے ان سے ملنا حضرت دل آج ٹیڑھی کھیر ہے
چاہے خلوت ہو کہ محفل ہو مگر وہ دل مرا ایسے لے لیتے ہیں جیسے باپ کی جاگیر ہے
شربت دیدار آکر غیر پیتے ہیں مگر جوتیاں کھانا مری تقدیر میں تحریر ہے

(غزل)

جو بے پردہ کسی کا عارضِ پر نور ہوجائے تو داغِ دل ہمارا بھی چراغ طور ہوجائے
تری تصویر کا میں نے مرقع دل میں رکھا ہے کہیں ٹھوکر سے یہ شیشہ نہ چکنا چور ہوجائے
خدا کے واسطے دھو ڈال دامن سے لہو قاتل مجھے ڈر ہے کہیں ظالم نہ تو مشہور ہوجائے
ہے وقت جاں کنی مشکل میں ہے جانِ حزیں میری جو تم نزدیک آجاؤ مصیبت دور ہوجائے
نہ شکوہ ہو جفاؤں کا نہ رونا کج ادائی کا وفا کا ان حسینوں میں اگر دستور ہوجائے
سنبھل کر لکھ غزل احقرؔ بہت نازک زمانہ ہے غزل گوئی میں بھی ورنہ کہیں مشہور ہو جائے

اچھے - مولانا محمد احمد نظام آبادی

۱۹۰۸ء ـــــ ۱۹۸۹ء

عربی وفارسی کے منتہی تھے۔ انھوں نے جوزۂ علمیہ نجف اشرف سے خوشہ چینی کر کے سند اجتہاد حاصل کی تھی۔ علمی و دینی شخصیت کے مالک تھے نجف اشرف میں مقیم تھے وہاں سے آئے تو جون پور محلہ سپاہ میں اپنے بیٹے مولانا طفیل عباس کے یہاں رہائش اختیار کر لی۔

ان کا اصل وطن جون پور تھا۔ نظام آباد میں نانہال تھا۔ انھیں ترکے میں نانہال کی ایک ریاست نما بڑی زمینداری حاصل ہوئی تھی۔ نظام آباد میں آج بھی ان کی ریاست کے کچھ آثار موجود ہیں۔ یہاں کے رئیس ہونے کی وجہ سے بازار میں کبھی پا پیادہ نہیں چلے۔ کہیں جاتے تو ہاتھی

پر سوار ہو کر نکلتے تھے۔ اس وقت ان کی شان اور سج دھج دیکھنے کے لائق ہوتی تھی۔ اولاد میں ایک بیٹے مولانا طفیل عباس اور چار بیٹیاں ہیں۔ مولانا سید شمیم الحسن صاحب عمید جامعہ جوادیہ بنارس ان کے بڑے داماد ہیں۔ مجالس ومحافل کا اہتمام دینی لگن اور خوداعتقادی کے تمام شرائط ولوازم کے ساتھ کرتے تھے۔ خوشی وغمی کے مواقع پر لنگر جاری کرنا ان کے معمولات میں شامل تھا۔ کھانے نہایت عمدہ اور لذیذ پکواتے اور غرباء ومساکین میں تقسیم کر کے بے پناہ خوشی محسوس کرتے تھے۔ یتیم ویسیر اور حاجت مندوں کی خبر گیری میں عموماً رہا کرتے تھے۔ کسی کو خط افلاس کے نیچے دیکھتے تو مالی مدد کر کے اس کو سماجی زندگی جینے اور قومی دھارے میں لانے کی تدبیریں کرتے تھے۔ بڑے مخیر اور کشادہ دست واقع ہوئے تھے۔ زیارتوں کا بے پناہ شوق تھا۔ دس گیارہ مرتبہ عتبات عالیات کی زیارت سے خود کو مشرف کیا تھا۔ اس کے علاوہ جب شوق نے زیادہ مہمیز کی تو زمینداری اپنے زیردستوں کے ذمہ کر کے جوار مولا نجف اشرف میں مکان تعمیر کرا کے مستقل اقامت گزینی اختیار کر لی۔ لیکن جب عراقی حکومت کا تختہ پلٹا اور عنان اقتدار صدام حسین کے ہاتھ میں آئی تو بیرونی علماء کی طرح انھیں بھی اپنے وطن ہندوستان لوٹنے کا حکم ملا اور یہ ہندوستان واپس چلے آئے۔ تبلیغ واصلاح کے لئے بمبئی وغیرہ کا سفر کرتے تھے جن کی حالت سقیم دیکھتے ان کی مدد کے لئے آگے بڑھتے۔ بڑی صالح، بے کینہ اور ہوائے دنیا سے بے نیاز طبیعت پائی تھی۔ تملق اور حاشیہ نشینی کو شخصیت کی کمزوری اور اخلاقی پستی تصور کرتے تھے۔ خندہ روئی، دل جوئی، نرم خوئی، شرافت لسانی، تہذیب واخلاق، دین داری، مؤدت ومحبت اہل بیت اطہار، ان کے باب زندگی کے روشن اور جلی عنوانات تھے۔ وہ اپنی اس وضع وخو کے پابند عمر بھر رہے۔ انھوں نے بمبئی میں وفات پائی اور اسی کی زمین ان کی مدفن بنی۔

یہ اردو کے شاعر بھی تھے۔ ان کا کلام ماہنامہ الجواد بنارس وغیرہ میں شائع ہوتا تھا۔ مذہبی شاعری سے خاص شغف تھا۔ اپنا کلام خود نہیں سناتے تھے۔ بنارس میں ان کے قصائد وغیرہ خوب پڑھے جاتے تھے اور پسند بھی کئے جاتے تھے۔ مولانا کی شاعری آسان لفظوں میں تھی۔ ان کا انداز سہل ممتنع کی شان لئے ہوئے ہوتا تھا۔ سلاست وبرجستگی اس کا نمایاں پہلو ہوتا تھا۔ ان کی زبان اور

کہنے کے انداز میں تاثیر ہوتی تھی۔

نمونۂ کلام

کربلا کے مرنے والے کام کیا کیا کر گئے		نام حق باقی رکھا، اسلام زندہ کر گئے
سیدہ کی گود کے پالے لہو سے سینچ کر		گلشن اسلام کا سرسبز پودا کر گئے
اک طرف تنہا مجاہد، اک طرف لاکھوں عدو		بچپنے میں رن میں اصغر نام اپنا کر گئے
کس طرح اچھے زمانہ ہوگا منکر پیاس کا		زیرِ خنجر بھی سوالِ آب مولا کر گئے(۱)

حواشی:

(۱) الجواد بنارس محرم نمبر ۱۳۷۲ھ ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۱۱۱

احتشام - پروفیسر سید احتشام حسین رضوی ماہلی

۲۱/اپریل ۱۹۱۲ء(۱) ــــ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء

احتشام حسین بڑی پہلو دار شخصیت رکھتے تھے۔ جس کا ہر پہلو بہت خوشگوار اور تابناک تھا۔ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بیک وقت بہترین ادیب، نظریہ ساز نقاد، ماہر لسانیات اعلیٰ درجے کے شاعر، مشاق مترجم، بلند پایہ افسانہ نگار، شفیق استاذ، ممتاز مفکر، قابل رشک نکتہ داں عالم، حکیموں میں حکیم، مولویوں میں علم مذہب سے آگاہ، علم مجلس کے ماہر، حسن اخلاق اور منصف مزاج کی مکمل تصویر، لطیف حسِ مزاح سے بہرہ مند، کم آمیز وتنہائی پسند مگر جہاں بینی میں فرد اول جہاد زندگی میں پامرد، غیر معمولی فہم ومطالعہ، علم ومشاہدہ اور قوت حافظہ رکھنے والے، مگر تعلّی و خود بینی سے عاری، مخیر، کنبہ پرور، غریب نواز، خدا ترس، سادہ لوح، بے ریا، سادہ دل، سادہ مزاج، خوش گفتار وخوش رفتار، تعلیم، فلسفہ، جمالیات، نفسیات، سیاسیات، سماجیات، اور تاریخ ان سب پر ان کی گہری نظر تھی۔ ہندی، اردو، انگریزی اور فارسی کتابیں مطالعہ میں رکھتے تھے۔ ہندی، فارسی اور عربی ادب کے علاوہ روسی، فرانسیسی اور انگریزی ادب کی مختلف تحریکوں، نظریوں، رجحانوں، اور دبستانوں پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ ان میں ایک یہ بھی خوبی تھی کہ بغیر تیاری کے ادب کے کسی بھی موضوع

پر نہایت مدلل، مربوط، واضح، رواں، دل نشیں، اور پر مغز تقریر کرنے پر قادر تھے۔

وہ ماہل ضلع اعظم گڑھ کے ایک متوسط اور شریف علم پرور گھرانے سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کی پیدائش موضع اٹرڈیہہ میں ہوئی (۲) اپنے پھوپھا سید محمد قاسم کے ساتھ گورکھپور کے مختلف مقامات پر رہ کر چھ سال کی عمر میں کلام پاک ختم کر کے دینیات سے واقف ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ماہل کے مڈل اسکول میں داخلہ لیا۔ ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوتے رہے یہاں تک کہ مڈل فرسٹ کلاس پاس کر لیا۔ جولائی ۱۹۲۸ء میں ویسلی ہائی اسکول اعظم گڑھ میں داخل ہوئے۔ یہیں سے ۱۹۳۰ء میں فرسٹ ڈویژن میں ہائی اسکول پاس کیا۔ پھر جولائی ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ کالج الہ آباد گئے وہاں سے ۱۹۳۲ء میں انٹرمیڈیٹ میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ جولائی ۱۹۳۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۳۴ء میں اسی سے پہلی پوزیشن میں بی اے کیا اور گولڈ مڈل پایا۔ ۳۶ء میں ایم اے میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اسی سال ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے اور آزادی کی جدوجہد سے بھی دل چسپی لی۔ جولائی ۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو وفارسی میں لکچرار کی جگہ ملی۔ ۳۹ء میں شادی کی۔ ۵۵ء میں ریڈر بنائے گئے۔ اگست ۶۱ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو وفارسی کی پوسٹ پر آپ کا تقرر ہوا۔ یکم نومبر ۶۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ہو کر آئے اور تادم آخر فرائض منصبی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ جولائی ۵۲ء میں سال بھر کے لیے یورپ وامریکہ اور ۶۲ء میں حکومتِ روس کی دعوت پر وہاں کا علمی دورہ کیا۔ اور اپنے تجربات ومشاہدات اور معلومات کو قلم بند بھی کیا۔ یورپ وامریکہ کے سفر کے تاثرات تجزیے ساحل اور سمندر کے نام سے ان کی زندگی میں اور سفر نامۂ روس ان کے وصال کے بعد ڈاکٹر اجمل اجملی کے مقدمہ کے ساتھ سودیت یونین۔ تاثرات اور تجزیے کے نام سے نئی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

مختلف موضوعات پر احتشام حسین کی کتابوں کے نام یہ ہیں

ویرانے (افسانوں کا مجموعہ الٰہ آباد ۱۹۴۳ء، لاہور ۱۹۴۷ء) تنقیدی جائزے (حیدرآباد ۱۹۴۴ء، الٰہ آباد ۱۹۴۵ء، لکھنؤ ۱۹۵۱ء اس کے بعد بھی کئی بار) روایت اور بغاوت (حیدرآباد ۱۹۴۷ء و ۱۹۵۶ء) ادب اور سماج (بمبئی ۱۹۴۸ء) جوش ملیح آبادی۔ انسان اور شاعر۔ (مرتبہ جعفر

عسکری) تنقید اور عملی تنقید (دہلی ۱۹۵۲ء) ذوق ادب اور شعور (لکھنؤ ۱۹۵۵ء) ساحل اور سمندر (سفر نامہ۔لکھنؤ ۱۹۵۴ء) اردو ساہتیہ کا اتہاس (ہندی میں علی گڑھ ۱۹۵۵ء) اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس (یہ اردو ساہتیہ کا اتہاس کا ترمیم شدہ دوسرا ایڈیشن ہے جو الہ آباد سے ۱۹۷۰ء میں طبع ہوا۔ اس کا روسی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے) عکس اور آئینے (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۲ء) افکار و مسائل (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۳ء) تنقیدی نظریات (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۰ء) اعتبار نظر (لکھنؤ، ۱۹۶۰، ۱۹۶۵ء) کلکی از رادھا کرشنن کا ترجمہ (دہلی ۱۹۶۱ء) وویکا نند از رومیں رولاں کا ترجمہ (دہلی ۱۹۶۳ء) گنجی کی کہانی از موراسکی (دہلی ۱۹۷۰ء) انتخاب آب حیات (دہلی ۱۹۷۲ء) روشنی کے دریچے (مجموعۂ کلام مرتبہ جعفر عسکری الہ آباد ۱۹۷۳ء) جدید ادب۔منظر اور پس منظر (مرتبہ جعفر عسکری اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۷۸ء، ۱۹۸۲ء) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (کئی ایڈیشن) اردو کی کہانی (متعدد ایڈیشن) اردو لسانیات کا خاکہ (متعدد ایڈیشن) ادب پارے (ترتیب) سوویت یونین تاثرات اور تجزیئے (مرتبہ اجمل اجملی۔شائع شدہ نئی دہلی)

تنقید میں احتشام صاحب کا درجہ بہت بلند ہے۔ان کے یہاں ہر قسم کی تنقیدیں ملتی ہیں کہیں ہم عصر ادب اور زندگی سے زیادہ معاملہ رکھا اور نظریاتی تنقید لکھی۔عملی تنقید کی طرف کم میلان رہا۔ وہ محض ایک ترقی پسند نقاد نہ تھے بلکہ ان کے قلم نے تنقید کے مختلف سرچشموں، دبستانوں اور تحریکوں کے پانی سے وضو کیا تھا اور اپنی پیاس بجھائی تھی۔وہ دوسرے نظریہ سازوں کی طرح ادب کی صرف ایک مخصوص قسم کی تنگ و تاریک اور اندھی، بہری، گونگی، لنگڑی، لولی، اپاہج اور بیساکھیوں کا سہارا لے کر چلنے والی انقلابیت کے وکیل نہیں تھے، وہ ادب میں سماجی شعور، گہری بصیرت اور باعظمت معنویت کے علمبردار ہونے کے ساتھ فن کی لطیف حسیت، شعریت اور نشتریت کے بھی قائل تھے۔ ان کے یہاں سماجی معنویت اور ادبی معنویت میں قدر مشترک کی تلاش کا بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ وہ ان کے درمیان کوئی قابل ذکر انفکاک، فصل، بعد اور تصادم نہیں پاتے بلکہ ادب کو تہذیب کی طرح ناقابل شکست تسلسل سمجھتے رہے۔اس لیے جدید سے لطف اٹھانے کے لیے وہ قدیم کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔انہوں نے عقائد اور حقائق میں مصالحت و مفاہمت کی صورتیں

نکالنے، روایت کو درایت کی کسوٹی پر دیکھنے، پرکھنے، جانچنے، سمجھنے اور حیات کے مدوجزر ہیں ذہنی بالیدگی اور شعور کی پختگی کا راستہ تلاش کرنے میں وقت صرف کیا اور ادب کی اخلاقی وانسانی قدروں کو رواج دیا۔ اردو تنقید کو نئی سمت وجہت سے آشنا کیا، نئی فضا اور نئی کائنات کے ہنگامے دیئے۔ اس کے سامنے نئے آفاق کے دروازے کھولے اور اسے نئی بلندیاں بخشیں۔ وہ ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والے جدید میلانات کو خاص طور سے احساس تنہائی، عرفان ذات، کلبیت، یاسیت، قنوطیت اور بے ہنگم انانیت کے جذبے کو شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ تنگ نظر نہیں تھے اس لیے فکر وفن کے نئے زاویوں، اور نو عمر نظریوں کو بھی قبول کرنے میں تامل نہ کرتے۔ ان کی مخالفت، اور تردید وتسبیب میں بھی تفکر کی فضا ملتی ہے دراصل وہ ایک فلسفی نقاد ہیں، ان کے قلم اور ذہن کا جوہر اس وقت کھلتا ہے جب وہ اصول ونظریات پر گفتگو کرتے ہیں۔ انھوں نے موضوع اور زندگی کے نظریہ کو اس طرح اہمیت دی کہ ہیئت کے تقاضے اور فن کے مطالبے بھی پورے ہوئے اور ادب کی سماجی و جمالیاتی قدر بھی برقرار رہی۔ ان کی تنقیدیں نقاد کے منصب کی وضاحت بڑی خوبی سے کرتی ہیں۔

احتشام صاحب کی نثر ہماری علمی نثر کا عمدہ نمونہ ہے۔ انھوں نے نثر کو فلسفہ کا ذہن اور زبان دی، شعر کا آہنگ اور رنگینی کم دی ان کا اسلوب حالی کے اسلوب کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ حسنِ شعریت سے عاری، سادگی لیے ہوئے، مگر بے نمک اور بے کیف نہیں۔ ان کی نثر میں زردے کا رنگ اور پلاؤ کی خوشبو نہ سہی لیکن ابالی کھچڑی بھی نہیں۔ ان کی نثر پر غور کرتے وقت یہ نکتہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ ایک فلسفی نقاد تھے اور زیادہ تر مجذوب فرنگی کو مقام کبریا سے آشنا کرنے اور نظریاتی باریکیوں، اور پیچیدگیوں کی گتھیاں سلجھانے کا فرض نبھاتے تھے۔ جس میں افہام وتفہیم اور ترسیل وابلاغ کے عام اور مروج رنگ وانداز کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور عبارت آرائی، سخن بافی، چرب زبانی اور شاعرانہ رنگینی کی کم ضرورت پڑتی ہے وہ تنقیدی مضامین لکھتے وقت دل سے نہیں ذہن سے کام لیتے تھے اور اپنے قاری کو پرستانوں کی نہیں دبستانوں کی سیر کراتے تھے اس لیے ان کی نثر میں کسی قسم کی شعریت، رنگینی وشگفتگی یا ادبیت کی گنجائش نہیں تھی۔ اگر ان کی ادبیت اور معاملات دل سے لطف اٹھانا ہو تو ان کے افسانوں اور شعروں کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

احتشام حسین کو بچپن ہی میں شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں پہلی باقاعدہ غزل کہی اور حیراں تخلص رکھا اس وقت اعظم گڑھ میں آٹھویں درجہ کے طالب علم تھے (۳)۔ اکثر تعطیلات میں جب ماہل آتے تو ان کے دم قدم سے شعر و سخن اور بیت بازی کی محفلیں گرم ہو جاتیں۔ انھوں نے بچپن میں جو ماتمی مجلسیں پڑھیں ان میں اپنے قطعات نوحے اور مذہبی رنگ کے کلام سناتے تھے۔ گھر میں منبر پر بیٹھ کر ذاکری بھی کرتے تھے۔ ان کے بچپن کا واقعہ ہے کہ ماہل میں ایک ہم عمر دوست سے ان کا معاہدہ ہو گیا تھا کہ ہم لوگ جو باتیں کریں گے وہ نظم میں ہوں گی (۴)۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ احتشام صاحب نے علم و ادب کی دنیا میں اپنی جس ہمہ دانی اور مکمل شخصیت کا مظاہرہ کیا اس کی بنیاد کی خشت اول بچپن ہی میں ماہل کے قصباتی ماحول سے فراہم کی گئی تھی۔

احتشام حسین کی زندگی بڑی دشوار گزار راہوں سے گزری تھی، انھوں نے سوزِ نیم شبی، اور آہِ سحر گاہی کا زہر پیا تھا اور انھیں رنگِ چمن اور فصل بہار کی بڑی قیمت چکانی پڑی تھی، وہ ہزاروں منزل وہم و گماں سے گزر کر یقین کی خلدِ طربناک تک پہنچے تھے۔ شعر کہنے کے لیے ان کے پاس مشاہدات، اور جذبات کی کمی نہ تھی۔ انھوں نے زندگی کو ہر رنگ، ہر پیرہن اور ہر انداز وقد میں دیکھا تھا۔ ان کے پاس سوچتا ہوا ذہن اور تڑپتا ہوا دل تھا۔ سوز و گداز اور سیماب وشی کی بھی کمی نہ تھی اس لیے جو کچھ کہا وہ زندگی کا ترجمان اور دلی کیفیات کا آئینہ بنا۔ انھوں نے شاعری کو صرف منھ کا مزا بدلنے کے لیے نہیں اپنایا بلکہ انھوں نے اسے ایک سماجی ضرورت سمجھا، یہ اور بات ہے کہ انھوں نے اس بت کی تراش خراش کر کے اس کے نقوش اور خد و خال کو تیکھا بنانے کے لیے زیادہ وقت نہیں دیا۔ کیوں کہ ان کی ادبی ذمہ داریوں کے کچھ اور اہم تقاضے بھی تھے۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے شاعری کو اپنی ذات کے اظہار کا مستقل وسیلہ نہ بنایا نہ اسے کوئی زیادہ اہمیت دی پھر بھی بڑے رچے بسے، شہد میں ڈوبے، شستہ و پاکیزہ اور دل میں اتر جانے والے اشعار کہے۔ انھوں نے شاعری کے مختلف اسالیب سے کام لیا، پابند نظمیں بھی کہیں اور آزاد و معری نظموں کی طرف بھی توجہ دی۔ انھوں نے رثائی عنصر اور مذہبی روح سے مملو شاعری بھی کی اور رومانی انداز کو بھی برتا۔

انھوں نے شاعری کو روح عصر سے قریب تر کرنے کے ساتھ دل کی دھڑکنوں سے بھی معاملہ بنائے رکھنے کا سلیقہ سکھا یا وہ شاعری سے عقلی ونظریاتی سطح پر نہیں تخیلی سطح پر معاملہ کرنا پسند کرتے تھے اس لیے ان کے یہاں پیغمبری کے کم، کافری و ساحری اور آذری کے پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔ان کی غزلوں میں شعر کی ماورائیت اور خودسپردگی کے عناصر زیادہ ملتے ہیں۔احتشام صاحب بنیادی طور پر رجائی شاعر ہیں۔لیکن بعض نظموں میں انھوں نے زندگی کی یاسیت،کلبیت اور ناکامیوں، محرومیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔اور کہیں کہیں ان کی تنہائی پسندی بھی پردے سے جھانک پڑی ہے پھر بھی ہم اس کو فیشن پرستی اور آج کے شاعروں کی طرح رجحان زدگی سے تعبیر نہیں کر سکتے۔انھوں نے بلا کسی اتباع وتقلید کے اپنی ذات ہی سے یہ عناصر حاصل کیے ہیں۔خود لکھتے ہیں:''میں طبعاً کم آمیز اور تنہائی پسند ہوں، بچپن میں یہ پہلو اتنا نمایاں تھا کہ بزرگ اور دوست اس پر ٹوکا کرتے تھے(۵)۔ان کی شاعری میں جوسوز وگداز،دھیمی دھیمی آنچ،افسردگی،ربودگی،احساس تنہائی،اور غم انگیزی کی فضا بندی ہے وہ ان کی افتادطبع سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ان کی شاعری نے روایت کی توسیع کی،تاریخ کے تسلسل کو برقرار رکھا اور فکر وآہنگ کے نئے دروازے کھولے۔انہوں نے شاعری کے وسیلے اور حیلے سے زندگی کو سمجھنے سمجھانے، بنانے سنوارنے، بدلنے، برتنے اور اسے انگیز کرنے کی کوشش کی۔اور شعرگوئی سے زندگی کی تفسیر وتنقید کے ساتھ جمالیاتی اور فنی اقدار کے فروغ کا کام لیا۔الفاظ کے دروبست،شعری سانچوں کی نگہداشت،فکر کے رچاؤ،اور رکھ رکھاؤ میں ان کی تنقیدی بصیرت کا عمل جاری وساری رہا۔اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری کو ان کے تنقیدی شعور سے اور ان کی تنقید کو ان کے تخلیقی شعور سے فائدہ پہنچا ہے۔ابہام واہمال اور ترسیل و ابلاغ کے المیہ سے ان کی شاعری پاک ہے۔بیان گنجلک،گمبھیر اور پیچیدہ نہیں،سادہ وشیریں ہے اور اپنے اندر دریا کی سی روانی لیے ہوئے ہے۔

(نمونۂ کلام)

کیوں یورشِ طرب میں بھی غم یاد آگئے　　سوچا ترے کرم کو ستم یاد آگئے
عریانیٔ فکر کھل نہ جائے　　خوابوں کے لباس سی رہا ہوں

حصارِ عہد سے باہر بھی گونج جاتے ہیں
حدود وقت میں لکھے گئے جو افسانے

طلسم راز نہ کھل جائے تنگ بینوں پر
تمہارے نام سے پہلے ہزاروں نام لیے

سنگِ دشنام برستے رہے ہر جانب سے
سخت جاں دل ہی کچھ ایسا تھا کہ ٹوٹا بھی نہیں

افق سے رنگ کئی پھوٹ کر زمیں پہ گرے
ابھی اڑا تھا مری چشم آزر و سے غبار

سورج چڑھا تو دھوپ کی لہروں میں غرق ہوں
جی خوش ہوا تھا سایۂ دیوار دیکھ کر

موج خیال پھیلتی جاتی تھی تا فلک
اب رک گئی ہے وقت کی رفتار دیکھ کر

گرد غم سے نہ بچ سکا آخر
ہم نے دامن بچا کے دیکھ لیا

بستیاں ہوتی گئیں برباد، ویرانے بڑھے
ہم یونہی منزل بہ منزل جانب صحرا گئے

روشن نہ سہی صبحِ وطن اے دلِ پر شوق
بے رونقیِ شامِ غریباں تو نہیں ہے؟

کیا جانئے کب راہ پہ لے آئے انہیں بھی
میرے ہی لیے گردش دوراں تو نہیں ہے

یقیں کے بھیس میں وہم وگماں بھی ہوتے ہیں
پیمبروں میں کچھ افسانہ خواں بھی ہوتے ہیں

سخت ہے پر عزیز ہے کتنی
ہائے رے تلخ زندگی کی مٹھاس

دراز ہیں تری زلفیں یہ مانتا ہوں میں
دراز اس سے بھی کار جہاں نظر آیا

اک کرن چھوتی ہے دل کو اکثر
خلشِ دستکِ الہام نہ ہو

کفر واسلام پہ لڑنے والو
یہ فقط دوریٔ یک گام نہ ہو

اب تو احساس بھی نہیں ہوتا
یہی غم سے نجات ہے شاید

بے نیازی ہے، تغافل ہے کہ بیزاری ہے
بات اتنی تو سمجھ لیتے ہیں دیوانے تک

زندگی روز نئی لگتی ہے دل والوں کو
گرچہ ہر بار وہی لیل و نہار آئے ہیں

وہ راہ جس پہ کئی بار بجھ چکیں لاشیں
اسی پہ روز نئے کارواں نکلتے ہیں

بارش سنگ ملامت ہے، خرد کا پتھراؤ
اپنے سر سے ہو جسے پیار مرے ساتھ نہ آئے

کون ہے خالق ان نظموں کا/ اس کو جان کے کیا پاؤ گے؟/ کیا وہ ان لفظوں میں نہیں ہے/
جن کے لمس سے ذہن وقلب تمہارے جاگ اٹھے ہیں/ فرض کرو/ وہ کوئی نہیں ہے/

رنگوں کا اک مجموعہ ہے موسیقی ہے/ رقص صدا ہے/ آوازوں کا اک طوفاں ہے/ کیا نہیں سمجھے،/
اچھا پھر کچھ ایسا سمجھو/ وقت کے دریا میں بہتا اک زندہ شعلہ/ نورازل کی ایک علامت/ وارثِ ذوقِ گناہ آدم/
معمولی اک انساں ہے/ جس نے کرب و مسرت کی دنیا میں مرگ و زیست کا زہر پیا ہے/
جس نے تخلیقی لمحات میں اکثر/ پھولوں کی آواز سنی ہے/ لفظوں کی خوشبو سونگھی ہے/
چاند کی کرنوں کی ٹھنڈک کو چکھ کر محسوس کیا ہے/ ساز بجے تو آنکھوں نے سنگیت کی لہریں دیکھی ہیں/
جس نے/ رقص کو اک پیچیدہ نظم کی صورت/ بحر و وزن میں ڈھلنے کا نظارہ کیا ہے/ اس کو جان کے کیا پاؤ گے؟/
اس کو دیکھ کے کیا سمجھو گے؟/ اس کے درد و کرب کو دیکھو/ اس کے لفظ و خیال کو سمجھو/
پھول اور پتھر ہاتھ میں لے کر شہر کی گلیوں میں پھرتا ہے/ چہروں کی شکنیں پڑھتا ہے/
نظروں کی باتیں سنتا ہے/ اس کی فکر کے آئینہ میں ہر تصویر چمک جاتی ہے/
اس کے ذہن کی دھرتی میں ہر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے/ وہ نغمہ ہے وہ دھرتی ہے/ وہ طائر ہے جسم بھی ہے/
اور روح بھی ہے وہ/ وہ شاعر ہے/ وہ انساں ہے/ تم نے اسے دیکھا بھی ہوگا/
اور اگر وہ صرف صدا ہے اس کو جان کے کیا پاؤ گے؟/ اس کو دیکھ کے کیا سمجھو گے؟/
کیا وہ ان شعروں میں نہیں ہے؟/ کون ہے خالق ان نظموں کا/

بچپن کی نہ پیری کی کہانی ہے پسند جو سب سے حسیں ہے وہ نشانی ہے پسند
جنت میں بلاتا ہے عطا کر کے شباب شاید کہ خدا کو بھی جوانی ہے پسند

(رباعی)

حواشی:

(۱) یہ صحیح تاریخ ولادت خود احتشام صاحب کی بتائی ہوئی ہے۔ ماہنامہ شاعر بمبئی جنوری، فروری ۱۹۷۳ء
(۲) احتشام نمبر شاہ کار، بنارس ص:۲۳۶
(۳) عکس اور آئینے ص ۱۷۸
(۴) احتشام نمبر شاہکار بنارس ص ۹۷۔ سید اولاد اصغر رضوی ماہلی صاحب نے ان کا نام علی انصر بتایا ہے، مکتوب بنام راقم یکم جولائی ۱۹۸۲ء
(۵) جدید ادب منظر اور پس منظر ص ۱۷۳

احد- منشی عبدالاحد

وطن مالوف غازی پور مگر بود و باش اعظم گڑھ میں تھی۔ مزاحیہ شاعری کرتے تھے۔ اعظم گڑھ شہر کی طوائفیں انہیں چھیڑ کر خوش ہوتیں اور ان کے برمحل اشعار اور دل چسپ جملوں کو سن کر گلنار اور باغ و بہار ہو جایا کرتی تھیں۔ برقؔ اعظمی کا بیان ہے کہ صاحب تصنیف تھے، ان کی کتابوں کے نام بھی مزاحیہ ہوتے تھے۔ لیکن ان کی کسی تصنیف کا کہیں کوئی نام ونشان نہیں ملتا اور نہ کسی لائبریری میں ان کی موجودگی کا کوئی علم ہے۔ ٹیوشن کرتے تھے اور رنڈیوں کو بھی پڑھاتے تھے، بہت فحش گو تھے۔ اعظم گڑھ میں پیوند خاک ہوئے۔ ان کی شاعری میں لہجے کی گراوٹ اور الفاظ کی رکاکت جا بجا ہے مگر یہ بھی ایک انداز سخن کی یادگار ہے اس لیے بادل ناخواستہ سہی یہ چند نمونے جو برقؔ اعظمی (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۸۳ء) کی زبانی روایت سے ملے ہیں درج ہیں۔

نمونۂ کلام

جب تک شب وصال مری خوں سے تر نہ ہو — نکلے نہ آفتاب الٰہی سحر نہ ہو
رنڈی بچوں کو اہل دول کیوں نہ دیں رقم — امداد اس کی فرض ہے جس کا پدر نہ ہو
دل لے کے جائیں کیا سوئے قالین گنج ہم (۱) — پوچھے گا ہم کو کون اگر پاس زر نہ ہو
ہوتا نہیں میں سیر ضعیفی میں بھی احدؔ — جب تک کہ سلسلہ مرا دو چار گھر نہ ہو
کیا جانے کیا معاوضہ لیں گی وصال کا — دس روپیہ تو مانگتی ہیں دیکھ بھال کا
ہو جائیں مالا مال یہ قالین گنجیاں — درشن اگر کریں مرے پمو دیال کا
کھائیں مرے پپیتے کی اک قاش وقت صبح — نسخہ بہت ہی ہے یہ مجرب طحال کا
باندھ پہ بیٹھ کے کہہ دو کہ وہ موتا نہ کریں — اور بھی شہر میں جاری کوئی دریا نہ کریں (۲)

حواشی:

(۱) قالین گنج شہر اعظم طوائفوں کا محلہ

(۲) ایک بہت ہی معزز فرد کی طرف اشارہ ہے جو عموماً باندھ پر بول ریز ہوتے تھے

احسانؔ-مرزا احسان احمد بیگ

۱۸۹۵ء ـــــ ۲۳ر دسمبر ۱۹۷۲ء

مسلم پٹی ضلع اعظم گڑھ کی مشہور علمی بستی ان کی زاد بوم تھی۔مگر بسلسلۂ وکالت شہر اعظم گڑھ میں ان کا قیام تھا۔ یہاں کے مشہور ادیب وشاعر اور وکیل تھے۔ان کے بڑے بھائی مرزا سلطان احمد بیگ تھے جو ریونیو بورڈ یوپی کے ممبر اور ریٹائرڈ کلکٹر تھے۔ان کے والد مرزا محمد سلیم متوفی ۱۹۲۳ء مولانا قاسم نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ احسان نے اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق اپنے گھر پر قاضی عبدالرحمن حیرتؔ سے حاصل کی تھی۔جو کئی پیڑھی سے علامہ شبلی نعمانی کے گھرانے کے بھی معلم واتالیق تھے۔

احسان علامہ اقبال سہیل کے ہم درس وہم پیشہ تھے۔شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۱۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ گئے وہاں ۱۹۱۸ء تک بسلسلۂ تعلیم قیام رہا ایل ایل بی کرنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۸ء میں اعظم گڑھ میں خلافِ ذوق آبائی پیشہ وکالت کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۵ء میں اس پیشہ سے علاحدہ ہو کر خانہ نشیں ہو گئے۔اور قلم کی عبادت میں وقت عزیز صرف کرنے لگے۔احسان نعمت اولاد سے محروم تھے۔بڑے پختہ اور بیدار مغز قلم کار تھے۔ان کے انداز واسلوب پر علامہ شبلی کی گہری چھاپ تھی۔اس تعلق سے انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”میرے نزدیک اردو انشا پردازی کا بہترین اور اعلیٰ ترین نمونہ علامہ شبلی مرحوم کا طرز تحریر ہے۔میں نے اپنے مضامین میں اسی انداز انشاء کی تقلید کی ہے اور بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے لیکن کبھی کسی سے مضامین پر اصلاح نہیں لی“۔

احسانؔ کی اردو اور فارسی کی تعلیم اسکول اور کالج میں ہوئی تھی مگر انہوں نے اپنے ذوق اور ذاتی محنت ومطالعہ سے ان دونوں زبانوں میں بڑی صلاحیت وبصیرت حاصل کر لی تھی۔انہوں نے اردو اور فارسی کے بڑے شاعروں اور ادیبوں کو ذہنی بیداری کے ساتھ پڑھا تھا اس لیے ان کے یہاں گہرائی اور برجستگی پیدا ہو گئی تھی۔ان کے یہاں کئی اضافتیں ملتی ہیں اور شاید ہی کوئی شعر ایسا ہو

جوعطف و اضافت سے خالی ہواس کے باوجود حسنِ شعری اورصوتی آہنگ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اعظم گڑھ کے بڑے شاعروں نے ہمیشہ ادب کے فاسقانہ وسوقیانہ رنگ سے اجتناب کیا ہے۔ احسان بھی زندگی کی سچائیوں کے نمائندہ اورعلمی بصیرتوں کے امین وعلم بردار بن کر ادب وتنقید کے میدان میں قلم کے جوہر دکھاتے رہے۔ انہوں نے ادب کے اخلاقی پہلو اور زندگی کی اصلاح و تہذیب سے علاقہ رکھا۔ وہ بازاری مضامین و خیالات اور مصنوعی افکار سے محترز ہوکر مذہب و سیاست، تاریخ وتمدن اوراخلاق وجذبات انسانی کی شائستگی کوشعروادب کا حصہ بنانے میں کامیاب رہے۔ ان کے اردو کلام کا مجموعہ ''پیام کیف'' ۱۹۴۰ء میں اور ادبی وتنقیدی مضامین ومقالات کا مجموعہ ''مقالات احسان'' ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ ''میں اور میری ادبی صلاحیت'' کا سال اشاعت ۱۹۷۱ء ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اعظم گڑھ اصغر وجگر کا مرکز ومحور اور شعری وادبی مرجع ومصدر رتھا۔ جگر مرادآبادی اوراصغر گونڈوی اکثر ان کے مہمان ہوتے تھے ان دونوں اہم شاعروں کے پہلے دیوان ''داغ جگر'' اور ''نشاط روح'' انھوں نے ہی مرتب کر کے معارف پریس سے چھپوائے اور اردو شاعری کو ان دونوں کے مقام ومرتبہ سے آشنا کیا۔ مولانا حمیدالدین فراہی کی فارسی شاعری پر شبلی کالج میگزین میں اہم مضمون لکھ کر علامہ فراہی کی فارسی فتوحات سخن اور شاعرانہ تفرد وتخصص سے علمی وادبی حلقوں کو روشناس کرایا۔ اورساتھ ہی اپنی فارسی دانی کی شہادت بھی پیش کی۔ اس مضمون سے احسان کی دقت نظر، وسعتِ مطالعہ اورنوائے عجم کے نشیب وفراز سے ان کی باخبری ظاہر ہوتی ہے۔

رشید حسن خان نے ''پیام کیف میری نظر میں'' کے زیرعنوان نگار لکھنؤ ستمبر ۱۹۵۵ء کے شمارہ میں ص ۱۳ پر ایک طویل مضمون لکھا ہے جس میں احسان کی زبان وبیان کی غلطیاں شمار کرائی ہیں اوران کی غیر شاعرانہ لسانی بےلطفی پر بحث کر کے انہیں فنی اسقام وعیوب سے گرانبار بتایا ہے۔ اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں نے احسان کی شاعری کے صرف ایک پہلو پر توجہ کی ہے اوراسی کو موضوع گفتگو بنایا ہے جب کہ تنقید نگاری کا حق یہ تھا کہ وہ دوسرے فنی وفکری پہلوؤں کو نظرانداز نہ کرتے اوران خصوصیات پر ایک طائرانہ نظر ہی ڈال لیتے یوں ہی ذراسی توجہ ارزانی کر کے کچھ مباحث ومسائل پر چند سخن گسترانہ باتیں ہی کہہ دیتے تو اس مضمون کی

اہمیت ومعنویت اورافادیت میں اضافہ ہوگیا ہوتا۔

احسان کا اسلوب، تربیت یافتہ اور مدرسۂ تہذیب وشرافت کا نمائندہ تھا، ذہنی وفکری اعتبار سے وہ اس رجحان کو تقویت دینے والے تھے جو اونچے خیالات کی عمدہ تصویر کشی اور سچے جذبات کی عکاسی کو منتہائے نگارش مانتا ہے۔ مرزا احسان اصلاً ایسے فن کار تھے جس نے مشرقی تہذیب کے دامن میں پرورش پائی تھی۔ وہ معنی بندی، حسن عبارت تزکیۂ نفس اور بلندی افکار کو بڑی دولت سمجھتے تھے۔ انہیں اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی کا طرز پسند تھا اور لکھنوی انداز کے ابتذال وسوقیت کے وہ سخت مخالف تھے جس کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک قلم کی روانی، تنقیدی بصیرت، لفظ کا خلاقانہ استعمال، فصاحت وبلاغت کلام اور مناسبت افکار واظہار فن کار کا خاص وصف ہے۔ بعض بعض مقامات پر اتنے اچھے اور بولتے ہوئے جملے لکھ گئے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے انہوں نے الفاظ ومحاورات پر زبردست حکومت کر کے ان سے خراج وصول کیا ہے۔

مرزا احسان بیگ نے دبستان شبلی کو اردو شعر وشاعری اور ادب کی دنیا میں مستقل شکل دینے اور اس کی روایات واقدار کو اردو شعر وادب میں رائج کرنے کے لیے بڑا کام کیا۔ اس دبستان کی خصوصیت تھی کہ اردو کی صالح اقدار اور زبان کی شائستگی کو برقرار رکھتے ہوئے ہم عصر تقاضوں اور مسائل کو اس طرح روشن کیا جائے کہ ادب کی فنی خوبیاں بھی باقی رہیں اور عصری تقاضوں کی بھی تکمیل ہو جائے۔ دبستان شبلی میں لکھنؤ کی ادبی خوبیاں رنگینیاں، رعنائیاں موجود ہیں اور اصلاح زبان کی تحریک کے زیر اثر زبان وبیان کی تراش خراش کا سلیقہ بھی پایا جاتا ہے مگر اہل لکھنؤ کا وہ سوقیانہ ومبتذل لب ولہجہ اور نسوانی اعضا کی منظر کشی نہیں جو وہاں کے تعیش اور ظاہر پرستی کا نتیجہ ہے۔ شبلی کے اثر سے اور پھر اعظم گڑھ میں ان کے متبعین اقبال سہیل، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی، مرزا احسان بیگ، یحیٰ اعظمی، امین اعظمی، منیف اعظمی، برق اعظمی وغیرہ کی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے اس دبستان نے زبان کی ادبیت وشعریت، خیالات کی پاکیزگی، اظہار کی ندرت و جدت، فکر واحساس کی شائستگی میں بڑی زبردست توسیع کی ہے اور اس کے دائرے کو دور تک پھیلا بڑھا کر ادب میں مستقل ایک دبستان فکر، تحریک اسلوب بیان اور ایک علاحدہ ادبی اسکول کی

تشکیل کے جذبے کو توانائی بخشی ہے۔اس طرح اردو شعر و ادب کی دنیا میں ایک قائدانہ رول ادا کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان گیر پیمانے پر اس دبستانی تحریک کے جو مثبت ذہنی وفکری اثرات مرتب ہوئے اس میں مرزا احسان بیگ کے کردار کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مرزا احسان اہل لکھنؤ سے اپنے اختلاف کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ''افسوس ہے کہ ہمارے غزل گو شعراء نے عشق کے درد وغم کو اس نگاہ سے کبھی نہیں دیکھا ورنہ آج عشق کی بزم کیف میں نوحہ گری اور آہ وبکا کا نفرت انگیز منظر نظر نہیں آتا(۱)۔ان کی نظر میں غزل میں تغزل کا ہونا بہت ضروری ہے اور اس کے لیے ایک درد آشنا دل بھی درکار ہے ورنہ شاعر فحاشی اور ابتذال کی طرف چلا جائے گا جو انسانی زندگی کی بہت بڑی پستی ہے۔ان کا خیال ہے کہ ''عشق ومحبت جو غزل کا خاص موضوع سخن ہے فطرت انسانی کا سب سے زیادہ نازک اور لطیف جذبہ ہے اس لیے اس سے صحیح طور پر صرف ذوق سلیم ہی کیف اندوز ہو سکتا ہے'' (۲)۔ایک جگہ وہ مواد وہیئت اور خیال واظہار کے تعلق سے اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں کہ ''تاثیر شعر کی جان ہے اس کے لیے حسن خیال کے علاوہ حسن بیان نہایت ضروری چیز ہے۔اس بنا پر جو شعراء نکتہ رس اور بلاغت شناس ہوتے ہیں وہ لطافت خیال کے ساتھ انداز بیان کی خوبی اور دل کشی کا خاص خیال رکھتے ہیں اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ معمولی خیال بھی ایسے اچھوتے طریقہ سے ادا کیا جائے کہ سننے والا وجد کرنے لگے اس کے لیے غیر معمولی قدرت زبان درکار ہے'' (۳)۔کچھ جملوں کے بعد لکھتے ہیں: ''غرض شاعر کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ شاعر ہے ناصح یا واعظ نہیں، خواہ فلسفہ لکھے یا علمی یا اخلاقی نکتے بیان کرے خواہ اسرار محبت کی گرہ کشائی کرے یا مناظر قدرت کی تصویر ہر موقع پر اس کا انداز بیان شاعرانہ رہنا چاہیے(۴)۔

مرزا صاحب شاعری کا حقیقی حسن دیکھنا پسند کرتے تھے ان کے کلام میں داخلی وخارجی دونوں خوبیاں ملتی ہیں۔وہ ماحول اور موسم کے تقاضوں کو موضوع بناتے ہیں وہ سرور کیف کی محفل میں شوریدہ سری اور ماتم وگریہ جس طرح عیب سمجھتے ہیں اسی طرح وہ رنجیدگی وآزردگی کے مقام پر نغمہ طرازیِ عیش کو بھی مذموم جانتے ہیں۔مرزا احسان اپنے ہم عصروں میں اقبال اور اصغر سے ذہنی قربت محسوس کرتے ہیں اور وہ ان کے دل دادہ ہیں۔وہ اقبال، اصغر، جگر اور اقبال سہیل کو اس لیے

اہم سمجھتے ہیں کہ ان کے یہاں لذت درداور روح زندگی کا سلسلہ ہے۔ اور شاعروں کی شاعری میں ذات وکائنات کے درمیان بہترین ربط وتعلق ہے۔

مرزا احسان اچھے تنقید نگار، بلند فکر شاعر، بہتر نثر نگار تھے۔ ان کے خاندان میں شعر و ادب کی ایک توانا روایت تھی۔ ان کے والد مرزا سلیم بلند و پاکیزہ مذاقِ شاعری رکھتے تھے وہ ایک اچھے شاعر تھے۔ دو بھائی مرزا سلطان احمد اور مرزا مشتاق احمد سخن فہم اور شعر و ادب کے پرستار تھے۔ احسان نظم وغزل، قطعہ اور مرثیہ کے شاعر تھے۔ مگر ان کا اصل جو ہر غزلوں میں کھلتا ہے ان کی غزلیں حسن وعشق کی سرمستی ورندی اور دل گداختگی وجگر سوزی کی کیفیات سے مملو ہیں۔ انہوں نے یاس والم کے سائے سے کلام کو ہمیشہ دور رکھنے کی کوشش کی وہ زندگی اور اس کی مسرتوں اور جوش کے دل دادہ تھے۔

نمونۂ کلام

منظر کائنات سمجھ، مقصد زندگی سمجھ
صبح کی روشنی سمجھ، شام کی تیرگی سمجھ
دل کو کچھ اپنے اس طرح وقف رضائے دوست کر
جو بھی نصیب ہو اسے حاصل سمجھ
سجدۂ سر کے ساتھ گر دستِ ستم بھی ہے دراز
ضائع پھر اپنی یہ تمام طاعت و بندگی سمجھ
سوز دروں سے اپنے خود ہو نہ سکی جو مشتعل
وہ تو ہے ایک مشت خاک اس کو نہ زندگی سمجھ
محبت جس کو تو اک سعیٔ لاحصل سمجھتا ہے
اسے تو زندگی کی روح میرا دل سمجھتا ہے
پریشاں ہوتو ہر ذرے سے ٹپکے نور لاہوتی
غبارِ قیس کو کیا صاحبِ محمل سمجھتا ہے
سفینہ اپنا جو ٹکرا رہا ہے موجِ طوفاں سے
وہی شوریدہ سر کچھ معنی ساحل سمجھتا ہے
کروں کیا نذر میں اس کو کہ یہ ذوقِ جنوں میرا
متاع جاں کو بھی اک ہدیۂ باطل سمجھتا ہے
رگِ جاں پر گرانا بجلیاں ان کی نگاہوں کا
نوازش کا وہ عالم تھا کہ اب تک دل سمجھتا ہے
کیا گلہ ان بجلیوں کا ، ہم تو یہ کشتِ حیات
کچھ انہیں کے فیض سے شاداب وتر دیکھا کیے
گو شب غم درد سے دل تھا تہ و بالا مگر
اک عطائے خاص بھی ہم تا سحر دیکھا کیے
ہے فقط اک جام لیکن جب اچھالا ہے اسے
عالم بالا کو بھی زیر و زبر دیکھا کیے

کچھ اس طرح بھی جنوں میں نظر اٹھا کے چلے
تمام عرصۂ عالم پہ جیسے چھا کے چلے

رہِ طلب میں گریں گرچہ بجلیاں اکثر
کنارِ شوق میں سب کو مگر دبا کے چلے

وہ اہلِ درد ہمیں تھے کہ اس رگ جاں پر
ہزار زخم لگے پھر بھی مسکرا کے چلے

رہ طلب میں نہ تھا کوئی ہم سفر اپنا
کہ ہر مقام سے آگے قدم بڑھا کے چلے

ہزار بار ملے تو گنوادیں ہم اس کو
دیارِ حسن میں جو زندگی گنوا کے چلے

یہ اہل ہوش تو مر کر نہ رہ سکے زندہ
وہ ہم تھے موت کو جو زندگی بنا کے چلے

کیا لیا اور کیا دیا میں کیا بتاؤں جب اٹھی
وہ نظر میری طرف اور یہ نظر ان کی طرف

تہ میں جس کی گر نہیں کوئی شرارِ سینہ تاب
لاکھ چمکے وہ گہر، ہے اصل میں لیکن خزف

وہ کسی شوریدہ سر کا ہے جنونِ آرزو
بن نہیں سکتا ہے جو تیرِ حوادث کا ہدف

اس نظامِ دہر کا بدلا ہے منظر جب کبھی
کوئی دیوانہ ہی اٹھا ہے ہمیشہ سربکف

پھر گیا رخ آندھیوں کا، بجلیاں واپس گئیں
اک گدائے راہ نے دیکھا ہے جب ان کی طرف

جلوۂ تہذیبِ نو کی تہ میں ہیں جو ظلمتیں
حیف ہے گر ان سے ہو انسان کے دل کو شغف

کیسے ہم سمجھیں کہ یہ ہے آدمی کی زندگی
ہورہے ہوں دل کے احساسات سارے جب تلف

عرصۂ عالم کو جس نے روند ڈالا تھا کبھی
پھر دیکھا دے اس زمانے کو وہی شانِ سلف

دیدۂ و دل ہیں آج سب محوِ نظارۂ جمال
میری جبینِ شوق کو فرصتِ بندگی نہیں

لیکن حریمِ حسن میں ولولۂ حیات آ
شیوۂ عشق سخت کوش گریۂ بے کسی نہیں

راہ طلب میں آئے تھے دیر و حرم سبھی مگر
یہ دلِ راز آشنا ہو نہ سکا کسی سے خوش

میکدۂ حیات کے کھل گئے جیسے در تمام
قلب وجگر ہیں اب تو یوں سوزشِ تشنگی سے خوش

کرم طوفانِ برق و باد کا جس پر رہا اکثر
یہاں تو عمر گزری ہے اسی شاخِ نشیمن پر

جب اک دن خاک ہی ہونا تھا جل کر دل کی قسمت میں
تو پھر الزام کیا ان کی نگاہ برق افگن پر

یہ میکدۂ عشق ہے، غم خانہ نہیں ہے
یاں کام نہیں اس کا جو دیوانہ نہیں ہے

کیفیتِ دردِ دلِ بے تاب کہوں کیا
اک راز حکیمانہ ہے، افسانہ نہیں ہے

ساقی ! نگہ مست کا بس ایک اشارہ
رندوں کو ترے حاجت پیمانہ نہیں ہے

قوت پہ کلیسا کو یہ کیوں ناز ہے اتنا بیدار حرم کا ابھی دیوانہ نہیں ہے
جھک جائیں مہ ومہر بھی آگے ترے لیکن لب پر وہ ابھی نعرۂ مستانہ نہیں ہے
اک بار ہے، اک ننگ ہے، مٹنے کے ہے قابل وہ دل جو تیری راہ میں دیوانہ نہیں ہے
لذت کے لیے ذوقِ تصور ہے یہ کیا کم گو پیشِ نظر صورت جانا نہ نہیں ہے
اک خاک نشیں بندۂ ناچیز ہوں لیکن ہے کون ادا مجھ میں جو شاہانہ نہیں ہے
کچھ ایسے محوِ لذتِ دردِ نہاں رہے دنیا سے بے نیاز رہے، ہم جہاں رہے
یوں ہو نثار راہ محبت تو لطف ہے دل میں بھرا ہو درد مگر چپ زباں رہے
پامالیِ چمن ہو نگاہوں کے سامنے اور اس پہ حکم یہ ہے کہ ضبط فغاں رہے
ذوق ستم سے ہو نہ سکا بے نیاز میں ہر چند میرے حال پہ وہ مہرباں رہے
لٹتا رہا قفس کے قریب اپنا آشیاں ہم تھے کہ پھر بھی مائلِ خوابِ گراں رہے
اے چشم شوق آج ہو یوں عرض مدعا ہر جنبشِ نگاہ میں اک داستاں رہے

بھائی مرزا سلطان احمد بیگ کی یاد میں قطعہ

آج یہ میرا نظام زندگی ہوگیا ہے کس طرح برہم نہ پوچھ
اور کچھ ہو پوچھنا تو دوں جواب وجہ غم مجھ سے مگر ہمدم نہ پوچھ
آج کن گہرائیوں سے روح کی اٹھ رہی ہے یہ نوائے غم نہ پوچھ
آج تر کرنے کو ہے دامن مرا کس طرح یہ دیدۂ پرنم نہ پوچھ
اپنی ان حسرت زدہ آنکھوں سے آج دیکھتا ہوں آہ! کیا عالم نہ پوچھ
ہاں مگر اب کچھ ترے اصرار پر دل ہے مائل درد کے اظہار پر

حواشی:

(۱) پیام کیف: ص۹۔
(۲) آہنگ غزل: ص۱۷
(۳) مقالات احسان ص: ۱۸۲
(۴) ایضاً

احسن-مولانا احسن اللہ سمبھی

۲۲ر جون ۱۸۸۶ء ۱۸ر رمضان ۱۳۰۴ھ ___ ۸ر ستمبر ۱۹۲۸ء

مولانا احسن سمبھی ضلع اعظم گڑھ کے ایک غیر معروف موضع سمبھی کے رہنے والے تھے۔ والدین نے آپ کا نام احسن اللہ رکھا تھا لیکن آپ خود محمد احسن کہا جانا پسند کرتے تھے۔ تخلص احسنؔ تھا۔ وطن کو عزیز رکھنے کی وجہ سے اسے اپنے نام کا جزو بنالیا تھا۔ اور احسن سمبھی کے نام سے اکناف ہند میں مشہور تھے۔ داروغہ محمد ظہور صاحب (۱) آپ کے والد ماجد تھے۔ آپ کا خاندان اعظم گڑھ کے چند پرانے اور شریف خاندانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ بچپن نہایت بے فکری سے گزرا۔ مولوی غلام عباس جو مبارک پور سے ترک مکانی کر کے سمبھی میں سکونت اختیار کر چکے تھے وہ ان کے استاذ علوم رسمی ہونے کے ساتھ ساتھ فن شعر میں بھی ان کے رہنما تھے۔ خاندان کے دو تین موزوں طبع نو جوانوں کا ساتھ ہوا تو طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہوگئی۔ مولانا غلام عباس مبارک پوری جو خاندان کے معلم تھے اور خود بھی شعر و سخن سے دل چسپی رکھتے تھے ان سے رائے لی جاتی تھی۔ مشاعرے منعقد ہوتے اور غزلیں کہی جاتی تھیں۔ انہیں چھوٹے چھوٹے مشاعروں میں ایک زبردست شخصیت تیار ہونے لگی تھی۔ اعظم گڑھ کے دوسرے مقامات پر منعقد ہونے والی اس قسم کی شعری محفلوں کی بڑی ادبی اہمیت ہے اور شعر و ادب کی ترویج میں ان کا زبردست حصہ ہے۔ مولانا احسن نے منشی احمد علی شوق قدوائی تلمیذ منشی سید مظفر علی اسیر لکھنوی سے بھی فن شاعری میں شرف تلمذ پایا تھا۔

عنفوان شباب میں علی گڑھ پہنچے وہاں سے حیدرآباد دکن اور دیگر مقامات میں گھومتے ہوئے ۱۹۱۹ء میں کان پور گئے اور مولانا آزاد سبحانی (۱۸۸۲ء۔۱۹۵۷ء) کے یہاں امین گنج میں قیام فرمایا۔

مولانا احسن کے شاگرد سید ابو محمد ثاقب کان پوری متوفی ۷ر دسمبر ۱۹۸۵ء نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں (۱۹-۱۹۱۸ء) میں ایک صاحب کان پور آئے ہوئے تھے اور مولانا آزاد سبحانی سے قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے ان ہی کے دولت کدے پر قیام پذیر تھے۔ یہ نظم (اپنی پہلی

نظم، چودہ برس کی عمر میں کہی ہوئی) اصلاح کے لئے میں نے ان ہی (مولانا آزاد سبحانی) کی خدمت میں پیش کی۔ مولانا نے فرمایا کہ اب مولانا احسن آ گئے ہیں تم اپنے مضامین نثر و نظم انھیں کو دکھایا کرو۔ چنانچہ میں نے وہ نظم مولانا احسن کی خدمت میں پیش کی، ان کی مخصوص اصلاح نے اس نظم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور پھر اصلاح کا مستقل سلسلہ قائم ہو گیا۔ (۲)

مدیر زمانہ کان پور دیا نرائن نگم کا بیان ہے کہ پہلے عرصہ تک وہ اپنے وطن اعظم گڑھ میں متفرق طور پر سرکاری ملازمت کرتے رہے مگر ادبی ذوق نے انھیں دیر تک اس صیغہ میں نہ رہنے دیا اور بعض اصحاب کی تحریک پر وہ کان پور چلے آئے۔ یہ کان پور میں عرصہ تک سوداگران پرم کے یہاں حساب و کتاب کا کام کرتے رہے اور اسی کے ساتھ شعر و سخن کا چرچا بھی قائم رکھا۔

کان پور میں آپ کی بڑی قدر و منزلت کی گئی اور آپ کے گرد عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا ایسے ماحول میں آپ نے ایک بزم ''حلقۂ ادبیہ'' قائم کر کے ناپختہ ذہنوں کی علمی و ادبی تربیت کا سلسلہ شروع کر دیا آپ نے نوجوانوں میں ذوق اور جوش عمل پیدا کرنے کے لیے کانپور سے ایک ادبی رسالہ ''الادب'' جاری کیا۔ جو مولانا آزاد سبحانی کی سرپرستی میں عرصہ تک نکلتا رہا۔ آپ نے ایک عرصہ تک دفتر زمانہ میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا ایک زمانہ میں زمانہ ہندوستان کی ادبی فضا پر چھایا ہوا تھا اور اہل علم کے حلقے میں اپنے علمی و ادبی مشمولات کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے مدیر و مالک منشی دیا نرائن نگم ہمیشہ آپ کا احترام کرتے تھے۔ وفات سے چند ماہ پہلے زمانہ کی ادارت سے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ رضوان اللہ صاحب نے ہمارے گاؤں ہمارے لوگ میں صفحہ ۱۳۱ پر اخبار صداقت کان پور سے بھی ان کے تاعمر وابستہ رہنے کی خبر دی ہے۔ ان کے انتقال پر مدیر زمانہ دیا نرائن نگم نے دسمبر ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں جو تعزیتی تحریر لکھی ہے اس سے بہت سے گوشے روشن ہوتے ہیں۔ جا بجا سے اس کے چند جملے یہ ہیں ''۸ر ستمبر (۱۹۲۸ء) کو مولانا احسن سمبھی بھی رہگرائے عالم جاودانی ہو گئے آپ ایک عرصہ سے بیمار تھے در حقیقت آپ کی صحت دو تین سال گزشتہ سے خراب تھی مگر اس طرف مہینوں کی علالت کے بعد چلنے پھرنے اور کام کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ خدا معلوم کان پور کی آب و ہوا آپ کے مزاج کے خلاف تھی یا کیا؟ لیکن یہاں

آپ کی صحت ہمیشہ خراب رہی جس کی وجہ سے آپ کبھی انہاک ودل جمعی کے ساتھ کوئی کام نہ کرنے نہ پائے۔خرابیٔ صحت کے باعث آپ دسمبر ۱۹۲۷ء میں دفتر آزاد وزمانہ سے بھی اپنا تعلق منقطع کرنے پر مجبور ہوگئے اس کے بعد آپ اپنے وطن تشریف لے گئے جہاں سے آپ حال ہی میں معہ عیال واطفال کان پور واپس آئے تھے اور مدرسہ فیض عام میں مدرس ہو گئے تھے"۔

زمانہ کانپور مارچ ۱۹۲۴ء کے صفحہ ۱۶۹ر پران کا ایک افسانہ ''دیوانۂ ادب'' چھپا ہے۔ اس میں ایک ادب کے رسیا، حسن فطرت کے پرستار ادیب کی زندگی اوراس کے مزاج کی عکاسی کی گئی ہے صفحہ ۱۷۰ر پر لکھا ہے: ''بیوی حسین تھی، لیکن شوہر کی طرح اس کے خیالات حسین نہ تھے۔ بالفرض خیالات بھی حسین سہی لیکن اس کی آنکھوں میں شرم تھی، ایسی شرم جو دوشیزگی کے لیے مخصوص ہے۔ادیب چاہتا کہ بیوی حسن فطرت کی سیر میں اس کا ساتھ دے''۔

افسانہ میں بتایا گیا ہے کہ ادیب گھر سے لا پتہ ہوجاتا ہے۔گھر کے لوگ بھی اس کی گم شدگی پر صبر کر لیتے ہیں۔لیکن اس کی بیوی اس گم شدگی کا سبب جانتی ہے اور وہ خود شوہر کے رنگ میں رنگ جاتی ہے اور مضمون نگاری شروع کر دیتی ہے۔

کان پور میں آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن کی اکثریت نے استادانہ حیثیت سے کافی شہرت پائی۔ ایسے چند حضرات کے نام یہ ہیں سید ابو محمد ثاقب متوفی ۷ر دسمبر ۱۹۸۵ء گنگا دھر ناتھ فرحت، محمد زبیر روحی، عبدالصمد بزمی، راز چاند پوری، سلیم نیدوروی، لیاقت اللہ نظر بریلوی مرحوم، ایمن شہابی۔

مولانا احسن ایک صوفی منش اور گوشہ نشین شاعر تھے۔ ہمیشہ گمنامی کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی۔ ورنہ فن سخن میں وہ کمال وتبحر تھا کہ اگر ذرا بھی شہرت وناموری کی طرف طبیعت مائل ہوئی ہوتی تو ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر آپ کا نام جاری ہوگیا ہوتا۔حلقۂ احباب نہایت وسیع تھا(۳)۔جو آپ کے مرنجان مرنج، با اخلاق، زندہ دل اور خوش باش وشگفتہ دماغ بزرگ ہونے کی علامت ہے۔لالہ سری رام دہلوی نے خم خانۂ جاوید میں عارف تخلص سے ان کا کلام شامل کیا ہے۔ان کا کلام اعظمی کے تخلص سے بھی چھپتا تھا مزحیہ کلام میں بھی اعظمی تخلص اختیار کیا کرتے تھے۔

مولانا احسن کو ہر صنف سخن پر قدرت تھی مگر غزل سے خاص شغف تھا۔ اصلاح کلام کا بہت اچھا سلیقہ معلوم تھا ذرا سی تبدیلی سے مضمون کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے تھے۔ تمام عمر شعر و ادب اور صحافت کی خدمت کی۔ افکار و خیالات میں قدیم و جدید کی جھلک تھی اور ہر شخص پر ان کی شخصیت کا اثر پڑتا تھا (۴)۔ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ احسن ایک زمانہ ساز اور عہد آفریں شخصیت کے حامل تھے اور جتنا ظاہر میں تھا اس سے کہیں زیادہ انھوں نے اپنے باطن میں چھپا رکھا تھا۔

مولانا احسن کے بڑے بیٹے نورالہدیٰ کان پور کی کوتوالی میں داروغہ تھے۔ ریٹائرمنٹ کی عمر سے بہت پہلے ۱۹۴۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی شخصیت بڑی پُرکشش تھی۔ مولانا احسن کے دوسرے بیٹے پروفیسر شبیر احمد تھے۔ وہ کان پور میں مولانا محمد علی میموریل انگلش اسکول کے بانی تھے۔ انھوں نے خود کو اس اسکول کے لئے وقف کر دیا تھا۔ مجرد زندگی گزاری۔ تیسرے بیٹے وسیم تھے انھوں نے زندگی بھر شاعری کے علاوہ کچھ نہیں کیا کچھ عرصہ تک مولانا محمد علی میموریل اسکول میں پڑھایا بھی تھا۔ شفیق جون پوری کے ہم عصر تھے۔ خاموش طبع اور کم آمیز تھے۔ چوتھے بیٹے پروفیسر شمیم احمد نے حلیم مسلم کالج کان پور سے بی کام کیا حیدرآباد میں شعبۂ انکم ٹیکس میں برسر کار رہے، کراچی گئے تو اقتصادیات کے پروفیسر ہوئے۔ سب سے چھوٹے بیٹے نسیم احمد محکمۂ پولس میں تھے اور یہ بھی کراچی چلے گئے تھے۔ بچوں کی تعلیم میں مولانا احسن کی بیوہ نے بڑی بیدار مغزی اور ایثار سے کام لیا۔ (۵)

مولانا احسن ماہر زباں داں، بلند پایہ استاذ شاعر، نامور صحافی اور اچھے ادیب تھے آپ کی نثر شگفتہ، رواں سلیس اور عام فہم اسلوب رکھتی تھی۔ عبارت آرائی، مبالغہ آمیزی اور تصنع سے احتراز کرتے تھے۔ آپ کے مضامین نظم و نثر زمانہ کان پور کے علاوہ دیگر رسائل و جرائد میں بھی شائع ہوتے تھے۔ زمانہ میں اکثر تنقیدیں اعظمی کے نام سے آپ ہی کی لکھی ہوئی شائع ہوئی ہیں۔ زمانہ جولائی ۱۹۲۸ء میں آیات وجدانی پر تنقید آپ ہی کی لکھی ہوئی تھی اور یہ آپ کا آخری مضمون ہے جو اس رسالہ میں شائع ہوا۔ اعظمی کے نام سے ان کے جو تبصرے، تنقیدیں، مزاحیہ و طنزیہ کلام اور سہرے وغیرہ شائع ہوئے ہیں ان میں ادبی اور جمالیاتی قدریں موجود ہیں۔ تبصروں سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ احسن کی تنقیدی بصیرت اور نقد و نظر کی گہرائی نے اصول نقد کی تشکیل اور مشرقی لسانیات کی تصویب میں حصہ لیا ہے۔ وہ

مشرقی اصول نقد اور رموز شعر سے واقف تھے۔ اردو کی ابتدائی تنقیدی شعور کی تاریخ میں احسن کی اہمیت کا تعین کیا جانا چاہئے۔ ان کے تاثرات ونظریات سے بھی تنقید کی ایک جہت روشن ہوتی ہے۔

مولانا احسن نے غزل کی عصمت اور اس کی شیشہ گری کی کمال احتیاط سے حفاظت کی ہے۔ ابتذال، سوقیانہ پن اور سطحیت جس کے لیے صنف غزل مورد عتاب ٹھہرائی گئی ہے اس قسم کی کوئی کمی یا کجی آپ کے کلام میں نہیں۔ آپ نے تغزل کے جوہر کو نمایاں اور شاعری کے فن کو ممتاز کرنے کی خدمت انجام دی ہے۔ قدماء کے رنگ کی پیروی بھی کی ہے مگر اس میں اپنی فکری وادبی روح بھی رچا بسا دی ہے۔ کلام فکر وفن سے بھر پور ہے۔ انھوں نے الفاظ وتراکیب کے انتخاب، اور محسوسات وخیالات کے نظم کرنے میں خوش ذوقی اور تازہ فکری سے کام انھوں نے کام لیا ہے۔ ہم ان کی غزلوں کو معیاری تغزل کا اعلیٰ نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

مولانا احسن سمبھی کے بارے میں نشور واحدی کا احساس ہے کہ "احسن کی غزلوں میں عناصر تغزل کی کچھ ایسی ہی حیات آفریں ترکیب اور تحلیل پائی جاتی ہے۔ حسرت کا کلام اگر پانی ہے تو اصغر کا کلام صرف رنگ اور جگر کا کلام دوپہر کی دھوپ مگر احسن کا کلام خون دل وجگر ہے جس میں حیات کی گرمی، محبت کی نرمی، حسن کی رنگینی کا امتزاج بدرجۂ کمال نظر آتا ہے۔ وہ اسی لہو کی ترنگ سے کھیلتا ہے اور اپنی گرم آہوں سے جذبات واحساسات کی موجوں کو لطیف سے لطیف تر بناتا جاتا ہے۔ فانی کی طرح نالہائے سرد سے فضائے غم والم میں انجماد نہیں پیدا کرتا۔ اس کی تخئیل اس قدر گداختہ اور سیال ہے کہ جام رنگین کا مادی تصور بھی اس کے سامنے دلِ خوں گشتہ کا آئینہ بن کر آتا ہے"۔(۶)

آپ کا دیوان مرتب ہو چکا تھا اور جلد ہی چھپنے والا تھا۔ مگر ایمن شہابی کی مشغولیات اور وسائل سے محرومی نے اس کی نوبت نہ آنے دی، البتہ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں ۳۸ صفحے کا پاکٹ سائز ایک کتابچہ احسن (سمبھی) کے سو شعر کے نام سے حلقۂ ادبیہ ہمایوں باغ کان پور سے شائع کیا ہے۔ یہ سو اشعار مولانا حسرت موہانی نے احسن کے کلام سے منتخب کر کے اپنے رسالہ میں شائع کیے تھے۔

نمونۂ کلام

یہ دنیا تو بظاہر اتحاد جسم و جان تک ہے ۔۔۔ خدا معلوم میری بے کسی کی حد کہاں تک ہے

جوفرصت ہوتو میں تم کو سنا دوں داستاں اپنی
کہ اس قصے کی خوبی میرے انداز بیاں تک ہے

اک داغ ہے پہلو میں دل ہے نہ تمنائیں
برسوں اسی محفل میں ہنگامۂ محفل تھا

قاتل نے آج روح کو بھی دل بنا دیا
دونوں کو اک نگاہ میں بسمل بنا دیا

خلوت سرائے دل کا یہ عالم کبھی نہ تھا
اک حسنِ بے حجاب نے محفل بنا دیا

اب اس سے بڑھ کے اے غمِ جاناں میں کیا کروں
میں نے تو دل میں رکھ کے تجھے دل بنا دیا

ابھی ہے نشۂ دوشینہ کا خمار مجھے
میں کیا کروں گا اگر یہ خمار بھی نہ رہا

اچھا ہوا کہ زندگیِ مختصر ملی
ورنہ امید و یاس کا قصہ دراز تھا

نالے کے ساتھ سینے سے نکلی تھی کوئی چیز
اب یہ خبر نہیں کہ وہ دل تھا کہ راز تھا

دلِ پر آرزو جوشِ جنوں کا میر ساماں تھا
یہ ویرانہ تو بربادی سے پہلے بھی بیاباں تھا

شبِ غم تو بھی مجھ کو چھوڑتی ہے کیا قیامت ہے
ترے دامن میں میری بے کسی کا راز پنہاں تھا

آنکھوں کے رہنے والے مٹی میں مل رہے ہیں
برباد ہو رہے ہیں آنسو مرے زمیں پر

ہائے رے میری بیکسی شمع بھی قبر پر نہیں
آکے صبا بھی پھر گئی سوئے مزار دیکھ کر

ہو چکا نذرِ قفس، ذوقِ تماشائے بہار
اب میں چھوٹوں بھی جاؤں نہ گلستاں کی طرف

وادیِ طور سے یا کوئے بتاں سے اٹھے
فتنۂ حسن قیامت ہے جہاں سے اٹھے

یہ جان کا جلنا یہ شب غم کی اداسی
یا رب کوئی شمعِ سرِ مدفن تو نہیں ہم

کسی کی جستجو میں جانب دل دیکھ لیتے ہیں
کوئی رہتا تھا جس میں ہم وہ منزل دیکھ لیتے ہیں

مدفن کی یہ اداسی، ٹوٹی ہوئی یہ قبریں
کیا جانے دفن کتنی اٹھتی جوانیاں ہیں

دعائیں دیں اجل کو جاگنے والے شب غم کے
کہ اب سوتے ہیں کس آرام سے گور غریباں میں

ستاتا ہے فلک مجھ کو مٹاتی ہے زمیں مجھ کو
مگر پھر بھی نہیں ہے اپنے مٹنے کا یقیں مجھ کو

غم کہ ہے جانِ زندگی اس کو کبھی فنا نہیں
لاؤ بدل لوں اس سے میں ہستئ مستعار کو

شام سے مضطرب ہے دل، رات پہاڑ ہوگئی
آج قرار آگیا گردش روزگا کو

وداع زندگی میں کیوں یہ شرط جانستاں رکھ دی
کہ بعد مرگ بھی قید حیات جاوداں رکھ دی

مری امید سے رونق تھی ظلمت خانۂ دل کی
شب غم تو نے آخر شمع اس گھر کی کہاں رکھ دی

صاف گوئی وہ کہ دوحرفوں میں سب کچھ کہہ دیا　　راز داری یہ کہ کہنے پر بھی سب کچھ راز ہے
روک لے اے ضبط آنسو جو کہ چشم تر میں ہے　　کچھ نہیں بگڑا، ابھی تک گھر کی دولت گھر میں ہے

حواشی:

(۱) رضوان اللہ صاحب نے ہمارے گاؤں ہمارے لوگ میں ص ۳۳ پر محمد شکور لکھا ہے جو کسی غلط فہمی سے ہے۔

(۲) ماہنامہ شاعر بمبئی نومبر ۱۹۶۵ء ص ۲۸

(۳) احسن سمبھی کے سو شعر: ص ۳۔۶

(۴) ثاقب کان پوری۔ ماہنامہ شاعر بمبئی نومبر ۱۹۶۵ء ص ۳۰

(۵) رضوان اللہ فاروقی کی کتاب ہمارے گانو ہمارے لوگ سے استفادہ کرتے ہوئے۔

(۶) احسن سمبھی کے سو شعر ص ۷۔۸

احسن - مرزا احسن اللہ بیگ انجان شہید

۱۸ر فروری ۱۹۱۸ء ـــــ ۵ر مئی ۱۹۸۶ء

مرزا صاحب انجان شہید اور آس پاس کے گانو میں اپنی تعلیمی خدمات اور درسگاہوں کی تاسیس کی وجہ سے اس دیار کے سر سید کہے اور سمجھے جاتے تھے۔ ان کی دوررس نگاہوں نے ٹیکنالوجی اور سائنسی تعلیم کی ضرورتوں کو آزادی کے حصول کے بعد ہی محسوس کر لیا تھا۔ مسلمانوں میں جس کی آج دھوم مچی ہوئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ تو وسائل کی محرومی اور کچھ برادران وطن کی لال فیتہ شاہی نے ان کے خواب کی تکمیل ان کی خواہش کے مطابق نہیں ہونے دی۔ مولانا آزاد کالج اور قدوائی نسواں ہائی اسکول کے مؤسس کی حیثیت سے ان کا نام ہمیشہ عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔

مرزا صاحب نے ذیل کا مرثیہ اپنے ایک دوست اور گاندھی ہائی اسکول مالٹاری قائم شدہ ۱۹۵۱ء کے پرنسپل جناب سید امین الحسن عظمت گڑھ کی موت پر کہا تھا۔ مرحوم کی وفات اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے عین جوانی میں ہوئی تھی۔ اس مرثیہ میں درد کی شدت کی آنچ کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

تھی شہادت کی کس قدر جلدی کام کچھ اور بھی کیے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ ساتھ ہم کو بھی لے لیے ہوتے (۱)

حواشی:

(۱) تہذیب انجان شہید۔مولانا آزاد انٹر کالج وقدوائی نسواں ہائی اسکول کا مشترکہ میگزین ص ۱۰

احسن-عبدالحفیظ

قیاساً ۱۹۳۵ء ــــ وفات ۲۰۰۱ء

موضع رسول پور، مبارک پور کے رہنے والے تھے۔ سیدھے سادے مومن قسم کے بے ضرر انسان تھے۔ اخلاق واخلاص اور عجز وانکسار ان کی زندگی کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ بغض وعناد سے دور تھے۔ اسلامی مزاج رکھتے تھے۔ پارچہ بافی پیشۂ آبا تھا اور یہی ان کا ذریعۂ معاش بھی تھا۔ بعد میں شغل معلمی اختیار کرلیا تھا اور اپنے مولد کے متصل موضع سریاں میں زیادہ دنوں تک خدمات انجام دیں۔ ان کا مذہبی ودینی کلام عموماً ''تنظیم نو'' نوادہ کے لوگ مثلاً حاجی عبدالستار، حاجی ظہیر احمد اور حاجی ابوالحسن اجتماعی طور پر خوش الحانی سے جلوس میلادالنبی اور دوسری تقریبات میں پڑھا کرتے تھے۔ سادہ وشیریں اور عام فہم انداز میں کہتے تھے۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ مگر خلوص و عقیدت کا عنصر ضرور شامل ہے۔ حمد، نعت، سہرا، رخصتی، منظوم دعا ان کی جولانگاہ سخن تھی۔ ان کی قلمی بیاض میں غزل بھی موجود ہے۔ مگر اسلامی ودینی شغف کی وجہ سے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں تھی اسی لیے ان کا غزلیہ کلام زبان وبیان اور خیالات وموضوعات کے اعتبار سے پھیکا پھیکا سا بے نمک اور روایتی قسم کا ہے۔ احسن نے اپنے شعری افکار سے دیہات کی شعری ضرورتوں کی تکمیل کی طرف خصوصی توجہ دی اور ایک خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعد کی شاعری انہیں چراغوں کی مدد سے روشن ہوئی ہے۔ یہ بھی بڑی بات ہے۔

نمونۂ کلام

ایسا خدا نے آج ہمیں رہنما دیا جس نے خدا کے دین کا رستہ بتا دیا

وہ لطف خدا ہے، مدینہ نبی کا — خدا کی عطا ہے، مدینہ نبی کا
مرا دل مدینے سے ہر دم لگا ہے — عجب دل ربا ہے ، مدینہ نبی کا
جہاں سے چلے جائیں جنت میں سیدھے — وہی راستہ ہے ، مدینہ نبی کا
ہے دعا میری کہ سرکار کا کوچہ دیکھوں — آنکھ ٹھنڈی کروں ، دربارِ نبی کا دیکھوں
یا خدا ساتھ ہی دربار بھی تیرا دیکھوں — کرلوں ارکان ادا اور میں کعبہ دیکھوں
مدتوں سے میں تڑپتا ہوں الٰہی دے دے — مجھ کو توفیق کہ آنکھوں سے مدینہ دیکھوں
رات دن روکے دعا تجھ سے ہے میرے مولا — میں بھی یثرب میں چلوں گنبد خضریٰ دیکھوں
میں پہلے رضائے خدا چاہتا ہوں — رضائے شہ انبیا چاہتا ہوں
مدینے میں گھر بار اپنا بنا لوں — نہیں کچھ بھی اس کے سوا چاہتا ہوں
بلا لو مدینے میں آقا بلا لو — تمہارا پڑوسی بنا چاہتا ہوں
یہی ہے تمنا کہ بن جاؤں میں بھی — غلام حبیب خدا چاہتا ہوں
سب کتابوں سے بھلا قرآن ہے — یہ ہمارا دین ہے ایمان ہے
ہم کریں گے اس کی عزت اور ادب — جسم میں جب تک ہمارے جان ہے
جو تلاوت رات دن اس کی کرے — جنتی کی بس یہی پہچان ہے
انھیں اب منانے کو جی چاہتا ہے — یہ بیتیں سنانے کو جی چاہتا ہے
مرے دل کی خوشیاں مچل کے ہیں کہتی — کہ آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے
آپ نے بحرِ ضلالت سے نکالا ہم کو — آپ کا لاکھ ہے احسان مدینے والے

احسنؔ ۔ مظفر حسن مئوی

۱۹۳۶ء ـــــ ۲۲/جنوری ۲۰۰۶ء

والد کا نام عبدالمنان تھا۔ ڈومن پورہ مئو کے رہنے والے تھے۔ مدرسہ عالیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ الہ آباد بورڈ سے منشی اور مولوی کی سند بھی حاصل کی تھی۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں تک فیض العلوم مئو میں درس وتدریس کا مشغلہ بھی اختیار کیا تھا۔ فضاؔ ابن فیضی کے صبح وشام کے حاضر باشوں

میں بہت نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ممکن ہے ان سے اصلاح لے کر کسب فیض بھی کیا ہو۔ تجارت کرتے تھے لیکن اپنا کاروبار شوق شاعری کو بنا رکھا تھا۔ حلقہ بھی ایسا تھا کہ خود بخود شعر گوئی کی طرف رجحان پیدا ہوجاتا تھا۔ فضا سے روز کی ملاقات نے اچھے شعر کہنے کی صلاحیت بھی پیدا کردی تھی۔ مسلکاً سلفی اور جامعہ عالیہ مئو سے وابستہ تھے۔ علم وادب کے شیدائیوں میں تھے۔ خود بھی شاعری کو سرسبز کرتے تھے اور شاعروں، ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔ پہلے اپنے ہم محلہ عبدالسلام اسلم مئوی کا کلام شعروسخن کی محفلوں میں صدا بند کرتے تھے۔ اپنی وفات سے دس برس پہلے خود بھی شاعری کرنے لگے اور احسن تخلص اختیار کیا۔ غزل اور نعت سے سلسلۂ سخن رکھا۔ کبھی کبھی اہل تعلق کی وفات پر تاثراتی نظمیں بھی موزوں کرلیتے تھے۔ گرمی محبت اور انسانیت کا درد رکھنے والے شاعر تھے۔ ان کا کلام قدیم مضامین وخیالات اور الفاظ وتراکیب کی روایات سے رشتہ رکھتا ہے لیکن کبھی کبھی دورانِ شعر گوئی میں ایسے فکری موڑ بھی آجاتے ہیں کہ زبان قلم سے نئی حسیت اور نئے انداز کے شعر بھی ادا ہوجاتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے اچھا مذاق شعری پایا تھا اس لئے ان کے اشعار صاحب ذوق کو متوجہ کرتے ہیں۔ حالات وزمانہ کی رعایت سے شعر کہتے تھے مگر علائم ورموز اور استعارہ واصطلاحِ شعری ہماری قدیم روایتِ شاعری سے مستفاد تھی۔

نمونۂ کلام

قیدی ہوں مگر پانو میں زنجیر نہیں ہے — ہے جرم وفا، قابل تعزیر نہیں ہے
مانا کہ محبت میں ہوں رسوائے زمانہ — اس میں مگر اپنی کوئی تقصیر نہیں ہے
لذت سے غم عشق کی آگاہ نہیں دل — حاصل مجھے عشق کی جاگیر نہیں ہے
احسنؔ تری آنکھوں کا مقدر ہے ازل سے — وہ خواب کہ جس کی کوئی تعبیر نہیں ہے
ازل سے میری فطرت ہے ابھرنا — عبث مجھ کو دبانا چاہتے ہیں
رچا کر وہ حنا میرے لہو کی — زمانے کو لبھانا چاہتے ہیں
اتنا سم آلود نفرت کا کبھی جھونکا نہ تھا — آدمی کا خون پہلے اس قدر سستا نہ تھا
شعلہ شعلہ بام ودر ہیں، ہر روش ہے قتل گاہ — ایسا منظر تو ان آنکھوں نے کبھی دیکھا نہ تھا

(نمونۂ کلام بشکریہ مشتاق احمد بیدلؔ)

احسنؔ - ممتاز احمد مئوی

۱۹۴۱ء ـــــ ۲۲؍دسمبر ۲۰۰۶ء

یہ ماسٹر عبدالرؤف گرافر کے فرزندار جمند اور طیب اختر مئوی محلہ ڈومن پورہ کے بڑے بھائی تھے۔ انھوں نے بھی اپنے والدمحترم کی طرح گرافری کو معاش کا ذریعہ بنا رکھا تھا اور ساتھ ہی ساتھ شاعری کے آنچل میں فکر وخیال کے گل بوٹے بھی ٹانکتے رہتے تھے۔ جیسے طالبؔ پارچہ بافی کی نقشبندی کے ساتھ شاعری کی زلفیں بھی سنوارتے تھے۔ انھوں نے منشی کا امتحان پاس کیا تھا۔ علمی شخصیتوں سے اپنے علم وخبر میں اضافہ کی سبیلیں نکالا کرتے تھے۔ طبیعت اخاذ پائی تھی جس کی وجہ سے اپنے اندر شعر فہمی اور شعرگوئی کی اچھی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔ مئو کی فضا علم وادب اور شعر ونغمہ سے ہر دور میں سرشار رہی۔ اس فضا میں احسنؔ کو اپنی ذہنی وفکری صیقل گری کا موقع ملا۔ اپنے اردگرد کے حالات وکوائف سے اثر پزیر ہوئے اور شاعری کے اچھے نمونے پیش کئے۔

ان کی فکر شعری کا محور اصلی تو غزل تھی لیکن چند نعتیں بھی کہی تھیں۔ کچھ قطعات بھی ان سے یادگار رہیں۔ انھیں زبان کے استعمال اور الفاظ کے انتخاب کا سلیقہ آتا تھا۔ انھوں نے خیال ومضمون کو متعلقات کے ساتھ شعری پیراہن دینے میں اپنی خوش ذوقی اور زبان پر قدرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان کے اشعار کے اسلوب سے ان کے شعور کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی شاعری قدیم وجدید رنگ وانداز کی نمائندگی کرتی ہے۔ الفاظ قدیم اور روایتی ہیں لیکن انھوں نے خیالات وتاثرات کی جن زیریں لہروں کو اپنی گرفت میں لیا ہے ان سے ان کی ہم عصر زندگی کے مسائل ونفسیات اور مباحث وابعاد سے گہرے رشتے کا علم ہوتا ہے۔ انھوں نے تصور وخیال اور زبان وشعور کے بدلتے مزاج کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے ان کے یہاں تازہ کاری اور رنگین نوائی کی خصوصیات کی کمی نہیں ہے۔ وہ تہذیب وثقافت، اقتصادیات ومذہبیات، اخلاقیات وترقیات کے حوالے سے سوالات پیدا کرتے ہیں اور ہماری سوچ کو ان کے جوابات تلاش کرنے پر ابھارتے ہیں۔ وہ ماضی، حال، مستقبل تینوں زمانوں کو سمجھنے کے لئے بڑے جتن کرتے ہیں۔ ان

کے کلام کے لہجے میں نوحہ گری بھی ہے، نئی بشارتوں کی سرگوشیاں بھی موجود ہیں، کائنات میں انسان کے مقام ومرتبہ کی طرف بلیغ اشارے بھی ملتے ہیں، قدروں کا تضاد وتصادم بھی شاعری کی سطح کو متاثر کرتا ہے اور ذہن کو ایک جہانِ معنیٰ آباد کرنے کی سمت بھی دکھاتا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی نفی اور کشاکشِ حیات سے فرار نہیں ملتا بلکہ اثباتِ بہار کا نیا منظرنامہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ منجدھار میں بھی حوصلوں، امنگوں کے گیت گانے والے شاعر ہیں۔

ان کے کلام کی برجستگی، لفظوں کا برمحل استعمال، استعارات وتشبیہات کی نادرہ کاری، ماضی سے استفادہ واستفاضہ کی خواہش، حال کو سنوارنے کی آرزو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کی نقشہ گری اور خاکہ نگاری نے بھی شاعری کی تشکیل اور صورت گری میں ان کی مدد کی ہے۔

نمونۂ کلام

اک بار جو طیبہ کی گلیوں سے گزر جائے
بگڑی ہوئی پھر اس کی تقدیر سنور جائے

حسرت ہے یہی دل میں، ارماں ہے یہی اپنا
بس ذکرِ محمد میں یہ عمر گزر جائے

مصروف ہو دل اتنا یادِ درِ اقدس میں
سینے میں مدینے کی تصویر اتر جائے

ہم مومنوں کے دل میں ہے الفت رسول کی
پوچھے تو کوئی ہم سے صداقت رسول کی

حیراں ہوں کس طرح سے میں دیکھا کروں اسے
پھیلی ہے ہر طرف جو کرامت رسول کی

مت چھیڑ مجھ کو سننے پہ اے گردشِ جہاں
چھیڑی ہے مطربہ نے حکایت رسول کی

نبی آئے تو دنیا میں حجاب آیا نقاب آیا
انھیں کے فیض سے دنیائے عالم پر شباب آیا

سلام اس ذاتِ اقدس، روحِ عرفاں، جانِ رحمت پر
سلام اس پر نہ جس کا آج تک کوئی جواب آیا

حجازی قافلہ جب بھی چلا مستانہ سا ہوکر
خدا کی سمت سے کفار پر قہر وعذاب آیا

صحابہ نے تو لڑلڑ کر احد میں فتح حاصل کی
مگر غفلت میں مسلم پر دوبارہ پھر عتاب آیا

مہکتا ہے زمانہ آج تک، دنیا میں خوشبو ہے
عرب کی سرزمیں پر جب مہکتا وہ گلاب آیا

رہتے ہیں سر جھکائے تری انجمن میں ہم
ورنہ کسی سے کم ہیں کوئی بانکپن میں ہم

بیٹھے ہیں اس طرح کہ خود اپنی خبر نہیں
کوئی بتائے ہیں کہ نہیں انجمن میں ہم

ابھریں گے ایک روز یہی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

بارشِ سنگِ ملامت ہوئی اتنی مجھ پر ؎ زندگی میرے لئے بارِ گراں ہو جیسے
ذرا اپنی فطرت پہ بھی ڈال نظریں ؎ مرے ظرف کو آزمانے سے پہلے
دیکھ کر یہ لگتا ہے ان کے عارض وگیسو ؎ چاند گھر کے رہتا ہو جس طرح گھٹاؤں میں
وفا کا ساز ہے کچھ نغمگی تو آجائے ؎ کہ مہ جبینوں میں کچھ بے کلی تو آجائے
حدیث شعروسخن ہو تو کس طرح سے ہو ؎ ہمارا دل بھی مگن ہو تو کس طرح سے ہو
زندگی کا مرے ماحول بدل سکتا ہے ؎ یہ برا وقت مرے سے بھی ٹل سکتا ہے
دل میں مومن کے اگر قوتِ ایماں ہوگی ؎ شک نہیں اس میں کہ ظالم بھی دہل سکتا ہے
قافلہ اہل جنوں کا جو رہا گرم سفر ؎ اپنی منزل سے بھی آگے وہ نکل سکتا ہے
اپنے کردار کو انسان سدھارے پہلے ؎ پھر تو ہر گام پہ گر گر کے سنبھل سکتا ہے
صرف انکار ہے چاہت بھی کہاں تک کرتے ؎ اپنی قسمت کو ملامت بھی کہاں تک کرتے
جو کہ الجھے ہیں بہت گردشِ دوراں میں ہنوز ؎ وہ مرے غم کی سماعت بھی کہاں تک کرتے
کتنے کم ظرف ہیں پیتے ہیں بہک جاتے ہیں ؎ عشق کے جام عنایت بھی کہاں تک کرتے
اپنی ہی آہ وفغاں سے ہمیں فرصت نہ ملی ؎ وقت کے ساتھ بغاوت بھی کہاں تک کرتے
دے دیا دل مجھے لمحوں میں محبت کے طفیل ؎ مرے ہمراہ شرارت بھی کہاں تک کرتے
جلتے رہتے ہیں جو شعلوں میں حسد کے اکثر ؎ ایسے لوگوں سے رفاقت بھی کہاں تک کرتے
ہر نفس عشق زر عنقا ہے اے دنیا والو ؎ ایسی حالت میں تجارت بھی کہاں تک کرتے
ایک جا ہوگئے اندازِ سخن دونوں کے ؎ حسن کے ساتھ نزاکت بھی کہاں تک کرتے
گیسوئے وقت سی بکھری ہے حیات کہنہ ؎ اس کو پانے کی شجاعت بھی کہاں تک کرتے

احقر-مولوی ضیاء اللہ مہراج گنج

١٨٥٦ء ـــ ١٩١٨ء تک موجود

ضلع اعظم گڑھ کے اچھے مدرسین میں گنے جاتے تھے۔ بڑے لائق و فائق اور دانشور معلم تھے۔ اردو شاعری کے ساتھ فارسی اشعار بھی بہت اچھے کہتے تھے۔ احقر اعظم گڑھ کے مشہور

شاعر یحیٰ اعظمی کے پدر بزرگوار تھے۔ فارسی کا بہترین ذوق رکھتے تھے اور اپنی زباندانی کے لیے سارے ضلع میں مشہور تھے(۱)۔ اقبال سہیل نے لکھا ہے کہ انہیں (یحیٰ اعظمی) بھی موزوں طبعی اور زبانِ فارسی کا ذوق اپنے والد مولوی ضیاء اللہ مرحوم سے ورثاً ملا ہے(۲)۔ مولوی ضیاء اللہ کے اپنے بیان کے مطابق ان کی پہلی تقرری ۳؍مئی ۱۸۷۲ء کو مولوی قربان علی صاحب ڈپٹی انسپکٹر کے عہد میں ۵؍روپیہ کے مشاہرہ پر جمیل پور کے اسکول میں افسر مدرسی پر ہوئی (۳)۔ یہ تقرری ان کی پندرہ سولہ برس کی عمر میں ہوئی تھی جب یہ مہراج گنج کے مدرسہ سے تعلیم پا کر فارغ ہو چکے تھے پھر یہاں سے تبادلہ کرا کے مدرسہ مہراج گنج کی نیابت مدرسی میں آگئے اور جمیل پور کو چھوڑ دیا۔ یہاں سات برس تک کار تدریسی انجام دیا۔ اگست ۱۸۸۰ء میں ان کا تبادلہ کوٹلہ میں کر دیا گیا۔ جب ۱۸۸۱ء میں انھوں نے نارمل اسکول کا امتحان پاس کر لیا تو ان کی تنخواہ میں ایک روپیہ کا اضافہ ہو گیا۔ ۱۸۸۴ء میں مدرسہ مہراج گنج کی جگہ خالی ہوگئی تو انھوں نے اس کے لیے اپنا استحقاق پیش کیا مولوی محمد اکبر خاں ڈپٹی انسپکٹر اور بابو شیام منوہر داس سب ڈپٹی انسپکٹر نے ان کی درخواست منظور کر کے مہراج گنج بھیج دیا۔ ۱۸۹۵ء میں اپر پرائمری کے آدھے لڑکے فیل ہو گئے اس لیے انھیں سزائے تبادلہ دے کر یکم اپریل ۱۸۹۵ء کو مدرسہ مینہ نگر میں بھیجا گیا۔ مہراج گنج میں ان کا عہدہ افسر مدرس کا تھا۔ یہ بائیس برس تک مہراج گنج میں نیابت اور مدرسی ملا کر رہے۔

احقر ایک اچھے مدرس تھے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف عام طور پر کیا جاتا تھا۔ حسن کارکردگی پر انھیں کئی بار اضافۂ تنخواہ کے علاوہ انعامات بھی دیئے گئے۔ یہ کئی سال تک اخبار کاشی پتریکا کے مستقل مضمون نگار بھی رہے۔ ان کے نام کی شہرت اضلاع شمال و مغرب میں دور دور تک رہی۔ مدارس اضلاع اودھ کے نصاب میں ان کا مضمون بھی شامل تھا اس کے ساتھ اضلاع اودھ کے سرکاری مدارس میں ان کی نظمیں پڑھائی جاتی تھیں۔ مولوی عبدالباری (ابو علی اثری) اعظم گڑھی نے بتایا تھا کہ بچوں کے لیے ان کی ایک کتاب بھی شائع ہوئی تھی۔ اس دیارِ مشرق میں ان کی شاعری اور مضامین نثر کی ایک خاص اہمیت تھی۔ اہل علم کے درمیان عموماً ان کی علمی و تدریسی خدمات کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ جب کوئی ان کے مدرسے میں آتا تو یہ مدحیہ قصائد سنا کر قدردانی

سے ممتاز ہوا کرتے تھے۔ مولوی عبدالباری نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کا ایک دیوان بھی تھا جو مولوی عبدالباری کی ملکیت میں تھا۔ ان کے کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ بھی ''کلام احقر'' کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا تھا۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ احقر المضامین کے نام سے بھی تھا جس سے ان کی نثر نگاری پر روشنی پڑتی تھی۔

احقرؔ نعت، غزل، مختلف موضوعات و واقعات پر نظمیں اور قصائد کہتے تھے۔ ان کی جودت طبع کے جوہر اردو اور فارسی زبانوں کی شاعری میں خوب کھلتے تھے۔ انھوں نے مخمس اور مسدس کی ہیئت میں بھی تجربے کیے اور کامیاب رہے۔ زیادہ تر نظمیں کہتے تھے اور خوب کہتے تھے نظموں کے مقابلے میں ان کی غزلیں خشکی لیے ہوئے تھیں۔ ان کے کلام میں اساتذہ کے اشعار بھی اپنی شان کمال کے ساتھ کہیں کہیں جڑے ہوئے نگینہ کی طرح مل جاتے ہیں۔ ان کی نظمیں اخلاقی اور موعظۂ و پند پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ ان کے کلام میں قطعات، مناجات اور منظوم خط بھی ملتے ہیں۔ احقر کی زبان صاف، سہل، آسان اور رواں ہے۔ انھوں نے راست انداز بیان کو اپنایا ہے۔ فارسی زبان وادب پر مکمل عبور رکھنے کے باوجود ان کے کلام میں غرابت لفظی، فارسیت زدگی، بیان کی ژولیدگی نیز الفاظ وتراکیب کی اجنبیت نہیں ہے۔ انھوں نے سیدھے سادے قریب الفہم، اور سہل العام رواں اسلوب میں نظمیں کہی ہیں۔ جب ہم تیز آنچ، زلزلہ پیدا کرنے والی اور ذہن وفکر کو اپنی گرفت میں لینے والی شاعری سے تھک جائیں یا اوب جائیں تو احقر کی سادگی، سچائی اور سنجیدگی سے لطف حاصل کر سکتے ہیں اور ہمیں محسوس ہونے لگے گا کہ ان کے انداز سخن اور لفظوں کے انتخاب نے ہماری روح کو نشاط وانبساط سے متلاطم کر دیا ہے۔

ان کی شاعری میں احساس عمل کی دولت چھپی ہوئی ہے اگر چہ اس عملیت زدگی نے کہیں کہیں شعریت اور فنی روح کو مجروح کر دیا ہے مگر کلام کی عقلیت واصلیت بھی اپنی ایک معنویت رکھتی ہے جو توجہ طلب ہے۔ ان کے قصائد میں شوکت الفاظ، بلندی خیال، اور جلال و جمال کی ملی جلی کیفیت ملتی ہے ان کے یہاں صوتی قافیہ کی مثالیں بھی ہیں اور مختلف ہئیتوں کا استعمال بھی ملتا ہے۔ انھیں بچوں کی نفسیات کا گہرا مشاہدہ وتجربہ حاصل تھا۔ تعلیمی نظریات پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ اخلاق

وفضائلِ انسانی کی اہمیت کا بھرپور احساس تھا اور یہی جوہر وہ اپنے شاگردوں میں بھی دیکھنا پسند کرتے تھے۔ ان موضوعات پر انھوں نے بچوں کے لئے نظمیں کہی تھیں جو قصۂ پارینہ اور متاعِ گم شدہ بن چکی ہیں۔ ان کی اسی طرح کی ایک نظم قاضی عبدالرحمٰن حیرتؔ کے مرتبہ ایک مختصر رسالہ تہذیب القواعد میں ہے جس کو یہاں درج کیا جارہا ہے۔

نمونۂ کلام

ہیں ارکان صحت کے جتنے مقرر　　بنا تندرستی کی ہے جن کے اوپر
صفائی ہے ان میں سے اک رکن اکبر　　جو ہم رکھیں اس پر توجہ برابر
تو قائم رہے تندرستی ہماری
کٹے عیش وآرام سے عمر ساری

صفائی ہے انساں کی راحت کا باعث　　صفائی ہے اعضا کی زینت کا باعث
صفائی ہے دفعِ کدورت کا باعث　　صفائی ہے فرطِ نفاست کا باعث
جو رہتا ہے ہردم صفائی کا خواہاں
وہ ہر وقت خرم ہے، ہر لحظہ شاداں

صفائی دلوں کی محبت بڑھائے　　صفائی غبارِ عداوت مٹائے
صفائی ہر اک کام بگڑا بنائے　　صفائی ہر اک شے کی دل کو لبھائے
صفائی ظاہر سے ہو شکل زیبا
صفائی باطن سے دل ہو مصفّا (۴)

ہو گیا گلشن میں پھر فیضِ نسیم مشکبار　　مژدہ باد اے ہم صفیر و آ گئی فصل بہار
خسرو گل کا ہوا تختِ چمن پر پھر جلوس　　جم گئی ہر ہر روش پر نونہالوں کی قطار
آج کل رونق گلستاں کی کہی جاتی نہیں　　اپنے اپنے حسن پر مفتوں ہیں خوبان بہار
گلشن سینہ میں گلہائے مضامیں دیکھ کر　　عندلیب طبع موزوں ہے نہایت بےقرار
شوق سے گھبرا رہی ہے خاطر نازک خیال　　فکر رنگیں کو نہیں اب مطلقاً صبر و قرار
فرط نخوت سے تصور کا نہیں ملتا مزاج　　کرتے ہیں وہم وگماں رمز و اشارہ بار بار

ہے فروغِ صفحۂ کاغذ جو بیضائے کلیم   معجزہ اب یوں دکھا اے خامۂ جادو نگار

(از مدح پنڈت کنور بہادر ڈپٹی انسپکٹر سابق مدارس ضلع اعظم گڑھ)

دلیری جس انسان میں جلوہ گر ہو   دلیری کا پیکر میں جس کے اثر ہو
جہاں میں وہ ممتاز ہو، بہرہ ور ہو   حصول مراد اس کا بے سیم وزر ہو
ملے فخر و عزت دلیری کے باعث
بڑھے مال و دولت دلیری کے باعث

(دلیری)

ہے عمر کے آغاز کا انجام بڑھا پا   صبح امید کا ہے گویا شام بڑھاپا
کرتا ہے لطفِ زیست سے ناکام بڑھاپا   دیتا ہے سدا مرگ کا پیغام بڑھاپا

(بڑھاپا)

زمانِ مفلسی میں اعتبار انساں کا جاتا ہے   کوئی کب مفلس بے چارہ پر ایمان لاتا ہے
وہ بے چارہ حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے   نہیں نودولتوں کی آنکھ میں مفلس سماتا ہے
ہو قدر و منزلت انسان کی عالم میں پیسے سے
نہ ہو پیسہ تو کوئی کوڑیوں کو بھی نہیں پوچھے

(مفلسی)

انھیں قوموں کے سر پر آج بہبودی کا سہرا ہے   انھیں کا گلشن اقبال سب میں رونق افزا ہے
بشر ہر ایک جن کا اتفاق آپس میں رکھتا ہے   انھیں کے اتفاق و یک دلی کا یہ نتیجہ ہے
کہ ڈنکا بج رہا ہے چار سو ان کی حکومت کا
عروج انتہا پر ہے ستارا بخت و دولت کا

(اتفاق)

نہ انساں نفس امارہ کے قابو میں اگر آئے   نہ اس غارت گر ایمان کا دھوکا اگر کھائے
ہوا و حرصِ دنیاوی کو خاطر میں نہیں لائے   اگر وہ خواہش نفسانی سے دل اپنا ترسائے
یہی وصف حمیدہ بے گماں ہیں ضبط کے معنی
کہ ہر دم نفس کے ہاتھوں سے ہو دل کی نگہبانی

(ضبط)

نعتیہ اشعار

گلستانِ دوعالم میں بہت کی جستجو میں نے کوئی سرو چمن ہمسر نہ نکلا قدِ رعنا کا
الٰہی حشر میں ہم پر ہو ظل رحمت عالم نہیں منظور ہے واں ہم کو سایہ شاخ طوبیٰ کا

غزلیہ اشعار

دیکھنا چاہو جو میرے دل کے داغوں کی بہار صورت لالہ دم گل گشت جا کر دیکھ لو
ڈال دو دشمن پہ برقِ خندۂ دنداں نما اے پری رونا ہمارا مسکرا کر دیکھ لو
فتنۂ محشر کا غل گور غریباں سے اٹھے گر خرام ناز سے مدفن کو جا کر دیکھ لو

یاد آئے جو شب ہجر میں گیسوئے صنم رہی تا صبح پریشان طبیعت کیسی
کرتا ہے قتل عمد کھیل سمجھ کر وہ صنم ہے لڑکپن کی ابھی تک اسے عادت کیسی
کردیا بے سرو سامان مجھے ہائے ستم چرخِ ظالم نے نکالی یہ عداوت کیسی

حواشی:

(۱) آج کل دہلی جنوری ۱۹۷۳ء ص ۳۱،
(۲) افکار سہیل ص ۲۵۹-۲۶۰،
(۳) درخواست بنام انسپکٹر مدراس
(۴) شبلی سخنوروں کی نظر میں۔ محمد الیاس الاعظمی۔ طبع اول اپریل ۲۰۱۲ء ص ۱۷۷

احقر۔ منشی ناگیشور پرشاد سریواستو

تخمیناً ۱۸۷۴ء ـــــ ۱۹۲۹ء

ان کا اصل نام منشی ناگیشور پرشاد اور تخلص احقر تھا۔ ان کے والد منشی گجادھر پرشاد سریواستو ایک باعزت اور پروقار لالہ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ احقر کا اصل وطن موضع کھیتولی پرگنہ نتھوپور ضلع اعظم گڑھ تھا۔ احقر نے تعلیم کا سلسلہ گھر سے شروع کیا۔ پھر مکتب، پاٹھ شالا اور پرائمری اسکول سے آگے تک کی تعلیم حاصل کر کے اردو، فارسی اور انگریزی میں صاحبِ لیاقت ہوئے۔ وہ جج صدر گورکھ پور کے پیشکار تھے۔ اسی تعلق سے وہ گورکھپور رہنے لگے اور گورکھپوری کی

نسبت سے مشہور ہو گئے، ڈاکٹر سلام سندیلوی اور مسلم انصاری نے علی الترتیب اپنی کتاب تاریخ ادبیات گورکھپور ص ۶۰ پر/اور دبستانِ گورکھپور ص ۱۱۳ پر اسی نسبت سے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء میں ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی اور اسی سال فوت بھی ہوئے۔ اس زمانے میں پچپن برس کی عمر میں سبکدوشی ہوتی تھی۔ صاحبِ دبستان گورکھپور کا بیان ہے کہ دورانِ ملازمت شعر گوئی کا جذبہ بیدار ہوا۔ ہم عصر شعراء کی معیت نے اس جذبہ کو مزید تقویت بخشی۔ ان کے استاد شاعر کا نام معلوم نہیں مگر کلام کی پختگی اور زبان و بیان کی صفائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی استاد ضرور تھا۔ اور یقیناً ان کے استاد مرزا فہیم گورکھپوری (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۵۴ء) رہے ہوں گے جس کی تصدیق کچہری کے ایک بزرگ وکیل نے کی۔ وہ شعر گوئی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے مگر عوامی مشاعروں میں شرکت سے گریز کرتے۔ حلقۂ احباب میں بصد شوق سناتے۔ ان کے کلام پر مذہب کا رنگ گہرا ہوتا تھا۔ ان کے افکار وخیالات اسی کے محور پر گردش کرتے۔ (۱)

احقرؔ نے غزلیں کم کہیں وہ زیادہ تر مثنوی کہتے تھے۔ فکر وفن پر ان کی نگاہ رہتی تھی۔ ان کے کلام سے ان کے ایک مکمل شاعر ہونے کی تمام خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں۔ زبان صاف، سادہ اور شیریں ہے۔ مصرعے رواں اور بے عیب ہیں۔ اچھی اور سچی شاعری ان کا مطمحِ نظر ہے، ان کا کلام ریاض الاخبار گورکھپور اور تحفۂ خوشتر گورکھپور وغیرہ میں ذوق وشوق سے چھپا کرتا تھا۔ احقرؔ نے ایک نظم ''رامائن موسوم بہ فسانۂ رام'' کہی ہے دراصل یہ کتاب رامائن کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب رفیع اللہ کے اہتمام میں مطبع رفاہ عام گورکھپور سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی ہے۔

جب فسانۂ رام شائع ہوئی تو اس کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ مرزا فہیم گورکھپوری، ایم گورکھپوری، ہنر گورکھپوری، حیران گورکھپوری ثم معظم آبادی اور گوہر گورکھپوری نے قطعات تاریخ کہے، ان قطعات سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ فسانۂ رام کی اشاعت ۱۹۲۹ء مطابق ۱۳۳۶ فصلی میں ہوئی۔

احقرؔ نے رامائن کا ترجمہ نہایت سلیس اور سادہ زبان میں کیا ہے۔ زیادہ تر اشعار میں روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ اس مثنوی کے چند اشعار اور تحفۂ خوشتر گورکھ پور۔ مئی ۱۹۲۳ء ص ۹۲ سے دو شعر درج ہیں۔

نمونۂ کلام

نیرنگی چرخ کا سنو حال | گھات اس کی عجب ، عجب ہے چال
اک روز جو رام بہر گل گشت | تکلیف کناں ہوئے سوئے دشت
دیکھا کہ عجب ہے اک کہکسار | پھولوں سے لدا ہے مثل گلزار
دیکھی یہ فضا تو دل ہوا شاد | خاطر ہوئی رنج و غم سے آزاد (۲)
کیوں قدم باہر نکالے،کوئی مرہی کیوں نہ جائے | لیلیٰ محمل نشیں ہے، آرزوئے دل نہیں
ہوئے ہیں بحرسخن سے سیر کتنے تشنہ کام | مثل طبع فانیؔ احقرؔ کوئی دریا دل نہیں (۳)

حواشی:

(۱) دبستان گورکھپور۔مسلم انصاری۔باراول ۱۹۹۷ءص ۱۱۴۔۱۱۵
(۲) تاریخ ادبیات گورکھپورص:۶۰-۶۱،سلام سندیلوی
(۳) شاہدعلی سبز پوش فانیؔ گورکھ پوری

احقر-مولوی حکیم محمد اصغر فاروقی کوریاپاری

جنوری(۱) ۱۸۶۴ء ـــــ ۱۷رجولائی ۱۹۴۶ء / ۱۴رشعبان ۱۳۶۵ھ

ان کے مورثِ اعلیٰ فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ ۔۷۹۰ھ) کے دورِحکمرانی میں دیار پورب کے علاقہ کوئریاپار ضلع اعظم گڑھ (اب ضلع مئو) میں آ کر آباد ہوئے تھے اور رشد وہدایت، تدریس وتبلیغ کی رونق مسند بنے ہوئے تھے۔اس فاروقی خانوادے میں زہدوتقویٰ،خداترسی اور خدمتِ خلق کی روایات ہمیشہ وسعت پزیر رہیں۔آس پاس کے مواضعات وقریات اس کے علمی وفکری اور تہذیبی ولسانی فیوض وبرکات سے حصہ پاتے رہے ہیں اور آج بھی اس علمی ودینی خانوادے میں بزرگوں کے اوصافِ حمیدہ اوراسلاف کی روایات موجود ہیں۔

یہ کوریاپار ضلع اعظم گڑھ (اب ضلع مئو) کے فاروقی خانوادے کے بڑے متقی پرہیز گاراور پابند دین وشرع بزرگ تھے۔ان کے والدگرامی کا نام شیخ محمد اکرام بن شیخ پیغمبر بخش تھا۔احقر طبیب حاذق بھی تھے اور نسخے بہت سستے لکھتے تھے۔دست شفا تھادور دور کے مریض آتے اور نسخے لکھوا کر

لے جاتے تھے۔ یہ جس دور کے طالب علم تھے اس زمانے میں اطراف کے اضلاع میں عربی کی اعلیٰ درس گاہیں نہیں تھیں۔ خانگی مکتب کا رواج تھا۔ شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ بندی کلاں (نومبر ۱۸۴۷ء / ۱۲۶۴ھ۔ ۱۳۶۲ھ) کے رہنے والے تھے اور آرہ (بہار) میں عربی کی اعلیٰ تعلیم پر مامور تھے انھیں سے مولوی اصغر صاحب نے آرہ میں عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مولانا اہلحدیث مسلک کے تھے استاذ کا رنگ شاگرد پر بھی چڑھا بہت دنوں تک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتے رہے البتہ آمین بالجہر کے پابند نہیں تھے۔ بعد میں مولانا وصی اللہ فتح پوری (۱۳۱۰ھ۔ ۱۳۸۷ھ) کے زیر اصلاح رہ کر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۲۸۰ھ۔ ۱۶/رجب ۱۳۶۲ھ/ جولائی ۱۹۴۳ء) سے بیعت ہوئے۔ ریاضت و تلاوت اور اوراد و وظائف کو مشغلہ بنا لیا تھا۔ منکسر المزاجی اور اتباع سنت میں ممتاز تھے۔ اپنے دور کے ملا تھے جو بعد کے عربی فاضل کے متوازی و مساوی تھا۔ ان کی تعلیمی لیاقت ملا کے علاوہ وی، ٹی، سی کی تھی۔ محکمۂ تعلیم میں بڑی ناموری کے ساتھ برسر کار تھے۔ یعنی گورنمنٹ نارمل اسکول گورکھپور (اب جے سی ٹی گورنمنٹ کالج کہا جاتا ہے) میں بیس برسوں تک تعلیم دیتے رہے اسی میں منشی پریم چند بھی مدرس تھے۔ افسروں میں ان کا بہت احترام تھا ۱۵/جنوری ۱۹۲۵ء کو ۵۵/برس کی عمر میں پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ یہ ایک چھوٹے زمیندار تھے اور چودہ بیگہ زمین وراثت میں ملی تھی بعد میں اپنی محنت اور رزقِ حلال سے تقریباً آٹھ بیگہ زمین اور خریدی تھی۔ یہ اپنے گانو کے سرپنچ بھی تھے۔ یہ بہت اچھا لکھنے والے اور خوشخط تھے ان کا سواد خط بہت پاکیزہ اور روشن تھا۔ احقر کی اولاد و مال اور علم و تقویٰ میں خدا نے بڑی برکتیں دی تھیں۔ آٹھ اولاد نرینہ کے والد بزرگوار تھے اور سب کے سب صاحبِ علم، اہل صفا، زہد و اتقا کے پابند اور حیثیت عرفی رکھنے والے ہوئے۔ ان میں شاعر و ادیب بھی ہیں اور سرکاری عہدیدار بھی۔ شمس الرحمن فاروقی انھیں کے پوتے ہیں۔

مولوی حکیم محمد اصغر شاعر بھی تھے اور احقر تخلص کرتے تھے ان کے فرزند ارجمند مولوی عزیز الرحمٰن فاروقی (مارچ ۱۹۰۲ء۔ ۱۹۹۳ء) نے راقم کو اپنے خط مرقومہ ۲۵/مئی ۱۹۸۰ء میں اطلاع دی ہے کہ انھوں نے کبھی کبھی مولانا عبدالغفار ضیاؔ مئوی (۲/صفر ۱۲۸۳ھ۔ ۱۳۴۱ھ) سے کلام پر اصلاح لی جو ان کے ساتھی اور رفیق تھے۔ اصغر نے زیادہ تر حمد و نعت اور مناجات لکھی

ہے۔ ان کے بیٹے مولوی محمد خلیل الرحمن فاروقی (۲۵؍جنوری ۱۹۱۰ء۔ ۱۲؍فروری ۱۹۷۲ء) نے اپنی خودنوشت قصص الجمیل فی سوانح الخلیل میں ان کے معمولات میں شامل ان کی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۶ء-۱۹۱۷ء میں لکھی گئی، ہفتہ کے ساتوں دن کی الگ الگ مناجات اور ایک دیگر مناجات ص ۳۶۱ تا ۳۷۴ د رج کی ہے۔ زبان سادہ، عام فہم اور اثر انگیز ہے۔

احقرؔ کو اپنے خیالات برجستگی اور لازمۂ شعری کے ساتھ ظاہر کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ وہ زبان و بیان اور اسلوب و انداز پر شاعرانہ دستگاہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ہفتہ بھر کی مناجاتوں میں جو انداز و اسلوب اختیار کیا ہے۔ وہ بالکل برجستہ اور بے تکلف ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی لسانی پیچیدگی یا شعری تصنع نہیں ہے۔ بارگاہ رب العزت میں بندہ کو کس طرز بندگی اور ادائے عجز و انکسار کے ساتھ کلام کرنا چاہیے ان کو اس کا احساس اور شعور کاملاً حاصل ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ کن الفاظ میں خداوند کریم سے دعائیں کی جائیں۔ مناجات کی زبان میں سادگی، برجستگی، احساس عبدیت، خشوع وخضوع، تضرع وزاری اور عاجزی وانکساری ہونی چاہیے۔ احقرؔ نے ان تمام مطالبات مناجات کو بطریق احسن پورا کیا ہے۔ زبان ایک صدی پہلے کے رنگ وآہنگ اور طرز و انداز کی نمائندگی کرتی ہے۔ شرفائے انجاب کے طرز زندگی، آداب معاشرت، افکار واقدار اور افتادِ مزاج پر بھی ان مناجاتوں سے روشنی پڑتی ہے۔ دنیا میں بندۂ خدا کو کس طرح رہنا چاہیے، مرد مومن کی تمنائے دلی کیا ہونی چاہیے، کن اخلاقی رذائل وذمائم سے اجتناب کرنا چاہیے۔ عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھنے والے کو زندگی کا آخری حصہ کس طرح گزارنا چاہیے، مناجات میں ان سب پر بہت بلیغ اشارے بھی موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت وعقیدت کا اظہار بھی ان مناجاتوں میں ہے۔ ایک مومن کامل کا ایمان واعتقاد جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر کیسا ہونا چاہیے؟ اس کی بہت واضح تعلیم مناجات میں دی گئی ہے۔ دوشنبہ کی مناجات میں ولادت باسعادت کا مبارک دن ہونے کی مناسبت سے ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حوالے ابتدائی پانچ اشعار کو چھوڑ کر اختتام تک کے سبھی شعروں میں آئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ احقرؔ کس قدر محب رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے۔ ان کی انھیں منظوم دعائے سحر گاہی کا نتیجہ ہے کہ ان

کے خاندان میں علم ودانش کی روشنی اورزہد وتقویٰ کی چنگاری نے ان کے بعد کی کئی نسلوں کوبھی روشن اورتازہ کار رکھا ہے۔اس خاندان میں شعروادب کے چرچے ضرور تھےاورآج بھی ہیں مگرعلم وعرفان کے مقابلے میں اس کوایک ضمنی مشغلہ کی حیثیت حاصل رہی اوراس جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس خانوادے میں ادیب وشاعر وصحافی اورمعلم ودانشور پیدا ہوئے۔ موجودہ دور میں شمس الرحمٰن فاروقی ،قیسی الفاروقی ،رضوان اللہ فاروقی ،نجم الرحمٰن فاروقی اس خانوادۂ علم وادب کے بڑےاورنمایاں نام ہیں۔

مناجات جمعہ

اے خدا اے کار ساز دوجہاں — تیری قدرت کا ہے سب جلوہ عیاں
اے دلوں کے راز داں ذرہ نواز — تو ہے قادر اور غنی اور بے نیاز
میری حالت سے نہیں تو بے خبر — تجھ پہ روشن ہے مرا عیب وہنر
عمر بھر میں نے کیے لاکھوں گناہ — ہو گیا میں اپنے کاموں سے تباہ
کثرت عصیاں سے ہوں میں شرمسار — ہوں سیہ کاری میں فردِ روزگار
نام لے کس منھ سے تیرا وہ بشر — جو گنہ میں مبتلا ہو عمر بھر
فعل جس کا جز خطا طاعت نہ ہو — تیری طاعت میں جواک ساعت نہ ہو
کس طرح وہ عفو کا ہو خواستگار — جس کے جرموں کا نہ ہوے کچھ شمار
ایک تو سنتا ہے اور غفار ہے — جس طرح جبار اور قہار ہے
اس لیے میں دل سے کرتا ہوں دعا — کر مری پوری تمنا اے خدا
رکھ مجھے ایمان کامل پر غفور — جادۂ ایماں سے کر مجھ کو نہ دور
جب کہ آئے میرا وقت واپسیں — ہو مرا رہزن نہ شیطانِ لعیں
حفظ میں رکھ مجھ کو سب امراض سے — اور ساری دنیوی اغراض سے
رکھ مجھے امراضِ جسمانی سے دور — تا نہ ہو کچھ میری طاعت میں فتور
اور بچا امراض روحانی سے بھی — اور سب وسواس شیطانی سے بھی
حفظ میں رکھ اپنے مجھ کو اے خدا — اور محبت اپنی خالص کر عطا

قرض کا کچھ بار میرے سر نہ ہو رزق کی تنگی کبھی مجھ پر نہ ہو
اے میرے معبود برحق ذوالجلال قہر سے اپنے بچا تو بال بال
ہوں بہت مسکین اور میں ناتواں تاب تیرے قہر کی مجھ میں کہاں

اور دعا یہ ہے کہ باایماں مروں
شافع محشر سے جنت میں ملوں

(مناجات پنجشنبہ)

یا قدیم و یا مجیب و یا حسیب یا خبیر و یا لطیف و یا حبیب
یا سلام و یا علی و یا عظیم یا بدیع و یا جلیل و یا حکیم
ظاہر و باطن ہوئی جتنی خطا سب سے تو بہ کرتا ہوں اے کبریا
استقامت مجھ کو توبہ پر نصیب کردے اے ستار اے نعم المجیب
فرض و واجب مجھ سے سب کچھ ہوں ادا اور نوافل بھی نہ ہوں مجھ سے جدا
مال طیب سے مجھے کردے غنی یا غنی و یا غنی و یا غنی
علم دیں سے سینہ کو معمور کر اور نشے میں علم کے مخمور کر
کبر و نخوت اور ریا سے دور رکھ بادۂ وحدت سے دل مسرور رکھ
روز محشر ہے بہت ہی جان گداز سب کے سب کاموں کا کھل جاتا ہے راز
جب قیامت میں اٹھوں بہر حساب ہاتھ میں ہو داہنے تیری کتاب
صورت خیر البشر پہچان لوں یا محمد بس وہاں کہتا پھروں
ہوں مرے اعمال جتنے ناروا ہوں شفیع اس کے محمد مصطفیٰ
کلمۂ طیب سے پلہ ہو گراں ہو زباں پر بھی یہی کلمہ رواں
ہو لوائے احمدی جس جا گڑا میں بھی پہنچوں اس جگہ پر دوڑتا
ہو تیرے دیدار کی نعمت حصول آخری میری دعا ہے کر قبول
نالۂ احقرؔ ہو مقبول جہاں جو پڑھے رکھ اس کو با امن و اماں
ہو تری توفیق اس کی رہنما راہ سنت پر چلے وہ برملا

جتنے بے اولاد ہوں اور نا مراد   صاحب اولاد ہوں اور بامراد
بس کر اے خامہ تو کر شکر خدا   ہوگئی مقبول احقرؔ کی دعا

حواشی:

(۱) انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی کو اپنے لکھے ایک خط مورخہ ۱۲؍اگست ۱۹۳۴ء میں اپنی عمر ۷۰؍سال لکھی ہے (قصص الجمیل فی سوانح الخلیل طبع دوم ۲۰۰۶ء ص: ۱۶۲۔ قصص الجمیل میں متعدد جگہ جنوری ۱۸۷۰ء جو ماہ و سالِ ولادت ہے وہ سرکاری ملازمت کے اعتبار سے ہے۔

احقرؔ- سید توقیر حسین

قیاساً ۱۹۲۲ء ـــــ ۱۰؍اپریل ۱۹۹۷ء/ ۲؍ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ

موضع سیہی پوسٹ راوت مئو ضلع اعظم گڑھ کے باشندہ تھے ان کے والد کا نام سید علی خاں تھے ابتدا میں جرمؔ محمد آبادی (۱۹۰۳ء-۱۵؍جنوری ۱۹۸۶ء) سے اصلاح لی پھر حاجی علی حماد مبارک پوری (۱۹۱۹ء- ۲۸؍دسمبر ۲۰۰۹ء کو بغرض اصلاح کلام پیش کرنے لگے۔ مذہبی اور اعتقادی شاعری کرتے تھے کبھی کبھی غزلوں کے اشعار بھی موزوں کرلیا کرتے تھے۔ زبان و بیان میں سادگی تھی اور خیالات میں عوامی فہم ونظر کی رعایت تھی۔ ان کی فکری اساس دور افتادہ بستیوں میں محفل مقاصدہ ومجلس عزا اور دوسری شعری تقریبات کو تازہ رکھنے تک محدود تھی۔ احقر جیسے شاعروں نے دیہاتوں میں اردو شعر وادب کا چراغ جلائے رکھنے میں قابل ذکر خدمات سرانجام دی ہیں۔ انھیں جیسے سخنوروں کی گرمی ذوق سخن اور مذاق شعری کی وجہ سے محافل ومجالس آباد رہا کرتی ہیں۔

نمونۂ کلام

احقر نہ ہوسِ زر نہ تمنائے جہاں ہے   مطلوب مجھے خاک درِ شاہِ زماں ہے
رنگینیٔ دنیا سے کروں کیوں نہ کنارا   سینے میں میرے الفت سردارِ جناں ہے
مظہر شام وفا اہل کرم رکھتا ہوں   تیرا شیدائی ہوں یہ جاہ وحشم رکھتا ہوں
شادمانی کی ہو محفل یا غمِ دوراں کی   یاحسین ابن علی کہہ کے قدم رکھتا ہوں

احمدؔ-منشی احمد اللہ اعظم گڑھی

اردو کے مشہور استاذ شاعر مرزا عبدالمجید بیگ فہیم گورکھپوری (۱۸۷۸ء۔۱۹۵۴ء) کے تلمیذ رشید تھے۔ اعظم گڑھ کے شاعروں میں اچھا مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے استاد شاعر فہیم گورکھپوری کے فیض تربیت سے شعر گوئی کے بہت سے مرحلے طے کر لیے تھے۔ زبان و بیان کی خصوصیات پر نگاہ ڈالئے تو محسوس ہوگا کہ انھوں نے متروکات و مختارات سخن کی سختی سے پابندی کی ہے۔ خیال و مضمون کو دیکھئے تو ظاہر ہوگا کہ انھوں نے حسن ظاہر پر اپنی نظر مرکوز کر رکھی ہے وہ معشوق کے سراپا، اس کی آنکھ، سینہ، چہرہ، ابرو، ہتھیلی، کلائی، لب درخسار، نقاب وزلف، قد و قامت کو غور سے دیکھتے ہیں اور اس پر شعر کہتے ہیں۔ ظاہری حسن پر ان کی نظر ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں محبوب کی ادائے ناز کے تذکرے ملتے ہیں۔ چوں کہ ان کے دور میں عشق و حسن کے روحانی تصورات اور متصوفانہ نظریات بدل چکے تھے۔ اس تصور میں مادیت، لذت کوشی، تعیش پسندی، جنسیت زدگی، شہوانی جذبات کی آسودگی شامل ہو چکی تھی۔ لکھنوی تہذیب اور کچھ مذہبی اجازت کی وجہ سے جنسی آسودگی کے وسائل بھی پیدا ہو چکے تھے۔ طوائف بازی علامت ریاست سمجھی جانے لگی تھی۔ احمدؔ نے اپنی شاعری میں ان سب کو جگہ دی ہے۔ ان کا خونِ دل استعارہ ہے محبوب کے رنگ حنا کا۔ وہ ہجر و فراق یار میں اس کے چشم و ابرو کو یاد کر کے روتے ہیں۔ ان کے بیان میں زبان و اسلوب کی خوب صورتی اور تشبیہ و استعارہ کی گل گونی و رعنائی ہے۔ خیال و جذبہ کی رنگینی و رعنائی کے ساتھ طرز ادا کی نفاست و نزاکت بھی موجود ہے۔ ان کے مضامین و خیالات وہی ہیں جو قدماء کے یہاں عام ہیں۔ مگر ان کے کہنے اور سوچنے کے لمحات میں کچھ نئے پہلو پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ انھیں اپنے رنگ میں قاری کے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

نمونۂ کلام

کب جگر زخمی نہیں، کب ٹکڑے ٹکڑے دل نہیں — وجہِ ایذا کب خیالِ ابروئے قاتل نہیں
وجہ کیا، پھر کیوں نکلتی حسرتِ قاتل نہیں — کند جب خنجر نہیں، شل بازوئے قاتل نہیں

شوخ کیوں ہاتھوں کا تیرے رنگ اے قاتل نہیں
کیا تری منہدی میں میرا خونِ دل شامل نہیں

دشمنِ جاں ایک عالم کی ہے اس بت کی ادا
سب کا قاتل ہے وہی، میرا ہی کچھ قاتل نہیں

بحرِ الفت میں جو ڈوبے وہ نہ نکلے آج تک
یہ نیا دریا وہ ہے جس کا کہیں ساحل نہیں

کیا ہو ابر و برق کو رونے تڑپنے کا شعور
وہ ہمارا دیدۂ تر، یہ ہمارا دل نہیں

ناپسند آئے مرا دل غیر کا دل ہو پسند
کیا کہوں کچھ تم کو تمیزِ حق و باطل نہیں

لطف تو جب ہے تڑپنے سے نہ ہو مہلت کبھی
جو اٹھے تھم تھم کے ہم اس درد کے قائل نہیں

کیوں نہ اے احمدؔ ہو فنِ شعر میں شہرت مری
کیا میں شاگردِ فہیم شاعرِ کامل نہیں(۱)

حواشی:

(۱) تحفۂ خوشتر گورکھپور۔ مدیر وسیم احمد خیرآبادی فروری ۱۹۲۳ء نمبر ۶ ص ۱۸-۱۹

احمدؔ- احمد علی فرح آبادی اعظمی

قیاساً ۱۸۳۳ء ـــــ ۱۹۲۵ء میں حیات تھے

موضع فرح آباد قصبہ نظام آباد ضلع اعظم گڑھ سے اتر پچھم گوشے میں واقع ہے۔ احمد علی یہیں کے رہنے والے صاحب علم و بصیرت معلم و مدرس تھے۔ زمانۂ شباب میں محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی مدارس تھے۔ علامہ شبلی نعمانی کے ہم عصر و ہم زمانہ تھے۔ نہایت خلیق، متین، خوش نویس اور خوش گو شاعر تھے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کا زمانہ دیکھا تھا اور ان دونوں کی صحبتوں اور مجلسوں میں رہنے کی سعادت بھی پائی تھی۔ باتیں چھڑ جاتی تھیں تو اکثر ان دونوں شاعروں کے واقعات سنانے لگتے تھے۔ ان کے شعری و ادبی ذکر سے اپنی یادوں کے چراغ روشن کرتے رہتے تھے۔

رحمت الٰہی برقؔ اعظمی کے بقول ۹۲ رسال کی عمر میں اکثر لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے اردو مڈل اسکول نظام آباد پر آیا کرتے تھے۔ ان کے احترام علمی میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر اپنی کرسی خالی کر دیتے تھے اور انھیں اصرار کر کے اپنی کرسی پر بیٹھاتے تھے۔ وہ بچوں کو بلا معاوضہ مفت پڑھاتے تھے۔ برق اعظمی بھی اسی زمانے میں اردو کی تعلیم اس اردو مڈل اسکول میں حاصل کر رہے

تھے اوران کے گھر پر حاضر ہوکران سے فارسی پڑھتے تھے۔ برق صاحب کا بیان ہے کہ پڑھانے کا انداز نہایت دل نشیں، دل چسپ اور ذہن ساز تھا۔ ان کا فارسی اور اردو دیوان الگ الگ موجود تھا۔ برجستگی کے باوجود بہت عمدہ اشعار کہتے تھے۔ زودگوئی کے ساتھ پرگوئی کے جوہر سے بھی متصف تھے ان کی فارسی مکتوب نگاری کی بھی اپنی ایک علاحدہ شان تھی۔ اس میں ادبی حسن اور بلاغت کا پہلو نمایاں رہتا تھا۔ انھوں نے ایک فارسی خط اپنے کسی دوست کو لکھا تھا جس کا یہ ایک شعر برق اعظمی کے بڑھاپے تک ان کے ذہن کی امانت بنا رہا۔

ہر شبے گفتم کہ فردا ترک ایں سودا کنم   باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

برق صاحب کی یادداشت کے مطابق ان سے ان کے گھر پر فارسی پڑھنے کا سال ۱۹۲۵ء تھا اس وقت ان کی عمر ۹۲ر برس تھی۔ ان کے پڑھانے کا انداز یہ تھا کہ طالب علم ان کے پیچھے پیچھے چلتے تھے اور یہ سبق دیدیا کرتے تھے۔

نظام آباد کے مٹی کے برتن اپنی خوبصورتی کی وجہ سے پورے ہندوستان میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ احمدؔ نے ان برتنوں پر اپنے کہے ہوئے اشعار کو نقش کرواکے نواب حیدرآباد (دکن) کو ہدیۃً بھجوایا تھا اس پر نظام دکن کی طرف سے سترہ روپیہ ماہوار پنشن ملنے لگی تھی جو تاعمر جاری رہی۔ نہایت بےضرر، فقیر منش اور سادہ مزاج استاذ علم تھے۔ بے نیازانہ زندگی پر قانع تھے اور پوری عمر صبر وشکر کی تصویر بنے رہے۔ کبھی کسی کے در پر ہاتھ نہیں پھیلایا۔

برق اعظمی کی روایت سے راقم کو ان کے خمسہ کا جو ایک بند ملا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خطابت وذاکری میں بھی پایۂ بلند رکھتے تھے اور لوگ ان کے واعظانہ طرز وانداز کے دل دادہ بھی تھے۔ یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ انھوں نے بھی مولوی غلام عباس مبارک پوری سے جو نقل مکانی کر کے مبارک پور سے موضع سمبھی اور اس کے بعد بمبئی چلے گئے تھے۔ فیض تعلیم پایا تھا اور صابر علی صابر نظام آبادی سے بھی فن شاعری میں خوشہ چینی کے لئے رابطہ استوار کر رکھا تھا جو ناسخ کے ارشد تلامذۂ سخن میں تھے۔ بند ملاحظہ ہو۔

ہو نہ جانا خود ستا و خود پسند   یاد صابرؔ کی یہ رکھنا ایک پند

گھر سے صابرؔ کے ہوا رتبہ بلند ذاکری تیری جو احمدؔ ہے پسند
فیض تعلیم غلام عباس ہے

ان کے جو اشعار نظام آبادی ظروف گلی پر نقش ہوتے تھے ان میں سے چند یہ ہیں جو برق اعظمی کی روایت سے راقم کو حاصل ہوئے ہیں۔

آراستہ ہوں ، ہری بھری ہوں صنعت کے طلسم کی پری ہوں
پڑتی ہے نگاہ سب کی مجھ پر کہنے کو غریب طشتری ہوں

برق صاحب کے بیان کے مطابق کمھاروں کے اصرار پر طشتری کے لیے یہ دو بیتی احمد نے برجستہ کہی تھی۔انھوں نے تیل کی پیالی کے لئے جو قطعہ کہا تھا وہ بھی بڑا شاعرانہ ہے۔ملاحظہ ہو

سنتے تھے اعلیٰ سے ادنیٰ کو عروج یہ مثل اب آزمائی ہوگئی
روغنِ گل کے عوض اس خاک کی زلفِ جاناں تک رسائی ہوگئی

احمد۔مولوی محمد احمد اعظم گڑھی

تخمیناً ۱۸۶۶ء ـــ دسمبر ۱۹۴۱ء

اعظم گڑھ کے محلہ آصف گنج میں پیدا ہوئے۔اعظم گڑھ شہر کے رئیس گھرانوں میں ان کے خاندان کو گنا جاتا تھا۔ان کی ابتدائی تعلیم شہر اعظم گڑھ کے خاندانی مدرسہ میں ہوئی۔عربی کی تعلیم کے لیے مدرسہ فیض عام کان پور میں داخل کیے گئے۔جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تاسیس عمل میں آئی تو وہاں جا کر عربی زبان میں اتنی مہارت پیدا کر لی تھی کہ مصر وشام اور عرب ملکوں سے جو عربی اخبارات وجرائد شائع ہو کر آیا کرتے تھے انھیں بہ آسانی سمجھ لیتے تھے۔نامعلوم اسباب کی بنا پر عربی تعلیم اھوری چھوڑ کر اعظم گڑھ کے نیشنل ہائی اسکول (موجودہ شبلی نیشنل پوسٹ ڈگری کالج) میں داخل ہوگئے۔ ۱۹۰۲ء میں اسی اسکول سے امتیاز کے ساتھ انٹرنس کیا۔اور کلکتہ میں انگریزوں کے چمڑے کے گودام سے منسلک ہوگئے۔ یہاں پر بڑی ناموری اور عزت کے ساتھ اخیر تک برسر کار رہے۔

ان کی شادی مہراج گنج میں مولوی ضیاء اللہ احقرؔ کی صاحبزادی اور دبستان شبلی کے مشہور شاعر یحییٰ اعظمی کی بہن سے ہوئی تھی۔ مولانا محمد احمد جب تک مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں رہے ''الاختبار'' نام کا ایک علمی وادبی تاریخی و مذہبی قلمی ماہوار رسالہ بھی اپنی ادارت میں برابر نکالتے رہے جس میں زیادہ تر مضامین انھیں کے لکھے ہوئے رہتے تھے اس قلمی ماہنامہ کی بڑی دستاویزی حیثیت ہے۔ اس سے اس وقت کی علمی کاوشوں کا بھی انداز ہوسکتا ہے۔ اس کا اجرا مئی ۱۹۱۶ء میں ہوا تھا۔

مولوی صاحب شاعر بھی تھے اور اردو فارسی دونوں زبانوں میں فکر کرتے تھے۔ ان کے کلام کا قلمی مجموعہ ان کے اخلاف میں ابھی تک موجود ہے۔ جس سے ان کے شاعرانہ مقام ومرتبہ کا علم ہوتا ہے۔ ان کے اس قلمی مجموعہ میں ہر صنف کے اشعار موجود ہیں جس سے شاعری کی ہر صنف پر ان کی جولانی طبع اور قدرت کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ شبلی کی مثنوی ''صبح امید'' کے رنگ میں ایک بڑی دل آویز مثنوی انھوں نے بھی کہی تھی جو ماہتاب پریس اعظم گڑھ سے ۱۸/مارچ ۱۹۱۵ء کو شائع ہوئی تھی جس کے کاتب ایس، ایم عبدالمجید انصاری ساکن اعظم گڑھ تھے اس مثنوی کا عنوان ''فغان احمد'' تھا جو ذیل میں اپنے مقام پر آرہی ہے۔

یہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں انگریزی شعبہ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اسی زمانے میں بعض اکابر کی آمد پر قصائد بھی کہے تھے۔ جو ان کے قلمی دیوان میں موجود ہیں۔ فارسی نظم ونثر دونوں اچھی اور برجستہ لکھتے تھے۔ فارسی میں علامہ شبلی نعمانی کے معاصر اور فارسی زبان وادب کے نکتہ شناس مولوی خدا بخش کے شاگرد تھے۔ یہ مولوی خدابخش مرحوم مہراج گنج کے تھے مگر اعظم گڑھ کے محلہ میر پیٹو میں آکر بس گئے تھے ان سے بہت سے لالاؤں اور کائستھوں نے فارسی زبان سیکھی تھی۔ مولوی احمد کے خطوط بڑے ادیبانہ اور انشا پردازانہ ہوا کرتے تھے۔ ان میں ادبی چاشنی کے ساتھ بلا کی تاثیر بھی ہوتی تھی۔ ان کے خطوط کی اچھی خاصی تعداد ابھی تک خاندان میں محفوظ ہے اگر یہ چھپ جائیں تو اردو کے ادبی خزانۂ عامرہ میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔ بعض لوگ تو ان کے خطوط ہی سے ان کی ادبی صلاحیتوں اور ان کی اعلیٰ ذوقی کے معترف ہوگئے تھے۔ قومی اصلاح وترقی کے کاموں سے بھی انھیں دلچسپی تھی جس کا ثبوت ان کی ذیل کی مثنوی ''فغان احمد'' بھی ہے۔ عنفوان

شباب میں اعظم گڑھ میں انھوں نے ایک اصلاحی انجمن قائم کی تھی۔ اس انجمن کے اجلاس میں کی گئی ان کی تقریروں کا جو قلمی مجموعہ محفوظ ہے اس سے اگر ایک طرف اس زمانے کی قومی سرگرمیوں، دل چسپیوں اور خیالات و مذاق کا علم ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کی قومی فکر مندیوں اور ان کے سوچنے کے انداز کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کی فرصت کا ایک دل چسپ مشغلہ حروف تہجی کے اعتبار سے اشعار کا انتخاب کرنا بھی تھا۔ اس طرح انھوں نے چھوٹی بڑی بہت سی بیاضیں تیار کر لی تھیں جو مباتیوں میں حصہ لینے والوں کے لیے بہت مفید تھیں۔

انھیں ناول نگاری سے بھی یک گونہ تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر ایک زمانے میں کلکتہ کی بخشی کمپنی کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے منسلک ہونے کی وجہ سے کلکتہ میں سکونت گزیں تھے۔ مولوی احمد کی ناول نویسی کا یہ ذوق شرر کا فیض صحبت تھا۔ ایک مختصر ناول ''ہائے غضب'' ماہتاب پریس اعظم گڑھ سے طبع ہوا تھا۔ انہوں نے مقالہ نگاری کا بھی بڑا ستھرا ذوق پایا تھا۔ ان کے تمام بڑے بڑے مقالے اردو میں ہیں جو اپنے مغز کے اعتبار سے رسالہ کا حکم رکھتے ہیں۔

مولانا کی شاعری اپنے وقت کی نقیب اور سیاسی و تمدنی نیز علمی و ادبی تحریک و مسائل کی نمائندہ ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط جما لینے کے بعد کے واقعات و حادثات اور مسلم عوام کی دینی و دنیاوی بے چینیوں کا علم ہوتا ہے۔ ان کی مثنوی فغان احمد کا آغاز مریض قوم مسلم کے چارہ ساز و مسیحا نفس افراد سے خطاب سے ہوتا ہے۔ ماضی کا ذکر اس انداز میں کیا گیا ہے کہ آنکھوں سے اشک خون جاری ہو جاتے ہیں۔ اس میں خود شاعر کا کرب پنہانی درد کی شدت و لذت کو بڑھا دیتا ہے۔ اس حصۂ نظم میں مسلمانوں کی تباہی و تاراجی کے اسباب و علل کا تذکرہ پوری جزئیات کے ساتھ آیا ہے۔ غفلت شعاری کے قبیح نتائج کی تصویر کشی شاعرانہ چابکدستی سے کی گئی ہے۔ جو طرز معاشرت مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھا اور جس کی برکتوں سے دین و دنیا کی کامیابیاں اس کا مقدر بنی ہوئی تھیں وہ تمام شعائر حیات غیروں کا دستور زندگی بن گئے اور مسلمانوں نے اس میراث پدر سے اپنے کو لاتعلق کر لیا۔ اس کے بعد کے اشعار میں مسلمانوں کو اسلاف کے جذبۂ تکمیلِ کائنات کی تمام تر حرارتِ ایمانی کے ساتھ کارزارِ زندگانی میں

قدم جما لینے کی ترغیب دی گئی ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا گیا ہے۔ بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت اور مدرسہ کی افادیت و اہمیت کی طرف بھی شاعرانہ اشارے کیے گئے ہیں۔

"شجرۂ طیبہ" کے نام سے ان کا ایک اور مناجات نما چار ورقی نمونۂ فکر دریافت ہوا ہے جو محرم ۱۳۰۴ھ میں منشی محمد ماجد علی کے مطبع کلیمی کلکتہ میں چھپا ہے۔ یہ شجرہ صابر یہ چشتیہ سلسلے کا ہے جس کو سید شاہ وارث حسن صاحب کوڑا جہاں آبادی کی فرمائش اور حافظ شیخ محمد عبدالکریم پیش امام نئی مسجد گینڈا تالاب کلکتہ کی خواہش پر نظم کیا گیا ہے۔

اس کی زبان بہت صاف اور لفظی تعقید کے عیب سے مبرّا ہے۔ شعریت و ادبیت کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جس سے شاعر کی قدرت بیان کا سراغ ملتا ہے۔ کہیں سے عجز بیان کی شکایت نہیں ملتی۔

مثنوی فغان احمد

اے قوم کے حامی و ہوا خواہ ذی عزت و ذی وقار و ذی جاہ
اے چارہ گرِ مریض بے جاں جو پائے دوائے درد پنہاں
حیرت زدہ ہوں کہ کیا بتاؤں کیسے تمہیں زخم دل دکھاؤں
اک رنج و الم کی داستاں ہے نغمہ نہیں پر شرر فغاں ہے
ہے یاد وہ دن کہ تم تھے سرتاج شاہان جہاں سے لیتے تھے باج
ہم روئے زمیں پہ محترم تھے ہم صاحب پرچم و علم تھے
معروف جہاں میں تھی شجاعت مشہور جہاں میں تھی سخاوت
تھا چشمۂ فیض ہم سے جاری سیراب تھی جس سے خلق ساری
تھے دشت و جبل ہمیں سے سیراب تھا باغ جہاں ہمیں سے شاداب
جتنے تھے حکیم اس جہاں کے گلچیں تھے ہمارے بوستاں کے
ہاں معدنِ علم و فن ہمیں تھے زینت دہِ انجمن ہمیں تھے

سرمایۂ فخر و ناز تھے ہم گلہائے چمن طراز تھے ہم
گردوں پہ رہا قدم ہمیشہ بھرتا تھا زمانہ دم ہمیشہ
پھونکا یہ فلک نے کون افسوں جس سے کہ جہاں ہوا دگرگوں
یکبار پلٹ گیا زمانہ بیگانہ ہوا جو تھا یگانہ
برپا ہے ہر ایک گھر میں ماتم لب پر ہے فغاں تو چشم پُرنم
ہم آج ز دستِ ظلم و بیداد ویراں ہوئے اور خانہ برباد
اب ملک رہا نہ کچھ خزانہ اغیار کا سن رہے ہیں طعنہ
افلاس نے ہے ہمیں دبایا نکبت کا ہے ابر سرپہ چھایا
عادات ہیں جاہلوں کے ہم میں اطوار ہیں کاہلوں کے ہم میں
ہر وقت ہے اختلاف ہم میں دل کا نہیں کوئی صاف ہم میں
ہے ایک کا ایک دل سے بدخواہ کیا پھوٹ یہ پڑگئی ہے اللہ
ہمِّ قومی کا پاس کچھ نہیں ہے عقبیٰ کا ہراس کچھ نہیں ہے
کل تک جو ابھی تھے طفلِ مکتب رستہ وہ ہمیں بتاتے ہیں اب
پہلے نہ تھے اس طرح سے ناچار پہلے نہ تھے ایسے خستہ و خوار
ہے بزمِ نشاط آج برہم ہیں خاک میں مل گئے ہم
کچھ رحم فلک تجھے نہ آیا اک آن میں کیا یہ کر دکھایا
کیوں آج ہماری ہے یہ ذلت کیوں آج یہ ہو رہی ہے درگت
کیوں آج ذلیل و مبتذل ہیں کیوں آج ہمارے ہاتھ شل ہیں
غفلت کا یہ سب ہے اپنے انجام ہے ٹوٹ پڑا جو کوہِ آلام
جب تک کہ ملے ہوئے تھے باہم لرزاں تھا مثالِ بید، عالم
جب تک کہ جمے تھے اپنے دیں پر سرسبز تھے صفحۂ زمیں پر
مذہب سے جو ہم نے منھ کو پھیرا ہر سو سے مصیبتوں نے گھیرا
بھولے جو "اوامر" و "نواہی" ہر سمت سے آگئی تباہی

پیمانِ وفا جو ہم نے توڑا اقبال و ظفر نے ساتھ چھوڑا
اے شیفتگان دینِ احمد اے جرعہ کشانِ جام سرمد
اے قوم کے محترم بزرگو اس خوابِ گراں سے اب تو چونکو
کس دھیان میں ہو، خیال کیا ہے؟ سوچو تو ذرا کہ حال کیا ہے؟
جو جو تھے شعار اہل دیں کے حصہ میں وہ آئے اہل کیں کے
اغیار کے دیکھئے خصائل معدوم ہیں ان کے سب رذائل
آپس میں ہے اتفاق کامل اک اک نے کیا ہے علم حاصل
سنتے ہیں جو قومی چندے کا نام کرتے ہیں وہ سب سے پہلے اقدام
اے مدعیان دین برحق ہے قوم کا آپ پر بھی کچھ حق
للہ اب اپنی آنکھیں کھولو اس قوم مریض کو تو دیکھو
کوئی نہیں جس کا یار و غم خوار کوئی نہیں مونس و مددگار
تھے اس پہ جو جان دینے والے اس ناؤ کے جو تھے کھینے والے
سب چل دیئے ایک ایک کرکے اب ہم ہیں نہ گھاٹ کے نہ گھر کے
اب ناؤ یہ ڈگمگا رہی ہے منجدھار میں غوطے کھا رہی ہے
ہمت سے اب اپنے کام لو تم یہ ڈوبتی ناؤ تھام لو تم
میداں میں قدم کو اب بڑھاؤ مردانہ وہ ہمتیں دکھاؤ
کافور ہو جس سے یہ جہالت معدوم ہو ذلت فلاکت
جاں قوم مریض کی بچالو تدبیر علاج کچھ نکالو
تعلیم کی اب ہے شرط تدبیر ہے ایک اسی دوا میں تاثیر
جس مدرسہ کی بنا ہے ڈالی جس گلشن دیں کے تم ہو مالی
سینچو اسے چشمۂ کرم سے سرسبز یہ ہے تمھارے دم سے
یہ سامنے چھوٹے چھوٹے بچے جو گلشن قوم کے ہیں پودے
معصوم ہیں اور بے زباں ہیں افتادہ ہیں، سربر آستاں ہیں

اک دن یہی مایہ ناز ہوں گے — اس قوم کے چارہ ساز ہوں گے
ہے آپ ہی انھیں کا سہارا — کافی ہے اک آپ کا اشارا
لو جود و سخا سے کام اب کچھ — پیدا کرو اپنا نام اب کچھ
کچھ حیلہ کرو نہ اب بہانہ — چندہ کرو داخل خزانہ
خیرات کی مد میں خرچ کرنا — ضائع نہیں بلکہ گھر ہے بھرنا
اب احمدؔ نامراد و ناکام — کرتا ہے دعا پہ ختم پیغام

....

اے خالق ہفت ارض وافلاک — از بہرِ رسول شاہ لولاک
جب تک ہے قمر، قمر میں انوار — جب تک ہیں شجر، شجر میں اثمار
یہ ذرہ فروغ میں "سہا" ہو — یہ قطرہ درِ گراں بہا ہو
یہ مرجع طالبانِ دیں ہو — یہ خاتم علم کا نگیں ہو
محفوظ رہے خزاں کی زد سے — مامون رہے نگاہِ بد سے

(شجرہ طیبہ)

اے خدائے کار ساز دو جہاں — اے کریم چارہ ساز بیکساں
اے مددگار ضعیف و ناتواں — اے انیس وغم گسار بے بساں
یہ ترا بندہ سراسر پر قصور — بد نہاد و بدتمیز و بے شعور
بے کس و ناچار و محتاج و غریب — تیرہ بخت و تیرہ روز و بدنصیب
آکے دھوکے میں یہ نفس بد کے آہ — بھول بیٹھا اپنا پیمان نباہ
کوچۂ عصیاں میں آوارہ پھرا — مدتوں تک بندۂ حرص و ہوا
ہو کے باغی تجھ سے یہ شوریدہ سر — ٹھوکریں کھاتا رہا یوں در بدر
جو عمل اس سے ہوئے ناکر دنی — بات جو نکلی وہ تھی ناگفتنی
لقمہ جو کھائے وہ سب ناخوردنی — نیند جو آئی وہ تھی نا خفتنی
الغرض اب تک جو کام اس سے ہوئے — سب خلافِ سنتِ نبوی ہوئے

ہر دو عالم میں ہوا یہ رو سیاہ — خستہ و ناچار و سر گرداں تباہ
ہر طرف سے پھر پھرا کر اے رحیم — آخرش یہ بندۂ عبدالکریم
آپڑا ہے در پہ تیرے پھر یہ آج — صدقے ستاری کے رکھ لے اس کی لاج
گو سزا وار معافی یہ نہیں — لائق عفو معاصی یہ نہیں
لیکن تیرے رحم کی امید پر — اے خدائے خالق جن و بشر
آستاں پہ رکھ کے یہ اپنی جبیں — بادلِ پژمردہ و اندوہ گیں
ملتجی ہے تیرے عفوِ عام کا — تیری رحمت اور ترے انعام کا
بخش دے میرے گنہ سب اے کریم — انت حسبی انت تو رب الرحیم
ہے تمنا یہ بصد عجز و نیاز — دل میں ایسا درد دے تو دل گداز
پھونک دے جو اس تن ناپاک کو — خاک کر دے ہر خس و خاشاک کو
گرم کر دے دل میں شوقِ بندگی — اور بخشے ذوق سر افگندگی
دل میں ہردم رغبت طاعت رہے — جس سے جاں کو قوت و راحت رہے
مشتعل ہوں جس سے سب سینہ کے داغ — جل اٹھیں ہر داغ سے سو سو چراغ
وہ تپش پیدا ہو دل میں اے خدا! — مضطرب ہو جائے دل سیماب سا
وہ بڑھے اس کے جگر میں تاب وتپ — ماہی بے آب کی سی ہو تڑپ
خرمنِ جاں جو جلائے مثلِ برق — وہ لگا دے آگ از پا تا بہ فرق
چھوڑ دوں میں صحبتِ نا سوتیاں — اور پکڑوں دامنِ لاہوتیاں

احمدؔ- بابو احمد خاں رئیس سدھاری

خاندان بابوان سدھاری ضلع اعظم گڑھ کے رئیس اور مولوی زین العابدین صاحب عابدؔ کے شاگرد تھے۔ زمیندارانہ ماحول میں پرورش پائی تھی خود بھی بڑے زمیندار اور متمول تھے۔ اس لیے زندگی عیش و آرام میں گزری تھی۔ ان کی شاعری ان کی زندگی ان کے دور کے تمدن اور ان کے مذاق سخن کی آئینہ دار ہے۔ ان کے دور میں ہندوستان کی وہ مغلیہ تہذیب جو ہند

و ایران کے مشترکہ کلچر سے نمو پزیر ہوئی تھی ابھی تک زندہ تھی مگر اس تہذیب اور اس وقت کی معاشرت میں بڑی خرابیاں پیدا ہوچکی تھیں۔ پہلے ہی اس تہذیب میں تکلف، تصنع اور اخلاقی گراوٹ کا عمل دخل بڑھ چکا تھا۔ اخلاق حسنہ اور دوسری انسانی خوبیاں زوال آمادہ ہوچکی تھیں۔ تصوف بھی اپنی روحانی اقدار کو کھو چکا تھا اور اس میں دنیاداری اور زر پرستی کی بو باس آچکی تھی۔ شاعری اس دور کے اعلیٰ طبقوں، رئیسوں اور زمینداروں کا مشغلۂ فرصت بن چکی تھی۔

احمد کی شاعری میں بھی وہ تمام چیزیں شامل ہیں۔ ان کی زبان اور ان کے خیال وتصور پر بھی ان کی زمیندارانہ تہذیب کا عکس نمایاں ہے۔ سماج کی سوچ کا زاویہ ایسا ہو چکا تھا کہ طوائف یا داشتہ کو رکھنا شرافت وریاست کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے تعیش پسندی اور لطف اندوزی اس معاشرت کا خاص مزاج بن گیا تھا۔ شاعری تو اپنے دور کا آئینہ ہوتی ہی ہے، وہ بھی اسی رنگ میں رنگ گئی۔ جو مضامین مدت دراز سے اردو شاعری خصوصاً غزلوں کا سرمایۂ ناز بنے ہوئے تھے۔ احمد کے یہاں ان سب سے اعتنا اور ربط ہے۔ انھیں مضامین وخیالات کو وہ پہلو بدل بدل کر اور اک ذراسی تبدیلی پیدا کر کے اپنی غزلوں میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا معشوق بھی قاتل، ظالم، خنجر آزما ہے۔ ان کے یہاں بھی محبوب کا ظلم وجور اور ستم وجفا موجود ہے۔ انھیں بھی محبوب کے خنجر، اور اس کے دیئے ہوئے زخم سے لذت ملتی ہے۔ بوسہ بازی چوماچاٹی، شب وصل کی سرمستی وخودفراموشی، محبوب کا رقیب کے ساتھ لطف وعنایت کا برتاؤ اور ان کی طرف کم التفاتی وبے اعتنائی کا سلوک اور ان سب کو دیکھ کر انھیں رنج وغم کا احساس ہونا، بت عشوہ طراز سے زکوٰۃ حسن طلب کرنا اور بوس وکنار کی تمام کیفیات ومضامین ان کی غزلوں کی اساس ہیں۔ جن میں تصنع، تقلید، ہوس ناکی، بے حجابی، محدود ومخصوص الفاظ واستعارات اور بے روح تشبیہات وکنایات کے سوا اپنا کوئی احساس، اپنی کوئی فکر کی گرمی، اپنے جذبات، اپنے خیالات نہیں۔ سارا کا سارا سرمایہ رسمی انداز اور تقلیدی اسلوب کا غماز ہے۔

نمونۂ کلام

دہن زخم سے اک شور بپا ہوتا ہے　　ترا خنجر جو گلے مل کے جدا ہوتا ہے

وہ الگ بگڑے ہیں، تقدیر الگ بگڑی ہے
دل بھی اب روٹھ گیا دیکھئے کیا ہوتا ہے؟
سن کے سب حالِ دلِ زار وہ بولے احمدؔ
خود مجھی سے مرے ظلموں کا گلہ ہوتا ہے(۱)

کیا مزہ ہوتا کہ ہم بوسے پہ بوسہ لیتے
آپ دشنام پہ دشنام سناتے جاتے
وہ بھی دن ہوتا کہ پہلو میں بٹھا کر تم کو
حال دل باتوں ہی باتوں میں سناتے جاتے
یا خدا ہوتی کہیں وصل کی شب لطف آتا
روٹھتے جاتے وہ ہم ان کو مناتے جاتے
چھوڑ کے نزع میں احمدؔ کو چلے تم افسوس
اس کی مٹی کو ٹھکانے تو لگاتے جاتے (۲)

عنایت آپ دو بوسے کیے جائیں
زکوٰۃ حسن ہے اس کو دیئے جائیں
مئے گل رنگ غیروں میں اڑائیں واں
یہاں ہم خون دل اپنا پئے جائیں
ہمارے سامنے غیروں کو دو جام
بھلا یہ زہر ہم کب تک پئے جائیں
کوئی حد بھی ترے جور و ستم کی
کہاں تک ضبط اے ظالم کیے جائیں
وہ چاہیں جس قدر رنج و الم دیں
ہمیں کیا جو ملے احمدؔ لیے جائیں (۳)

حواشی:

(۱) پیام یار لکھنؤ ماہ فروری ۱۸۹۹ء ص ۷،

(۲) پیام یار اگست ۱۹۰۰ء ص ۱۷،

(۳) ایضاً ستمبر ۱۹۹۸ء

احمدؔ ۔ مولانا حافظ سید احمد کونروی

۱۸۹۲ء کے آس پاس ــــ ۱۹۵۹ء کے لگ بھگ

موضع کونرہ گھنی کے رہنے والے، انگریزی دور کے کامیاب مختار شیخ نبی احمد شاہ کے منجھلے صاحبزادے، حافظ عبدالعزیز چورنؔ کے بڑے بھائی، باپ کی طرح زہد وتقویٰ سے آراستہ، ذکر واذکار سے کافی شغف رکھتے تھے اس شغف میں مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی صحبت ومعیت کا بھی خاصا دخل رہا ہوگا کیونکہ ان کے اہم ترین اصول تبلیغ میں سے یہ تھا کہ مبلغین ذکر کا اہتمام رکھیں اور بالخصوص تبلیغی اوقات میں ذکر الٰہی کی کثرت کریں۔(۱)

صوم وصلوٰۃ کے پابند، اور شریعت مطہرہ پر کاربند تھے۔ اپنے والد ماجد سے اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم پائی۔ موضع چکیا، مبارک پور کے حافظ محمد مصطفیٰ سے حفظ کیا۔ پھر عربی تعلیم کے لیے مدرسہ عالیہ مظاہر علوم سہارنپور چلے گئے وہاں مولانا محمد الیاس کاندھلوی بانی تبلیغی جماعت سے عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ کی تکمیل کر کے سند فراغ حاصل کی۔ آپ نے اپنے استاذ گرامی کے اخلاص دینی، ایثار نفسی، دنیا سے بے تعلقی اور اصلاحی وتبلیغی انہماک کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کے اثرات و ثمرات کا ذائقہ چکھا تھا۔ دیہات کے ناواقف مسلمانوں اور شہر کے بے عمل اور صوم صلوٰۃ سے بیگانہ افراد قوم کے درمیان اس تحریک کی افادیت واہمیت اور وقت وحالات کے تقاضوں کے پس منظر میں اصلاح وتبلیغ کی ضرورت سے آپ اچھی طرح واقف ہو چکے تھے اس لیے مولانا محمد الیاس صاحب کی معیت وقیادت میں میوات کے علاقے میں تبلیغ وتزکیۂ نفس کے کام میں لگ گئے۔ اس وقت خطۂ میوات خصوصیت کے ساتھ تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں سے متمتع ہو رہا تھا۔(۲) اسی دوران کسی عامل سے عمل تسخیر اجنہ کی سند بھی حاصل کی اس کے بعد دہلی چلے گئے۔ اور طب ونباضی اور نسخہ نویسی کا علم حاصل کرنے لگے۔ تکمیل طب کے بعد جہاں رہے ایک کامیاب طبیب وعالم تسلیم کیے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے حافظ سید احمد کو اخلاقی محاسن سے آراستہ کر کے خدمت خلق کے لیے ان کے دل کو حوصلہ مند بنا دیا تھا۔ مریضوں کو عموماً بغیر کسی معاوضے کے دوائیں دیا کرتے تھے۔ آسیب زدہ افراد کو تعویذ، گنڈے کشادہ دلی کے ساتھ دیتے تھے اور اس کی کوئی اجرت طلب نہیں کرتے تھے۔ یہ سب نیکیاں کر کے وہ اپنے رب سے اجر کے امیدوار تھے اس لیے حرص وطمع کے داغ سے ہمیشہ ان کا دامنِ دل پاک رہا۔ ان کا فیض ہندو مسلم سب پر یکساں تھا۔ کسی کے ساتھ کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔

سید احمد عالم دین اور حافظ قرآن ہونے کے ساتھ شعر وادب کا پاکیزہ مذاق بھی رکھتے تھے۔ نکتہ سنجی ونکتہ رسی سے آپ کو وافر حصہ عطا ہوا تھا۔ مصرعوں پر برجستہ گرہ لگاتے تھے مگر ان کا کلام بالکل نایاب ہے۔ ان کی ایک مزاحیہ تضمین لوگوں کو اب تک یاد ہے۔ مصرع تھا ''زندگی موت ہے حیات نہیں''، اس پر انھوں نے گرہ لگائی ''جب میسر ہی دال بھات نہیں''۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو چار اولاد نرینہ کی نعمت سے نوازا تھا (۱) خدا بخش (۲) حکیم زین

العابدین، یہ شاعر بھی تھے اور چرکین تخلص کرتے تھے (۳) شمس العارفین، انھیں کی شادی کے موقع پر عبدالحلیم بن فضل الکریم نے فارسی میں ایک عمدہ قطعہ کہا تھا۔ (۴) عین الزاہدین۔

حواشی:

(۱) فضائل ذکر عکسی۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی ص ۲

(۲) فضائل ذکر عکسی۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی ص ۲

احمد- مولانا علی احمد کوئر یا پاری

۱۳۱۳ھ ـــــ ۲۸/ذوالحجہ ۱۳۷۹ھ/ ۱۳/جون ۱۹۶۱ء

مولانا علی احمد کا تاریخی نام سراج الحق ان کے والد مولانا محمد رضا نے رکھا تھا جس سے ۱۳۱۳ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق فاروقیان کوئر یا پار کے علمی خانوادے سے ہے۔ اپنے وقت کے بڑے جلیل القدر عالم دین اور صاحب استعداد ادیب وشاعر اور نہایت کامیاب مدرس تھے۔ ان کی تدریس کا شہرہ دور دور تک تھا۔ ان سے ہندوستان کے متعدد عربی مدارس نے اکتساب فیض کیا۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ علی احمد بن محمد رضا بن ظہور احمد بن محمد عاشق علی بن امام الدین بن محمد قائم بن تاج الدین بن علاء الدین بن سراج الدین بن امیر الدین بن عبدالرحمٰن خاں بن محمد اعظم خاں بن جمال الدین بن نظام الدین بن بایزید بن حبیب اللہ بن خلیل اللہ بن شیخ محمد بن عبدالرحمٰن بن برہان الدین بن خواجہ شمس الدین بن امیر حسن بن حضرت عبداللہ بن امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

ان کے آباء واجداد دس گیارہ پشت سے کوئر یا پار میں بودو باش رکھتے ہیں۔ ان کے مورث اعلیٰ شیخ محمد اعظم خاں ہیں جو پرگنہ کوڑیا (کوئر یا پار) میں کسی معمولی عہدے پر مامور تھے۔ ان کے چار بیٹے حبیب اللہ خاں، اسماعیل خاں، دریا خاں، عبدالرحمٰن خاں تھے۔ آپ نے اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا ابوالحسن مئوی کی خدمت میں عربی متوسطات تک پڑھی اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں جا کر مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد

عثمانی، مولانا غلام رسول خاں ہزاروی وغیرہ سے جملہ مروجہ علوم وفنون دینیہ کی تکمیل کر کے ۱۳۳۵ھ میں سند فراغ حاصل کی۔ اس کے بعد تھانہ بھون جا کر مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں تزکیۂ نفس کے لئے روحانی تربیت حاصل کی۔ یہاں ایک سال تک مقیم رہ کر ذکر واشغال کے ساتھ مولانا تھانوی کے مواعظ حسنہ کو بھی قلم بند کرنے کی سعادت پائی۔

اپنے مرشد کی اجازت سے احیاء العلوم مبارک پور میں تدریسی خدمات انجام دیں یہیں مولانا حکیم الٰہی بخش مبارک پوری سے علم طبابت میں کمال پیدا کیا۔ مولانا عبدالغفار گھوسوی کے اصرار پر ناصر العلوم گھوسی کی تدریس منظور کر لی ۱۳۴۹ھ تک یہاں رہ کر ناصر العلوم کو بام عروج پر پہنچایا۔ پھر مطلع العلوم بنارس میں شیخ الحدیث بنا دیئے گئے۔ ۷؍شوال ۱۳۵۱ھ میں اس سے علیٰحدہ ہو کر اعظم گڑھ میں حکمت شروع کی۔ مگر غیبی اشارہ پا کر پھر دینی تعلیم وتعلم کا سلسلہ شروع کیا اور مدرسہ ہاشمیہ بمبئی میں مدرسی کرنے لگے۔ معیار کی پستی اور طلبہ کی کمی کے سبب ڈابھیل (گجرات) کے جامعہ اسلامیہ کے نامور اساتذہ کے رفیق درس وتدریس ہوئے۔ ۱۶؍ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ کو مدرسہ بیت العلوم سرائمیر میں آئے اور چار برس تک مدرس رہے۔ دوبارہ ناصر العلوم گھوسی میں دو برس تک مصروف تدریس رہے۔ یہاں سے جامعہ اسلامیہ گورکھپور میں منتقل ہو گئے۔ پھر مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں پڑھانے لگے مگر جماعت اسلامی کے غلبہ کی وجہ سے یہاں بھی نہ رہ سکے اور انوار العلوم مئو آئمہ ضلع الہٰ آباد گئے۔ چند سال کے بعد دوبارہ مدرسۃ الاصلاح کی خدمت قبول کر کے وفات تک اسی سے وابستہ رہے۔

آپ کے اندر تصنیف وتالیف کا بھی ذوق تھا۔ آپ کی کتابوں کے نام یہ ہیں:

شرح کتاب الایمان للصحیح المسلم (قلمی) قانون وراثت، رسالۃ التوسل (قلمی) انھوں نے فاروقیان کوئریا پار کا شجرۂ نسب جس کو مولوی سبحان اللہ فاروقی نے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا تھا جلد بندی کے وعدے پر لا کر اس میں کچھ ترمیم واضافہ کیا مگر اس وقت اس کا بھی سراغ نہیں ملتا۔ مولانا کو شعر وشاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ ایک قلمی بیاض سے مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی نے تذکرۂ علمائے اعظم گڑھ میں ان کے چند اشعار نقل کئے ہیں وہیں سے لے کر یہاں بھی درج کئے جا رہے ہیں۔

جو قطرہ مل گیا دریا سے پھر دریا نہ ہوجائے
جو دریا جوش سے ابلا کہیں قطرہ نہ ہوجائے

ہمارا دل سدا زندہ رہے عشق الٰہی سے
پڑا ہے ساتھ زندوں کا کہیں مردہ نہ ہوجائے

امید وصل زیست میں جب ہوچکی فنا
جینا عبث ہے عاشق بیزار کے لئے

مچھلی سے پوچھئے لب دریا سے ہوکے دور
کیسی تڑپ ہے چشمۂ انبار کے لئے

مرحبا صل علیٰ کیا ہے شہانہ سہرا
ہم عزیزان وطن گائیں سہانا سہرا

قد رعنا کے محاسن کی حفاظت کے لئے
بن گیا شکل قبا اور دوشالا سہرا

گرمیِ رخ سے ہے نکلا جو پسینہ رخ پر
رنگ وبو چڑھ کے ہوا اور دوبالا سہرا

احمدؔ-مولوی احمداللہ املوی

تقریباً ۱۲۹۲ھ ـــــ ۱۹؍فروری ۱۹۶۸ء/ ۱۳۸۸ھ

مولوی احمد اللہ بن محمد اسماعیل بن عبداللہ بن حسام الدین املوی مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور میں مدرس تھے۔ ابتدائی فارسی اپنے چچا مولوی سلیم اللہ سے پڑھی پھر عبدالحق دہلوی سے تعلیم حاصل کی جو موضع املو کے رہنے والے تھے لیکن دہلوی کی نسبت سے مشہور تھے اور مولانا نذیر حسین دہلوی کے تلمیذ رشید تھے۔ اکثر کتابیں مولانا شاہ محمد سریانوی سے مدرسہ منبع العلوم خیرآباد میں پڑھی تھیں۔ بڑے نیک متواضع اور سیدھے سادے بزرگ تھے۔ نصاب تعلیم کی تکمیل نہیں کر سکے تھے۔ نہایت خوش خط تھے۔ کئی درسی کتابوں کو نقل کر کے پڑھتے پڑھاتے تھے۔ شعر وشاعری کا بھی نہایت ستھرا ذوق تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہنے کی صلاحیت تھی۔ فارسی کے نہایت اچھے عالم تھے املو کے تمام ہی اساتذہ کے استاد تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً سو برس کی تھی۔ مولانا جن کتابوں کو پڑھاتے تھے ان کے حاشیے میں کہیں کہیں ان کے قلم سے انھیں کے اشعار بھی درج کئے ہوئے ملتے ہیں۔ جو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں۔ انھوں نے ایہام گوئی کے تتبع میں یا یوں ہی تفنن طبع اور رنگ محفل قائم رکھنے کے لیے کچھ ایسے اشعار بھی کہے ہیں جو ذومعنی ہیں۔ ان کے مستعمل لفظوں کا ایک معنی مراد لیا جائے تو مضمون مبتذل اور فحش ہوجاتا

ہے اور دوسرا معنی لیا جائے تو پیشہ وروں کے کمال ہنر پر اظہار خیال محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح کے اشعار کہہ کے احمد نے زبان پر اپنی زبردست قدرت اور خیال کی مناسبت سے الفاظ کے استعمال میں پختہ مشقی وبلوغت فکری کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

نمونۂ کلام

دختر درزی کا سینا دیکھ کر دل میں آتا ہے کہ مل مل دوں اسے
کجڑن دکاں پہ بیٹھی پوشاک سبز پہنے سویا جو پاس ہوتا جو مانگتی سو دیتا
نداف کی لڑکی جو ہو دوکان کے اوپر گالوں کو صاف کر کے کرے بھاؤ روئی کا

احمدؔ - مولانا مفتی محمد احمد جہانگیر خاں

۱۰؍محرم ۱۳۵۳ء ـــــ ۱۳؍ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ ۱۸؍اگست ۱۹۹۷ء

نام نامی محمد اور عرف جہانگیر تھا۔ فتح پور تال نرجا وطن مالوف۔ ان کے والد مرحوم فصاحت حسین خاں مرحوم، عارف کامل، قطب وقت، حضرت مولا سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ جن کی بزرگانہ دعائیں اس خانوادے کو حاصل تھیں۔ مولانا حافظ علیم اللہ فتح پوری (۲۰؍مارچ ۱۸۵۷ء۔ ۲۵؍دسمبر ۱۹۶۲ء) حافظ ریاض الدین اور مولانا خلیل احمد کچھوچھوی آپ کے اولین اساتذہ میں ہیں۔ جین پور ضلع اعظم گڑھ کے مدرسہ سے تعلیم کے بعد بریلی گئے وہاں دارالعلوم مظہر اسلام میں حضور مفتیٔ اعظم ہند اور علامہ مفتی سید افضل حسین سے اکتساب فیض کیا پھر مبارک پور مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم آئے یہاں حضرت مولانا غلام جیلانی گھوسوی، حضرت مولانا عبدالمصطفیٰ اعظمی، حضرت مولانا سید محمد سلیمان بھاگل پوری اور حضرت مولانا حافظ عبدالعزیز مرادآبادی شیخ الحدیث اشرفیہ کی خدمت میں رہ کر صاحب لیاقت ہوئے۔ ان کی فراغت ۱۳۸۳ھ میں دارالعلوم شاہ عالم احمد آباد (گجرات) سے ہوئی۔ ۱۳۶۴ھ میں حضور مفتیٔ اعظم ہند سے بیعت ہوئے۔

آپ دور طالب علمی ہی سے فتویٰ نویسی کے مبارک کام میں لگ گئے تھے۔ فراغت کے

بعد انوار العلوم جین پور میں مسند درس سنبھالی پھر ۱۳۷۵ھ میں دارالعلوم منظر اسلام بریلی میں نائب مفتی و نائب صدر مدرس ہوئے۔ اس کے علاوہ دارالعلوم شاہ عالم گجرات، اودے پور راجستھان، مدرسہ تدریس الاسلام ضلع بستی، دارالعلوم منظر اسلام بریلی اور بمبئ میں تدریس وافتاء سے متعلق رہے۔ تلامذہ کی کثیر تعداد نے آپ سے اکتساب فرمایا اور صاحب لیاقت ہوئے۔

آپ ایک کامیاب مناظر و خطیب اور شاعر و ادیب کی حیثیت سے بھی جماعت اہل سنت میں معروف تھے۔ آپ کی کامیاب بحث و جرح سے فریق مخالف پر سکتہ کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ آپ کی تصانیف عوامی حلقوں میں نہ آنے کی وجہ سے مشہور نہیں ہوئیں۔

علمائے اہل سنت عموماً مذہبی شاعری اور نعت و منقبت سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ نعت نگاری کی دنیا میں ان کی خدمات سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔ مولانا بھی شاعر تھے اور احمد تخلص کرتے تھے۔ ان کی فکر سخن کا محور نعت و منقبت کی اصناف تھیں۔ ان کی نعتیہ شاعری میں مخالفین و معاندین مسلک پر گہری چوٹ کی گئی ہے شاید یہ ان کی مناظرانہ دلچسپیوں کا اثر ہو۔ کیوں کہ یہ واکانیر کے مناظرہ میں مناظر کی حیثیت سے کامیاب ہوئے تھے اور اس مناظرہ کی وجہ سے بڑی شہرت پائی تھی۔

اگرچہ ان کی شاعری میں زبان و بیان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں ملتی ہے، جیسے اجتماع ردیفین وغیرہ کی مثالیں ان کے اشعار میں موجود ہیں۔ فارسی و عربی الفاظ کے حروف علت کا سقوط بھی ہے۔ لیکن ایک عاشق صادق کی کیفیات دل اور واردات و محسوسات کی گرمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار اور حالات علمائے فتح پور سے لئے گئے ہیں۔

نمونۂ کلام

یا رسول اللہ دل ناشاد ہے   آپ سے فریاد ہے فریاد ہے
نفس نے برباد کر ڈالا مجھے   آہ کتنا ظالم و جلاد ہے
ہائے کیسے لوگ ظالم ہوگئے   ان کی تو بے داد گویا داد ہے
آج کا صوفی ہے بندہ نفس کا   گویا وہ فرعون ہے، شداد ہے

کہتا ہے روزے نمازیں چیز کیا	وہ تو پہنچا سیدھے خلدآباد ہے
صلح کلی مولویوں کو کیا کہوں	ان کا مذہب دین سے آزاد ہے
یا رسول اللہ دہائی آپ کی	ساری دنیا طالب امداد ہے
موت آئے آپ کے قدموں تلے	سب کہیں احمدؔ کا دل بھی شاد ہے

احمد/ عاصم - مولوی سید احمد حسن محمد آبادی

- ۲۰۱۳ء

دورِ قدیم سے محمد آباد گوہنہ شرفائے انجاب کی بستی اور شعروادب کا گہوارہ ہے۔ اس سرزمین نے بڑے بڑے اساطین علم، رجال عصر، مدبر قوم، مقرر ومصنف اور معلم ومدرس پیدا کئے حکومت کے انتظامی امور میں عمل دخل رکھنے والے حکام ومنصف اور مجسٹریٹ اسی کی آغوشِ شفقت میں پروان چڑھے اور ملک وقوم کی خدمت کے لائق ہوئے۔ شعروادب کی تمام شاخوں کو سرسبز کرنے والے شاعروادیب، نقادوصحافی، افسانہ نگاروانشائیہ نویس اسی آسمان دانش وفرہنگ کی جگمگاتی کہکشاں تھے اور آج بھی یہ سلسلۂ رنگ ونور جاری ہے۔ مجتہدالعصر مولانا احمد حسن اسی محمد آباد گوہنہ کے سپوت اور جامعہ جوادیہ بنارس کے فخر الافاضل تھے۔ انھوں نے مولانا ظفرالحسن عاقلؔ نظام آبادی سے زبردست کسبِ فیض کیا تھا۔ عربی وفارسی اور علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد جامعہ جوادیہ بنارس میں مدرس ہوئے۔ بعد میں ایمانیہ عربی کالج مقیم گنج، بنارس کے پرنسپل کے عہدے پر فائز کئے گئے۔ بڑی علمی صلاحیتوں اور فنی خوبیوں کے مالک تھے اسی کے ساتھ انسانی اخلاق کا بہترین نمونہ بھی تھے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف محاذ کو اپنی تحریکی روح سے گرم کر رکھا تھا۔ بنارس میں معتقدین کی ایک بڑی فوج تیار کر رکھی تھی۔ ان کی شاعری کا محور فضائل ومناقب اہل بیت اور محامد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ انھوں نے ادبی وفنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام فہم واسلوب میں اشعار موزوں کیے اور کامیاب رہے۔ شاعری ان کی فطرت میں شامل تھی۔ ان کی شاعری میں ان کی نفاست طبع کا پورا پورا حصہ ہے۔ وہ شرفائے انجاب کی زبان کی نمائندگی کرتے

تھے۔کلام میں بے ساختگی اور بیان میں برجستگی ہے۔خیالات میں بلندی اور فکر میں شہباز کے پرِ پرواز کی قوت پنہاں تھی یہ ظریف وخوش اندیشہ وشگفتہ دماغ شاعر تھے۔آداب سخن سے واقفیت رکھتے تھے اوران کی پابندی بھی کرتے تھے۔انھوں نے روایت کی توسیع کر کے مذہبی شاعری میں اچھے نمونے پیش کیے۔ان کی غزلیں بھی بڑی تہ دار اور پر کشش ہوتی تھیں۔زندگی سے ان کا بہت گہرا رشتہ تھا۔تجربات ومشاہدات کا بھی بڑا وقیع سرمایہ اور وافر ذخیرہ تھا۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ان سب کی وجہ سے ان کے فرمودات کی تاثیر بڑھ جاتی تھی۔آسان زبان میں معنی خیز اور پہلودار باتیں پیش کرنے کی مہارت حاصل تھی۔پہلے احمد تخلص سے ان کا کلام شائع ہوتا تھا پھر تخلص کو تبدیل کر کے عاصم ہو گئے۔"دل بھی کوئی چیز ہے" ان کا نمونۂ غزلیات ۲۰۰۲ء میں زیورطبع سے آراستہ ہو چکا ہے جس کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ہماری علمی روایت کا تمدنی اثاثہ ان کی شعر گوئی کی اساس ہے۔انھوں نے ماضی حال مستقبل تینوں کو اپنے فکری دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔آئینۂ ایام میں زمانے کی ادائیں بھی دیکھی ہیں اور انھوں نے اپنے عکس کو بھی دکھایا ہے۔

نمونۂ کلام

خامشی جس کی زباں بن کے فسانہ کہہ دے ۔۔۔ کوئی اصغر کے سوا ایسا سخنور نہ ہوا
رزم عباس میں خیبر کا مزہ آتا ہے ۔۔۔ بس کمی یہ تھی کہ جبریل کا شہپر نہ ہوا
قبر اصغر پہ چھڑکنے کے لیے بھی احمدؔ ۔۔۔ شاہ کو پانی کا اک قطرہ میسر نہ ہوا(۱)

ایسا کوئی گلستاں ٹوٹا نہیں خزاں سے ۔۔۔ جیسا نبی کا گلشن اجڑا ہے دو گھڑی میں
عابد یہ رو کے بولے، دیکھی جو شہ کی میت ۔۔۔ لاشِ پدر ہے عریاں بیٹے کی زندگی میں
عباس فوج کیں سے رن میں گرج کے بولے ۔۔۔ آئے مقابلے پر دم ہو اگر کسی میں
بے شیر کو لٹا کر تربت میں، شہ پکارے ۔۔۔ تم نے بھی ساتھ چھوڑا، اے لال بیکسی کا(۲)

فرشتوں سے بھی منوایا گیا ہوں ۔۔۔ بڑے اکرام سے لایا گیا ہوں
اندھیروں کو اجالوں ہی سے کد ہے ۔۔۔ میں سورج تھا تو گہنایا گیا ہوں

تاخیر یوں ہوئی کہ ہمیں اپنے پاؤں سے
کانٹے نکالنے میں بڑا وقت لگ گیا

رکھا ہے پاؤں آج تو ہم نے زمین پر
کیا کہئے پالنے میں بڑا وقت لگ گیا

موتی جو آتھ آئے تو اب جوہری بنیں
دریا کھنگالنے میں بڑا وقت لگ گیا

فصیل دل پہ جلادو محبتوں کے چراغ
یہ آسمان ہے ایسی ہی کہکشاں کے لئے

اس آسمان کے نیچے کہاں غموں کو فرار
تڑپ کے کیا کریں پھر عمر جاوداں کے لئے

پہونچ کے چاند پہ بستی بسانے والے ہیں
کہاں پہ آگئے نکلے تھے ہم کہاں کے لئے

ہجر کی رات جسے اس کے کرم نے بخشی
پھر کبھی اس کے مقدر میں سویرا نہ ہوا

مٹ گئی دولتِ دل بک گئے قرطاس وقلم
میرے ہاتھوں میں مگر گھی کا نوالہ تو ہوا

کس کی خوشبو بس گئی ہے یہ انفاس میں
ذہن جھولے جھولتا ہے، جنت احساس میں

حواشی:

(۱) ماہنامہ الجواد بنارس۔محرم نمبر مئی، جون ۱۹۶۳ء ص ۲۳

(۲) ایضاً۔محرم نمبر مئی، جون ۱۹۶۵ء ص ۵۹

احمدؔ- سید احمد حسین

فروری ۱۹۲۳ء ـــــ ۷ ستمبر ۱۹۹۳ء/۱۹ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ (بدھ)

سید محمد عرب بیچو کے بیٹے تھے۔ان کا وطن موضع سیہی پوسٹ راوت مئو ضلع اعظم گڑھ تھا مگر زندگی کا بیشتر حصہ عروس البلاد بمبئی میں گزارا۔ وہاں بسلسلۂ ملازمت قیام تھا۔میدان شاعری میں ریاض جرولی کو استاذ سخن منتخب کیا تھا۔سامنے کی بات سیدھے سادے انداز میں بیان کردیا کرتے تھے۔غزلیں اور نعت ومنقبت سے دل چسپی تھی۔ان کے کلام بڑی تلاش وجستجو کے بعد ملے ہیں۔

نعت

جو سمجھا نہیں ابتدائے محمد
وہ سمجھے گا کیا انتہائے محمد

کہا پیار سے ان کو یٰسین و طٰہٰ
پسند آئی ایسی ادائے محمد

مجھے فکر کیا مغفرت کی ہو احمدؔ
شفاعت کی خاطر جب آئے محمد

نورِ محمدی میرے سینے میں ڈال دو ہیرا یہ ایک اس کو نگینے میں ڈال دو
طیبہ میں یعنی عرش کے زینے میں ڈال دو ایسی نگاہ حج کے مہینے میں ڈال دو
قیدی بنا کے مجھ کو مدینے میں ڈال دو

جب تک کہ تم رہے میرے گھر چاندنی رہی وابستہ ہر خوشی سے میری زندگی رہی
تم پاس تھے تو شام بھی لگتی تھی شامِ نو تم دور کیا گئے کہ سحر شام سی رہی

اخترؔ- اکبر حسین ماہلی

ماہل میں ابو محمد عیشؔ کے ہم عصروں میں گزرے ہیں جو صرف قصیدہ کہتے تھے اور برابر والد صاحب، ابو محمد عیش اور وہ ماہل، اعظم گڑھ، سرائمیر، دیوگام، سلطان پور وغیرہ کی سالانہ محافل میں شریک ہوتے رہے۔ جس میں تقریباً زیادہ تر اقبال سہیل بھی شرکت کرتے تھے۔(۱)

حواشی:

(۱) اولاد اصغر۔ مکتوب بنام راقم یکم جولائی ۱۹۸۱ء

اخترؔ- سید محمد اختر کرہانی

کرہاں کے سادات میں شمس الدین عرف میر شمسی (ف ۱۰۶۰ھ) سے نسبی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ میر شمسی اپنے زمانے کے اہل اللہ اور صوفیہ کے طبقے میں شہرت و ناموری کے مالک تھے۔ پہلے محمد آباد گوہنہ میں سکونت رکھتے تھے۔ ان کے نقل مکانی کے سلسلے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ اپنے بھائی کی کسی بات سے رنجیدہ ہو کر کرہاں میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی ان کی اولاد کرہاں میں پھلی پھولی اور بام عروج پر پہنچی ان کا مزار کرہاں میں آج بھی موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے زندگی میں سات پیادہ حج کیے تھے۔ اس علاقے میں ان کی کرامتوں کے دسیوں واقعات عوام وخواص کی زبانوں پر رہا کرتے ہیں۔

اختر زمیندار گھرانے کے فرد فرید تھے۔ یہ شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق بھی رکھتے تھے اور

شاعری میں اختر تخلص کرتے تھے۔ ان کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا اور آج بھی اس خاندان میں کئی شاعر اردو شاعری کے چراغ کی لو کو تیز کیے ہوئے ہیں۔ خاندان میں نادر کتابوں پر مشتمل ایک کتب خانہ بھی تھا جس میں قلمی کتابیں بھی تھیں۔ اس دور کے شرفا عام طور سے شعر وسخن سے شغف رکھتے تھے اس لیے کہ دیہاتوں اور دور افتادہ بستیوں میں جہاں شرفا کی عموماً چھاؤنیاں ہوا کرتی تھیں، تفریح کے دوسرے مشاغل مفقود تھے۔ لے دے کے شعروشاعری ہی دل کو بہلانے کا ذریعہ تھی۔ تعطیلات اور دوسرے مواقع پر شعری نشستوں اور مقامی مشاعروں کا عام رواج تھا۔ جن میں آس پاس کے گانو اور شہروں کے عزیز دار و رشتہ دار جمع ہوجایا کرتے تھے ان میں کچھ مستقلاً شاعر ہوتے، کچھ تفنن طبع کے طور پر شاعری سے دل بہلایا کرتے تھے۔

ان کے خاندان میں موسیقی سے دل چسپی لینے کا بھی عام رجحان تھا۔ مذہبی ماحول کی وجہ سے سوزخوانی، نوحہ وسلام اور مرثیہ پڑھنے کا رواج تھا۔ زمینداری نے رئیسانہ ٹھاٹ باٹ بھی پیدا کر رکھا تھا۔ اس لیے تمام مشاغل بے فکری سے جاری تھے۔

ان کی شادی بارہ ضلع غازی پور میں ایک ایسے خاندان کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی جن کا سلسلۂ نسب سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ (۱۱؍رجب ۴۰۵ھ ؍ ۱۵؍فروری ۱۰۱۵ء۔ ۴۲۴ھ ؍ ۱۰؍جولائی ۱۰۳۳ء) سے ملتا ہے۔ ان کی پانچ اولادیں ہوئیں۔ علی بخش غضنفر، اعظم حسین، حسام الدین حیدر، شمس الدین حیدر شمیم کرہانی، علی حیدر اور نرجس خاتون۔ ان کے دو بیٹے سید اعظم حسین اعظم کرہانی اور شمیم کرہانی بھی بہت اچھے شاعر ہوئے اور شعر و ادب اور صحافت کا سلسلہ ان کے پوتوں میں بھی جاری ہے شمیم کرہانی کے بیٹے سید حسین اختر مراد کرہانی، سید عابد اختر کرہانی، سید عابد اختر عابد کرہانی، سید باقر اختر سلمان کرہانی بھی شاعر ہیں اور اپنے دور کی عصری حسیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سید اعظم حسین اعظم کرہانی کی بیٹی عترت زہرا عترت، سطوت زہرا سطوت افسانہ نگار اور شاعرہ ہیں اور بیٹے اعظم عباس شکیل کرہانی منفرد لب ولہجہ کے شاعر اور کئی کتابوں کے مرتب و مقدمہ نگار ہیں۔

اخترؔ - مولانا حبیب الرحمن اعظمی

۱۹۰۱ء/۱۳۱۹ھ ــــ ۱۹۹۲ء

مولد و منشا مئو ناتھ بھنجن۔ کلام پاک اور اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ اس کے بعد اپنے خسر مولوی عبدالرحمن ساکن اورنگ آباد مئو کے پاس فارسی کی تعلیم پائی۔ عربی مولوی عبدالعزیز بلاقی پورہ مئو کے پاس شروع کی اور اسی کے ساتھ تجوید کا ایک منظوم رسالہ مولانا عبدالحق پیلی بھیت سے پڑھا اور زبانی یاد کر کے سنایا پھر نحو وصرف کی اکثر کتابیں مولانا ابوالحسن مئوی سے پڑھیں۔ ابتدائی ادب کی دو ایک کتابوں کا کچھ حصہ مولانا محمد صابر بلاقی پورہ مئو کی خدمت میں رہ کر پڑھا۔ ادب، معانی، منطق میں ملاحسن تک، فقہ اور حدیث میں مشکوٰۃ وترمذی نصف اول کی تعلیم حضرت مولانا عبدالغفار (۲۰رصفر ۱۲۸۳ھ - ۱۳۴۱ھ) تلمیذ رشید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۲۴۴ھ - ۱۳۲۳ھ) کی خدمت میں جب کہ مولانا گنگوہی کا قیام بسلسلۂ تدریس گورکھپور اور بنارس میں تھا حاصل کی۔ اور انھیں کے زیر درس رہ کر بنارس سے ۱۹۱۸ء میں ملا الہ آباد کا اور ۱۹۱۹ء میں فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے مگر درمیان سال میں بیمار ہوکر چلے آئے ۱۳۳۸ھ میں دوبارہ دیوبند جاکر شریک دورہ ہوئے اور ترمذی کا کافی حصہ محدث عصر انور شاہ کشمیری (۱۲۹۲ھ - ۱۳۵۲ھ) سے پڑھا۔ مولانا کریم بخش سنبھلی سے مئو میں دورہ کی کتابیں پوری کیں۔ انھیں سے معقولات کی باقی کتابیں بھی درساً درساً پڑھیں۔ ۱۳۳۹ھ سے دارالعلوم مئو میں درس دینا شروع کیا۔ ۱۳۴۳ھ میں مظہرالعلوم بنارس کے مدرس اول بنائے گئے۔ ۱۳۴۹ھ میں مفتاح العلوم میں شیخ الحدیث اور صدرالمدرسین مقرر ہوئے۔ ۱۳۶۹ھ تک اس خدمت کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ علالت کی وجہ سے عہدۂ تدریس سے سبکدوش ہوئے۔ مولانا جمعیۃ العلماء کی سرگرمیوں میں زبردست حصہ لیتے تھے اور سیاست کے رخ کو متعین کرتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں اترپردیش کے ممبر اسمبلی منتخب ہوکر پانچ برس تک عوامی وسیاسی اور سماجی وسرکاری سرگرمیوں میں شریک رہے۔ ان کی دینی وعلمی اور تصنیفی وتالیفی خدمات کا

افق بڑا تابناک ہے۔انھوں نے علم ومعارف کے کشت زار میں اپنی فکر و ذہانت کے جو گل رنگیں کھلائے اس نے تاریخ وتمدن ہند کے کئی پہلوؤں کو شفق رنگ اور گلنار بنا دیا۔

مولانا حبیب الرحمن اعظمی ہندوستان کے علمائے فحول میں فقید النظیر حیثیت رکھتے ہیں۔ بلاد اسلامیہ کے اکابر علماء بھی آپ کے علم وفضل اور تحقیق وتصنیف کے اعتراف وقدردانی میں پورے انشراح قلب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔مختلف یونیورسٹیوں کے ممتحن کی ذمہ داریاں بھی آپ سے منسلک رہیں۔آپ کے ارشد تلامذہ میں مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد حسین بہاری، مولانا عبدالستار شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا عبدالجبار شیخ الحدیث مظہرالعلوم بنارس، مولانا محفوظ الرحمن نامیؔ، مولانا ظفیر الدین مفتاحی وغیرہ بکثرت علماء شامل ہیں۔

مولانا کا قلم علم ومعارف کی مختلف شاخوں کی قلم بندی کرتا رہا۔انھوں نے اپنے صریر خامہ سے خروش ناآشنا میدانوں میں محشر خیال برپا کر دیا اور علم وتحقیق کے مسافروں کو اپنی بانگ درا سے جادہ پیما کرنے میں بے پناہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔مولانا کی عربی کتابیں یہ ہیں۔ (۱) مسند الحمیدی دو جلدیں (۲) کتاب الزہد والرقائق الایام عبداللہ بن المبارک (۳) سنن سعید بن منصور دو جلدیں (۴) انتقاد الترغیب والترتیب (۵) کتاب التوسل للمحدث محمد طاہر الفتنی (۶) المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ چار جلدیں (۷) المصنف لعبد الرزاق گیارہ جلدیں (۸) کشف الاستار بزوائد المسند البزار (۹) کتاب الثقات لابن شاہین غیر مطبوعہ (۱۰) الہادی لرجال الطحاوی غیر مطبوعہ (۱۱) الاتحافات السنیہ بذکر محدث الحنفیہ غیر مطبوعہ۔

اردو کتابیں: (۱) نصرت الحدیث (۲) اعیان الحجاج دو جلدیں (۳) رکعات التراویح (۴) رکعات التراویح مذیل برد انوار المصابیح (۵) شارع حقیقی (۶) احکام النذر لاولیاء اللہ (۷) الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ (۸) الازہار المربوعہ فی رد الآثار المتبوعہ (۹) تحقیق اہل حدیث (۱۰) دفع المجادلہ عن آیات المباہلہ (۱۱) ارشاد الثقلین بجواب الاتحاد الفریقین (۱۲) التنقید السدید علی التفسیر الجدید (۱۳) ابطال عزاداری (۱۴) تعزیہ داری سنی نقطۂ نظر سے (۱۵) رہبر حجاج (۱۶) تحقیق الکلام غیر مطبوعہ۔ان کے علاوہ مولانا کے بہت سے مقالات ومکتوبات

بھی غیر مطبوعہ صورت میں ہیں۔

مولانا ادیب و محقق اور مفسر و محدث ہونے کے دوش بہ دوش شعر و شاعری سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے تھے۔ کبھی دوسرے علمی مشاغل کی طرح وہ اپنی شاعری کو زیادہ شاداب بنانے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے مگر جو کچھ کہا وہ ان کی قادرالکلامی اور شاعرانہ بصیرت کا اشاریہ بن گیا۔ ان کی فکر رنگیں نے اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں کو نوازا گو کہ ان زبانوں میں ان کے آثار سخن سب کے سب محفوظ نہیں رہ سکے مگر جو بھی لوگوں کی توجہ سے باقی رہ گئے ہیں ان سے مولانا کی شاعری کے اصلاحی و دینی اور اخلاقی و تاریخی پس منظر اور پیش منظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مولانا شاعری میں کبھی شوقؔ، کبھی اخترؔ اور کبھی حبیبؔ تخلص اختیار کرتے تھے۔ اردو کے دبستانی اساتذۂ فن نے جو اصول فن اور قواعد سخن تجویز کیے ہیں مولانا کے یہاں ان کی پابندی سے آزادی ملتی ہے۔ ان کا کلام اس اعتبار سے زبان و بیان کے کانٹے پر سبک ہے۔ مگر ایک ایسے عالم دین کا فکری سرمایہ ہے جو علمی و دینی تحقیقات میں سرکھپا رہا ہے اور فرصت ملنے پر منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے شاعری کر رہا ہے اس لیے یہ بھی لائق توجہ ہے۔

نمونۂ کلام

شکرانۂ مولائے نعم پہلے ضروری تھا — مقصود سفر ورنہ یہ بقعۂ نوری تھا
صد شکر کہ حاصل ہوا اب قرب حضوری — اب دل میں نہیں جو شکوۂ دوری تھا

وہ جہاں کا رمز وجود ہے وہ مدار کار نظام ہے — وہ خدا کی شانِ جمال کا بخدا کہ مظہر تام ہے
کرو یاد معرکہ بدر کا، پڑھو فتح مکہ کا واقعہ — وہ خدا کا قہر وجلال تھا یہ نبی کی رحمت عام ہے
سبھی انبیائے کرام کا ہے مقام سب سے بلند تر — وہ ہلال چرخ کمال تھے، مرا شاہ بدر تمام ہے
جو غذائے روح وسکون دل ہے انھیں کی پاک حدیث یہ — جو مریض دل کے لیے شفا یہ انھیں کا پاک کلام ہے
جو مجھے ملا وہ ملا انھیں کی نگاہ لطف و کرم سے ہے — قلم و زبان حبیبؔ کیا یہ انھیں کا فیض دوام ہے

ز آستانت با سر اشک غم بیادت می روم — با دل صد چاک و باصد یاس و حسرت می روم
گر توانستم نمی بودم ز پائے تو جدا — می روم لیکن بقصد و عزم مودت می روم

می روم سوئے وطن وز درد دل بے اختیار ۔۔۔ نالۂ دارم کہ میگوئی بہ غربت می روم
یا رسول اللہ جئنا اذ ظلمنا فلنجد ۔۔۔ ربنا با ہر دو وصف ختم آیت می روم
اُنْعِشَنْ اِیاہ یا مولی الحبیبؔ الاعظمی ۔۔۔ خستہ افتادہ نماید چوں بہ کویت می روم
اھلاً بمقد مک الھنی و مرحبا ۔۔۔ یا عالم الشھباء امام الشام
لم یجو علم الفقه والآثار شا ۔۔۔ می کجمعک بعد ذاک الشام

(شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی مئوتشریف آوری پر فی البدیہہ کہے گئے)

اقبال سہیل (۱۸۸۶ء۔۱۹۵۵ء) کی موج کوثر کو پڑھ کر اتنا محظوظ ہوئے کہ بے ساختہ یہ چند شعر موزوں ہوگئے جو اقبال سہیل ہی کی زمین میں موزوں تاثرات ہیں۔

اے اقبالؔ اے شاعر ملت، نازش قوم اور فخر جماعت
مدح نگارِ مرسلِ خاتم صلی اللہ علیہ وسلم
لکھی تو نے کتنے سچی کتنی بلند اور کتنی پیاری
نعت حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم
اس نے روحوں کو گرمایا، جوشِ عقیدت اس نے بڑھایا
سب کی زبانوں پر ہے پیہم صلی اللہ علیہ وسلم
تجھ کو مبارک مدح نگاری، تجھ پر سایۂ رحمت باری
تجھ سے راضی ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم
إِنَّکَ اِنْ تَقْرأَهُ عَلَيْهِ يَوْمُ الْمَحْشَرِ حِيْنَ تَرَاهُ
اَرْجُوْ مِنْهُ اَنْ يَّتَبَسَّمْ صلی اللہ علیہ وسلم(۱)

بیروت و کویت اور حلب میں نہ کشش تھی ۔۔۔ یہ جاذبہ تھا حب حدیث نبویؐ کا
صبا کی چھیڑ پہ جھلا کے بول اٹھا غنچہ ۔۔۔ یہ بار بار بری لت ہے گد گدانے کی
آب کیا چہرہ پہ ہے اس بت شعلہ رو کے ۔۔۔ معجزہ ہے کہ جہاں آگ وہاں پانی ہے(۲)

حواشی:

(۱) اقبال سہیل حیات اور شاعری۔منورانجم ۱۹۹۵ء ص ۲۹۰-۲۲۹۱

(۲) مئوناتھ بھنجن کا ادبی منظر نامہ۔ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی شمولہ ماہنامہ بزم سہارا مئی ۲۰۱۱ء ص ۱۰۔

اخترؔ - خواجہ حسین اختر اعظم گڑھی

اندازاً ۱۹۱۳ء — ۱۹۶۰ء اندازاً

اعظم گڑھ شہر کے رہنے والے تھے۔ نام خواجہ عبداللہ تھا مگر اپنی عرفیت خواجہ حسین اختر سے مشہور ہوئے۔ صدیقی النسل تھے(۱)۔ خواجہ عنایت اللہ محکمۂ پولس میں تھے ترقی کر کے سب انسپکٹر ہو گئے تھے مگر والد خواجہ حمایت اللہ کی وفات کی وجہ سے گھر آ کر زمینداری کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ آپ کے والد خواجہ عنایت اللہ میں بڑی آن بان تھی انھوں نے پوری دلجمعی سے زمینداری کی ذمہ داری اس کے تمام تر حقوق کے ساتھ نبھائی۔ آخری دور میں جب ضعیف العمری کی وجہ سے زمینداری کی نگہداشت اچھے طریقے سے نہیں کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے منجھلے صاحبزادے خواجہ حسین اختر کے ذریعہ انتظام زمینداری فرما دیا(۲)۔

خواجہ حسین اختر نے گھریلو تعلیم پائی تھی۔ رئیس گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور کارزمینداری آپ سے متعلق تھا۔ باغ و بہار اور مرنجان مرنج طبیعت کے مالک اور سیدھے سادھے بے ضرر انسان تھے۔ طبیعت احباب پسند اور جلوت آشنا ملی تھی۔ حلقۂ احباب بہت وسیع اور متنوع تھا، فطری شاعر تھے بارہ تیرہ سال کے سن میں شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد پورے خاندان کے ہمراہ پاکستان چلے گئے۔ لاولد تھے(۳)۔

اختر کا رجحان نظم نگاری کی طرف زیادہ تھا وہ غزلیں بھی کہتے تھے مگر کم کہتے تھے۔ کلام معیاری رسالوں میں شائع ہوا کرتا تھا۔ انھیں شعر سنانے کا بڑا چسکا تھا۔ تعلیم زیادہ نہیں تھی لیکن خاندانی آدمی تھے۔ کھاتے پیتے آداب زمانہ سے واقف، علم مجلس کے ماہر، وضع دار اور اچھے ذوق کے مالک تھے اس لیے اپنے گھر پر چند لوگوں کو بلا لیتے تھے اور گرمی محفل کا سامان فراہم کر دیتے تھے۔ بھوپال میں بھی زندگی کے کچھ ایام گزارے تھے۔'' پہلے حافظ یٰسین برقؔ سے اصلاح لیتے تھے الہ آباد وغیرہ کا کوئی امتحان بھی دیا تھا(۴)۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں انھوں نے سیماب اکبرآبادی (۱۸۸۰ء۔۱۹۵۱ء) کی شاگردی اختیار کی(۵)۔

اختر اپنی شاعری میں زندگی کی نامیاتی قدروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ اپنے گرد وپیش کی سیاسی اتھل پتھل اور معاشرتی زندگی سے متاثر ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان کے یہاں خارجی حقیقت جب شعر کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے یا شاعری کا جز بنتی ہے تو اس کی خارجیت میں تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔ ان کا اسلوب و آہنگ، لفظون کا انتخاب، اور تخلیقی رویہ، شاعرانہ شعور ان کی اندرونی کیفیت کے مدوجزر اور موج تہ نشیں کی ترجمانی کرنے لگتا ہے۔ انھوں نے شعر کی ظاہری ہیئت پر اپنے شاعرانہ تخیل، جذبات وتاثرات کا گہرا نقش چھوڑا ہے اور اس کے توسط سے شعر کا جادو جگانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں ہیئت اور معنی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی تاثراتی کیفیت کے دو رخ ہیں۔ ان کی جو نظمیں دستیاب ہوسکی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے غزل کی ہیئت، روایت، اور اپنے شعری تجربے میں ماضی کے رشتے اور بحور واوازن کے احترام کو باقی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی بعض نظموں پر غزل مسلسل کا دھوکا ہوتا ہے۔ اگر نظموں میں عصریت، سماجیت، اور سیاسی آگہی کی لے پر غزلیت، لہجے کی معصومیت، جذبے کی وارفتگی، سبک لفظوں کی شیرینی غالب آجاتی تو یقینا ان کی نظمیں غزل مسلسل ہی بن جاتیں۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی نظمیں غزل مسلسل کی توسیع ہیں۔

اختر کا کلام اپنے ملک اور اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، تاریخی، اخلاقی، اور ثقافتی حالات وکوائف کا منظوم حافظہ اور شعری یادداشت ہے جس سے ہمارے شعور واحساس میں ایک مسرت آگیں اہتراز پیدا ہوتا ہے اور بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ان کی فکری بنیادیں اس وقت کی مذہبی اور مابعدالطبعیاتی اقدار پر استوار ہیں انھوں نے جو کچھ کہا اس کو اپنی نفسیات، مزاج اور طبیعت کا رنگ وانداز دے دیا۔

نمونۂ کلام

وہ کیوں ننگ غلامی کو نہ منشائے فضا جانے　　جو دیواروں سے زنداں میں فقط سر پھوڑنا جانے
قفس ہی کے کسی گوشے میں جس نے آنکھ کھولی ہو　　وہ آزادی کے گہوارے کی قیمت کیا بھلا جانے
سمجھتا ہے جو اپنے خواب ہی کو عین بیداری　　تو پھر ترک جمود و کسل کو وہ کیوں روا جانے

خلاف باغباں وہ کوئی سازش کر نہیں سکتا جو اپنی زندگی کو بھی اسی کی اک عطا جانے (۶)
جو میرا طورِ دل حسن تجلی کا امیں ہوتا تو ذرہ ذرۂ کونین میرا خوشہ چیں ہوتا
زمین و آسماں کی دھجیاں اڑتی نظر آتیں اگر دست جنوں بیزار جیب و آستیں ہوتا (۷)

حواشی:

(۱) ماہنامہ شاعر آگرہ اسکول نمبر ۱۹۳۷ء: ص ۲۷۹
(۲) ماہنامہ شاعر آگرہ اسکول نمبر ۱۹۳۷ء: ص ۲۷۹
(۳) مجھے یہ باتیں اختر کے چچازاد بھائی خواجہ محمود اللہ نے ۱۰/ اگست ۱۹۸۰ء کو زبانی بتائیں۔
(۴) مولوی عبدالباری (ابوعلی اثری) اعظم گڑھی
(۵) ماہنامہ شاعر آگرہ اسکول نمبر ۱۹۳۷ء: ص ۲۷۹
(۶) لمحۂ فکریہ ماہنامہ شاعر آگرہ ستمبر ۱۹۴۶ء۔
(۷) احساس - ماہنامہ شاعر آگرہ اگست ۱۹۴۸ء ص ۳۰

اخترؔ - عبیداللہ مسلمی

یکم جون ۱۹۲۸ء ـــ ۲۵/ اپریل ۱۹۸۹ء/ ۱۸/ رمضان ۱۴۰۹ھ سہ شنبہ صبح دس بجے

اخترؔ مسلمی کا مولد و مسکن مسلم پٹی ضلع اعظم گڑھ تھا اسی وطنی نسبت کی وجہ سے تلفظ کی کچھ تبدیلی کر کے اخترؔ مسلمی لکھتے تھے۔ ان کے دادا رجب علی، پر دادا محمد سلیمان اور والد حافظ عطاء اللہ تھے۔ پہلے ان کی سکونت پھریہا پھر مسلم پٹی ہوئی۔ اخترؔ مسلمی نے ۶/ جولائی ۱۹۳۷ء کو حافظہ شروع کیا اس کے بعد مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں داخلہ لیا یہاں اردو، فارسی، عربی متوسطات تک پڑھی۔ دسمبر ۱۹۴۹ء میں مدرسہ امدادیہ بیساں متصل پھول پور اعظم گڑھ میں معلم ہو کر درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ ۱۷/ نومبر ۱۹۵۲ء کو ۲/ بجے شب میں ان کے والد حافظ عطاء اللہ کا مسلم پٹی میں انتقال ہو گیا۔ یہ یکم ستمبر ۱۹۵۷ء کو مدرسہ امدادیہ بیساں سے مستعفی ہو کر اسی تاریخ میں بسلسلۂ معاش پھول پور آ گئے۔ یکم جون ۱۹۶۸ء کو پھول پور سے سرائمیر منتقل ہو گئے اور گھڑی سازی کرنے لگے۔ یکم اکتوبر ۱۹۶۸ء کو اردو کے اچھے اور کہنہ مشق شاعر ماسٹر اشتیاق احمد راشد کی

قائم کردہ انورا کیڈمی کے حوالے سے ان کے رفیق کار بنے اور ماہنامہ ''کرنین'' سرائمیر کا اجرا کیا لیکن افسوس کہ یہ ماہنامہ وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے رجسٹریشن سے محروم رہ گیا اور اس کی تمام کاپیاں روک دی گئیں آج اس رسالہ کے نمونہ کی کاپی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اختر نے نومبر ۱۹۷۱ء سے سرائمیر میں مستقل سکونت اختیار کر کے گھڑی سازی اور مشق سخن کا سلسلہ جاری رکھا تو یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں جان پڑ گئی۔ شعروادب کا ماحول نہایت خوش گوار ہو گیا جس کے اثر سے بہت سے نئے شاعر ادبی افق پر جگمگاتے ستاروں کی طرح نمودار ہو گئے۔ ۲۱ رجنوری ۱۹۷۴ء کو ان کی والدۂ محترمہ اور ۱۷ ردسمبر ۱۹۷۶ء کو ان کی رفیقۂ زندگی نے داغ مفارقت دیا۔ ان پیہم حادثات نے ان پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کی شادی حافظ ظہیر الحسن سرائمیری کی صاحبزادی رابعہ خاتون سے ہوئی تھی۔ شاعری میں اقبال سہیل (۱۷ رجنوری ۱۸۸۶ء۔ ۷ رنومبر ۱۹۵۵ء) ان کے رہنما تھے۔

اختر کو اللہ نے حسن صورت کے ساتھ حسن صوتی اور لحن داؤدی سے نوازا تھا اس لیے جہاں بھی مشاعروں میں جاتے تھے اپنے سحر ترنم سے دلوں پر چھا جاتے تھے۔ بڑھاپے تک ان کی آواز کا جادو کام کرتا رہا۔ اختر مسلمی بڑے خلیق، بے ضرر، مخلص اور نرم خو انسان تھے۔ ان کی شاعری پر بھی ان کی انسانی خوبیوں اور اخلاق کریمانہ کے نقوش تابندہ ہیں۔ یہ زبان و بیان اور دبستان اعظم گڑھ کی اقدار کے حوالے سے بہت حساس تھے۔ انھوں نے اپنے کلام پر کبھی ابتذال اور سوقیانہ مضامین کا سایہ نہیں پڑنے دیا۔ انھوں نے ہمیشہ لفظ و معنی، جذبہ و خیال اور ذات و کائنات کے رشتوں کی مٹھاس اور گھلاوٹ سے اپنی شاعری کو دو آتشہ بنانے کی کوشش کی۔ اختر کے یہاں اچھی اور سچی شاعری کی بہت عمدہ مثال ملتی ہے۔ وہ ہمیشہ غزل کی آبرو کے نگہبان اور لہجے کی شائستگی کے ترجمان بنے اور کشت سخن کی آبیاری کرتے رہے۔ یہ پوری عمر مسائل حیات اور آلام روزگار سے نبرد آزما رہے مگر انھوں نے کسی موڑ پر ہمت نہیں ہاری انھوں نے ہر پڑاؤ پر اپنے تازہ دم اور تازہ کار ہونے کا احساس کرایا۔ ان کو کبھی کسی کا حاشیہ نشیں یا آستاں بوس بنتے نہیں دیکھا گیا انھوں نے ہمیشہ اپنی خودداری اور عزت نفس کو بچائے رکھا۔ ان کی شاعری ان کی زندگی کی ترجمان اور زندگی پر ان کے ایمان کی گواہ بنی رہی۔ انھوں نے عصری تقاضوں کو شعر کا پیرہن عطا کر کے

وقت وحالات سے اپنی فنکارانہ واقفیت اور خلوص ودیانت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ غزل کی ریزہ خیالی کوفن کا شاہ کار بنا کر پیش کرنے کی ان کی صلاحیت اہل نظر سے اپنا اعتراف کرا رہی ہے۔ اور شاعروں کی بھیڑ میں اپنی خوشبو سے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہے۔ انھوں نے فن اور فکر کے بامعنی امتزاج پر ہمیشہ اپنے دستخط ثبت کیے ہیں اس لیے ان کی شاعری بہت سے دلوں کی دھڑکن بن جایا کرتی ہے۔ انھوں نے اپنی تنہائی کے عذاب کو اور انفرادی کرب کو غزل کی مشاطگی اور شانہ کشی میں بھولنے کی کوشش کی ہے۔ انھیں ذاتی غم یا آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے کا فن خوب اچھی طرح معلوم ہے۔ تلخئ حیات کو غم جاناں کا حصہ کیسے بنایا جائے یہ ہنر انھیں آتا ہے۔ ان کی غزلوں کے دو مجموعے موجِ نسیم ۱۹۶۱ء میں اور موجِ صبا مئی ۱۹۸۱ء میں چھپ کر اہل فن سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اب ۲۰۱۴ء میں ان کا کلیات بھی چھپ چکا ہے۔

اختر نے غزل کے ساتھ حمد ونعت اور مناجات کی صنف کو بھی سرسبز کیا ہے۔ ان کے کلام میں مدرسے کا ترانہ اور قطعات بھی نظر آتے ہیں بہر حال جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ فن اور زبان و بیان کی کسوٹی پر کس کر کہتے ہیں۔

ان کا شعور پختہ، ان کی نظر وسیع، ان کا ذوق بالیدہ ان کا لہجہ شائستہ، ان کا قلم سنجیدہ و تراشیدہ ہے۔ اختر کی زبان سادہ وشیریں اور سلیس ورواں ہے۔ انھوں نے سلیس زبان میں تازہ کار اور پرتاثیر اشعار کہے ہیں۔ انھیں زبان پر قدرت حاصل ہے۔ مشکل مقاماتِ آہ وفغاں اور دل ودماغ کو پگھلا دینے والے تجربات ومشاہدات کو بھی آسان زبان میں بیان کیا ہے۔ جس نے کلام میں نشتریت پیدا کر دی ہے۔

نمونۂ کلام

تم ایک پل کے لیے دل میں آئے اور چلے — تمہارا گھر یہ نہیں ہے تو رہ گزر بھی نہیں
وقت کی معیت میں پتھروں کا لشکر ہے — کون ایسی آفت میں آئینہ بنائے گا
مصلحت کیا ہے مصیبت میں مشیت جانے — بندگی کا تو تقاضا ہے کہ رحمت جانے
لطف ہی کیا حیات کا گر نہ ہو غم کا سلسلہ — ختم نہ ہو خدا کرے رنج و الم کا سلسلہ

میرے تو سہل تر ہوگئی حق کی معرفت
زینۂ معرفت بنا عشق صنم کا سلسلہ

محبت منزل انسانیت ہے
محبت کی کوئی منزل نہیں ہے

نہ ہو دل میں اگر درد محبت
تو کوئی اور شے ہے دل نہیں ہے

خوشی ہی شرط نہیں لطف زندگی کے لیے
متاع غم بھی ضروری ہے آدمی کے لیے

ہائے اس رہ روِ برباد کی منزل اے دوست
جس نے گھبرا کے تیرا نقش قدم چھوڑ دیا

زمانہ تیرے لیے بے قرار ہوجائے
تو دوسروں کے لیے بے قرار ہو تو سہی

راس آئے تو کرم ہے، نہ راس آئے تو ستم
کہتے ہیں جس کو عشق جزا بھی سزا بھی ہے

جب ہر اک شمع تمناؤں کی بجھ جائے گی
تب کہیں جا کے شب غم کا سویرا ہوگا

اختؔر زباں سے بھی نہ کرو اس سے عرض حال
چہرے سے جو سمجھ نہ سکے دل کی کیفیات

ہیں ترے دل کی طرح داغ مرے دامن پر
دل مگر صاف ہے ناصح تیرے دامن کی طرح

چونکے جو ہم تو جائزۂ دو جہاں لیا
غافل ہوئے تو اپنی خبر کو ترس گئے

انساں کے دل کا حال بھی کتنا عجیب ہے
مانے تو ایک بات نہ مانے تو لاکھ بات

اک بار ان کو پانے کی دل میں تھی آرزو
سو بار اپنے آپ کو کھونا پڑا مجھے

برباد ہوگیا ہوں مگر مطمئن ہے دل
شرمندۂ کرم تو نہ ہونا پڑا مجھے

ہے اس کے در کی بات الگ ورنہ دوستو
لاکھ آستاں ہیں جو مرے سر کو ترس گئے

چہرے کی ہر شکن میں ہے تحریر شرح غم
کیا پوچھتے ہو حال مرا، دیکھتے نہیں

کچھ اس طرح سے مٹا میرے دل سے غیر کا نقش
کہ اب تو غیر بھی اپنا دکھائی دیتا ہے

نشانِ راہ اندھیروں میں گم نہ ہوجائے
بڑھے چلو ابھی رستہ دکھائی دیتا ہے

اے طوفان حوادث ہم کو یہ نہ سمجھ انجانے ہیں
تو نہ ہمیں پہچانے لیکن ہم تو تجھے پہچانے ہیں

جامہ آج کے انسانوں کا کیا پوچھو ہو کیا ہے؟
خلق ومروت کے تانے ہیں بغض وحسد کے بانے ہیں

آج کے دور میں ناممکن ہے دانے ہوں اور دام نہ ہو
طائر دل یہ خوش فہمی ہے دام نہیں ہے دانے ہیں

چہرے تمام زرد ہیں، آئینے گرد گرد ہیں
صحن جہاں میں دوستو ایسی چلی ہوا کہ بس

صبر و قرار دل مرے جانے کہاں چلے گئے — بچھڑے ہوئے نہ پھر ملے، ایسے ہوئے جدا کہ بس

ہے یوں تو شفا بخش نسیم سحری بھی — لیکن ترے دامن کی ہوا اور ہی کچھ ہے

کیفیتِ غم دل کی ہوعیاں نہ چہرے سے — پردۂ تبسم میں تلخیاں دبی رکھنا

کون سننے والا ہے بےحسوں کی دنیا میں — اپنے غم کی سینے میں داستاں دبی رکھنا

قطعات

ذہنوں کے یہ خود ساختہ اصنام بدل دو — ایقان سے اندیشۂ اوہام بدل دو

اے گردش ایام کے مارے ہوئے لوگو — چاہو تو رخ گردش ایام بدل دو

روتے کٹی ہے عمر ہنسی کی تلاش میں — غم جھیلتا رہا ہوں خوشی کی تلاش میں

پوچھو نہ دوستو مری ناکامیوں کا حال — گم ہو گیا ہوں آپ کسی کی تلاش میں

جو مریض غم کی کرے دوا، دل دردمند کو دے شفا — نہیں اور کوئی ترے سوا تری شان جل جلالہ

تو سکون دل، تو قرار جاں، تو معین و حامیِ بےکساں — تو ہی بے سہاروں کا آسرا تری شان جل جلالہ

مناجات

نہ کی میں نے تری طاعت گزاری — گناہوں میں بسر کی عمر ساری

سراپا زندگی میری خطا ہے — تری رحمت کا لیکن آسرا ہے

عنایت کی نظر اک بار کردے — تو میرا دامن امید بھر دے

ترے محبوب کا دیدار ہو جائے — زیارت خواب میں اک بار ہو جائے

اخترؔ - محمد رفیع اعظمی

—— اگست ۱۹۵۹ء

ان کے بارے میں حکیم اسحق اعظمی متوفی ۱۸؍فروری ۱۹۷۵ء کا بیان ہے کہ:

’’رفیع اختر مرحوم میرے پھوپھی زاد بھائی تھے انتہائی ذہین اور ذکی تھے۔ مگر عین جوانی میں درخت سے گر کر دونوں پیروں سے معذور ہو گئے۔ ۴۲ء کی تمام تحریکوں اور جلوسوں میں سائکل پر بیٹھ کر انقلابی نظمیں پڑھتے رہے۔ ۴۵ء کے الکشن میں پورے ضلع کا دورہ کرتے

رہے۔ تمام آنے والے رہنماؤں کے جلسوں میں نظمیں پڑھیں اور جمعیۃ کا پروپگنڈا کرتے رہے۔ آواز میں بہت سوز تھا اور کافی مؤثر انداز میں پڑھتے۔ ۴۷ء اور پھر آگے چل کر کمیونسٹ پارٹی کی تحریکوں اور پھر کانگریس کے رہنماؤں سے میل جول بڑھا لیا تھا۔ الگو رائے شاستری سے خاص قربت تھی۔

شاعری بھی کرتے، گیت لکھتے اور افسانے بھی لکھا کرتے۔ آ کر وقت میں میرے ساتھ رہنے لگے تھے مگر مزاج کی تیزی نے مجھ سے بھی خفا ہونے پر مجبور کیا اور پڑوس کے ایک گھر جا کر رہنے لگے اور پھر ہم لوگوں کے یہاں نہ آئے"(۱)۔

محمد رفیع اخترؔ مرحوم نے سب سے پہلے ۱۹۴۱ء میں قصبہ پھول پور میں سبھاش چندر بوس کی صدارت کے ایک کانگریسی جلسے میں رام پرساد بسملؔ کی مشہور غزل پڑھی تھی اور جس کا یہ مطلع ضرب المثل بن گیا تھا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے ۔ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

ان کی آواز بہت اچھی اور پرسوز تھی چنانچہ ان کی مانگ ہر جلسہ اور جلوس میں ہوتی تھی۔ جب ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی طرف سے بھارت چھوڑو کی تحریک کی ابتدا ہوئی تو وہ جلوس کے آگے آگے سائیکل پر بیٹھے لاؤڈ اسپیکر پر انور صابری کی نظمیں پڑھتے تھے اور دلوں میں جذبات حریت کی حرارت بھر دیتے تھے۔

۱۰/ ۱۱/ ۱۲/ جون ۱۹۴۰ء مطابق ۳/ ۴/ ۵/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۹ھ یوم دوشنبہ سہ شنبہ چہارشنبہ کو بسلسلۂ سنگ بنیاد جامع مسجد متعلقہ احیاء العلوم مبارک پور ایک زبردست جلسہ ہوا۔ اس میں ہندوستان بھر کے مشہور علمائے اسلام نے شرکت کی تھی حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ، حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، علامہ انور صابری اور رفیع اختر مرحوم نے انگریزوں کے خلاف بڑی پرجوش اور ولولہ انگیز تقریریں کیں اور نظمیں پڑھیں۔ اس پر انگریزی سرکار نے مولانا احمد سعید دہلوی، انور صابری اور رفیع اختر کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا تھا اور مقدمہ چلا تھا۔

حواشی:

(۱) پروانۂ چراغ مزار خود یم کا۔ مرتبہ شعیب اعظمی۔ نومبر ۱۹۷۵ء ص ۹۹

اخترؔ - مختار احمد مئو

۱۹۳۰ء ـــ ۱۰ ؍نومبر ۲۰۱۳ء تدفین ۱۱؍نومبر ۲۰۱۳ء

عبدالشکور شاکرؔ مئوی کے خلف رشید، انتہائی خوش مزاج، نفیس الطبع، خوش گو اور خوش اخلاق شاعر تھے۔ شاعری وراثت میں ملی تھی اور اپنے خاص رنگ و اسلوب سے اس وراثت میں مزید جلا اور توسیع کرکے اپنی ذہنی وفکری توانائیوں کا اظہار کیا۔ ان کی رسمی تعلیم معمولی تھی مگر انھوں نے خداداد ملکۂ سخن کے سہارے غزلیں خوب کہیں۔ عموماً شعراء کلام مکمل کر لینے کے بعد کسی سخن فہم کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اخترؔ بھی غزل کہہ لینے کے بعد دوسروں کو سنانے کے لیے بے چین ہو جایا کرتے تھے اور جب تک کسی داد دینے والے سخن شناس کو ڈھونڈھ کر سنا نہیں لیتے تھے ان کی تسکین نہیں ہوتی تھی۔ ان سب کے باوجود بقول اثرؔ انصاری علمی اور ادبی محفلوں میں اپنی علمی کم مائیگی کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار رہتے تھے۔ انھوں نے غنی احمد غنیؔ سے کلام پر اصلاح لی تھی اور انھیں کو اپنا استاد سخن بنایا تھا۔

اخترؔ نے چونکہ علم و ادب کی تعلیم کم حاصل کی تھی۔ علوم رسمیہ بھی بس یونہی مختصر معلوم تھے۔ علم و مطالعہ میں بھی کوئی خاص انہماک نہیں تھا اس لیے ان کی شاعری کی زبان بہت سہل، سادہ اور آسان ہے۔ فارسی تراکیب اور عربی کے الفاظ کا استعمال انھوں نے بہت کم کیا ہے۔ سیدھی سادی بات اور سامنے کی واردات سیدھے سادے لہجے میں اور وہ بھی اپنے انداز میں کہہ گزرے ہیں۔ انھوں نے شاعری کو اپنے فکر و مزاج کی مناسبت سے برتا ہے۔

نمونۂ کلام

آنسوؤں کا اک سمندر ہے مگر اب خشک ہے ۔۔۔ میری آنکھوں میں یہ اب کیا دیکھنے آئے ہیں لوگ
تو سمجھتا تھا کہ دنیا میں اکیلا ہے مگر ۔۔۔ شکر ہے اخترؔ تجھے بھی پوچھنے آئے ہیں لوگ

چھوڑ دو یارو حسینوں کی گلی کے راستے ۔۔۔ ڈھونڈھنے نکلیں گے یہ خود ہی تمھیں دیکھا کرو
تم سے اخترؔ کو شکایت؟ دشمنوں کی بات ہے ۔۔۔ اس کے بارے میں تم ایسی بات مت سوچا کرو

کیا بتاؤں وقت کی رفتار کتنی تیز ہے　　کام ہیں باقی بہت اور وقت بیتا جائے ہے
قاتلوں کو آج کوئی ٹوکنے والا نہیں　　بے گناہوں پر ہی سب کا ہاتھ اٹھتا جائے ہے
صرف میں ہی مرتکب ہوں جیسے سارے جرم کا　　کیوں مرا ہی نام تنہا سب سے پوچھا جائے
کیا کوئی محفوظ رکھے گا چمن کی آبرو　　باغباں جب خود ہی کلیوں کو مسلتا جائے ہے
آکے پلکوں پر جو رک جائے وہ آنسو اب کہاں　　بن کے دریا اب تو یہ پانی بھی بہتا جائے ہے

اتنی فرصت ہمیں دیتا غم ایام کبھی　　زلف کی چھاؤں میں کچھ وقت گزارا کرتے
دل میں اک شہر ہے آباد تمناؤں کا　　تم بھی اے دوست کبھی اس طرف آیا کرتے

چاروں طرف ہیں راہ میں کانٹے بچھے ہوئے　　اے رہروانِ شوق ذرا دیکھ بھال کے
اخترؔ کسی طرح نہ بجھی تشنگیِ غم　　ہم پی گئے ہیں زہر بھی ساغر میں ڈھال کے
چلو وہاں کہ جہاں ہر نصیب بنتے ہیں　　یہاں تو کچھ نہ ملا عمر بھر کسی کو کبھی

اختر - اقبال احمد اشرفی مبارک پوری

۱۹۳۳ء ــــ ۲۰۰۹ء

والد کا نام محمد یوسف بن حافظ محمد صدیق تھا۔ موروثی مکان پورہ صوفی میں تھا مگر ان کے والد اپنی سسرال پورہ رانی میں رہنے لگے تھے۔ ان کے خاندان میں انگریزوں کے آخری زمانے تک برادری کی سرداری رہی۔ اسی وجہ سے ان کے خاندان کے لوگ مہتر کہے جاتے تھے۔ برادری کی شادی بیاہ کی تقریبات، عائلی مسائل کے فیصلے۔ آپسی تنازعات کی صلح صفائی وغیرہ میں ان کی رائے حتمی اور آخری سمجھی جاتی تھی۔ تمام امور ان مہتروں کی نگرانی میں انجام دیئے جاتے تھے۔

اخترؔ نے اردو اور فارسی کی تعلیم انجمن فیض عام محلہ پورہ رانی کے شبینہ اسکول میں حاصل کی تھی اور کسب معاش کا ذریعہ پارچہ بافی کو بنایا تھا۔ سید مخدوم اشرف سلطان جہانگیر سمنانی متوفی ۸۰۸ھ کے خاندان سادات کے مشہور اہل دل بزرگ حضرت سید امیر اشرف اشرفی الجیلانی کچھوچھوی متوفی جولائی ۱۹۹۴ء کے دست حق پرست پر سلسلۂ اشرفیہ میں بیعت تھے۔ انھیں

سادات سے بڑی عقیدت اور آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے از حد محبت تھی۔ خود بھی ذرا سے وارفتہ مزاج تھے۔ مزارات کی حاضری اور بزرگوں کی زیارت سے انھیں خصوصی دل چسپی اور ایک خاص قسم کا تعلق خاطر تھا۔ ملنے والوں سے عموماً خانقاہ وتصوف، مزاراتِ اولیاء وظائف واوراد، اور بزرگوں کے واقعات وحالات کی باتیں کرتے تھے۔

اخترؔ اشرفی کسی زمانے میں شاعری سے جنون کی حد تک تعلق رکھتے تھے اور کلام لکھ لکھ کر قوالوں کو دیا کرتے تھے۔ ان کی نعتیں جلوس عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں نعت خواں جماعتیں پڑھا کرتی تھیں۔ صحبت کے میلہ میں بھی ان کا کلام گایا جاتا تھا۔ ان کی لکھی چادریں بزرگوں کے عرس وجلوسِ چادر میں خوب پڑھی اور سنی جاتی تھیں۔ انھوں نے ہر قسم کی شاعری کی لیکن خمسہ میں ان کو خاص مقام حاصل تھا۔ دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کی انتظامی تبدیلی، اہل مبارکپور پر خاندان سادات کچھوچھہ کی روحانی نوازش، باشندگانِ قصبہ کی دینی سربراہی وقیادت، افرادِ ملت کے دلوں میں ان سے والہانہ عقیدت ومحبت اور مولانا حافظ عبدالعزیز بھوج پوری (۱۸۹۴ء۔۱۹۷۶ء) کے عقیدت مندوں کی اشرفی آثار کو ختم کرنے کی سازش وکوشش کے احوال وواقعات کے لیے ان کا کلام ایک تاریخی مرقع کی حیثیت رکھتا ہے۔ دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم کے موجودہ ارباب حل وعقد کے ایسے اقدامات پر بھی انھوں نے احتجاجی نظمیں کہی ہیں، جن سے اس مدرسہ کے ماضی کے کارنامے اور بزرگوں کے دینی وملی نقوش آنے والی نسلوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہیں، انھوں نے ان واقعات وحادثات کو بڑی شرح وبسط، دل سوزی اور ملی درد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دارالعلوم اشرفیہ کی پرانی عمارت کے انہدام، اشرفی دارالمطالعہ کے سرمایۂ کتب کی بربادی، اس کی زمین پر اشرفیہ جونیر اسکول کے قیام وتعمیر جدید کے پس پردہ سادات بیزاری کے جوجذبات کام کر رہے تھے ان کے کلام سے ان کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔ ایک مدرسِ محترم کا بہت بڑا قلمی مجسمہ تراشنے کے لئے جو منظم تحریری وتقریری کام کیے گئے یا کئے جا رہے ہیں ان تمام پر ان کی نظمیں تاریخی آثار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے روحانی شخصیتوں کو اپنی متعدد نظموں میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی خدمات کے اعتراف واحترام کی اہمیت وافادیت کا احساس دلایا ہے۔

ان کے یہاں زبان کی سادگی ہے مگر واقعات کی صداقت ملتی ہے۔لفظوں میں جذبہ و جوش اور درد و داغ وسوز وساز کی ایک دنیا آباد ہے۔خیالات بڑے پاکیزہ ہیں۔ان کے یہاں عاشق کا دل، محبت کرنے والے فرد کی ورافتگی اور شاعر کا دل ہے۔اساتذۂ سخن کے صحبت یافتہ نہ ہونے اور محاسن ومعائب شعری اور آدابِ شعر گوئی کی آگاہی رکھنے والے شاعر سے وابستہ نہ رہنے کی وجہ سے ان کے کلام میں فنی اسقام کو راہ مل گئی ہے۔

نمونۂ کلام

هم پر رسول پاک کا احسان ہوگیا بخشش کا اپنی دیکھئے سامان ہو گیا
تبلیغ میں رسول کی کتنا رہا اثر انسان کو بھی دیکھئے انسان ہو گیا
کیا عظمت رسول کو اخترؔ بیاں کروں روح الامیں بھی آپ کا دربان ہوگیا
آکر نبی نے باغِ رسالت سجا دیا گلزار التفات کا غنچہ کھلا دیا
اس محسنِ عظیم کا کارِ عظیم ہے ہر لوح دل پہ نقش محبت جما دیا
بزم جہاں میں کیسے ہمیں رہنا چاہیے اخترؔ نبی نے آ کے سلیقہ سکھا دیا
کیوں تجسس میں پڑے ہو کیوں ہو گھبرائے ہوئے کملی والے حشر میں امت ہیں بخشائے ہوئے

فیضان ذالجلال کا دریا کہوں تجھے
رب العلاء کی ذات کا جلوہ کہوں تجھے
تیرے جمال رخ پہ نچھاور ہے آفتاب دنیا نہ پیش کر سکی تیرا کوئی جواب
بحرکرم کا گوہر یکتا کہوں تجھے
تیری فضیلتوں پہ خدائی نثار ہے لاریب تو ہی رحمتِ پروردگار ہے
بخشش کو عاصیوں کا وسیلہ کہوں تجھے
صدقے ہیں تیرے نور کے انوار دوجہاں حق نے تجھے بنایا ہے سرکارِ دوجہاں
سارے جہاں کا مالک و مولا کہوں تجھے

زخم دلِ دو نیم کے مرہم ہو یا نبی رنج و الم کے ماروں کے ہمدم ہو یا نبی
ہر دل کے درد و غم کا مداوا کہوں تجھے
آفت زدوں کو امن کا پیغام دے دیا تشنہ لبوں کو ساغر اسلام دے دیا
انسانیت کا محسن اعلیٰ کہوں تجھے
تخلیق دوجہاں کی بنا تو ہے یا رسول ہر درد لادوا کی دوا تو ہے یا رسول
اے میرے شاہ رشک مسیحا کہوں تجھے
شمس وقمر نے پائی ضیاء تیرے نور سے قائم ہوئی ہے صبح و مسا ترے نور سے
سارے جہاں میں سب سے نرالا کہوں تجھے
کیسا کرم ہے دیکھئے اپنا ہو یا ہو غیر کھولے گا کون باب شفاعت ترے بغیر
میدانِ روزِ حشر کا دولھا کہوں تجھے
اخترؔ پہ یا رسول ترا لطف عام ہو الفت میں تیری، زندگی ساری تمام ہو
اپنی اس آرزو کا اجالا کہوں تجھے

کافی ہے بیکسوں کو سہارا حضور کا آ جائے گا گہن میں ستارا غرور کا
ہردم دعائے خیر ہے امت کے واسطے یا رب بچالے آبرو حضرت کے واسطے
آفت ہمارے سر پہ جو آئی ہے ٹال دے کشتی بھنور میں آ کے پھنسی ہے نکال دے
یا رب ذالجلال مسلماں پہ رحم کر سارے جہاں کے صاحب ایماں پہ رحم کر
ظلم و ستم کی آہنی دیوار توڑ دے ظالم کا ہاتھ اُٹھا ہے پنجہ مروڑ دے
اخترؔ کی یہ دعا ہے دلوں کو نکھار دے بگڑا ہوا نصیب ہمارا سنوار دے
آیا ہے بڑے فخر سے طاقت کے بھروسے تھوڑے سے مسلمان ہیں قدرت کے بھروسے
بغداد میں آیا ہے مچانے کو تباہی مرنے سے نہیں ڈرتے ہیں ملت کے سپاہی
سب اہل وفادار و رسن توڑ کے دیکھو میدان میں آئے ہیں وطن چھوڑ کے دیکھو
کابل سے چلا، آ گیا بغداد کے سر پر یہ وقت کا فرعون ہے فرعون ستم گر
اللہ کی رحمت کا سروں پر رہے سایہ محبوب خدا احمد مختار کا صدقہ

حشر ہو میرا الٰہی شاہِ سمنانی کے ساتھ
روزِ محشر میں رہوں محبوب سبحانی کے ساتھ
دفن کرنے جب چلیں احباب میت کو مری
وہ جنازہ لے چلیں آیاتِ قرآنی کے ساتھ
اب تلافی ہو نہیں سکتی کسی سے دوستو!
یاد ماضی کی فقط ورد زباں رکھا کرو
جس نے کی تیری بغاوت اشرفی دارالعلوم
کھو چکا اپنی شرافت اشرفی دارالعلوم
لٹ گیا اغیار کے ہاتھوں چمن فردوس کا
مل گئی جب سے قیادت اشرفی دارالعلوم
سائے میں فردوس کے آرام ہم کرتے رہے
اب کہاں پائیں گے راحت اشرفی دارالعلوم
درس گاہِ دین وملت کا نشاں باقی نہیں
کیسی آئی تجھ پہ آفت اشرفی دارالعلوم
چارسو پھیلی تھی اخترؔ روشنی مصباح کی
اب نہیں باقی ہے طلعت اشرفی دارالعلوم

اخترؔ- عبدالسمیع

۱۹۶۰ء میں شبلی کالج اعظم گڑھ میں بی اے سال اول کے طالب تھے۔

جب کہ تخریب نشیمن کی خبر ہوتی ہے
حسرت ویاس کی گلشن پہ نظر ہوتی ہے
یوں تصور میں شبِ ہجر بسر ہوتی ہے
ان کی تصویر مرے پیش نظر ہوتی ہے
پھیر لیں آنکھ تو چھا جائے گلستاں پہ خزاں
پھول کھل اٹھتے ہیں جب ان کی نظر ہوتی ہے
چار تنکے وہیں چننے کا مزا ملتا ہے
جس جگہ یورشِ صدبرق وشرر ہوتی ہے
دیکھتا ہوں جو کسی صاحبِ زر کو یارب
مجھ کو بھی خواہشِ گنجینۂ زر ہوتی ہے
زیرِ تعلیم ہوں ڈرتا ہوں اسی سے اکثر
شاعری ایسے میں مائل بہ ضرر ہوتی ہے
مرنے والے نے مسیحا سے دمِ نزع کہا
”ڈوبنے والے کی ساحل پہ نظر ہوتی ہے“
کیوں نہ ہو رحم کا طالب یہ تمہارا اخترؔ
جبکہ دنیائے جنوں زیروزبر ہوتی ہے(۱)

حواشی:

(۱) شبلی نیشنل کالج میگزین اعظم گڑھ سالانہ نمبر ۱۹۶۰ء ص ۶۹

اخترؔ - اختر عباس مبارک پوری

۱۹۵۹ء ــــ ۲۳؍مارچ ۲۰۰۷ء ۳؍ربیع الاول ۱۴۲۸ھ

محلہ شاہ محمد پور کے رہنے والے تھے۔ والد گرامی کا نام ناصر حسین تھا۔ باب العلم میں درجہ پنجم تک تعلیم پائی تھی۔ ذکاوت و ذہانت وراثت میں ملی تھی۔ اور حافظہ بہت قوی تھا۔ دوسرے شعراء کے سیکڑوں اشعار زبانی یاد تھے۔ پورا مشاعرہ سننے کے بعد ایک ایک شاعر کے اشعار حافظے کے کشکول میں امانت کی طرح محفوظ رکھتے تھے اور اہل ذوق کی صحبت میں انھیں سنایا کرتے تھے۔ خود اپنے کلام کو کبھی بیاض کا رہین منت نہیں رکھا۔ سارا کلام ان کی یادداشت کے محافظ خانے کی دستاویز بنا رہا۔ مشاعروں اور نشستوں میں طویل سے طویل کلام زبانی سناتے تھے۔ سنانے کا انداز بھی بڑا پیارا تھا۔ بنگلور گئے تھے اور فجر کی نماز کے لیے مسجد میں گئے، وہیں دل کا دورہ پڑا۔ وفات پا گئے۔

انھوں نے بڑی موزوں طبیعت پائی تھی۔ کلام طولانی ہوا کرتا تھا۔ کئی کئی مطلع کہنے کے عادی تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طبیعت ہر وقت حاضر رہتی تھی۔ جب چاہتے تھے کچھ اشعار کہہ لیتے تھے۔ ناظر مبارک پوری (۱۹۰۳ء - ۱۵؍جولائی ۱۹۹۰ء) سے کسب فیض کیا تھا۔ ان کے بڑے بھائی شوکت عباس (۱۹۴۸ء - یکم اپریل ۲۰۱۳ء) بھی مبارک پور کے اچھے شاعروں میں گنے جاتے ہیں۔ دونوں بھائی کبھی کبھی آپس میں شعر گوئی اور دوسرے شاعروں کے کلام پر تبصرہ کر کے ادبی تجزیہ اور شعری محاکمہ بھی کرتے تھے۔ اس طرح دونوں شاعر بھائیوں نے گھر میں ایک علمی و ادبی اور دینی فضا قائم کر رکھی تھی۔

اختر نے بیس برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ بہت ذہین و فطین اور حاضر دماغ تھے۔ جو لفظ سن لیتے اور اس کے معانی و مفاہیم سمجھ لیتے تھے پھر وہ عمر بھر حافظے سے محو نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے کبھی کلام کو لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا کلام دستبرد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ یہ مختلف رنگ، مختلف طرح اور مختلف موضوعات کے اشعار کہا کرتے تھے۔ غزل کی صنف میں نعت رسول یا منقبت ائمہ اور مدح اہل

بیت کو بھی شامل کر لیتے تھے۔ کہیں کہیں مدح و منقبت اور نعت کے اشعار میں غزل کا رنگ و آہنگ ابھارنے لگتے تھے۔ انھوں نے قدیم و جدید دونوں رنگوں کی آمیزش سے اپنے فن اور کلام کو نیا آب و رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں لفظوں کی رعایت و تکرار اور لفظوں کے حروف و سکنات کی تبدیلی سے اشعار کی فضا بندی کا رجحان عام ہے۔ خیال کی پیش کش کے ساتھ لفظوں کے در و بست اور اس کی شکست و ریخت سے نیا نیا مفہوم پیدا کرتے تھے۔ اس میں وہ بہت کامیاب تھے۔ وہ غیر مرئی کو مرئی اور نامحسوس کو محسوسات کی گرفت میں لانے کا ہنر سیکھنا چاہتے تھے۔ ان کو اور عمر ملی ہوتی تو فن میں کچھ اور نکھار آ گیا ہوتا۔ دوسرے شاعروں کے اچھے مفاہیم اور مصرعے لینے میں بھی انھیں کوئی حیا مانع نہیں تھی۔

نمونۂ کلام

زماں مہکے، زمیں مہکے، آسماں مہکے — رسول پاک کی خوشبو سے کل جہاں مہکے
نبی کے پھول کی خوشبو سے جاوداں مہکے — سدا بہار شریعت کا گلستاں مہکے
نبی کے عشق میں ہوں اپنی انگلیاں جو قلم — تو خوشبو دار قلم بن کے خاندان مہکے
مرے نبی کے پسینے میں ایسی خوشبو ہے — مہک سے جس کی رسولوں کا کارواں مہکے
نگاہِ لطف اگر ہو گل رسالت کی — مرا وجود، مری روح، میری جاں مہکے
گل ریاض نبی کی لطیف خوشبو سے — خزاں کی رت میں بہاروں کا گلستاں مہکے
علی کا خواب نبی کے خیال کی خوشبو — یقیں کے پردے میں سرکار کا گماں مہکے
نبی کے عشق میں شعلے گلاب ہو جائیں — سلگتے جسم سے اٹھتا ہوا دھواں مہکے
شمیم زلف رسالت کے شامیانے میں — یہ رحمتوں کی گھٹا زیر آسماں مہکے
وہ خوشبو ہے کہ جس خوشبو سے خوشبو کا بدن مہکے — وہ خوشبو دار پودا ہے کہ روحِ پنجتن مہکے
یہ وہ غنچہ دہن ہے جس سے غنچوں کا دہن مہکے — یہ وہ گل پیرہن ہے جس سے گل کا پیرہن مہکے
یہ وہ نغمہ ہے جس نغمے سے خود ہر نغمہ زن مہکے — یہی وہ زمزمہ ہے جس سے داؤدی دہن مہکے
یہ وہ سورج مکھی ہے جس سے دھرتی کا گگن مہکے — روپہلی چاندنی بھیگے، کرن پھوٹے، پون مہکے
قلم مہکے، علم مہکے، دلِ خیبر شکن مہکے — زباں کھولے سخن مہکے، علم کھولے تو رن مہکے

علی کا بانکپن مہکے، محمد کا چلن مہکے — گلِ عزمِ حسینی ، غنچۂ خُلقِ حسن مہکے
کلیم عصر نو مہکے، کلام پنجتن مہکے — فصاحت کی زباں مہکے، بلاغت کا دہن مہکے
قلم معجز رقم بن جائے اعجاز سخن مہکے — مرے مضمون سے محمود کا کام و دہن مہکے
میں دیوانہ ہوں دیوانہ، محمد کا ہوں دیوانہ — مری دیوانگی مہکے، مرا دیوانہ پن مہکے
یہ محفل نور کی ،یہ زمزمہ خوانی، گل افشانی — مرا حسن تکلم، میرا انداز سخن مہکے
ترے یوم ولادت سے ہے روشن دیں کا مستقبل — یہ دن مہکے، یہ ماہ و سال مہکے، اور سن مہکے

گل مسکرائے ، غنچہ دہن بولنے لگے — صحرا کی خامشی میں چمن بولنے لگے
محفل میں شاہزادۂ فن بولنے لگے — ممدوح کی ثنا میں سخن بولنے لگے
بیمار غم ، اسیر محن بولنے لگے — شانوں کے مثل، داغ رسن بولنے لگے
اخترؔ اگر ہو ہند میں آمد حضور کی — قدموں کو چھو کے خاک وطن بولنے لگے

اگر زاہد نشے میں چور ہو جائے تو کیا ہوگا — شرابی میکدے سے دور ہو جائے تو کیا ہوگا
مری جان و فا مغرور ہوجائے تو کیا ہوگا — محبت کی نظر بے نور ہوجائے تو کیا ہوگا
مری شمع وفا گل کرنے والو سوچ لو پہلے — دیا میرا چراغ طور ہو جائے تو کیا ہوگا
زبان سنگ سے آئینۂ دل توڑنے والو — کہیں شیشے سے پتھر چور ہوجائے تو کیا ہوگا

ایک مشت خاک کو آدم کا پتلا کردیا — روح پہنا کر فرشتوں سے بھی اونچا کردیا

اخترؔ- مولانا مختار احمد اختر فیضی

۱۹۲۴ء ـــ ۱۰؍نومبر ۲۰۱۳ء تدفین ۱۱؍نومبر ۲۰۱۳ء

محلہ قاسم پورہ قصبہ مئوناتھ بھنجن کے باشندے عبدالعزیز مرحوم کے صاحبزادے اور مئو کے علمائے اہل حدیث میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں مدرسہ فیض عام مئو کے اساتذہ کی خدمت میں رہ کر پڑھیں۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں زیرِ تعلیم رہے۔ وہاں ان کی تعلیم وتربیت مبارکپوری اصحابِ درس وتدریس کی مرہونِ منت تھی۔ ان

کے شیوخِ تعلیم میں مولانا عبیداللہ رحمانی محدث مبارکپوری، ان کے برادرِ خورد مولانا عبیدالرحمٰن طالبؔ مبارکپوری اور مولانا حکیم محمد بشیر مبارکپوری کے نام شامل ہیں۔ انھوں نے مدرسہ رحمانیہ دہلی میں مولانا محمد بشیر مبارکپوری سے مسلم شریف، مولانا عبیدالرحمٰن طالبؔ سے بلوغ المرام اور شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی سے مشکوٰۃ وترمذی کا درس لیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں وطن آ گئے اور مدرسہ فیض عام میں داخلہ لیا اور یہیں نصابِ تعلیم کی تکمیل کی۔ مسلم کا ایک حصہ اور بخاری کا پورا حصہ مولانا محمد احمد سے پڑھا۔ اس کے بعد انھوں نے مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی (شیخ بنارسی) کی خدمت میں بنارس حاضر ہوئے اور ان سے صحیحین کے درس کی تجدید کی۔

اختر فیضی نے تکمیل کے بعد دارالحدیث مئو سے متعلق رہ کر درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ آخری حصۂ عمر میں معذور ہو گئے تھے۔ مجاز اعظمی کے دوستوں میں تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن قمرؔ مبارکپوری (موضع حسین آباد) سے بڑے گہرے مراسم تھے جو آخر وقت تک قائم رہے۔

مولانا تصنیف وتالیف کے ساتھ شعر وسخن سے بھی دل چسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے درسیات کے مشکلات کو حل کیا تھا۔ بیضاوی اور حماسہ کے باب الادب کی شرح لکھی تھی۔ فرائض پر بھی ان کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔

فسادات کے تعلق سے اختر فیضی کا صرف ایک قطعہ دستیاب ہو سکا ہے اس کے علاوہ کچھ اور کلام حاصل نہیں ہوا۔

نمونۂ کلام

بظاہر اخوت کا نورِ مجسم زباں پر تو ہے خدمتِ خلق پیہم
انھیں سے ہے خطرے میں اب امن عالم حقیقت میں یہ ننگِ انسانیت ہیں

اخترؔ - طیب اختر مئوی

یکم اکتوبر ۱۹۵۹ء ـــــ ۱۱رجولائی ۲۰۱۴ء/ ۱۲ررمضان ۱۴۳۵ھ جمعہ

ان کے والد گرامی عبدالرؤف گرافر طالبؔ تھے۔ جو شاعری بھی کرتے تھے۔ فضا ابن

فیضی اور اثر انصاری کے صحبت یافتہ تھے اور شعر فہمی میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ کئی برس سے آپ کا گلا رندھا ہوا تھا۔ آواز صاف نہیں نکلتی تھی۔

طیب صاحب کی ابتدائی تعلیم مفتاح العلوم مئو میں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ طور پر مختلف امتحانات پاس کر کے صاحب لیاقت ہو گئے تھے۔ شاعری میں مختلف شاعروں سے فیض اٹھایا تھا جن میں کوثر معروفی اور ظفر احمد ماہر عبدالحئی کے نام نمایاں طور پر لئے جاتے ہیں۔ حمد، نعت، نظم، قطعہ، رباعی، غزل اور خمسہ میں ان کی منظوم نگارشات ملتی ہیں جو اہم شعری سرمایہ ہے۔ زبان وبیان کا خاص لحاظ رکھتے تھے اور فنی ابعاد کو روشن کرنے کی کوششوں میں رہا کرتے تھے۔ انھیں وقت وحالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو شاعری کا حصہ بنانا پسند تھا۔ علامتوں اور جدید لہجے سے استفادہ کرنے کی طرف بھی رجحان تھا۔ انھوں نے اصناف کے مزاج وروح کو سمجھ کر ان کی مناسبت سے لفظوں کا استعمال اور انتخاب کیا ہے۔ وہ اچھی شاعری اور جمالیاتی وعصری پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں طرز نو کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری کا وزن ووقار بڑھ گیا ہے۔ انھوں نے شاعری کی دنیا میں خوب سے خوب تر کی جستجو میں بہت سے مقامات جنوں طے کئے تھے اور ان کا شوق کئی مرحلۂ جاں گسل سے گزرا تھا۔ اسی لئے ان کے کلام میں ایک ایسی تاثیر ہے جس سے دماغ کو روشنی اور دل کو تازگی ملتی ہے۔

نمونۂ کلام

سرسبز نہ ہو کیوں کر دلِ شیدائے مدینہ — رہ رہ کے ابھرتی ہے تمنائے مدینہ
کرنا ہو نظارہ جسے فردوسِ بریں کا — اس شخص سے کہہ دو کہ چلا جائے مدینہ
تمنا ہے کہ پہنچوں کاش میں ان کے ٹھکانے پر — محمد مصطفیٰ صل علی کے آستانے پر
زباں ذکر محمد سے مہکتی ہے سدا میری — لگا رہتا ہے دل انوار ورحمت کے خزانے پر
بشارت جن کے آنے کی خلیل اللہ نے دی تھی — چلا آیا پلٹ کر شمس بھی ان کے بلانے پر
ضیا پاشی جہاں میں جب ہوئی روئے پیمبر کی — چمک مدھم پڑی چرخ بریں پر ماہ واختر کی
کرم مولا کا سمجھوں یا اسے اعجاز احمد کا — کہ افزوں تر ہے انجم سے ضیا ہر ایک کنکر کی

اگر توصیف سرکارِ دوعالم کی لکھی جائے　سیاہی لکھتے لکھتے ختم ہوجائے سمندر کی
برائے نعت اخترؔ کو کیا ہے یاد لوگوں نے　الٰہی لاج تیرے ہاتھ میں ہے آج اخترؔ کی

دم نکل جائے میرا الٰہی ذکر خیرالوریٰ کرتے کرتے
بند ہوجائیں سانسیں مری مصطفیٰ مصطفیٰ کرتے کرتے
سورہاہوں میں قرآن پڑھ کر کٹ گئی رات واللیل کہہ کر
کاش کٹ جائے یہ زندگی بھی ذکرِ شمس الضحیٰ کرتے کرتے

ہے اب محنت کشوں کی آبرو دوشیزۂ اردو　رہی ہوگی کبھی شاہوں کے ایوانوں سے وابستہ
منکشف جو کرسکے مجھ پر مرے باطن کا حال　ایسا اک شیشہ بنادے شیشہ گر میرے لئے
حق کی صدا ہو، پیہم سچ کا نغمہ ہو　مرنے کی ساعت میں لب پہ کلمہ ہو
چہروں کے رنگ چوس گئی فکر روزگار　پہلی سی اب وہ شکل وہ صورت نہیں رہی
تم آسماں کی بلندی کی سیر کرلینا　سلیقہ سیکھ لو پہلے زمیں پہ چلنے کا
ذہن ودل، فکر وخیالات ہیں ریزہ ریزہ　منتشر میں، مرے حالات ہیں ریزہ ریزہ
راہِ پُرخار میں گر گر کے سنبھلنا سیکھو　طرزِ اسلاف پہ اے دوستو! چلنا سیکھو
زہر تریاق کی صورت میں بدلنا سیکھو　ناگ کے پھن کو بھی پیروں سے کچلنا سیکھو
مومنو! دل میں شہادت کا اگر جذبہ ہو　باندھ کے سر پہ کفن گھر سے نکلنا سیکھو
بڑھ کے خود منزلِ مقصود قدم چومے گی　موم کی شکل میں تم پہلے پگھلنا سیکھو
ایک ہی بات پہ تاعمر رہو تم قائم　موسمِ گل کی طرح تم نہ بدلنا سیکھو
ناز وانداز سے خالی ہے تمہارا دامن　نرم کلیوں سے ذرا تم بھی مچلنا سیکھو
چاند کی طرح چمکنا ہو اگر اے اخترؔ　تم بھی سورج کی طرح شام کو ڈھلنا سیکھو
اپنے شانوں پہ اگر یوں زلف کو لہراؤگے　دل الجھ جائے گا تو کس طرح سے سلجھاؤگے
اس بھری دنیا میں ڈھونڈھوگے اگر لے کر چراغ　چاہنے والا میرے جیسا نہ ہرگز پاؤگے
رہ زنوں کا بول بالا ہے ذرا رکھنا خیال　ورنہ اہل کارواں تم راہ میں کٹ جاؤگے

روٹھنے والو ذرا اختؔر کا، کہنا مان لو | روٹھ کر جاتے ہو لیکن پھر یہیں تم آؤ گے
عزم وہمت حوصلہ گر ساتھ لے کر جاؤ گے | منتظر ہر گام پر منزل کو اپنی پاؤ گے
کامیابی ہے اسی میں ایک در کے ہو رہو | دربدر کی ٹھوکریں کب تک یوں ہی تم کھاؤ گے
اس جہاں میں کون سمجھے گا تمہارے درد کو | تم کہاں بے چہرگی کا کرب لے کر جاؤ گے
لٹ گیا سرمایۂ دیں ہوچکا سب کچھ تباہ | اے مسلمانو! بتاؤ ہوش میں کب آؤ گے
ضبطِ غم، ضبط جنوں میں ہوگیا برباد دل | دل کی بربادی کا منظر دیکھنے کب آؤ گے
جس بلندی پر ہے اختؔر کا کمالِ فن | اس جگہ پر جاتے جاتے شاعرو تھک جاؤ گے

اخلاق - سیدنذیراحمد

جیل خانہ اعظم گڑھ میں نائب داروغہ تھے۔فن سخن میں حضرت سید ضامن علی جلال لکھنوی (۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء یا ۱۸۳۵ء- ۱۹/اکتوبر ۱۹۰۹ء/ ۱۳۲۷ھ) سے استفادہ کرتے تھے۔ مارچ ۱۹۰۸ء میں لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ ابھی نومشق ہیں مشق کرنے پر اچھا کہنے لگیں گے(۱)۔ان کے دیگر احوال کہیں اورنہیں ملے خم خانۂ جاوید جلد اول مرتبہ لالہ سری رام سے ذیل کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔

نمونۂ کلام

ہوش کیا میرے ہی کھوئے چشم فسوں ساز نے | سامری بھی سحر بھولا ان کی چتون دیکھ کر
ہماری لاش کو ٹھکرا کے ناز سے بولے | پڑے ہیں آج تو خوب آپ دم چرائے ہوئے
کل تو مسجد سے چلے آتے تھے آج اے اخلاقؔ | رہن میخانے میں دستار و قبا رکھی ہے
پائی ہے تم نے ماہ لقا شکل حور کی | روشن ضیائے رخ سے تجلی ہے طور کی
ایک ٹھوکر کبھی تربت پہ لگائی ہوتی | میری سوئی ہوئی تقدیر جگائی ہوتی
دل لگانے کا ذرا لطف اٹھاتے ہم بھی | دل و دل بر میں کسی روز لڑائی ہوتی (۲)

حواشی:

(۱) خم خانۂ جاوید، جلد اول۔ لالہ سری رام ص ۲۴۶ مطبوعہ لاہور ۱۹۰۸ء

(۲) خم خانۂ جاوید، جلد اول۔ لالہ سری رام دہلوی ص ۲۴۶ مطبوعہ لاہور ۱۹۰۸ء

ادریس اعظمی - مولانا محمد ادریس

قیاساً ۱۸۸۰ء ـــ قیاساً ۱۹۳۷ء

مولانا اپنے علم وفضل، زہد وورع اور اخلاق وفضائل کے اعتبار سے اپنے معاصر علماء میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کا خصوص وامتیاز تھا کہ یہ اپنے علاقے میں زمرۂ علمائے ثلٰثہ کے ایک اہم رکن تھے۔ یعنی مولانا عبدالغنی پھول پوری (موضع چھاؤں) (۱۲۹۳ھ۔ ۱۳۸۳ھ) مولانا زین العابدین موضع ٹیونگا اور تیسرے یہ خود اپنے دیار کے نادرۂ روزگار علماء میں فائز المرام اور فائق المراتب تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ مولوی حبیب الرحمٰن قاسمی مؤلف تذکرۂ علمائے اعظم گڑھ نے اوسط الذکر مولانا زین العابدین جیسے معروف علماء کا ذکر اپنے تذکرہ کے دونوں ایڈیشن میں نہیں کیا جبکہ وہ موضع جگدیش پور قصبہ پھول پور سے وطنی نسبت رکھنے کی وجہ سے صاحب فضل وکمال کے موضع ٹیونگا قصبہ پھول پور سے اتنی قربت مکانی رکھتے ہیں جسے فاصلۂ چندگام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ راقم کا احساس ہے کہ اگر مؤلف محترم حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۹۶ء) کی تحقیقی بیاض وتحریرات اوران کی نفع بخش رہنمائی نہ پاتے تو شاید تذکرۂ علمائے اعظم گڑھ کچھ اور مختصر ہونے کے علاوہ دورِ قدیم کے علماء کے احوال سے بھی یکسر خالی رہتا۔ کیوں کہ انھوں نے تحقیق کم اور تحریری استفادہ زیادہ کیا ہے۔

مولانا محمد ادریس بن عبدالحق بن بیچو دادے موضع ٹیونگا قصبہ پھول پور ضلع اعظم گڑھ کے ایک کاشتکار گھرانے سے تعلق رکھنے والے نہایت صاحب لیاقت ماہر علوم دینیہ ومشرقیہ تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم والدین کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد جون پور میں مولانا ابوالخیر مکی بن مولانا سخاوت علی جون پوری (۱۲۷۴ء۔ ۱۳۲۲ء) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ یہاں ان کے ہم درس

وہم سبق ضلع اعظم گڑھ بلکہ خطۂ مشرق کی اہم علمی ودینی شخصیت اور معروف مرشد صوفی مشرب مولانا عبدالغنی پھول پوری بھی تھے۔ مولانا محمدادریس نے عربی ودینی تعلیم کے لیے دیو بند کا سفر کیا اور دارالعلوم دیو بند میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن (۱۲۵۱ھ/۱۸۵۱ء۔۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء) کے علاوہ دوسرے اساتذہ سے کسب فیض کیا۔

مولانا کی شادی سبرحد ضلع جون پور میں ہوئی تھی۔ اولاد ذکور میں محمد سعید اور محمد الیاس کے علاوہ تین بیٹیاں بھی تھیں۔ محمد سعید کے صاحبزادگان ریاض احمد مرحوم، عبدالحق اور فضل الرحمٰن ہیں۔ چار دختران میں سے ان کی بڑی بیٹی رقیہ خاتون وفات پا چکی ہیں۔ محمد الیاس بن مولانا محمدادریس کے ایک بیٹے افضال احمد اور دو بیٹیاں موجود ہیں۔ مولانا کی وفات ہارٹ اٹیک میں ہوئی تھی ان کا مولد موضع ٹیونگا ہی ان کا مدفن بھی بنا۔ مولانا کے حالات ان کے پوتے فضل الرحمٰن کی روایت پر مبنی ہیں

مولانا کی رہائش اپنے موضع میں تھی۔ وہ عمر بھر تبلیغ دین کے مقدس فریضے میں لگے رہے۔ اس دیار میں ان کی مناظرانہ حیثیت مسلم تھی۔ وہ امام المناظرات ہند کہے اور سمجھے جاتے تھے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۳ء تک انھوں نے ۳۶ مناظرے کیے۔ ان کی علمی صلاحیت اور حاضر جوابی بے مثال تھی۔ منطق وفلسفہ اور دوسرے عقلی علوم پر انھیں عبور حاصل تھا۔ علم کلام میں یدطولیٰ رکھنے کی وجہ سے اپنے حریف پر حاوی رہا کرتے تھے۔ اپنے موضع ٹیونگا قصبہ پھول پور میں دفتر خادم الاسلام قائم کر کے تصنیف وتالیف اور وعظ وتبلیغ کے میدانوں کو سرسبز کیے ہوئے تھے۔ ان کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں اہم علوم کی کتابوں کا بڑا نادر ذخیرہ موجود تھا۔ اس کی بہت سی اہم کتابیں گورینی ضلع جون پور کے مولوی عبدالحلیم صاحب فیض آبادی ناظم مدرسہ ریاض العلوم گورینی یہ کہہ کر لے گئے کہ جب خاندان میں کوئی اس کا خواہش مند ہوگا تو یہ کتابیں واپس کر دی جائیں گی۔ وہ بھی مرحوم ہو گئے۔ تقاضا کرنے پر ان کے لڑکے بتاتے ہیں کہ معلوم نہیں وہ کتابیں کیا ہوئیں۔ ان کی مناظرانہ کتابوں میں سے ایک کتاب "جواب ہنود" انگریزی دور میں شائع ہوئی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کو پڑھ کر بہت سے ہندو مذہب کے پیروکار اسلام کی آغوش میں چلے آئے تھے۔ ہندوؤں کے احتجاج کی وجہ سے

انگریزی حکومت نے پابندی لگا کر اس کی جلدیں ضبط کر لی تھیں۔ اب وہ کتاب ناپید ہے اور کہیں دستیاب نہیں۔ تفسیر سورۂ یوسف اور مجموعۂ دعائے ماثورہ بھی مطبوع قلمی یادگاریں تھیں۔

مولانا کا ایک مختصر کتابچہ مثنوی "انوار الیٰسین" کے نام سے طبع ہوا تھا جو سورۂ یٰسین کی منظوم تفسیر و ترجمہ پر مشتمل تھا۔ اس مثنوی میں انھوں نے دعائیہ اشعار بھی شامل کیے تھے۔ اگر یہ مکمل صورت میں فراہم ہوگئی ہوتی تو شاعر کے اساتذہ و تلامذہ، قرابت دار و احباب کے ساتھ ان کی سوانح کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی۔ اس مثنوی کے چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں۔ مولانا ادریس نے پہلے سورہ کا متن پھر اس کے نیچے تفسیر و ترجمہ کے اشعار درج کرنے کا التزام رکھا ہے۔ اس مثنوی کا پہلا ایڈیشن غالباً ۲۵ ورق پر مشتمل ہے۔ ان کے اشعار کی زبان صاف ہے کہیں کہیں ضرورتاً عربی و فارسی الفاظ و تراکیب سے ترجمانی میں مدد لینے کا رجحان ہے۔ مثنوی سے شاعر کی فکری و فنی اور ادبی و شعری اہلیت و صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ زبان و لغت پر ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ شعور لسانی کا گہرا احساس ان کے یہاں موجود ہے۔ ابتدائی اشعار یوں ہیں

سورۂ یٰسین مکیہ وہی ثلٰث وثمانون آیۃ

سورۂ یٰسین ہے مکیہ جان — متفق ہیں اس پہ جملہ راویان
آیتیں اس میں تراسی ہیں عیاں — اور بیاسی ہیں نزدِ کوفیاں
ایک ایک آیت میں سن اے مرد صاف — کرتے ہیں راوی وقاری اختلاف

یٰسین

میں نے یہ نکتہ کیا ہے انتخاب — یعنی ہر حرف مقطع از کتاب
گنج سربستہ ہے از اسرار غیب — عالم اس کا ہے خدا بے شک وریب
ہے پُر اَز سرّ خدا ہر ایک حرف — ہے نہاں قطرہ میں دریائے شگرف
علم ان کا پہلے حضرت کو دیا — سورتوں کے ساتھ پھر نازل کیا
ان کے معنوں سے جز اللہ ورسول — نہ ہیں آگہ عالمانِ ذی عقول
کہتے ہیں چند عالمانِ مستقیم — کہ ہے یٰسین اسم قرآن عظیم

فھی الی الاذقان

پس ہیں وہ اغلال پہناور بڑی گردنوں میں تا زنخداں ہیں پڑی
کہ ہلا سکتے نہیں ہیں اپنا سر کر نہیں سکتے بہ پیشِ پا نظر

دعا کا صرف ایک شعر روایتاً ملا ہے جو یوں ہے

یا خدا ادریسؔ کی ہے التجا کر اجابت اس کی تو یہ دعا

ادریس اعظمی - مرزا محمد ادریس بیگ

تخمیناً ۱۹۳۶ء ـــ ۱۹۹۳ء قیاساً

موضع سلہرا دیوگام ضلع اعظم گڑھ ان کا مسقط الراس تھا۔ ابو عبیدہ خاں عبدہؔ اعظمی (۱۹۳۶ء۔ ۱۹۹۵ء) کے ہم عصروں اور ان کے دوستوں میں تھے۔ تجارت پیشہ تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ عبدہ صاحب مشاعروں کے انعقاد سے خاص دل چسپی رکھتے تھے۔ ماضی میں ان کی سرگرمی اور ادبی امنگ کے نتیجے میں سرزمین دیوگام پر کئی بڑے اور اچھے مشاعرے ہوئے۔ شاعروں کی کثرت کی بنا پر کچھ لوگ انھیں شاعروں کی ریلی کا نام دیا کرتے تھے۔ ادریسؔ اعظمی ان مشاعروں کے ہر مرحلۂ دشوار میں عبدہؔ کے دست راست رہا کرتے تھے۔ غزلیں کہتے تھے اور روایتی انداز میں کہتے تھے۔ کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔

دیکھ لیتے ہیں برابر نہیں دیکھا کرتے جلوۂ دوست کو اکثر نہیں دیکھا کرتے
ان کو احساس تڑپنے کا نہ ہوگا ہرگز جو تماشا تہ خنجر نہیں دیکھا کرتے
بڑھ کے رخ موڑ دیا کرتے ہیں میدانوں کا مرنے والے کبھی لشکر نہیں دیکھا کرتے
تم نے منھ موڑ لیا مجھ سے کوئی بات نہیں غم زدوں کی طرف اکثر نہیں دیکھا کرتے
ان کی آنکھوں سے چھلک پڑتے ہیں آنسو ادریسؔ دامنِ زیست کبھی تر نہیں دیکھا کرتے (۱)

ترے بخشے ہوئے انعام سے جل جاتے ہیں مرے ہی لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں
کس قدر تنگ نظر حضرت ناصح ٹھہرے ذکر مے کرتے ہیں اور جام سے جل جاتے ہیں

ساقیا مجھ کو نگاہوں سے پلا، جام نہ دے — لب مرے تیری قسم جام سے جل جاتے ہیں
وہ جو دیتے تھے کبھی پیار کا پیغام ادیبؔ — اب وہی پیار کے پیغام سے جل جاتے ہیں(۲)

حواشی:

(۱) سووینیر جشن جوہر صدیقی منعقدہ ۶ ر نومبر ۱۹۸۲ء ص ۴۵

(۲) ایضاً ص ۵۸

ادیبؔ - انیس احمد

جولائی ۸ ۱۹۳۸ء ـــــ ۱۱ رمئی ۲۰۱۴ء/۱۱ ر رجب ۱۴۳۵ھ

اردو کے نامور معلم و مدرس، شاعر و ادیب، افسانہ نویس و انشائیہ نگار اور عمدہ قلم کار تھے۔ آپ کے والد گرامی قاری ریاست علی صاحب (۱۹۰۰ء۔ ۱۹۷۲ء) مئو کے نامور علمائے درسیات سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ دارالعلوم مئو کے شیخ الحدیث اور فن تجوید کے بڑے ماہر تھے۔ خلاصۃ التجوید آپ کی نہایت کارآمد تصنیف ہے۔ کثیر التلامذہ بھی تھے۔

انیس ادیب نے ناظرہ اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد دارالعلوم مئو میں داخل ہوئے۔ عربی و فارسی کی تکمیل کر کے منشی کامل اور منشی فاضل کے امتحانات اول درجے میں پاس کئے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے بھی تمام امتحانات میں شریک ہوئے اور پہلے درجے میں کامیابی حاصل کی۔ آپ کی پہلی تقرری مدرسہ تعلیم الدین مئو میں بحیثیت مدرس ہوئی۔ ۱۹۶۲ء میں دارالعلوم مئو کی تعلیم و تدریس سے متعلق کئے گئے۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے فارسی، سیاسیات، ادبیات اور انگریزی مضامین کے ساتھ ہائی اسکول، پری یونی ورسٹی، بی اے اور ایم اے کے امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کئے۔ جس کی وجہ سے ان کی معلمانہ شان میں اضافہ ہوا۔

انیس ادیب نہایت بااخلاق اور اصول پسند ادیب تھے۔ وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور اچھا لکھتے تھے۔ انھیں فن تقریر پر بھی دسترس تھی۔ ۱۹۵۵ء میں ادارہ شمع ادب کی بنیاد ڈالی گئی تو اس میں ناخواندہ بالغوں کو خصوصیت کے ساتھ تعلیم دے کر کارگاہ زندگی کے ہنگاموں سے نپٹنے کا شعور

دیا۔انھیں فلاحی، تعلیمی اور سماجی کاموں سے خاص شغف تھا۔وہ علم وادب کے بڑے شیدائی تھے۔ قرطاس وقلم سے پیمان وفا باندھنے والوں کے وہ بڑے قدردان بھی تھے۔مجلسی انسان تھے۔اس لئے بذلہ سنجی اور حسِ مزاج بھی رکھتے تھے۔ان کی لذت گفتار سے محفلیں آباد رہتی تھیں۔

انھوں نے شاعری تو کم کی ہے لیکن افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری اور تنقیدی و تحقیقی مضامین لکھنے کے بعد جو بھی شعر کہے ان کی بھی ایک جہت اور حیثیت ہے۔ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی ادبی چاشنی ہے۔جس کی فکری سطح بھی بلند ہے۔ ہمارے اطراف میں شاعروں کی کبھی کمی نہیں رہی لیکن جن شاعروں نے شعری رنگ وآہنگ کے معیار کو باقی رکھنے کے لئے جتن کئے ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔انیس کی شاعری اپنے دور کے اسالیب سے ہم آہنگ اور عصری تقاضوں کی ترجمان ہے۔ نقوش صدرنگ، جب رات جاگتی ہے، شمع انشا، مشاہیر شعراء اردو کی فارسی شاعری، (پی ایچ ڈی کا مقالہ) ان کی تصانیف ہیں۔اہل علم کے درمیان ان کتابوں کی اہمیت ہے۔ان کتابوں سے مصنف کی ادیبانہ صلاحیتوں اور تخلیقی شعور کی نشان دہی ہوتی ہے۔

سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ لسانی وفکری سطح پر ابھرنے والے انقلاب پر بھی ان کی نظر تھی اسی لئے ان کے اشعار بڑے شگفتہ اور عصری مسائل کا مرقع ہوتے تھے۔انھوں نے کروٹ بدلتے ہوئے ادب سے استفادہ کرکے اپنی عصری آگہی کی نشان دہی کی ہے۔ وہ کتابوں کے بڑے پارکھی تھے۔دانش کدہ لائبریری مئو سے وابستگی نے ان کی متاع فکر وخیال کو بیش قیمت بنانے میں بڑی مدد کی تھی۔انھوں نے اس چمنستان علم اور خیابان فکر سے اپنے دامن کو گرانمایہ بنانے کی طرف سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ان کے کلام کی تازہ کاری مئو کے شاعروں میں انھیں بلند مرتبے پر فائز کرتی ہے۔وہ کم کہتے تھے مگر جب کبھی جذبات سے مغلوب ہوکر محوفکر ہوجاتے تو فکر وخیال کی ان وادیوں میں پہنچ جاتے تھے جہاں ان کے شعری اکتسابات کہنہ مشقی کی تصویریں ابھارنے تھے۔تذکرۂ سخنورانِ مئو۔اثر انصاری میں ان کے چند اشعار ہیں۔ڈاکٹر شکیل اعظمی کی کتاب مئو۔شہر ہنروراں میں بھی ان کے دو شعر درج ہیں جو سخنورانِ مئو سے نقل کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل احمد نے ان پر کئی مضامین لکھکر اور انھیں شائع کراکے حق شاگردی ادا کیا ہے۔

نمونۂ کلام

اعتبار وعدۂ فردا نہ مجھ سے پوچھیے
انتظار شوق میں شام وسحر ہوتی گئی
ہم نے بخشی ہے غم دوراں کو عمر جاوداں
گردش دوراں ہماری ہم سفر ہوتی گئی
کیجئے کیوں کر خلوص دوستاں کا تذکرہ
دوستی بھی اب تو وقف سیم وزر ہوتی گئی
حکایت نگہ التفات کس سے کہوں
جو خود سمجھ نہ سکا میں وہ بات کس سے کہوں
جسے میں لذت بے چارگی سمجھتا ہوں
وہی ہے لطف غم کائنات کس سے کہوں
دیتے ہیں سکوں مجھ کو یادوں کے ترے سائے
آوارہ مسافر کو اک چھانو سی ملتی ہے
کیوں شمع کو ہو فکر جاں سوزیِ پروانہ
جب آگ میں خود اپنی تا صبح وہ جلتی ہے
کیا جانے ادیبؔ آخر کیوں باد بہاراں بھی
راہوں سے مری اکثر کترا کے نکلتی ہے
نظام امن وسکوں ہوگیا اگر برہم
تو کاروبار جنوں صبح وشام کیسے چلے
کشودکار اگر ہو نہ ہمتِ مرداں
شکایتِ غمِ دوراں سے کام کیسے چلے

ارشادؔ - سید حسن ارشاد محمد آبادی

۲۲؍ربیع الاول ۱۳۱۱ھ ــــ ۲۸؍شوال ۱۳۸۱ھ ۴؍اپریل ۱۹۶۲ء

آپ اردو کے عظیم ومشہور محقق وشاعر وادیب سید علی جواد زیدی (۱۰؍مارچ ۱۹۱۶ء-۶؍دسمبر ۲۰۰۴ء) کے چچازاد بھائی تھے۔ آپ کا تعلق سادات محمد آباد گوہنہ کے ایک ایسے علمی خانوادے سے ہے جس میں شعروشاعری کی روایت بہت پہلے قائم ہوچکی تھی۔ اور جس کو ابھی حال تک علی جواد زیدی نے نہ صرف برقرار رکھا تھا بلکہ اسے جدید حسیت کے ساتھ آگے بھی بڑھایا تھا۔

آپ میور سنٹرل کالج الہ آباد (اب الہ آباد یونیورسٹی) سے بی اے فارسی مضمون کے ساتھ اور ایل ایل بی کیا۔ چند ماہ پریکٹس کے بعد منصفی کے امتحان میں شریک ہوکر کامیابی حاصل کی۔ منصفی کے بعد ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر ممتاز کیے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں سخت علیل ہو گئے۔ ۱۹۵۰ء میں وظیفۂ حسن کارکردگی پر مستقل گھر رہنے لگے۔ ان کی سبکدوشی کے زیادہ ایام علالت

میں گزرے۔شادی پارہ ضلع غازی پور میں ہوئی تھی۔آٹھ اولادیں ہوئیں۔ پانچ بچپن ہی میں فوت ہوگئیں۔ایک لڑکی اور دولڑکے حیات تھے۔آخر میں صرف سید علی نقاد ثمر زیدی ان کی یادگار رہ گئے تھے جواردو کے اچھے شاعر بھی تھے۔

آپ فارسی اچھی جانتے تھے عربی میں کچھ درک تھا۔ بی اے تک فارسی مستقل مضمون تھا۔ بدو شعور سے شعر موزوں کرنے لگے تھے۔کالج کی تعلیم کے دوان یہ سلسلہ تیز تھا۔بعد میں اس سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ممکن ہے کہ الہ آباد میں کسی سے کلام پر اصلاح لیتے رہے ہوں مگر اس کا سراغ نہیں ملتا۔مذہبی رجحانات رکھتے تھے۔ پابند صوم وصلوٰۃ ،منکسر المزاج اور اقربا پرور تھے۔ مشاہرے کا زیادہ حصہ خاندان اور رشتے داروں کی کفالت میں خرچ ہوجاتا تھا۔تعزیئے بھی خود ہی بناتے تھے(۱)۔

قدیم اسلوب وآہنگ میں اچھا شعر کہتے تھے۔اگر صحت اور ذوق نے مساعدت کی ہوتی تو فکری بلندی اور لہجے کی طرفگی کا انداز ہی کچھ اور ہوتا اور ان کی شاعری کے آفاق کی پہنائیاں پڑھنے والے سے وسعت نظر کا مطالبہ کرتیں۔سلمان بورڈنگ ہاؤس میور سنٹرل کالج الہ آباد کی طرف سے ۱۴رنومبر ۱۹۱۴ءکوسید علی نقی،صفی لکھنوی (۱۸۶۲ء۔۲۵رجون ۱۹۵۰ء) کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کا گلدستہ بھی شائع کیا گیا تھا وہ گلدستہ نقاد صاحب نے راقم کوایک بار دکھایا تھا جس کے صفحہ ۶ر پر ارشاد زیدی کی غزل چھپی تھی۔

ارشاد تعلیم یافتہ ،صاحب استعداد اور باذوق شاعر تھے۔طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔غزلیں زیادہ کہتے تھے۔ بعد میں اس وادی سے بہت دور ہوگئے تھے۔ باضابطہ کسی کے شاگرد نہیں ہوئے ممکن ہے الہ آباد میں کسی سے اصلاح لی ہو۔بی اے تک فارسی مضمون تھا اس لیے ان کی فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی۔عربی میں کچھ درک رکھتے تھے۔

ذیل میں ان کی ایک غزل دی جارہی ہے جواس وقت کہی گئی ہے جب یہ الہ آباد میں میور سنٹرل کالج میں سکنڈ ایر کلاس کے طالب علم تھے۔

نمونۂ کلام

مبارک ہو کہ بالا تر رہے اپنے مقابل سے
فروغ حسن میں تم بڑھ کے نکلے ماہ کامل سے
تامل کیوں ہے کہہ دے کوئی اس لیلیٰ شمائل سے
مرا دل پردہ داری میں نہ کم ٹھہرے گا محمل سے
تمہارے ہجر نے ایسا تغیر کر دیا پیدا
جو دیکھو گے کبھی ہم کو تو پہچانو گے مشکل سے
نہ ہو تکلیف اس کے دست و بازو کو تو اچھا ہے
ملا دیں بڑھ کے خود اپنا گلا شمشیر قاتل سے
تصور ہر گھڑی رہتا ہے ان کے تیر مژگاں کا
کسی صورت خلش یہ برطرف ہوتی نہیں دل سے
گلوں کو کیا بھلا نسبت تمھارے روئے رنگیں سے
کسی دن جاکے ہم گلشن میں پوچھیں گے عنادل سے
ہے پاس آبرو و تو موت ہے ناجنس کی صحبت
جیالوں کو یہ لازم ہے رہیں کچھ ہٹ کے ساحل سے
نہ آیا شمع بھی کوئی جلانے میری تربت پر
قیامت تک رہے گا یہ گلہ یارانِ محفل سے
وہ تعمیر حرم تھی جس سے بت باہر ہوئے ناصح
نہیں ممکن صنم نکلیں ہمارے کعبۂ دل سے
حسینوں کا تغافل رہزنی کا کام کرتا ہے
پھرے ہیں قافلے حسرت کے لٹ کر دل کی منزل سے
ہوا ہے سر کو سودا پھر تمہاری زلف پیچاں کا
محبت پاؤں کو پیدا ہوئی ہے پھر سلاسل سے

یہ سناٹا ہے اب ارشدؔ ورنہ عشق سے پہلے
جگر سے ایک پہلو دوسرا آباد تھا دل سے

حواشی:

(۱) سید علی نقاد ثمر زیدی۔(زبانی بات چیت)

ارشدؔ - ماسٹر عبدالحی (ارشد الاعظمی)

محمد آباد یکم جنوری ۱۹۳۶ء ـــــ ۹؍جولائی ۲۰۰۸ء چوبیس پرگنہ بنگال

قصبہ محمد آباد گہنہ کا محلہ فرید آباد وطن تھا۔ انصاری برادری کے فرد تھے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مولوی محمد رمضان تھا جو ۱۹۵۳ء میں فوت ہو گئے اور انھیں داغِ یتیمی سہنا پڑا۔ چچا عبدالکریم سردار کی پرورش میں آ گئے انھیں کی نگرانی میں ابتدائی تعلیم محمد آباد میں ہوئی کلکتہ آئے تو

انھوں نے ہگلی مدرسہ سے میٹرک کیا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے عالم، جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل اور انسٹی ٹیوٹ آف کمرس برمنگھم (صوفی کمرشیل کالج کلکتہ) سے اسٹینوگرافی کی سند حاصل کی۔ کلکتہ یونی ورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی کیونکہ رشی بنکم چندر کالج نئی ہٹی بنگال اسی کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ تحصیل علم کے بعد بنیا پوکھر جونیر ہائی اسکول کلکتہ میں بطور ٹیچر مامور ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں حاجی نگر آدرش ہندی ودیالیہ ہائر سکنڈری اسکول کے شعبۂ اردو میں ہیڈ مدرس ہوئے۔ بعد میں کلکتہ کی مشہور صنعتی ملحکم چند جوٹ مل میں اکاؤنٹ سپر وائزر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان کی مستقل رہائش ۸/۷ انلسن روڈ حاجی نگر ضلع شمالی چوبیس پرگنہ (مغربی بنگال) میں تھی۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز حالات کے جبر اور زندگی کے شدائد میں تلخ تجربات اٹھانے کے بعد ہوا۔ والد مولوی محمد رمضان ۱۹۵۳ء میں فوت ہوئے تو ان کی شعری حس تیز ہوگئی۔ پہلی نظم نغمۂ بیداری ۱۹۵۳ء کے عصر جدید کلکتہ میں شائع ہوئی اس نظم میں انھوں نے سید تخلص اختیار کیا تھا۔ انھوں نے اس سے پہلے اعظم اعظمی کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ آخر میں ارشد الاعظمی ہو گئے۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ مضمون نگاری کو بھی اپنے خیالات ومحسوسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

ان کا نظریۂ شاعری تقلید کا مخالف اور ترقی پسندانہ طرز بیان کا حامی رہا۔ مگر وہ روایت کے حصار سے خود کو آزاد نہیں کر سکے۔ اپنی زندگی اور اپنے ماحول کو انھوں نے اپنی ادبی وفکری اور شعری ولسانی تجربہ گاہ قرار دے رکھا تھا۔ قدیم طرز رنگ وآہنگ میں کہنے کے باوجود نئی حسیت اور عصری تقاضوں پر نظر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ آہنگ میں قدیم صوتی نظام ہے۔ اگرچہ انھوں نے نئی سمت وجہت، نئے رجحانات اور ترقی پسندی کی بات کی ہے۔ مگر ان کا اسلوب قدیم سرمائے سے بہت حد تک متاثر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا کلام ہماری روایت کے رچاؤ میں اتنا رچا بسا ہے کہ قدیم ادبی وشعری ذخیرے سے اس کی ناوابستگی بے معنی حقیقت ہوگی۔ انھوں نے بڑا کام یہ کیا ہے کہ اپنے زمانے کے درد کو بھی اپنے دل میں اتار کر اس کو اپنی فکر کا حصہ بنا کر اور اس کو اپنے خونِ جگر کی سرخی دے کر پیش کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں کچھ امتیازی خصوصیات کی نمود کا احساس ہوتا ہے۔

کلکتہ ایک ایسا صنعتی شہر ہے جہاں کی زندگی میں تجارت کا پہلو اور معاش کے مطالبات سرفہرست ہیں۔ صارفیت جس کی پہلی ترجیح ہے۔ ارشد کے کلام میں اسلاف کی قدروں کی تلاش کا جذبہ اور بزرگوں کی روایت کے اتلاف کا درد ہے۔ وہ مادیت کو اخلاق کے زیر اثر رکھنے کے تمنائی اور زندگی کی نامیاتی قدروں کے مبلغ ہیں۔ انھیں پرانی معاشرت سے انحراف اور آباؤ اجداد کے بنائے ہوئے خطوط و دائرہ سے بچ کر چلنے کی روش پر ایک خاص قسم کے تکدر اور تصنع کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ڈھب سے نئی بشارتوں پر کان دھرنے کے ساتھ ماضی کے گنبد نیلوفری کی آواز بازگشت سے بھی استفادہ کرنے کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں جو احتیاط اور بچ بچ کر چلنے کی خواہش ہے وہ ماضی سے سلسلہ رکھنے کی وجہ سے ہے۔ وہ تسلسل اور ربط وتعلق کے شاعر ہیں، ترک وایجاد اور انقطاع و تنسیخ ان کے مذہب میں شامل نہیں۔ اسی لیے ان کے تجربات کے وقت بھی خلاؤں میں پرواز کرتے ہوئے ان کے قدم زمین ہی پر رہتے ہیں۔ وہ خارجی اور داخلی دونوں احساس کو اساس بنائے ہوئے ہیں۔

ان کے کلام و نگارشات جن اخبار و رسائل میں چھپے ان کے نام یہ ہیں۔ عبرت سوڑہ، سوز کلکتہ، خاتون مشرق دہلی، پرواز جالندھر، نیر تاباں کان پور، سیرت بنارس، آزاد ہند کلکتہ، اجالا کلکتہ، راشٹریہ سہارا (اردو دہلی) روزنامہ ہند، اخبار مشرق کلکتہ و دہلی، عصر جدید کلکتہ، اقراء، سنگم، آبشار، غازی، لبیک، افضل رسڑا، صدف جگندل، الہلال شیام نگر، لمعات حاجی نگر، عکس حیات خضر پور۔

جن اداروں سے ان کی وابستگی تھی ان کے نام ہیں۔ بزم شاہین کے صدر، نثار لائبریری حاجی نگر کے صدر، کاروان اردو مغربی بنگال خضر پور کلکتہ جامع مسجد مارواڑی کل کے جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو شاخ حاجی نگر کے جنرل سکریٹری، جنتا کلب و لائبریری کے رکن، مدرسہ شبینہ مدنی کے رکن، نئی ہٹی اردو پرگریسیو سوسائٹی کے رکن، انڈو جرمن فرینڈ شپ سوسائٹی بارکپور کے خازن۔

اردو، انگریزی، ہندی، عربی، فارسی اور بنگلہ زبانوں سے واقفیت تھی۔ بڑی پاپولر اور سرگرم زندگی گزاری اپنے دور و دیار میں ایک فعال اور متحرک انسان سمجھے گئے۔(۱)

نمونۂ کلام

کیوں ہو مجبور رستم پھر انساں — کیوں سہے رنج و الم پھر انساں
مزرعہ شوق کا ہوتا ہے ہرا — پانے والا ہے نعم پھر انساں
رہ نہیں سکتا صف آخر میں — لے کے اٹھا ہے علم پھر انساں
ہے علم دار حقیقت ارشدؔ — ہو گیا اہل ہمم پھر انساں

کیوں گردش دوراں مجھے برباد کرے ہے — ہر روز نیا اک ستم ایجاد کرے ہے
بھولے سے کہاں مجھ کو کوئی یاد کرے ہے — کب شادماں میرا دلِ ناشاد کرے ہے
لے آیا مرا شوق شہادت سرِ مقتل — لیکن ابھی تاخیر کیوں جلاد کرے ہے
پرواز سے محروم پر و بال ہیں میرے — مضبوط قفس کیوں مرا صیاد کرے ہے
دشوار ہے اب دام محبت سے نکلنا — یہ قید مسلسل کسے آزاد کرے ہے
چھوڑا ہے کسے دست اجل نے یہاں ارشدؔ — جنت کی عبث آرزو شداد کرے ہے

اندیشہ جو طوفانِ بلا کا نہیں کرتے — رخ کشتی ہمت کا وہ موڑا نہیں کرتے
اغیار کی نظروں سے جو پردہ نہیں کرتے — کیوں عام زمانے میں وہ جلوہ نہیں کرتے
بیمار تڑپتے ہیں شب و روز تمہارے — کیسے ہو مسیحا کہ تم اچھا نہیں کرتے
ہم جادۂ منزل کی طرف خود ہی بڑھیں گے — اے راہ نما کچھ تری پروا نہیں کرتے
نظروں سے گرا دیتے ہیں اہل نظر ان کو — جو اپنا مقام خودی پیدا نہیں کرتے
دنیا میں وہی تنگ نظر ہوتے ہیں ارشدؔ — جو اپنے سوا اوروں کو دیکھا نہیں کرتے

دیکھئے رسم وفا کو یوں نبھاتا کون ہے — دار پر منصور بن کر آج آتا کون ہے
میری آشفتہ بیانی سے ہیں بدظن آپ کیوں — آپ ہی بتلایئے دل کو جلاتا کون ہے
جرم ہے میری نظر کا یا تجلی کا قصور — میری عقل و ہوش کو آخر اڑاتا کون ہے
عمر تو میں نے گزاری، جان بھی جائے یہیں — تیرے کوچے سے بھلا اب اٹھ کے جاتا کون ہے
خرمنِ دل کو جلایا کس کی نگہِ نازنے — ایک محشر سا بتا ارشدؔ اٹھاتا کون ہے

وعدہ کا اس کے کوئی بھروسہ نہ کیجئے | اس بے وفا پہ دیکھئے تکیہ نہ کیجئے
غصہ جو قہر ہے تو کرم بھی ہے اک ستم | اب مہر کی نظر سے بھی دیکھا نہ کیجئے
کہتا ہے شوق دل کا کہ پردہ اٹھایئے | غیرت یہ کہہ رہی ہے کہ ایسا نہ کیجئے
رکھنا پڑے گا عشق و محبت کا جب بھرم | حد ادب یہی ہے کہ شکوہ نہ کیجئے
ارشدؔ نہ ہوگا سجدہ کوئی قابل قبول | جب تک در حبیب پہ سجدہ نہ کیجئے

حواشی:

(۱) راقم کو یہ تفصیلات ارشاد احمد انصاری بن مولانا نثار احمد مرحوم ساکن حاجی نگر ضلع شمالی چوبیس پرگنہ مغربی بنگال موجودہ وائس چیرمین حالی شہر مغربی بنگال سے ملی ہیں۔ مغربی بنگال میں اردو غزل آزادی کے بعد۔ جاوید ارشد ص ۱۴۷ پر بھی مختصر حالات واشعار ہیں

اسحٰقؔ - حافظ محمد اسحٰق مئوی

معلم پیشہ تھے اور مئو ناتھ بھنجن سے باہر رہتے تھے مگر انتقال اپنے وطن ہی میں کیا۔ بڑے متقی، پرہیز گار اور عارف باللہ بزرگ تھے۔ زندگی بھر نعمت اولاد سے محروم رہے(۱)۔

ان کی نعتوں کا سولہ صفحے پر مشتمل ایک مختصر مجموعہ ''مرأۃ النعت'' کے نام سے ۱۳۴۵ھ میں شائع ہوا تھا اس وقت یہ مئو کے محلہ کا دی پورہ میں سکونت گزیں تھے۔

ان کی شاعری کو اگر فنی معیار اور شعری وادبی کسوٹی پر پرکھا جائے تو کوئی خاص بات نہیں ملے گی بلکہ زبان و بیان کے معائب کے ساتھ اسلوب و ہیئت میں روایتی انداز ملے گا لیکن ان کے کلام کو اگر فن شاعری کے اصول و معیار سے بلند ہوکر دیکھا جائے تو اس میں شاعر کی گرمیِ خلوص، اور جذبۂ محبت وعقیدت کی حرارت ضرور ملے گی۔ ان کا مقصد شاعری کرنا اور فن کے جوہر دکھانا نہیں ہے بلکہ انھوں نے شعروشاعری کو اپنے قلبی تاثرات، ذہنی محسوسات، مقامات تصوت کی تشریحات، اور دینی جذبات کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا ہے۔ ان کی شمولیت سے اعظم گڑھ کی ایک صدی پہلے کی اس ادبی فضا کا دکھانا مقصود ہے جو ذوق تصوف سے آشنا ارباب باطن کی خانقاہی زندگی پر چھائی

ہوئی تھی اس کی ادبی اہمیت چاہے کچھ بھی نہ ہو لیکن اس کی تاریخی، ثقافتی اور سماجی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ان کے کلام میں بلند خیالی اور خوش نوائی کے ساتھ کہیں کہیں پیکر تراشی، تشبیہ و استعارہ اور تلمیحات کی رنگینی لطف سخن کو دوبالا کر دیتی ہے۔

نمونۂ کلام

مشتاق ہے دل آپ کے دیدار کی خاطر   گاہے در دولت پہ بلا لیجے تو اچھا
شکوہ نہ گیا دل سے مرے تشنہ لبی کا   اک جام محبت کا بلا دیجے تو اچھا
دیار ہند سے اک پل میں پہنچا دے مدینہ کو   اگر فرمان ہوجائے ہوا کو یا رسول اللہ
رکھتے ہیں زرِ نقدِ محبت کا خزانہ   بے مثل تونگر ہیں یہ حضار محمد
جاروب پلک ہوتی ہے جبریل کی جس جا   عالی ہے جہاں میں وہی سرکارِ محمد
کیجے ملاحظہ یہ ہے تحفہ درود کا   ہمراہ اپنے لائے ہیں سرکار کے لیے
بیٹھے ہیں سر جھکائے پس خانۂ نبی   طوبیٰ کو چھوڑ سایۂ دیوار کے لیے
اسحق چلو کر لو مدینے کی زیارت   اوقات بسر کرتے ہو کیوں بیٹھے بخانہ
شوق دیدار میں شبانہ روز   چشم وا رکھتے ہیں دلِ بیدار
کر گیا کوچ ہم تھے غفلت میں   قافلہ لے کے قافلہ سالار
چشم بے نور کو کروں روشن   ہاتھ آئے جو مدینے کا غبار
مردہ ہزار سالہ ہو زندہ بلفظ قُم   گر آپ ایک دم لبِ جاں بخش وا کریں
کبھی گر دیکھ پاتے آپ کی محراب ابرو کو   مسیحا سجدۂ شکرانۂ یزداں ادا کرتے

حواشی:

(۱) دل حسینی مئوی

اسد - مولانا اسداللہ کوپاگنجی

۔۔۔۔ ۳۰/ذوالقعدہ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء

مولانا اسداللہ اپنے وقت کے ایک جید عالم دین تھے۔ بلکہ وہ اپنے دور میں طبیب

حاذق کے طور پر بھی مشہور تھے۔ مولانا محمد عثمان معروفی لکھتے ہیں کہ مولانا عظیم اللہ صاحب (یکم رمضان ۱۳۱۰ھ۔ ۲۶ر مئی ۱۹۷۶ء) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ حنفیہ جون پور میں آپ نے مولانا ہادی حسن صاحب سے پڑھا ہے۔ وہ مولانا اسد اللہ صاحب کو پا گنجی کی ذہانت واستعداد کی تعریف کرتے تھے(۱) مولانا اپنی عالمانہ شان ووقار کا بڑا پاس ولحاظ رکھتے تھے۔ عبا ہمیشہ زیب تن رہتی تھی۔ طبابت وحکمت میں حذافت ومہارت کی دولت کے ساتھ شاعری کا بھی پاکیزہ ذوق تھا۔ کو پا گنج کے مشہور شاعر بندہ علی شاہ آپ سے معمر تھے مگر وہ بھی اپنی شاعری میں ان سے استفادہ کرتے تھے۔

مولانا نے تحصیل علم کے بعد عمر کا بیشتر حصہ بمبئی، مالیگاؤں، بھیمڑی، اکولہ وغیرہ کی علمی ودینی سرگرمیوں میں گزارا اس لئے ان کے احوال بھی پردۂ گم نامی میں ہیں۔ آخری ایام میں وطن کی طرف مراجعت کی اور کو پا گنج کا قبرستان گنج شہیداں آپ کا مدفن بنا۔

مولانا اپنے دیار میں بھی اپنی علمی صلاحیتوں کی وجہ سے اہل علم کے نزدیک شہرت ومقبولیت رکھتے تھے۔ اسی لئے ان کی وفات پر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا انعام الحق مئوی نے ان کا پُرسوز مرثیہ کہا جو درج ذیل ہے

در جوار رحمت غفار چوں نازل بشد — خیرمقدم گفت رضوان ودرِ جنت کشاد
غوطہا درلُجۂ تاریخ چوں اختر ببرد — داد غواصے در تاریخ "اومغفور باد"
۱۳۴۰ھ

مولانا انعام الحق شعاعؔ ملا فاضل مئوی جو ضیاء مئوی کے شاگرد تھے ان کا مرثیہ یہ ہے

نسیم علم وہنر مولوی اسداللہ — کرم سے جن کے کہ تھا باغ باغ کو پا گنج
شعاعؔ نے سنہ رحلت جو پوچھا ہاتف سے — بتائیں جو کہ ہیں اہل دماغ کو پا گنج
الگ نکل کر اک امی نے یوں اشارہ کیا — گل آج ہائے ہوا اب چراغ کو پا گنج
۵۱ — ۱۳۴۰ھ

حواشی:

(۱) تذکرہ مشاہرکوپا گنج۔ محمد عثمان معروفی طبع اول ۱۹۸۶ء ص ۸۲

اسعد سیمابی - مولوی فقیراللہ مبارک پوری

۱۹۰۴ء ــــ ۱۵؍دسمبر ۱۹۸۲ء/ ۲۸؍صفر ۱۴۰۳ھ بدھ

اسعد علامہ سیماب (۱) اکبرآبادی اور رحمت الٰہی برق اعظمی کے شاگرد تھے۔ اور ان دونوں اساتذہ کے واسطے سے خاندان داغ کے ایک رکن تھے۔ ان کا تعلق مبارک پور کے شعراء کے اس سلسلۃ الذہب سے تھا جس نے شعروسخن کے چراغ کی لوکوتیز کرنے کی سعی بلیغ کی۔ اور ہر دور میں ادبی محاذ پر سرگرم عمل رہے۔

ان کے والد کا نام ولی اللہ تھا حج بیت اللہ سے مشرف تھے محلہ پورہ رانی اجودھیا دھوبی کے مکان کے پاس جو دیوبندی اور بریلوی جماعت کا مشترکہ مدرسہ مصباح العلوم تھا اس میں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے اساتذہ میں مولوی محمد محمود معروفی متوفی ۱۴؍اپریل ۱۹۵۱ء اور مولوی محمد صدیق گھوسوی متوفی ۲۱؍مارچ ۱۹۱۶ء تھے۔ محلہ پورہ رانی میں حضرت مولانا قاری محمد یحیٰ ناظم اعلیٰ اشرفیہ اور مضطرؔ مبارک پوری کے گھر کے سامنے جو دالان نما گھر تھا اس میں سُنّی دیوبندی اختلاف کے بعد اہل سنت کا مدرسہ مصباح العلوم آ گیا تو اسعد یہاں چلے آئے۔ پھر محلہ پرانی بستی میں جامع مسجد راجہ مبارک شاہ کے متصل گدامیاں کے مکان میں مدرسہ آ گیا اور طلبہ کی کثرت کی وجہ سے راجہ مبارک شاہ کی جامع مسجد میں بھی تعلیم ہونے لگی تھی، پرانے مدرسہ میں بھی جو پرانی بستی میں ہے وہاں بھی اشرفیہ مدرسہ قائم رہا اس میں شرح جامی شرح وقایہ اور مشکوٰۃ کی تعلیم مولانا عبدالحفیظ ابن مولانا عبدالمجید مفتی آگرہ (۱۳۱۸ء۔ ۱۹۵۸ء) سے حاصل کی۔ ۱۹۲۰ء میں والد کی علالت کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا۔

شعروشاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا مگر باقاعدہ آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوا پہلے زماںؔ مرحوم کو کلام دکھایا پھر ۱۹۴۵ء میں سیماب اکبرآبادی (۱۸۸۰ء-۱۹۵۱ء) سے وابستہ ہوئے۔ ان سے

خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح لیتے تھے۔ سیماب اکبرآبادی پاکستان چلے گئے تو یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ ۱۹۶۵ء میں برق اعظمی کی تحریک پر دوبارہ شاعری شروع کی اور انھیں کو کلام دکھانے لگے۔ حکومت برطانیہ کے زمانے میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر رہے۔ بڑے سرگرم اور فعال و متحرک قسم کے انسان تھے۔ دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم کے بہت بڑے خیرخواہ تھے۔ اور اس کے رکن ہمیشہ نامزد کیے جاتے تھے۔ تحریک خلافت اور آزادی ہند کے پرجوش علم برداروں میں سے تھے۔ مبارک پور کی خلافت کمیٹی سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ اس کی رسید بھی چھپی تھی اور چندہ وغیرہ جمع کر کے باہر بھیجا جاتا تھا۔ اس تحریک چندہ میں ان کی سرگرم شرکت رہا کرتی تھی۔

تقریباً تمام اصناف سخن میں ان کے شعری آثار ملتے ہیں۔ مشاعروں اور مقاصدوں میں شریک ہوکر خوش ہوتے تھے۔ علماء و مدارس سے انھیں بڑی دل چسپی تھی علماء کی محفلوں میں بیٹھ کر انھیں لُطفِ زندگی حاصل ہوتا تھا۔ دینی و مذہبی اور سیاسی وسماجی ذہن و مزاج رکھتے تھے اور جس سے بھی ملتے تھے کھل کر اور بے ساختہ ملتے تھے۔ مدرسہ اشرفیہ کی تعمیر جدید کے لئے جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ سے دو ماہ تک چندہ کا جو سلسلہ شروع ہوا اس میں ان کی لکھی چندے کی نظموں کو بھی زماں مرحوم، میاں صاحب عبدالکریم عاشق، میاں جی غلام حسین خاکی وغیرہ کی نظموں کے ساتھ خاص اہمیت حاصل تھی۔ مولانا مفتی عبدالمنان اعظمی رقم طراز ہیں کہ "مولوی فقیراللہ صاحب مرحوم شاعر بھی تھے اور ان کی نظمیں بھی چندہ میں پڑھی جاتی تھیں۔ انھیں کی تخریج کردہ تاریخ سنگ بنیاد، بے حد عمدہ اور مقبول خاص وعام ہوئی۔" پھر نہ تاریخ کیوں "باغ فردوس" ہو۔" (۲) بہت بے لوث، مخلص، مرنجان مرنج اور کشادہ دل بزرگ تھے۔ جس سے بھی ملے کھل کر ملے کسی سے بغض نہیں رکھا۔

اسعدؔ کی شاعری جذبات عشق و محبت سے عبارت ہے۔ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھنے کے باوجود ان کی امنگ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کے کلام میں عہد شباب کے برق پارے اپنی تمام تر جوش و گرمی کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کا مزاج بہاریہ اور غنائیہ عناصر سے بنا تھا۔ اس لیے ان کے یہاں عشق و مستی کا بہاؤ اپنی راہیں خود تلاش کر لیتا ہے۔ غزلیں تغزل سے لبریز ہیں اور الفاظ میں سادگی و برجستگی ہے ان کی خصوصیات کلام میں ان کی طبیعت کا رنگ شامل ہے۔

نعت ومنقبت میں عشق ومستی کا یہی نقیب شاعر جوش جنوں کی وادی سے نکل آتا ہے اور دیوانگی وفرزانگی کے درمیان نقطۂ اتصال تلاش کر کے اعتدال وتوازن پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ یہ قدسی صفات بارگاہوں کے پایۂ احترام کا عرفان رکھتا ہے۔ یہ شاعر نعت اپنے ڈھب سے سیدھے سادے پیرائے میں گفتگو کرنے کو شاعری کا کمال سمجھتا ہے۔ اسعدؔ دل کے گداز، عشق کے سوز اور دردِ محبت کے داغہائے سینہ سے اپنی مذہبی واعتقادی فضا کو روشن کرتے ہیں۔

فقیر اللہ اسعد سیمابی نے کچھ تو نیم قصباتی ماحول، کچھ اپنے پیشرو شعراء اور کچھ ادبی مرکزوں سے دوری کی وجہ سے شاعری کو عشق کی حد تک نہیں برتا۔ شاعری سے ان کا معاملۂ دل وقت پر کام آنے والی چیزوں جیسا تھا۔ اہل علم ونقد کا فیصلہ ہے کہ اچھا ادب بہرحال عشق سے پیدا ہوتا ہے۔ فن کار جب تک زندگی، زندگی کے حسن، زندگی کے نشیب وفراز، انسان، انسان کی فطرت، اس کی خوٗبوٗ، خوبیوں اور خامیوں سے عشق نہیں کرتا اس وقت تک اس کی ادبیت میں ابدیت کی شان نہیں آتی۔ ان کی شاعری نے ہمارے شعری سرمائے اور ہمارے معاشرے پر نظر ڈالی لیکن یہ نگاہ واقعتاً ایک اچٹتی ہوئی اور سرسری سی تھی۔ اسی لیے واقعے تو خیر واقعے تھے جو ایک لمحاتی اور اضطراری حقیقت رکھتے تھے، بڑے بڑے ہنگامے اور انقلابات بھی ان کی شاعری کا موضوع نہ بن سکے، ان کا تعلق اس دور سے ہے جب اسالیب بیان کے نئے نئے دبستان وجود میں آچکے تھے۔ ساری ناکامیوں اور کامیابیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ادب نے معاشرتی مسائل کو اپنا موضوع بنالیا تھا۔ اس نے اپنے عہد کے سارے تاریخی محرکات اور فنی واقداری رجحانات کو اپنے اندر سمولیا تھا۔ اردو شعر وادب کی دنیا میں قدیم وجدید شعریات ولفظیات کی روایت بن چکی تھی۔ اور نئے تجربات کے لیے روایات کی زمین تیار ہوچکی تھی۔ اس کا مقصد انسانی تہذیب و تاریخ کو ایک نئی جہت، نیا موڑ اور نیا رخ دینا تھا اور معاشرے میں ایک ذہنی انقلاب برپا کرنا امر واقعی بن چکا تھا۔ فن کاروں نے معاشرتی تحریکات کو فروغ دینے کے لیے اپنے قلم کو علم بنالیا تھا۔ انھیں علامہ سیماب اکبرآبادی جیسے نابغۂ روزگار و بالغ نظر شاعر کی رہنمائی حاصل ہوگئی تھی۔ جن کی فکر میں عصری بصیرت کی جھلکیاں اور جن کے اکتسابات میں ذہنی ونفسیاتی مسائل کے عکس نظر آتے

ہیں۔ اگر اسعدؔ نے اپنے فکر وفن کے لیے ان کے مشورے کی روشنی میں فکری وفنی ریاضت کی ہوتی تو ان کی شاعری کا افق ضرور بے کراں ہوجاتا۔ اور ان کے کلام میں معاشرے کی کیفیات کے ساتھ ادبی سماج کی کیفیات کا بھی بھر پور اظہار نظر آتا۔ ان کا کلام ایسے بزرگ کی واردات قلب کا نمونہ ہے جو بت طناز کی عشوہ طرازیوں اور چھیڑ خانیوں سے پیدا ہونے والے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے اور جرأت مند ہونے کے بعد اپنی سادہ لوحی کی بنا پر اپنے غیر استعاراتی اور براہ راست لب ولہجہ میں گفتگو شروع کر دیتے ہیں جس میں جذبے کی اصلیت، بات کی واقعیت اور کیفیت کی سچائی تو ضرور ہوتی ہے لیکن بات میں ندرت اور تاثرات میں رنگینی ولذت نہیں ہوتی۔

نمونۂ کلام

بہار رخصت ہوئی چمن سے ہر اہل دل اک عذاب میں ہے
سکوں میسر نہیں کسی کو نفس نفس اضطراب میں ہے
اگر ہے جینا جہاں میں تم کو تو پہلے مرنے کا ڈھنگ سیکھو
ستم کشو! زندگی تمہاری چھپی ہوئی انقلاب میں ہے
جمال تازہ برس رہا ہے کچھ آج ساقی کے میکدہ پر
نگاہِ ساقی یہ کہہ رہی ہے کہ زندگانی شراب میں ہے

بہار کہتے ہیں جس کو یہ وہ بہار نہیں — ہوائے گلشنِ ہستی تو خوش گوار نہیں
رہینِ لذتِ غم مجھ کو یوں ہی رہنے دے — حیات تازہ تو اے دوست خوش گوار نہیں
بہار تازہ تو آئی چمن میں اے اسعدؔ — مگر بہار کا اب مجھ کو اعتبار نہیں
جہاں سے جلوۂ فطرت کی ارزانی نہیں جاتی — سحر سے پہلے تاروں کی درخشانی نہیں جاتی
یہ آنسو مختصر ہیں، کچھ حقیقت ہی نہیں ان کی — مگر قطرے یہ وہ ہیں جن کی طغیانی نہیں جاتی
محبت میں یہ عالم ناتوانی کا ارے توبہ — وہ بالیں پر ہیں صورت ان کی پہچانی نہیں جاتی
غزل کیا کہیں جب طبیعت خجل ہے — نہ پہلے سے ہم ہیں نہ پہلے سا دل ہے
وہ روندا کیے اور میں کہتا رہا یہ — ارے میرا دل ہے، ارے میرا دل ہے

جوانی سے بہتر بڑھاپا ہے میرا
کہ وہ عارضی شے تھی یہ مستقل ہے

شاید گرے گی اس پر پھر برق آسماں سے
ظاہر یہ ہو رہا ہے خاشاک آشیاں سے

واقف نہیں ہے کوئی سوزِ غم نہاں سے
شاید اب اٹھ گئے ہیں اہل نظر جہاں سے

ہوجائے گا زمانہ دم بھر میں محو حیرت
وہ کام لوں گا اب میں اک عزمِ نوجواں سے

دیکھو قدم اٹھاؤ، ہاں ہاں قدم بڑھاؤ
پاؤ گے تم نہ منزل بچھڑے جو کارواں سے

واقف نہیں تھا پہلے اس لطف اس مزے سے
کیا سر اٹھاؤں گا اب میں تیرے آستاں سے

آرائش گلستاں آساں نہیں ہے ایسی
تخریب ہو رہی ہے ترمیم گلستاں سے

اب سرگزشت اپنی ان سے کہوں گا میں بھی
معلوم ہو رہے ہیں وہ آج مہرباں سے

میرے شکستہ دل سے بیزار کیوں ہے کوئی
اس کے لیے نیا دل لاؤں گا میں کہاں سے

تیری وفا سے بدظن وہ شوخ خود نما ہے
لیکن میں مطمئن ہوں اس دور امتحاں سے

یہ دل فریب منظر، یہ کیف زا نظارہ
آنکھیں لڑا رہا ہے اسعدؔ اب آسماں سے

بتائیں کیا تمہیں ہم نے جہاں میں آ کے کیا پایا
در فخر رسل سے راستہ حق کا ملا پایا

توسل سے ترے مانگا جو حق سے مدعا پایا
"تجھے پایا تو سب کچھ یا محمد مصطفیٰ پایا"

نظر آئینہ نور نبی پر جب پڑی اپنی
تو اس میں نورِ حق کو سر بہ سر جلوہ نما پایا

تمہارے روئے پرانوار کی تمثیل میں ہم نے
کلام اللہ میں شمس الضحیٰ لکھا ہوا پایا

نگاہِ اولینِ حضرتِ آدم پڑی جس دم
تمہارا نام نامی عرش اعظم پر لکھا پایا

وارد جو چمن میں قدم ناز نبی ہے
مستی میں ہر اک شاخ شجر جھوم رہی ہے

سرکار کے آنے کی کچھ اس درجہ خوشی ہے
صلوٰۃ کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے

آیا جو مریض اس میں شفا اس کو ملی ہے
صد رشک مسیحا شہِ طیبہ کی گلی ہے

نیند آئی نہ دم بھر بھی کبھی باغ میں اس کو
نرگس کی زیارت کے لیے آنکھ کھلی ہے

وہ آنکھ سوئے حور جناں کیا بھلا اُٹھے
جس آنکھ میں تنویر رخ پاک نبی ہے

رضواں تری جنت کے لیے خاک میں ترسوں
وہ بھی تو مدینہ ہی کی تصویر کشی ہے

ذکر شہ دیں سن کے اگر فرط ادب سے
بھیجو نہ درود ان پہ تو بے ادبی ہے

کچھ ہو کہ نہ ہو پاس مرے غم نہیں اسعدؔ آنکھوں میں تجلّی مدینہ تو بسی ہے

حواشی:

(۱) عاشق حسین سیماب اکبرآبادی جون ۱۸۸۰ء اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اجمیر میں عربی وفارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی گورنمنٹ کالج اجمیر سے انگریزی میں ایف، اے کیا اور جونپور کی ایک فیکٹری میں ملازم ہوگئے۔ ۱۹۲۲ میں آگرہ آکر قصرادب کی بنیاد ڈالی ۲۳ء میں پیمانہ ۲۹ء میں ہفتہ وار ''تاج'' اور ۳۰ء میں ماہنامہ شاعر جاری کیا۔ ۱۸۹۸ء میں داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے ۳۱ر جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی میں انتقال کیا، دوہزار سے زیادہ ان کے شاگرد ہوئے مختلف عنوانات ومسائل پر ۱۰۳ منظوم ومنثور کتابیں شائع ہوئیں (تفصیل کے لیے سیماب حیات اور کارنامے، سیماب کی نظمیہ شاعری، شاعر شمارہ ۴، ۵، ۶، ۱۹۷ء ہم عصر اردو ادب نمبر (شاعر) جلد اول ۱۹۹۷ء ۹۸ء وغیرہ دیکھیں۔

(۲) مدرسہ اشرفیہ سے الجامعۃ الاشرفیہ تک مفتی عبدالمنان اعظمی مطبوعہ ۲۰۱۳ء ص ۵۰

اسلمؔ - مولانا محمد اسلم جیراجپوری

۲۷ر جنوری ۱۸۸۲ء/ ۷ر ربیع الاول ۱۲۹۹ھ ـــــ ۲۸ر دسمبر ۱۹۵۵ء

یہ مولانا سلامت اللہ جے راج پوری (۱۸۵۱ء- ۱۵ر جون ۱۹۰۴ء) کے لائق فرزند تھے۔ پانچ برس کی عمر میں مکتب میں داخل کیے گئے ان کے والد مولانا سلامت اللہ جماعت اہلِ حدیث کے ممتاز عالموں میں تھے۔ نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال میں جن علماء کو جمع کیا تھا ان میں ایک مولانا سلامت اللہ بھی تھے۔ وہ بھوپال میں عربی مدارس کے مہتمم ہونے کا اعزاز رکھتے تھے۔ اس لیے مولانا اسلم کی تعلیم کا انتظام بھی وہیں ہوا۔ ۱۳۰۵ھ میں حافظ سید مظہر حسین کی نگرانی میں حفظ قرآن کی تکمیل کی۔ اس کے بعد فارسی درسیات کا آغاز فرمایا۔ پوری گلستاں بوستاں اور استاد کی لکھی ہوئی قواعد کی کتاب اپنی خداداد قوت حافظہ کی بنا پر یاد کرلی۔ اپنے استاد مولانا فتح اللہ سے فارسی کی تحصیل وتکمیل کرکے مولوی شاہ محمد سے علم ریاضی حاصل کیا۔ اس طرح فارسی، حساب، اقلیدس، مسافت اور جبر ومقابلہ کی تعلیم دو برس میں مکمل کرلی اور انگریزی کے حصول کی

طرف مائل ہو گئے۔علوم عصریہ کے بعد علوم دینیہ کی طرف رجحان پیدا ہوا تو ایسے صاحب علم وکمال ہوئے کہ ہزاروں میں انتخاب روزگار اور یادگار زمانہ بن کر رہے۔

تکمیل تعلیم کے بعد لاہور کے پیسہ اخبار میں ملازمت کر لی۔ وہاں کے حلقۂ ادارت میں شامل ہوئے اور عربی کے ترجمہ نگار کی حیثیت سے اہم علمی وقلمی خدمات انجام دیں۔ اس سے علاحدہ ہو کر علی گڑھ کالج آئے اور عربی کے مدرس کی حیثیت سے طالب علموں کے ذوق علمی کی سیرابی کی۔ یہاں لٹن لائبریری کی علوم شرقیہ کی کتابوں کے نگراں بھی رہے اور مشرقی کتابوں کی فہرست سازی کر کے علم وتحقیق کی راہیں آسان کیں۔ ۱۹۲۰ء میں جب یونی ورسٹی قائم ہو گئی تو اس کے شعبۂ عربی میں شخصیت سازی اور کارمردم گری میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک ترک موالات کے دور شباب میں مولانا محمد علی جوہر کی خواہش پر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اپنی تمام علمی وتدریسی دل چسپیاں وابستہ کر لیں اور یہیں پوری عمر عزیز گزار دی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی آج جو کچھ بھی ہے اس میں ان کی بھی قربانیاں ہیں۔ اس کے فروغ واستحکام اور مسلم انڈیا کے تمدن وتاریخ کی راہ عمل متعین کرنے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ ہمیشہ ان کا بھی نام اور کام روشن رہے گا۔

مولانا کا علم زندہ تھا اور اس میں بڑی برکت تھی۔ وہ اپنے دور کے ارباب فکر و دانش اور صاحبان کمال وشعور میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور مدح وستائش کی زبان سے یاد کیے جاتے تھے۔ وہ باہر کی دنیا میں بھی اپنا ایک پایۂ اعتبار اور مقام استناد بنائے ہوئے تھے۔ انھیں کعبہ شریف پر غلاف چڑھانے کا شرف بھی حاصل تھا۔ مگر ان سب کے باوجود فروتنی اور عجز و انکساری سے کبھی وہ خالی نہیں رہے۔ نام ونمود اور شہرت طلبی سے انھیں کوئی تعلق نہیں تھا۔ سادگی و سادہ لوحی ان کی سیرت کا ایک روشن باب ہے۔ ان کا قلم بڑا زرنگار اور رواں تھا وہ ہر موضوع پر حاوی تھے مگر اسلامی تاریخ ان کا خاص میدان تھا۔ وہ جب تک اس خیمۂ افلاک کے نیچے رہے اردو میں تاریخ اسلام کے گوشوں کو قلم کی رنگین روشنی اور تحقیق کے قمقموں سے جگمگاتے رہے۔

تعلوم عرب (تاریخ تمدن اسلامی۔ جرجی زیدان کا ترجمہ) تاریخ القرآن، حیات حافظ شیرازی، حیات جامی، تعلیمات قرآن، نوادرات، جواہر ملیہ، مقالات اسلم، ہمارے دینی علوم

(مجموعۂ مضامین) محجوب الارت، عربی خط، تاریخ الامت (۸ حصے) ارکان اسلام، عقائد اسلام (یہ دونوں کتابیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے نصاب میں شامل رہ چکی ہیں) الوراثت فی الاسلام، سیرت فاتح عمرو بن العاص (فاتح مصر)، خواتین اور نکات قرآن، دیوان حافظ کی تاریخی فالیں اور تاریخ نجدان کی اہم کتابیں ہیں جن سے ان کی علمیت، تحقیقی بصیرت اور تصنیفی صلاحیتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

الوراثت فی الاسلام میں مولانا نے بعض مسائل وراثت جیسے عول وحجب وغیرہ کا انکار کیا ہے۔ ترکی کے مشہور عالم وفقیہ موسیٰ جاراللہ نے صحیفۃ الفرائض نامی کتاب لکھ کر ان کے شبہات اور زیر بحث مسائل پر دل چسپ اور تحقیقی نظر ڈال کر علمی جواب دیا ہے۔ مولانا کی تاریخ القرآن ۱۹۲۵ء، میں شائع ہوکر علمی حلقوں میں شہرت کا سبب بنی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے مصحف عثمانی کے رسم الخط وغیرہ پر علامہ زمخشری اور امام سیوطی جیسے قدیم ماہرین علوم قرآنی کے حوالے سے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں اور اس کے اتباع پر بھی بحث کی ہے۔ ان کے بعد اردو میں اسی موضوع پر اور اسی نام سے مولانا مفتی عبداللطیف نے بھی ایک کتاب اپنی تحقیقی وعلمی یادگار بنا کر پیش کی۔ اس میں قرآن کی جمع وترتیب کے مباحث کے ساتھ مصحف عثمانی کی کتابت اور اس کے تاریخی موضوعات ومسائل پر تحقیقی روشنی ڈالی ہے۔ جمع وتدوین قرآن کے نام سے سید صدیق حسن کی بھی ایک کتاب دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے ۱۹۶۴ء میں اشاعت پذیر ہوئی اس میں بھی عثمانی کتابت ورسم خط کے تعلق سے اجمالاً مگر کارآمد اور دل چسپ بحث چھیڑی گئی ہے۔ حیات حافظ اور حیات جامی سے ان کی فارسی شعر وادب سے گہری وابستگی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان کتابوں میں انھوں نے حالات زندگی کے ساتھ ان دونوں اہم شاعروں کے اکتسابات وافاضات، افادات واضافات اور تفردات وخصوصیات کو بھی روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ الامت کو ارباب علم نے شوق کی نظر سے پڑھا اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی وجہ یہ تھی کہ مصنف نے اسلامی تاریخ کے مستند ماخذ کی مدد سے بڑی تلاش وجستجو اور تحقیق وتنقیح کے بعد اس سلسلے کو مرتب کیا ہے۔ امت محمدی کی یہ تاریخ اپنی گوناگوں خوبیوں، علمی نوادرات اور صحت واقعات کے سبب دوسرے ممالک میں بھی مقبول

ہوئی۔ اس کے آٹھوں حصے سیرت رسول، خلافت راشدہ، خلافت بنو امیہ، خلافت عباسیہ، عباسیۂ بغداد، عباسیۂ مصر، آل عثمان، تاریخ اسلام اور قرآن پر مشتمل ہیں۔

مولانا اسلم اپنے علم و وجدان اور علمی و تحقیقی تصانیف کی وجہ سے بڑی اہم شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے بعض مسائل پر اپنی محققانہ رائے کا اظہار بلاخوف اور برملا کیا ہے۔ وہ علم و تحقیق سے شغف رکھنے والے صاحب قلم تھے اور مباحث کو تحقیق و تجزیہ تک محدود رکھنا پسند کرتے تھے۔ وہ ذاتیات پر حملہ کرنے اور نفس مسئلہ سے علاحدہ ہو کر گفتگو کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کی علمی بصیرت غلوئے عقیدت کے حصار سے باہر تھی۔ ان کے والد مولانا سلامت اللہ جے راج پوری حجیت حدیث کے غالی مبلغ تھے اور ان کے یہی فرزندان کے اس رنگ و آہنگ پر سوالیہ نشان لگانے والے تھے یعنی انھیں حجیت حدیث پر اتنا اصرار نہ تھا بلکہ وہ تو بعض مقامات پر حدیث کو خبری حیثیت دینے کی وکالت کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ خود کو فرقۂ قرآنیہ میں بھی شمار نہیں کرتے۔ وہ اپنے مجموعۂ مقالات نوادرات میں لکھتے ہیں کہ ''میں اہل قرآن کے فرقہ میں داخل نہیں کیوں کہ میں اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یقینی مانتا ہوں بخلاف اہل قرآن کے جو عمل متواتر کے قائل نہیں''۔ ان کی وفات کے بعد شاہ معین الدین احمد ندوی نے معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۵۶ء کے شذرات میں لکھا ہے کہ ''اہل قرآن کی طرف مائل تھے مگر منکرین حدیث کی طرح غالی نہ تھے اور سنت متواترہ کو مانتے تھے عملاً دین دار اور طبعاً بڑے سادہ، متواضع اور خلیق تھے''۔

ان کی سادگی کے بارے میں ان کے ہم وطن ضیاء الرحمن اعظمی نے تاریخ جے راج پور میں صفحہ ۴۳ پر ایک بہت دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ ''ایک بار اوکھلا (دہلی) اپنے گھر رات کو کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی آمد ہوئی۔ مولانا نے انھیں مدعو کیا اور ذاکر صاحب یہ کہتے ہوئے کہ آج مولانا کے ساتھ کھانے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ بسم اللہ کر کے بیٹھ گئے۔ کھانے میں دال روٹی کے ساتھ صرف چٹنی تھی۔ مولانا کے ملازم نے ذاکر صاحب کی پشت سے انگلیوں کے گول گول نشان کا اشارہ شروع کر دیا جسے مولانا نے اندیکھی کر دیا۔............ جب ڈاکٹر

صاحب چلے گئے تو مولانا نے ملازم سے پوچھا کہ یہ تم انگلیوں سے اشارہ کیا کر رہے تھے؟ ملازم نے جواب دیا: ''وہ کوفتے رکھے ہوئے تھے میں نے سوچا دسترخوان پر یہ بھی آجائے تو اچھا تھا صرف چٹنی ہی تھی۔

مولانا نے نہایت سادگی اور بھولے پن سے کہا مگر وہ کوفتے تو کل کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔...... اس کے بعد انھوں نے جو بات کہی وہ سونے کے حرف سے لکھنے کے لائق ہے۔ فرمایا مہمانوں کے لیے جب آپ تکلف کرنا شروع کر دیں گے تو کچھ ہی دنوں میں تکلف سے گھبرا کر بداخلاقی کا مظاہرہ بھی شروع ہوجائے گا۔ ان کو دیکھ کر کبھی چھپ جائیں گے کبھی جھوٹ کہلا بھیجیں گے کہ کہہ دو گھر میں نہیں ہیں۔ اس لیے بہتر ہے آپ جو کچھ کھا رہے ہوں وہی اپنے مہمانوں کو بھی حاضر کر دیں۔ اس طرح ساری عمر نہ تو آپ مہمانوں سے گھبرائیں گے نہ ہی کبھی بداخلاقی کے جرم کا ارتکاب کر سکیں گے''۔

مولانا اسلم عربی فارسی اور اردو شعر و ادب کی تاریخ پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی کتابیں اس پر شاہدِ عدل ہیں۔ وہ مشرقی شعور نقد و نظر اور عربی و فارسی کے اصول انتقاد سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ ان کی نظر میں وہ تمام نکات روشن تھے جن کے التزام سے کوئی فن پارہ شاہ کار بن کر تاریخ ادب میں یادگار ہوجاتا ہے۔ وہ علم و ادب کی مختلف تحریکوں اور دور بہ دور کی لسانی و شعری لہروں اور کروٹوں کی معنوی قدروں کا بھی ادراک و شعور رکھتے تھے۔ نوع بہ نوع کے فکری دبستانوں کے اساسی و حقیقی ادبی نظریات کی روح ان کے مطالعہ و مشاہدہ اور تجزیہ و تفحص کے سبب ان کی نگاہ نقد میں واشگاف اور بے حجاب تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے عمیق مطالعہ اور وسیع معلومات سے کام لے کر جب کسی بحث میں حصہ لیتے تھے تو وہ حقائق کی تہیں اور پرتیں الٹ پلٹ کر اہل علم کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ اہل علم اور صاحبان ذوق کے حلقوں میں ان کا اعتبار و وقار قائم تھا اور ان کی باتوں کو حرف آخر کا درجہ حاصل تھا۔

مولانا اسلم کے تفردات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ جب کسی موضوع پر سوچتے اور پھر اسے تحریر کے لباس حریری میں پیش کرنے کا ارادہ کرتے تو بالکل غیر جانبدار اور لاسلکی ہو کر

مقدمات قائم کرتے اور بین السطور سے نتائج اخذ کرتے تھے۔ وہ علمی و ادبی بحث ومباحثہ میں وکالت سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے۔ علم وتحقیق کی روشنی میں جو راہ صواب ہوتی اسی کی طرف اشارے کرتے تھے۔ انھیں مبالغہ آرائی اور بے جا عقیدت شعاری سے ہمیشہ نفرت رہی۔ جیسا کہ ذیل کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

اسلم جے راج پوری ناقد اور شاعر بھی تھے اقبال کے دوستوں میں تھے اور دونوں کے درمیان سلسلۂ مراسلت رہا کرتا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں جب اقبال کی اسرار خودی چھپی تو لوگوں نے اقبال کے خلاف اور خواجہ حافظ کے تصوف کی حمایت میں ایک ادبی محاذ قائم کیا۔ خواجہ حسن نظامی اور اکبرالہ آبادی وغیرہ اس میں پیش پیش تھے۔ اسلم جے راجپوری پہلے شخص تھے جنھوں نے اقبال کی حمایت میں ایک پرمغز مقالہ اسرار خودی پر لکھا جو ۱۹۱۶ء میں الناظر لکھنؤ میں شائع ہوا۔ اقبال کو یہ مضمون پسند آیا اور اس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک خط میں اسلم صاحب کے نام بھی کیا ہے(۱)۔

بالکل یہی بات شیخ عطاء اللہ نے بھی لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ''علامہ اقبال سے مولانا اسلم جیراجپوری کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اقبال کی اسرار خودی جب چھپی تو خصوصیت سے اقبال کے دوست خواجہ حسن نظامی حافظ شیرازی پر اقبال کے اعتراض پر بھڑک گئے اور ان کے خلاف طوفان برپا کردیا۔ اسلم جیراجپوری نے بھی اس سلسلۂ مضامین میں حصہ لیا اور ایک غیر جانبدارانہ مضمون لکھ کر اقبال کا دفاع کیا۔ جب اسرار خودی کی اشاعت ثانی ہوئی تو اقبال نے حافظ سے متعلق اشعار اور دیباچہ حذف کردیا۔ اس کے بارے میں اقبال نے مولانا اسلم جیراجپوری کو اپنے خط محررہ ۱۷رمئی ۱۹۱۹ء میں لکھا۔

خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا۔ خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی (۲)۔

انھیں سب خصوصیات کے مدنظر شاہ معین الدین احمد ندوی نے مولانا اسلم کے متعلق لکھا ہے کہ ''مرحوم صاحب علم ونظر عالم تھے۔ اگرچہ ان کی تعلیم پرانے اور پھر اہل حدیث کے ماحول

میں ہوئی تھی لیکن وہ بڑے روشن خیال اور زمانہ کے حالات اور رجحانات سے باخبر تھے۔ اور کسی سوسائٹی میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے(۳)۔

مولانا شعر وادب کا بہت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ بڑی شگفتہ اور شستہ زبان استعمال کرتے تھے۔ غزلیں خوب کہتے تھے بعد میں دینی ومذہبی، قومی وملی اور تاریخی وواقعاتی نظموں کا رجحان بہت غالب ہوگیا تھا۔ ان کی ابتدائی شاعری میں بھی حسن وشباب کا ذکر اور عہد جوانی کے جذبات کا اظہار خوبصورتی اور لسانی تہذیب وشائستگی کے ساتھ ہوا ہے۔ بے حجابی، بے باکی، سوقیانہ پن، عامی انداز سفلی اور بازاری انداز گفتگو ان کے یہاں مفقود ہے۔ وہ جوش میں بھی ہوش کی باتیں کرتے ہیں۔ حواس باختگی کے لمحات میں بھی وہ اپنے دل ودماغ کو ایک حد اعتدال میں رکھنے پر قادر ہیں۔ آشفتہ خاطری، وارفتہ مزاجی، شوریدگی ودیوانگی میں بھی ان کی شخصیت ٹوٹنے اور بکھرنے نہیں پاتی۔ وہ اپنے انداز ومزاج، معیار واقدار کے اعتبار سے شریف النفس اور سلیم الطبع شاعر لگتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دور کے اہم رسالوں اور گلدستوں کی زینت ہوا کرتا تھا اور وہ بھی بالکل آغاز شباب یعنی اٹھارہ برس کی عمر میں۔ یہ کم اہم بات نہیں ہے کہ اس بازیچۂ اطفال والی عمر میں ہی انھیں شہرت ملنے لگی تھی اور پیسہ اخبار، لاہور، پیام یار لکھنؤ، زمانہ کان پور، علی گڑھ منتھلی۔ فصیح الملک لاہور، (مدیر احسن مارہروی) معارف اعظم گڑھ، گلبن سخن بھوپال، الناظر لکھنؤ وغیرہ میں ان کے مضامین نظم ونثر عزت کے ساتھ نمایاں طور سے شائع ہونے لگے تھے۔ اور علمی حلقوں میں ان سے خاص دل چسپی لی جانے لگی تھی۔

اسلم جیراجپوری کے استاذ سخن کے بارے میں لالہ سری رام دہلوی نے اپنی کتاب خم خانۂ جاوید کی جلد اول صفحہ ۲۹۶ پر لکھا ہے کہ حکیم معشوق علی صاحب جوہرؔ کے تلامذہ میں ذی لیاقت وخوش فکر ہیں عرصہ دراز تک استاذ کا فیض صحبت اٹھایا ہے لیکن پیام یار لکھنؤ بابت ماہ جنوری ۱۹۰۰ء کے صفحہ ۲؍ پر ان کی جو غزل شائع ہوئی ہے اس میں انھیں جمیل سہسوانی کا شاگرد لکھا گیا ہے۔ اسلم اس زمانے میں بھوپال میں تھے اور وہیں سے اپنا کلام پیام یار میں اشاعت کے لیے بھیجا کرتے تھے۔

اسلم کی دینی وعلمی حیثیت نے ان کے شاعرانہ مرتبہ وکمال کو پس منظر میں ڈال دیا ہے۔ جب کہ ان کی شاعری کی داد ان کے ہم عصر اردو کے بڑے بڑے دانشوروں نے دی ہے۔ انھیں

میں علامہ اقبال بھی ہیں۔ مولانا غزلیں بڑی پیاری اور غزلیہ رنگ آہنگ کو قائم رکھتے ہوئے کہتے تھے جن میں شوخی وطراری، جذبات کی شعلگی، رومانیت کی گرمی بھی ہوتی تھی اور زندگی کے ادراک و شعور کو بھی موضوع بنایا جاتا تھا۔ انھوں نے عشق کی واردات کے بیان میں صوفیانہ ذوق نظر سے کام لیا ہے۔ اس طرز اظہار کا مقصد مجاز سے حسن حقیقی کی طرف ذہنی وفکری سفر کا حوصلہ پیدا کرنا ہے۔ پھر بھی انھوں نے جلد ہی غزل گوئی سے دوری پیدا کر لی کیوں کہ ان کے بھی کانوں میں بدلتے وقت کے قدموں کی آہٹ اور سیاسی وسماجی انقلاب کی یہ آواز گونجنے لگی تھی کہ ساقی دور بدلنے والا ہے۔

شبلی، حالی، اقبال، سرور جہاں آبادی، نظم طباطبائی، چکبست نظمیہ شاعری کے اصل خدو خال کو ابھار چکے تھے۔ اسلم کی نظم نگاری اپنی قوم اپنی ملت اور اپنے دور کی حدی خوانی اور بانگ رحیل بنی اور حقیقی معنوں میں وہ شبلی وغیرہ کی نظمیہ شاعری کی ترقی یافتہ شکل اختیار کر گئی۔ لالہ سری رام دہلوی نے بھی اپنے مذکورہ بالا تذکرے میں لکھا ہے کہ ''رنگ زمانہ اور مذاق عام کے خیال سے غزل گوئی کو چھوڑ کر اخلاقی نظموں کی طرف مائل ہیں، کچھ جملوں کے بعد ان کی غزلوں کے متعلق یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ''غزلوں کے اشعار چست اور مزیدار ہیں۔

اسلم نے ایک غزل سوال وجواب کے رنگ میں کہی ہے۔ اصلاً یہ غزل تو رومان پرور فضا کی زائیدہ محسوس ہوتی ہے اور اس میں عشق جفاپسند کی بے قراری اور دل سوزی محبت کی کیفیت اپنے رنگ میں نظر آتی ہے لیکن مزید توجہ کی جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ اسلم نے غزل کے مروجہ اسلوب میں اپنی نکتہ آفریں طبیعت، فلسفیانہ انداز نظر اور مجاز سے حقیقت کی طرف مراجعت کا ایک طرز پیش کیا ہے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

خاموشیوں میں رمز حقیقت سنایئے   اسلمؔ یہ سب فضول سوال و جواب ہے

اسلم کے جو کلام ابتدائی دور میں شائع ہوئے ہیں ان میں خیال وزبان کے اعتبار سے تندیِ صہبا سے آبگینہ پگھلنے والی کوئی بات نہیں لیکن ان کی شاعری جیسے جیسے آگے بڑھی ان کے مینائے غزل میں جو ذرا سی باقی رہ گئی تھی وہ شکایت بھی دور ہوگئی۔

''جواہر ملیہ'' مولانا اسلم کی نظموں کا مجموعہ ہے یہ دوسری بار ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس

میں کل بائیس (۲۲) صفحات پر نظمیں ہیں جو زیادہ تر مذہبی رنگ و آہنگ کی حامل ہیں اور قومی و ملی احساسات و جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل نظموں کے عنوانات یہ ہیں (۱) مساوات پسندی۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں لکھی گئی ص ۲ (۲) للّٰہیت۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں لکھی گئی ص ۴ (۳) استغنائے علم۔ اپریل ۱۹۱۹ء علی گڑھ کالج میں لکھی گئی (۴) حلاوت علم۔ اپریل ۱۹۱۹ء مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں لکھی گئی (۵) جذبۂ اخلاص۔ مولانا محمد علی جوہر و شوکت علی پہلی بار جیل سے رہا ہو کر مدرسۃ العلوم آئے تو ان کے خیر مقدم میں ۲۴؍ جنوری ۱۹۲۰ء کو کہی گئی (۶) شمع ملت جنوری ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی جب تحریک ترک موالات شروع ہوئی (۷) نوید امید۔ ستمبر ۱۹۲۳ء۔ مولانا محمد علی جوہر جب دوبارہ جیل سے رہا ہو کر جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ آئے تو لکھی گئی۔ (۸) جزیرۃ العرب۔ ستمبر ۱۹۲۳ء جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ میں لکھی گئی۔ (۹) مسلم دشمن نواز۔ (مثنوی) جنوری ۱۹۱۹ء (۱۰) اسلامی صدا۔ مارچ ۱۹۲۴ء جامعہ ملیہ کے طلبہ کے لیے لکھی گئی۔ اسی میں ان کا ایک وہ شعر بھی ہے جو مدتوں سے اہل ذوق کی زبانوں پر گردش کر رہا ہے اور اسلام پسندوں میں بہت مقبول و متداول ہے یہی نہیں اس کو کلنڈر اور طغریٰ کی زینت بھی بنایا جا رہا ہے۔ آج کے ہندوستانی مسلمانوں کے منظر نامے کے علاوہ عالمی بساط سیاست پر اہل ایمان کی ایمانی حرارتیں چھین لینے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کے تناظر میں اس شعر کی معنویت اور بڑھ گئی ہے۔ دیکھیں

نورِ حق، شمع الٰہی کو بجھا سکتا ہے کون؟ جس کا حامی ہو خدا، اس کو مٹا سکتا ہے کون؟

مولانا کی شاعری ان کی زبان و دل کی ترجمان ہے جو ان کے دل میں رہتا تھا وہی زبان پر بھی آتا تھا۔ وہ اپنی شاعری سے اپنی قوم کی حدی خوانی کا کام لینا چاہتے تھے۔ ان کے یہاں جو دردمندی، غم گساری اور خدا ترسی تھی اس کا اظہار ان کی نظموں میں بہت واشگاف انداز اور نمایاں صورت میں ہوا ہے۔ وہ دین و دیانت، زہد و تقویٰ اور حسنِ عمل کی خوبیاں ملت کے ہر فرد میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی شعر گوئی ان کی اس تمنا کی گواہی دے رہی ہے۔ وہ لفظوں کو اس کے صحیح مقام پر برتنے کا فن جانتے تھے۔ بات کس طرح کی جائے کہ اس میں تاثیر پیدا ہو اور دل میں ترازو

ہوجائے انھیں اس کا بھی بخوبی علم تھا۔انھوں نے بعد کی زندگی میں غزل گوئی تقریباً ترک کر ڈالی تھی ان کی شعری توجہ سراسر نظم نگاری کی طرف ہوگئی تھی۔اس زمانے میں وہ اسلامی دینی اور مذہبی رنگ و انداز کی نظمیں لکھا کرتے تھے اور اس کے کسی گوشے کو اپنی نظموں کا مرکزی مضمون قرار دیتے تھے۔ان کی اس طرح موضوعاتی نظمیں بڑی دل چسپ، پر تاثیر اور اثر انگیز ہیں۔ان کی ایک نظم ماہنامہ معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۱۸ء جلد ۳ نمبر ۵ میں چھپی ہے۔''مساوات پسندی اس کا عنوان ہے اس کا مرکزی خیال وہ واقعہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفۂ دوئم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا وظیفہ بڑھا دیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مساوات پسندی کے تحت اس کو قبول نہیں فرمایا۔مولانا اسلم فرماتے ہیں:

حضرت عائشہ وہ شمع حریم نبوی — جن سے روشن ہے نہاں خانۂ اخبار رسول
ان کو ملتا تھا وظیفہ جو گزارے کے لیے — جس پہ تھا عہد رسالت سے برابر معمول
خرچ کو ان کے وہ کافی نہیں ہوتا تھا مگر — فقر سے تھیں نہ وہ دل گیر، نہ فاقہ سے ملول
عہد میں اپنے جو فاروق نے دیکھا یہ حال — کر دیا ان کے وظیفہ میں اضافہ معقول
لے کے جب اس کو گئے حضرت صدیقہ کے پاس — بولیں میں کر نہیں سکتی ہوں اضافہ کو قبول
جملہ ازواج کو حضرت نے مساوی رکھا — اب یہ تفریق مدارج ہے بہم ان میں فضول
اپنی ہم چشموں سے کچھ بڑھ کے نہ لوں گی ہرگز — میں نہ توڑوں گی مساوات کا پاکیزہ اصول
اہل بیت نبوی پر ہو خدا کی رحمت — جن سے امت میں ہوئے ایسے فضائل منقول(۴)

ان کی غزلوں کا ابھی تک کوئی انتخاب کہیں سے شائع نہیں ہوسکا ہے اندیشہ ہے کہ پرانے رسائل و جرائد میں جو کچھ چھپا ہے وہ بھی معدوم نہ ہوجائے اس لیے یہاں غزلوں کے کچھ نمونے درج کیے جارہے ہیں۔اس کے بعد نظموں کے اشعار پیش کیے جائیں گے۔

تو برا مجھ کو نہ کہنا بہت اچھا میں ہوں — اے مری جان ترا عاشق شیدا میں ہوں
ہر بُن مو مرا کیوں طالب دیدار نہ ہو — عاشق جلوۂ معشوق سراپا میں ہوں
قد موزوں ترا کہتا ہے کہ ہوں میں شمشاد — چشم کہتی ہے تری نرگس شہلا میں ہوں

درد ہے ، سوز ہے ، حیرت ہے ، پشیمانی ہے — کس مصیبت میں گرفتار خدا یا میں ہوں
ہائے رے بے خبری، یہ نہیں اب تک معلوم — کون محبوب ہے وہ جس پہ کہ شیدا میں ہوں
باغ میں جوش بہاراں ہے، گھٹا چھائی ہے — ساقیا! کیوں نہ بھلا طالب صہبا میں ہوں
جب سے عاشق بتِ کافر نے کیا ہے اسلم — ہرطرف خلق میں بدنام ہوں،رسوامیں ہوں(۵)

ہوئی دار پر معراج حاصل — ملا ہے خوب اعزاز محبت
کہاں دیکھیں، کہاں ڈھونڈھیں، کدھر جائیں — ملے گا کون ہم راز محبت(۶)

گردش قسمت سے الٹا ہے اثر تدبیر کا — وہ بھی اب ملتا نہیں جو ہے مری تقدیر کا
وہ آئیں یا قضا آئے شب غم — کوئی غم خوار ہو جانِ حزیں کا
ہاں دیکھو شبِ وصل بھی آنکھیں نہ ملاؤ — لگ جائے نہ دھبا کہیں دامان حیا میں
کیا لذت بیداد ہے کرتا ہوں دعائیں — اللہ کرے اور ترقی ہو جفا میں
تن تن کے کہتا ہے ترا خنجر بے داد — آجائے نہانا ہو جسے آبِ بقا میں
شب فرقت کی ظلمت اک بلا ہے — نہیں آتی قضا بھی جس کے ڈر سے(۷)

خم خانۂ جاوید میں درج تیسرے شعر کے مطلع ومقطع اور درمیانی اشعار کو حذف کر دیا گیا ہے جو یوں ہیں۔

ڈالا دلِ ناداں نے تجھے ہائے بلا میں — کم بخت کہاں جا کے پھنسا زلف دوتا میں
ڈر ہے نہ پڑے فرق تری طرز جفا میں — اللہ کرے آئے نہ تاثیر دعا میں
سودا کرے کیوں گیسوئے پرخم کا کسی کے — کیا کام کوئی جاکے پھنسے مفت بلا میں
تلوؤں سے ملیں آنکھیں تو وہ بولے بگڑ کر — کیا کرتے ہو؟ پڑجائیں گے چھالے کفِ پا میں
کیا قہر ہے ہمراہ لیے غیر کو اسلم — آیا ہے ستم گار مری بزم عزا میں(۸)

میں نے کہا ہجر میں جینا عذاب ہے — کہنے لگے کہ نفس کشی میں ثواب ہے
میں نے کہا کہ مایۂ راحت ہے وصل دوست — کہنے لگے کہ باعثِ صد اضطراب ہے
میں نے کہا کہ پھر دل مضطر کا کیا علاج — کہنے لگے کہ سوز غم اکسیر ناب ہے
میں نے کہا کہ عہد حسیناں ہے بے ثبات — کہنے لگے کہ عشق مجازی سراب ہے

میں نے کہا کہ آتشِ گل میں کہاں تپش   کہنے لگے کہ سینۂ بلبل کباب ہے
میں نے کہا کہ رخ سے اٹھا دیجئے نقاب   کہنے لگے کہ دیکھنے کی کس کو تاب ہے
خاموشیوں میں رمزِ حقیقت سنائیے   اسلمؔ یہ سب فضول سوال وجواب ہے(۹)

کوئی شے باعثِ دوری نہیں ہے   فقط دل میں کشش پوری نہیں ہے
یہاں فرماں روا ہیں حضرتِ عشق   حکومت دل کی جمہوری نہیں ہے
یہ دل بھی تو نہیں قابو میں کم بخت   انھیں کی اک مجبوری نہیں ہے (۱۰)

ایک دن اپنی خبر کو آپ چلئے تو سہی   قیدِ زنجیرِ تعلق سے نکلئے تو سہی
یاد آجائے مجھے اپنا دل مرحوم پھر   اک کلی ہلکی سی چٹکی میں مسلئے تو سہی
خونِ عاشق بھی حنا کی طرح لاتا ہے رنگ   دیکھئے پچھتا کے ہاتھوں کو نہ ملئے تو سہی(۱۱)

ہمیں گر آزماتے ہیں تو پہلے یہ بھی وہ کہہ دیں   ملے گا کیا کوئی بوسہ ہمارا امتحاں ہوکر
نہ پورا وار کر مجھ کو قسم اپنی نزاکت کی   تڑپنے دے مجھے مقتل میں قاتل نیم جاں ہوکر
کبھی ایفا نہیں ہوتا ہے وعدہ ان حسینوں کا   یہ جب اقرار کرتے ہیں تو رہ جاتی ہے ’ہاں‘ ہوکر(۱۲)

بھلا بتایئے تو کیا خطا ہوئی مجھ سے   جو آپ بزم سے اپنی اٹھائے دیتے ہیں
مجھ ایسے سوختہ جاں کی نہ داستاں سنئے   کہ اس کے فقرے کلیجہ ہلائے دیتے ہیں
جو دیکھتے ہیں کسی جو روش کی تیغ ستم   ہمارے زخم جگر مسکرائے دیتے ہیں
ہمارے آہ و فغاں بھی غضب ہیں اے اسلمؔ   کہ آسمان وزمیں کو ہلائے دیتے ہیں(۱۳)

ستاتا شام ہی سے ہے شب وصل   غضب میں جان ہے مرغ سحر سے
کرے نظارہ وہ اور میں ہوں محروم   مجھے ہے رشک اپنے نامہ بر سے
شب فرقت کی ظلمت اک بلا ہے   نہیں آتی قضا بھی جس کے ڈر سے
مزا دردِ نہاں میں کیا ہے اسلمؔ ؟   کوئی پوچھے مرے دل سے، جگر سے

وہ عرب کہ دین برحق ہوا جس سے آشکارا   مٹی تیرگی باطل، کیا کفر نے کنارا
ہے اسی میں گھر خدا کا جو چراغ ہے ہدیٰ کا   کہ جہانِ تیرہ میں ہے وہی حق کا اک منارا

کف پائے شاہ دیں کے لیے ہوں گے اس نے بوسے
مجھے سنگپارہ بطحا کا ہے لعل سے بھی پیارا (۱۴)

امتحاں گاہِ عمل ہے یہ جہان گیر و دار
ذرہ ذرہ جس کے عنصر کا ہے گرم کار زار

ہے غرض حسن عمل، بازیچۂ طفلاں نہیں
یہ حیات بے بہا ملتی نہیں ہے بار بار

سعیِ پیہم ہے نشانِ قیس و شانِ کوہکن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت وکوہسار

سوز دل نے پھونک ڈالے خطر ہائے موت وزیست
ہوگیا پروانۂ آتش بجاں شعلہ شکار

سوز و ساز بندگی ہے اصل راز زندگی
ہے اسی قوت کے قبضہ میں عنان روزگار

ہے سلیمانی کا منصب کارِ نظم ملک و دیں
اس کو کیا انجام دے سکتی ہے مورِ زلہ خوار (۱۵)

دہر میں مسلم ہے حق کی آزمائش کے لیے
قلعۂ ایماں نہیں ملتا نمائش کے لیے

کھول کر اس عبرت کدہ میں دیدۂ تحقیق کو
دیکھ زندان بلا میں یوسف صدیق کو

سرزمین کربلا کی سمت بھی کرلے نگاہ
خاک وخوں میں دیکھ لے نقشِ جبینِ دیں پناہ

آزمائش ہے نشان بندگان محترم
جانچ ہوتی ہے اسی کی جس پہ ہوتا ہے کرم

اس کسوٹی پر کھرے کھوٹے کی ہوتی ہے تمیز
جھیل کر زنداں کی سختی ہوتے ہیں یوسف عزیز (۱۶)

حواشی:

(۱) اقبال کی زبان پر ایک ادبی معرکہ۔اکبر حیدری کشمیری۔مشمولہ ہفتہ وار ہماری زبان دہلی ۲۲رجون ۱۹۹۴ء ص ۷
(۲) اقبال نامہ۔مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اول ص ۵۲-۵۵ بحوالہ زندہ رود۔جاوید اقبال ص ۲۹۲۔
(۳) معارف جنوری ۱۹۵۶ء۔شذرات ص ۳
(۴) معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۱۸ء ص ۲۷۷
(۵) پیام یار لکھنؤ بابت ماہ جنوری ۱۹۰۰ء ص ۲
(۶) فصیح الملک لاہور۔مدیر احسن مارہروی۔مئی ۱۹۰۵ء بحوالہ ہفتہ وار ہماری زبان ۲۲رستمبر ۱۹۷۹ء ص ۲
(۷) خم خانۂ جاوید۔لالہ سری رام دہلوی جلد ا ص ۲۹۶
(۸) گلبن سخن بھوپال ۱۳۱۸ھ ص ۴۔مرتبہ محمد عبدالشکور اخلاص
(۹) علی گڑھ منتھلی جنوری ۱۹۱۷ء ص ۱۶
(۱۰) علی گڑھ منتھلی اگست وستمبر ۱۹۱۷ء ص ا

(۱۱) پیام یار لکھنؤ اپریل ۱۹۰۰ء ص ۷۔

(۱۲) پیام یار لکھنؤ جون ۱۹۰۰ء ص ۶

(۱۳) گلبن سخن بھوپال- مرتبہ محمد عبدالشکور اخلاص ۱۳۱۸ھ ص ۳

(۱۴) جزیرۃ العرب

(۱۵) نوید امید

(۱۶) جذبۂ اخلاص

اسلم - مولانا محمد سلیم جہانا گنج

ق یا ساً ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۱ء ـــــ یکم مارچ ۱۹۷۶ء/ ۲۹/صفر ۱۳۹۶ھ

مولانا محمد سلیم اسلم بن حافظ محمد بشیر بن حافظ محمد حیات (بڑے حافظ صاحب) جہانا گنج کے دینی و مذہبی خاندان کے فرد تھے ان کے دادا گھر پر حفاظ کو تعلیم دیتے تھے ان کے والد حافظ محمد بشیر نے سفر حج کی مبارک ساعتوں میں قابل رشک موت پائی۔ اسلم نے اپنے قلم سے اپنے اقرأ کرنے کا سنہ ۱۳۴۸ھ لکھا ہے اس کے بعد انوار العلوم جہانا گنج میں ابتدائی اردو پڑھی۔ احیاء العلوم مبارکپور میں چھ برس تک زیرِ تعلیم رہے اور مولانا قاضی اطہر مبارکپوری سے دیگر مدرسین کے علاوہ متوسطات تک کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا قاضی اطہر کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے۔ مدرسہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں فراغت ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی پڑھا۔ حکمت کی تعلیم حکیم محفوظ علی دیوبند سے حاصل کی تھی۔ طبابت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ غزل اور نعت نگاری سے تعلق تھا۔ روایتی مضامین اور گل وبلبل، بہار وخزاں، عارض وگیسو، چشم و ابرو، شانۂ وگلگونہ کے الفاظ ان کی شاعری کا سرمایۂ ناز تھے۔ زندگی کی کشاکش میں شعروسخن سے دل چسپی مایۂ راحت بن جاتی تھی۔ نعت ومنقبت اظہار عقیدت کا وسیلہ اور اعتقادیاتی حس کی تطہیر وطہارت کا ایک ذریعہ تھی۔ اسی تعلق سے علم وادب اور دین ومذہب کے فروغ کی بھی کچھ سبیلیں پیدا ہوجاتی تھیں۔ قوت متخیلہ ذہن وفکر کی بیداری اچھے استاذ سخن کی تربیت ادبی وشعری ماحول، رہ نمائی کرنے والی اچھی کتابوں، رسالوں کی

معیت ورفاقت کی دولت اگر قسمت سے کسی کومل جائے تو شاعری کے نئے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔عموماً ہماری نواحی بستیاں ان خصوصیات سے خالی تھیں اور دیہاتی ماحول میں زندگی گزارنے والے اکثر شاعر زراعت پیشہ، پارچہ باف، محنت مزدوری کرنے والے جفاکش طبقے سے ہوا کرتے تھے جن کے شب وروز اندیشہ ہائے دوردراز میں گزرتے تھے۔اس لئے ان کی شاعری کے بال وپر بھی پوری طرح نہیں کھل پاتے تھے۔اسلم کی شاعری میں بھی اسی لئے کئی آنچ کی کمی رہ گئی۔

نعت

آپ فخر دوعالم ہیں شاہ امم، درحقیقت ہے دونوں جہاں آپ کا
سیدالاولیں خاتم المرسلیں، دونوں عالم ہے خیرالزماں آپ کا
ہے لقب آپ کا رحمۃ العالمیں،طٰہٰ یٰسین اور شافع المذنبیں
ہے یہ توصیف قرآن میں آپ کی، ہے خداوند خود مدح خواں آپ کا
آمد ورفت موسیٰ کی تھی طور تک، میرے آقا گئے مرکز نور تک
فرش سے عرش تک ذکر ہے آپ کا، یہ زمیں آپ کی، آسماں آپ کا
سدرۃ المنتہٰی تک ہی جبریل ہیں، بعد ازاں میرے آقا ہی تنہا گئے
یہ شرف آپ ہی کو ہے تنہا ملا، ہے مکاں آپ کا لا مکاں آپ کا
ہے تمنا یہ اسلمؔ کی اے شاہ دیں، کالی کملی کا کونہ ملے حشر میں
ہو نہ ایسا کہ محشر میں دردر پھرے، کیوں کہ ہے امتی نیم جاں آپ کا

سکوت شب کے اشارے سلام کہتے ہیں	خموش چاند ستارے سلام کہتے ہیں
صبوح، بادۂ خوش رنگ، جام ومینا بھی	نشاط وکیف کے مارے سلام کہتے ہیں
یہ پُربہار فضائیں، یہ چاندنی راتیں	یہ دل فریب نظارے سلام کہتے ہیں
خمار بادۂ نخوت سے چور ہو ہو کر	کلی کلی کے اشارے سلام کہتے ہیں
بصد نیاز وعقیدت بصد خلوص تمہیں	ستم نصیب تمہارے سلام کہتے ہیں
دلوں میں حسرت وارماں لئے تم کو	غم فراق کے مارے سلام کہتے ہیں

میں آ گیا جو تھپیڑوں کی زد میں اے اسلمؔ
تو دور ہی سے کنارے سلام کہتے ہیں

پُرکیف بہاروں میں شبنم جو نکلتی ہے ہر پھول کے پتوں پہ موتی سی چمکتی ہے
گلشن کی فضاؤں کا پُرکیف ہے نظارہ جُنبش سے ہواؤں کی ہر شاخ لچکتی ہے
دن بھر تو یہ سب کلیاں مرجھائی سی رہتی ہیں یہ پھول کی رانی بھی راتوں میں مہکتی ہے
یہ آتش الفت بھی کر دیتی ہے خاکستر جب عشق کی بھٹی میں یہ آگ دہکتی ہے
موتی کی طرح آنسو پلکوں پہ چمکتے ہیں ہوجاتے ہیں یہ پانی جب شاخ لچکتی ہے
یہ زلف سیہ ناگن بیتاب سی رہتی ہے جتنا ہی ہٹاتے ہیں عارض پہ مچلتی ہے
یہ بنت عنب اسلمؔ کر دیتی ہے دیوانہ
جب شوخ لباسوں میں قلقل سے نکلتی ہے

یہ کشش ہے خاص مے میں یا کہ پیمانے میں ہے
میں یہاں ہوں میرا دل ساقی کے میخانے میں ہے
تو نے دونوں کو جلا کر رکھ دیا اے سوز عشق
شمع میں کچھ جان باقی ہے نہ پروانے میں ہے
بنٹ گئی ہے مختلف حصوں میں پروانے کی خاک
کچھ یہاں محفل میں کچھ بستی کے ویرانے میں ہے
سن کے میری داستاں وہ چشمِ پُرنم ہوگئے
ایسی دکھڑے کی کہانی میرے افسانے میں ہے
پھر گئیں ساقی کی نظریں اڑ گیا محفل کا رنگ
آہ وزاری ہر طرف اک شور میخانے میں ہے
کیا کروں میں تجھ سے اسلمؔ دورِ حاضر کا بیاں
خون ناحق ہر طرف ظالم کے کاشانے میں ہے

صبا گیسوئے خود لہرارہی ہے گھٹا ساون کی گویا آرہی ہے
حنائی دست اور مخمور آنکھیں یہ لالی خوں کی پائی جارہی ہے
مزین اور ان کی بے حجابی قیامت پر قیامت ڈھارہی ہے
رخِ تاباں پہ زلفوں کا مچلنا یہ ناگن چاند پر بل کھارہی ہے
شہیدِ باوفا کے خوں کی لالی شگفتہ گل میں پائی جارہی ہے
سرِ بالیں مریض ناتواں کے دعا چپکے سے مانگی جارہی ہے
لڑکپن دھیرے دھیرے جارہا ہے قیامت چپکے چپکے آرہی ہے
الٰہی خیر ہو اسلمؔ کی اب تو
محبت کی ادا بل کھا رہی ہے

وقت آئے گا سمن زار بیاباں ہوں گے نہ تو گل ہوگا نہ گلشن نہ گلستاں ہونگے
اک بیک ان کے نشیمن سے دھواں اٹھے گا دورِ حاضر کے یہ گل چیں بھی پریشاں ہونگے
حشر میں ان کے تغافل کی جو پیشی ہوگی سامنے آئیں گے سب راز جو پنہاں ہونگے
بسترِ مرگ پہ بیمار الم کی حالت دیکھکر وہ بھی بہت دل میں پشیماں ہونگے
عنبریں زلف سے دو ناگ لٹکتے دیکھا غالباً ثمر جوانی کے نگہباں ہونگے
میرے غم خانے میں اک بار تو آکر دیکھو میرا ذمہ ہے کہ جلوے بھی پریشاں ہونگے
آرہا ہے ابھی اک دور خزاں کا اسلمؔ
باغباں ہوگا نہ گلزار وگلستاں ہونگے

ساحل نے کنارا کرہی لیا موجوں کا سہارا ٹوٹ گیا
غیروں سے کوئی امید نہیں اپنوں کا سہارا ٹوٹ گیا
اے جذبۂ دل اے ذوقِ طلب اللہ تجھے دائم رکھے
تیرے ہی سہارے جینا ہے اوروں کا سہارا ٹوٹ گیا
اے رنج ومحن کچھ مہلت دے کچھ دیر کا اب تو مہماں ہوں
اب سوزِ دروں بھی ختم ہوا اشکوں کا سہارا ٹوٹ گیا

جب ہجر میں کچھ رولیتا تھا تسکین ذرا ہوجاتی تھی
دم توڑ دیا اب نالوں نے آہوں کا سہارا ٹوٹ گیا
فرقت کے بھیانک لمحوں کوکاٹے تو کوئی کیسے آخر
امید وصال یار نہیں یادوں کا سہارا ٹوٹ گیا
فریاد وبکا ،لاحاصل ہے اٹھ عزم عمل کر آگے بڑھ
جانے دے بلا سے گر اسلمؔ غیروں کا سہارا ٹوٹ گیا

وعدہ کرتے ہیں وہ سرکار بدل جاتے ہیں — باتوں ہی باتوں میں اقرار بدل جاتے ہیں
کیا اثر حسن میں رکھا ہے خدا نے کہ جسے — دیکھتے ہی دلِ بیمار بدل جاتے ہیں
جبکہ آتا ہے گلستاں کی بہاروں پہ شباب — گل کا کیا ذکر ہے ہر خار بدل جاتے ہیں
میرا ٹوٹا ہوا دل دیتا ہے جسدم آواز — چیخ میں نغمۂ گل بار بدل جاتے ہیں
زندگی موت کے پہلو میں چلی جاتی ہے — جب محبت کے سمن زار بدل جاتے ہیں

جبکہ آتا ہے برا وقت کبھی اے اسلمؔ
غیر تو غیر ہیں خود یار بدل جاتے ہیں

اسلمؔ - محمد اسلم انصاری اعظم گڑھی

___ ۱۹۷۵ء

کسی زمانے میں مہراج گنج ضلع اعظم گڑھ صنعتی وتجارتی منڈی مانا جاتا تھا مگر نہ جانے اس کوکون سی نظر بد لگی کہ ایک اجڑا دیار بن گیا۔ جب مہراج گنج کی بستی ٹوٹی تو اس خرابے میں آباد لوگ خصوصیت سے انصاریوں کے خاندان اعظم گڑھ کے محلہ میر پیٹو کے باغ میں آکر آباد ہونے لگے۔ اسی میں مولوی خدا بخش متوفی ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۲ء بھی شامل تھے۔ فارسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے مولوی اسلم انصای انھیں کے لائق فرزند اور خدمت خلق کے جذبت سے سرشار فردِ ملت تھے۔ انھوں نے ہر موڑ پر قومی تحریکات کا ساتھ دیا۔ ۱۹۲۰ء سے خلافت اور تحریک عدم تعاون میں

بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ مولوی اسلم انصاری کے قرابت دار رفیق انصاری اور شفیق انصاری دونوں بھائی خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے اولین مجاہدین میں سے تھے۔(۱) ترک موالات، سودیشی بائیکاٹ، انسداد مے نوشی، انتخابات اور نمک سازی کی تمام سرگرمیوں میں ان کی خدمات زریں حرفوں میں لکھی جانے کے لائق ہیں۔ ان کا تعلیمی اور علمی دائرۂ عمل بھی وسیع تھا۔ شہر میں ان کے انصاری دواخانہ کی بڑی شہرت تھی۔ یونس انصاری کے زیرنگرانی بڑی مفید دوائیں تیار کرا کے اطباء کو بھیجی جاتی تھیں۔ ان کی شادی محلہ آصف گنج اعظم گڑھ میں مولانا محمد احمد کی بیٹی عالیہ سے ہوئی تھی۔

راقم الحروف کو اسلم انصاری کا ایک مدحیہ قصیدہ مولوی ضیاء اللہ احقر مہراج گنجی کی تحقیق کے سلسلے میں انھیں کے کاغذات میں دستیاب ہوا ہے یہ قصیدہ مولوی اسلم انصاری کی تحریر میں ہے اس میں مولوی نثار احمد بھیروی کی مدح کی گئی ہے جو تحصیلداری سے ترقی پا کر آنزیری مجسٹریٹ ہو گئے تھے۔ قصیدہ کے آخری دو شعر بتاتے ہیں کہ یہ قصیدہ محض مدح سرائی کے خیال سے نہیں لکھا گیا ہے بلکہ حصول ملازمت اس کا خاص مقصد رہا ہے۔ قصیدہ میں تاریخ اندراج نہیں ہے کہ اس سے پتہ چلے کہ اس کو کب موزوں کیا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ اسلم کے مالک انصاری دواخانہ ہونے سے پہلے اور ان کی تعلیم مکمل کرنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد کا ہے کیوں کہ انصاری دواخانہ قائم ہونے کے بعد اسلم کی مالی حالت اتنی مستحکم ہو چکی تھی کہ وہ اپنے دل میں ملازمت کرنے کا خیال نہیں لا سکتے تھے۔ یہ ان دنوں کا موزوں کیا ہوا ہوگا جب اسلم بیکاری و بیروزگاری کی مار جھیلتے رہے ہوں گے۔ اس قصیدہ کا سرنامہ اس طرح ہے۔ قصیدہ مدحیہ

در مدح جناب مولوی محمد نثار علی خاں صاحب آنزیری مجسٹریٹ متوطن موضع بھیرا تحصیل محمد آباد ضلع اعظم گڑھ

از تفتہ جگر محمد اسلم ولد مولوی خدا بخش اعظم گڑھی

نمونۂ کلام

سمندِ خامۂ مشکیں جو پا بجولاں ہے بنا یہ صفحۂ قرطاس آج میداں ہے

کسی کی مدح سرائی کا دل میں ساماں ہے گروہِ مطربِ مضموں ہمارا مہماں ہے
وہ کون سا ہے خوش اقبال جس کی مدحت میں خیال خوش ہے اور فکر بلند نازاں ہے
مزاج معتدل اس دم ہے طبعِ موزوں کا کہ جمع آج مری خاطر پریشاں ہے
وہی نثارِ علی خان صاحبِ شوکت کہ جس کے جودو کرم کا جہاں ثناخواں ہے
بلند حوصلگی عالی ہمتی اُس کی جبینِ مطلعِ انوار سے نمایاں ہے
جو آیا جوش میں دریائے ہمت واحساں تو پُرز گوہرِ مقصود جیب وداماں ہے
یہ خوش خیالی ہے اس کی کہ مجد سرسید جو دل سے حامی وہمدرد ہر مسلماں ہے
جو آ گیا درِ دولت پہ کوئی بھی سائل تو اس کا مرغِ مراد اُس کے دل سے پراں ہے
قبائے رحم ومروت کو زیب ہے تن سے کُلاہِ خلق کی سر سے پھبن نمایاں ہے
تصدق اس کی اِس ہمت کے اور سخاوت کے کہ مہربانِ مساکین وبے نوایاں ہے
بیان شیریں زبانی کا ہو بھلا کیسے؟ کہ لب وفورِ حلاوت سے لب سے چسپاں ہے
کھلے جو غنچۂ لب منھ سے اس کے پھول جھڑیں دم کلام زباں اس کی شکر افشاں ہے
وہ رہ کے عہدۂ تحصیل داری پر برسوں کئے وہ کارِ نمایاں کہ عقل حیراں ہے
رہا ہے موردِ تحسین و آفریں ایسا کہ جس کا افسرو ماتحت تک ثناخواں ہے
ہوا جو لے کے وہ پنشن مکاں پہ جلوہ فگن تو پھر بھی تاج حکومت کا سر پہ تاباں ہے
مجسٹریٹ ہے آنزیری اب وہ عالی جاہ یہ اس کی خوبی تقدیر وفضل یزداں ہے
وہی ہے شانِ حکومت، وہی اولوالعزمی وہ قدرومنزلت اب اور بھی فروزاں ہے
وہ ہوکے دل سے اوامر نواہی کا پابند خدائے پاک کی طاعت میں شادوفرحاں ہے
کسی کی زندگی پُرلطف ہو تو ایسی ہو کنیز دولت واقبال جس کا درباں ہے
مری زباں نہیں اوصاف کے لئے کافی زمانہ اس کا ثناخواں ہو تو شایاں ہے
یہی بجا ہے کہ اب ختم ہو دعا پہ کلام جب اس کی مدح وستائش بروں زامکاں ہے
الٰہی عمر طبیعی تک تو رہ حافظ اسی طرح سے کہ جس طرح اب نگہباں ہے
حکومت اس کے گھرانے میں یوں رہے ہردم کنیز جس طرح آقا کے زیرِ فرماں ہے

ادھر اے اہل کرم بھی ذرا توجہ ہو — ثناگر آپ کا امیدوارِ احساں ہے
ستاتی ہے اسے بیکاری اور ناداری — بہت ہی اسلمؔ ناشاد اب پریشاں ہے

حواشی:

(۱) مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ۔ مومن محی الدین طبع اول مارچ ۱۹۹۴ء ص ۳۱۳۔ ۲۱۴

اسلمؔ - عبدالسلام مئو

۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء ــــــ ۱۹۸۴ء

محلہ ڈومن پورہ پچھّم کے باشندے تھے۔ شاعری کی دنیا میں کوئی خاص شہرت نہیں تھی کیوں کہ نام ونمود کی ہوس سے دامن کش تھے مگر نعت وحمد اور نظم وقطعات میں پختہ شعوری کا ثبوت دیتے تھے۔ مدتوں ان کا کلام مولوی مظفرحسن احسنؔ مئوی (۱۹۳۶ء۔ ۲۲؍جنوری ۲۰۰۶ء) محفلوں میں سناتے رہے ہیں۔ اورسنانے کا یہی ذوق بعد میں ان کی بھی سخنوری کی بنیاد بنا۔

اسلم کے والد حکیم مولوی عبدالقادر صاحب تھے۔ بچپن ہی میں ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء میں شفیق باپ کا سایۂ شفقت ان کے سر سے اٹھ گیا تھا اُس وقت ان کی عمر دو یا تین برس کی تھی اس حساب سے ان کی ولادت ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء میں قرار پاتی ہے۔ تعلیم کوئی خاص نہیں تھی لیکن صاحبان علم اور ارباب شعروادب کی صحبتوں میں رہ کر استفادۂ علمی کیا تھا اور اپنے اندر اچھی علمی صلاحیت پیدا کرلی تھی۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ شعرگوئی کی طرف طبیعت مائل ہوگئی۔ فضا ابن فیضی کے تلامذہ میں تھے۔ انھوں نے فضا صاحب کی اصلاحی توجیہات سے بڑا استفادہ کیا تھا۔

غزلیں اور تاثراتی نظمیں خصوصیت سے کہتے تھے۔ اندرا گاندھی کے حادثۂ قتل پر ایک تاثراتی نظم لکھی تھی جس کا تذکرہ احباب کی محفلوں میں ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی تاثراتی نظمیں موزوں کرکے اپنی طبیعت کے پُردرد ہونے اور اپنی فطری حساسیت وزودحسی کی طرف بلیغ اشارہ کیا تھا۔ چند منتشر پرزے ملے ہیں جن پر ان کا کلام درج ہے، جو چند نظمیں ہیں ان پر عنوان نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نظموں کے عنوانات تجویز نہیں

تھے۔ ان کے کلام کی اشاعت اخبار وجرائد میں نہیں ہوسکی تھی اس لئے ان کی حفاظت نہیں ہوسکی۔ ان کے کلام کو صدا بند کرنے والے مولوی مظفر حسن احسنؔ مئوی بھی اب نہیں رہے کہ ان کے اشعار فراہم ہوسکیں۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے معمولی کہنے والوں میں تھے۔ زبان وبیان کی خامیاں بھی ہیں۔ راقم کو کافی جدوجہد اور رابطے کے بعد جو کلام دستیاب ہوا ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ فضا جیسے صاحبِ فن اور استاد شاعر کی نگاہِ اصلاح سے نہیں گزر سکا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بالکل ابتدائی دور کی کاوش ہو۔

نمونۂ کلام

چہکتے پھر رہے ہیں اب عنادل لالہ زاروں میں — خزاں کا نام بھی آتا نہیں لب پر بہاروں میں
صبا گلشن میں آئی ہے پیامِ زندگی لے کر — پپیہے نے مچایا شور گلشن کے نظاروں میں
سنائی دے رہی ہیں ہر طرف قمری کی آوازیں — ملا ہے راستہ سب کو چمن کے مرغزاروں میں
ہوئی رخصت خزاں جس دم چمن سے لے کے پامالی — شگفتہ ہوگئیں کلیاں گلستاں کی قطاروں میں
نسیم صبح گلشن میں چلی انگڑائیاں لے کر — دوبالا ہوگئی رونق گلستاں کے نظاروں میں
نہ گھبراؤ اندھیرے سے غبار آلود ہے منزل — برابر روشنی ملتی رہے گی رہ گزاروں میں
بہاریں آگئیں اور جھومتا ہے ہر چمن اسلمؔ — نہ بیٹھے مضمحل کوئی گلستاں کے کناروں میں

(نمونۂ کلام بشکریہ مشتاق احمد بیدل مئوی)

اسمٰعیلؔ - منشی محمد اسمٰعیل نرولی

قیاساً ۱۸۷۱ء ـــــ ۱۹۳۱ء

والد گرامی کا نام شبراتی تھا، موضع نرولی، متصل شہر اعظم گڑھ کے باشندے اور نداف برادری سے تھے اس کے باوجود اردو ہندی سے مڈل پاس تھے، جو بہت بڑی بات تھی۔ انھوں نے گورنمنٹ اسکول جونپور میں تعلیم پائی تھی۔ یہ دو بھائی تھے منشی اسمٰعیل اور مظفر حسن۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں اور آزادیِ ہند کی تحریک سے وابستگی کی وجہ سے یہ ہائی اسکول کی تعلیم مکمل نہیں کر سکے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب طالب علم تعلیم چھوڑ چھوڑ کر تحریک آزادی میں شامل ہو رہے تھے۔ ان کے والد شبراتی دیوانی میں ملازم تھے اس لئے اسمٰعیل ظاہراً سیاسی سرگرمیوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے رہے تاکہ ملازمت پر کوئی آنچ نہ آسکے۔ لیکن پوشیدہ طور پر ان کی سرگرمیاں تیز تر تھیں۔ بعد میں یہ محرر رجسٹری اہرولہ، اعظم گڑھ کے عہدے پر فائز ہوئے کیوں کہ حساب میں بہت تیز تھے۔ اور اس میں بڑی قابلیت حاصل تھی۔ محرری ترک کر کے انھوں نے دارالتعلیم مبارک پور میں مدرسی اختیار کر لی تھی آخر دم تک وہیں رہے۔ اور وہیں فوت بھی ہوئے۔ منشی اسمٰعیل کی شادی کلثوم بنت کریم بخش کے ساتھ ہوئی تھی اور ان کے چھوٹے بھائی مظفر حسن کی شادی کلثوم کی چھوٹی بہن خیر النساء بنت کریم بخش سے ہوئی تھی۔ اور ان دو بہنوں کی چھوٹی بہن اقلیمہ کی شادی ماسٹر عبدالقادر کے ہمراہ ہوئی تھی۔ کلثوم کی رحلت کے بعد انھوں نے دوسری بیوی سلّم سے نکاح کیا۔ اسمٰعیل کی دو صلبی اولاد عبدالحمید اور محمد امین تھے۔ ان کی فارسی اچھی تھی انگریزی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ انھیں شعر و شاعری سے بھی شغف تھا اور کبھی کبھی طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔ (۱)

حواشی:

(۱) راوی ماسٹر عبدالقادر صاحب نرولی ۵ ؍دسمبر ۱۹۸۲ء

اسیرؔ - سید محمد مرتضیٰ حسین محمد آبادی

۱۸۹۶ء اندازاً ــــ ۱۸ ؍رجب ۱۳۹۴ھ ؍ ۵ ؍اگست ۱۹۷۴ء (بعارضۂ فالج)

ابتدائی تعلیم محمد آباد گوہنہ ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی عربی و فارسی ایمانیہ عربی کالج بنارس میں پڑھی۔ مستقلاً محمد آباد میں رہے۔ دورانِ تعلیم شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ کسی سے کلام پر باقاعدہ اصلاح نہیں لی۔ زمینداری کرتے تھے ان کے دور میں شاعری شرفائے انجاب کی حیثیت عرفی اور سماجی قدر کا طرۂ امتیاز تھی اس لئے اس سے تعلق خاطر رکھا۔ غزل، سہرا اور قصیدہ کی صنف کو شاداب رکھا۔ قصائد زیادہ کہے۔ دیوان قلمی اسیر تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ان کے اخلاف میں محفوظ ہے۔ ایک بیاض قلمی راقم کی نظر سے گزری اس میں قصائد، قطعات وغیرہ ہیں۔ ان میں بیشتر کا موضوع

اسلامیات سے ہے۔ایک بیاض اور تھی جس میں صرف غزل تھی۔وہ بیاض جوان کے اخلاف کے پاس ہے اور اہل بیت اطہار سے متعلق اس میں صرف قصائد ہیں اس سے ان کے مذہبی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ان کے بہت سے قصائد کاغذات پر بھی ہیں۔ان کے بارے میں سید علی جواد زیدی نے لکھا ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمۂ معصومین علیہم السلام کی شان میں بے شمار قصائد مقاصدوں میں پڑھے ہیں۔بے حد پُرگو ہیں لیکن کبھی اپنے قصائد شائع نہیں کرائے قصیدے رسمی اور روایتی انداز کے ہوتے ہیں لیکن کلام میں پختگی ہے۔(۱) مگر زیدی صاحب نے کوئی نمونہ درج نہیں کیا۔اسیر نے اپنی مذہبی و دینی بصیرت اور ملی محسوسات وجذبات کو روایتی انداز میں الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

نمونۂ کلام

تمہاری فتنہ سامانی نہ جائے گی، نہ جائے، پر
نہ بدلا ہے نہ بدلے گا زمانے سے چلن اپنا

بھلا کیوں ان کے چاہے سے مری قسمت بدل جاتی
عدو ہو جب زمیں، دشمن ہو جب چرخ کہن اپنا

اٹھا دیتے وہ مجھ کو اپنی محفل سے تو بہتر تھا
ندامت سے نہ جھکتا سر میانِ انجمن اپنا

وحشی ترا اب ہوش سے بیگانہ نہیں ہے
ہشیار سے ہشیار ہے، دیوانہ نہیں ہے

ہے سردسرِ شام سے ہنگامۂ محفل
اب شمع بھی جلتی ہے تو پروانہ نہیں ہے

یہ خانۂ دل میرا محبت سے بھرا ہے
آبادی ہے آبادی ہے ویرانہ نہیں ہے

مالک تھے اسیرؔ ہم بھی کبھی طبل وعَلَم کے
اب اگلی سی وہ سطوت شاہانہ نہیں ہے

اکیلی شام سے روئی سحر تک میری تربت پر
اگر ہمدرد ہے کوئی تو بس شمع فروزاں ہے

نہ وہ آئیں مری تربت پہ بہرِ فاتحہ خوانی
اندھیری رات ہے، وحشت ہے اور گورِ غریباں ہے

رات فرقت میں بہرطور بسر ہوتی ہے
آپ کیا جانیں کہ کس طرح سحر ہوتی ہے

دل تڑپ اٹھتا ہے بیتاب نظر ہوتی ہے
ان کے یاں آنے کی جب گرم خبر ہوتی ہے

یاس کے ساتھ ہی رہتی ہے امید موہوم
ڈوبنے والوں کی ساحل پہ نظر ہوتی ہے

زلف ورخ ہی کے تصور پہ رہا کرتا ہوں
عمر کٹتی ہے یونہی شام وسحر ہوتی ہے

ہوگی اے دست جنوں تیری عنایت کس پر
میرا دامن نہ رہا میرا گریباں نہ رہا

کشتۂ عشق پہ چارہ گرو احساں نہ رہا | درد تو دل میں رہا درد کا درماں نہ رہا
مذہب عشق کے آغاز کا انجام تو دیکھ | کوئی کافر نہ رہا کوئی مسلماں نہ رہا
اس کی پیشانی سے افشاں چھوٹ کرجس دم گری | لوگ سمجھے میری تربت پر چراغاں ہوگیا

ذیل کا قصیدہ موت سے پانچ دن قبل ۱۳؍رجب ۱۳۹۳ھ؍ ۱۵؍اگست ۱۹۷۴ء کولکھا گیا تھا یہ اسیر کا آخری قصیدہ ہے

اس ماہ وش کے رخ پہ کچھ ایسا نقاب ہو | ہلکا سا جیسے چاند کے اوپر سحاب ہو
پہلو میں دل ہو، دل میں نہ کیوں اضطراب ہو | جب حسن بے مثال ہو، جب لاجواب ہو
تیرِ نگاہ ناز کی سرگرمیاں نہ پوچھ | گرہوسکونِ قلب تو گراضطراب ہو
زخمِ جگر کی ٹیس ہے اک لذت دوام | یا رب خلش یہ دل کی مرے بے حساب ہو
اس طرح شمعِ حسن کی ہوں ضوفشانیاں | جیسے شعاعِ مہر فلک، لاجواب ہو
ہاں اے اسیرؔ مطلعِ نو ایک پھر پڑھو | رنگیں کتابِ مدح کا ہر ایک باب ہو
ایسی ثنا وصیِّ رسالت مآب ہو | مملو صفت سے جس کی خدا کی کتاب ہو
اک غلغلہ بلند ہو صلوٰ علیہ کا | حیرت زدہ ملک بھی ہر اک بے حساب ہو
مولائے کائنات کا کعبے میں یہ شرف | پائے علی ہو، دوشِ رسالت مآب ہو
ہم مرتبہ نہیں ہے علی کا جہان میں | لاسکتے ہو تو لاؤ اگر دستیاب ہو
ہاں اے اسیرؔ مدح جناب امیر میں | جتنا زیادہ ہوسکے کارِ ثواب ہو(۲)
حبیب کبریا کا کوئی ہمسر ہونہیں سکتا | کوئی ہم مرتبہ ان کا پیمبر ہونہیں سکتا
مقابل رحمۃ اللعالمیں کے کوئی کب ہوگا؟ | رسولِ حق سا کوئی عدل گستر ہونہیں سکتا
شفیع المذنبیں لائے نوید بخشش امت | مرے دل میں کبھی اب ہولِ محشر ہونہیں سکتا
شہ لولاک کا عز وشرف قرآن سے پوچھو | کسی بندے پہ اتنا فضلِ داور ہونہیں سکتا

اسیرؔ بے نوا کو گر شہِ بطحیٰ بلا لیتے
فرشتہ بھی کوئی پھر اس کا ہمسر ہونہیں سکتا (۳)

نظم

اسلام کو عالم میں افسانہ بناڈالا　　کعبہ نہ رہا کعبہ بت خانہ بناڈالا
دنیا کی محبت میں قرآن جلایا ہے　　مسجد میں اگر پہنچے میخانہ بناڈالا
سرکارِ دوعالم نے جو باغ لگایا تھا　　کانٹوں سے اسے بھرکر ویرانہ بناڈالا

قطعات

وہ زور وقوت وہ جوانی نہ رہی　　وہ دل وہ طبیعت کی روانی نہ رہی
کیا حال کہوں عالمِ پیری کا اسیرؔ　　جیتے تو ہیں پر وہ زندگانی نہ رہی

نہیں ہے شمع محفل میں مگر پروانہ باقی ہے　　کہانی مختصر ہونے پہ بھی افسانہ باقی ہے
اسیرؔ آخر زمانہ مطمئن کس طرح ہوجائے　　فضاؤں میں ابھی تک فطرت دیوانہ باقی ہے

مداح نبی و حیدر ہوں میں　　توصیف کنانِ آل پیمبر ہوں میں
مجھ کو یہ شرف خدا نے بخشا ہے　　محفل میں جو آج زیب منبر ہوں میں

نعتیہ قصائد

محمد مصطفیٰ مسندنشینِ بزمِ لاہوتی　　محمد مصطفیٰ سرچشمۂ فیضانِ داور ہے
اے رسولِ محترم اے مظہرِ خلق وکرم　　آدمی تیرے سبب سے آج انساں ہوگیا
اللہ اللہ کیا شرف بخشا ہے خالق نے انھیں　　کہدیا جو آپ نے مرضی داور ہوگیا
محبوب کردگار لباس بشر میں ہے　　انسانیت کا کیوں نہ ہو رتبہ بڑھا ہوا
مسیحا آنے والے ہیں مریضِ غم کی بالیں پر　　مگر کہتا ہے دل ایسا مقدر ہونہیں سکتا

حواشی:

(۱) قصیدہ نگاران اتر پردیش، سیدعلی جوادزیدی طبع دوم ۱۹۸۳ء ص ۸۷
(۲) ماہنامہ الواعظ ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۴ء ص ۱۳
(۳) نعت خیرالمرسلین نمبر دوماہی العلم بمبئی اگست ۱۹۹۴ء۔ مدیر سید علی جوادزیدی ص ۱۹۰

اسیرؔ - محمد عثمان انصاری

۱۹۲۰ء ___ ۱۹۹۷ء

موضع رموپور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ پدر بزرگوار حُب علی تلاش معاش میں بمبئی آئے تو یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ اپنے اہل وعیال کو بھی عروس البلاد میں منتقل کرلیا اور خود بمبئی ہندوستان مل میں پارچہ بافی میں مصروف روزگار ہوکر دووقت کی روٹی کا انتظام کرنے لگے۔ دولڑکے محمد عثمان اسیر انصاری اور عبدالرحمٰن محسن انصاری تھے ان کی تعلیم وتربیت کے لئے بھی ہاتھ میں دو پیسہ ہونا ضروری تھا۔ کپڑا مل کے پہئے کی گردش سے گردشِ وقت کا حوصلہ آزمانے لگے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلاکر گردشِ روزگار کو شکست دے دی۔ ان کے مذکورہ دونوں بیٹے شاعر ہوئے، محسن صاحب کی تعلیم کچھ زیادہ ہوئی تو وہ شاعر ہونے کے ساتھ ادیب بھی ہو گئے اور نثر نگاری میں دور دور تک نیک نام ہوئے۔

اسیر نے انجمن اسلام بمبئی میں میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد معاش ومعیشت کے مسائل کی طرف توجہ کی۔ مختلف کمپنیوں سے وابستہ ہوئے مگر مزاج ذرا تند تھا اس لئے نباہ نہیں کر سکے۔ بعد میں خود روزگاری کے خیال سے تجارت کا سلسلہ شروع کیا۔ شادی شاہ گنج ضلع جونپور میں کی پانچ بیٹے محمد متین، محمد امین، محمد مبین، محمد نسیم، محمد یٰسین اور دو بیٹیاں عارفہ بانو اور مسعودہ بانو ان کی جسمانی یادگاریں ہیں۔ انھوں نے محنت ومشقت کر کے بچوں کو تعلیم دلائی۔

شاعری میں کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ اپنے وجدان وشعور کو رہنما بنایا اور اپنی خداداد شعری صلاحیت پر اعتماد کرکے آگے بڑھے بہت کچھ کہا۔ تقریباً تمام مروجہ اصناف میں اپنی فکری یادگاریں چھوڑیں مگر مجموعۂ کلام کی اشاعت کی سبیل نہیں نکل سکی۔

بزم احباب کماٹی پورہ بمبئی کے بانی رکن تھے۔ اسی محلہ میں ان کا قیام بھی تھا۔ نشستوں کے علاوہ بڑے مشاعرے بھی ہوتے تھے اور زمین پر ٹاٹ بچھایا جاتا تھا ان کی گلی میں بچھے ہوئے ٹاٹ پر بمبئی کے نمائندہ شعراء بیٹھتے تھے اور اپنا کلام سناتے تھے۔ شکیل بدایونی اور خمار بارہ بنکوی

وغیرہ بھی ان مشاعروں کے خصوصی مہمان شاعر ہوا کرتے تھے۔ شعروشاعری کا یہ رت جگا رات بھر کا جشن شعرونغمہ ہوا کرتا تھا۔ کماٹی پورہ کی نیند سے بوجھل فضا جاگ اٹھتی تھی اور خوشگوار موڈ میں ہوکر واہ واسبحان اللہ کے شور سے گونجنے لگتی تھی۔

نمونۂ کلام

ہر شے میں تو نہاں ہے، ہر شے سے تو عیاں ہے　　تیرے کرم پہ آقا! قربان میری جاں ہے
تو ہے زمیں کا مالک، تو مالکِ زماں ہے　　خالق ہے تو مکاں کا، خلاقِ لامکاں ہے
حمدِ خدا کا نغمہ ہرسو رواں دواں ہے　　لکھوں میں حمد تیری مجھ میں یہ دم کہاں ہے
آقا کریم تو ہے، مولا رحیم تو ہے　　اک لائقِ عبادت تیرا ہی آستاں ہے
تیرے ہی دستِ قدرت میں ہے نظامِ عالم　　یہ کائنات تیرا اک امر کن فکاں ہے
آقا ہے تو جہاں کا سب ہیں غلام تیرے　　تو ربِ عالمیں ہے مخلوقِ کُل جہاں ہے

اشفاقؔ - ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی

یکم جنوری ۱۹۳۵ء ـــــ ۲۶/مارچ ۲۰۰۵ء

اشفاق احمد صدیقی ولد شیخ عبدالستار موضع کوٹھنہ ضلع اعظم گڑھ کے تھے۔ بچپن میں والدین کی شفقت سے محروم ہوگئے گھر کی ساری ذمہ داریاں ان کے کمزور کندھوں پر آگئیں۔ ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی ایس سی کرنے کے بعد گورکھپور کے ریلوے آفس میں ملازمت کرلی۔ ملازمت کے دوران انھوں نے ۱۹۶۵ء میں گورکھپور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ ڈاکٹر محمود الٰہی (۲/ستمبر ۱۹۳۰ء - ۲۰/مارچ ۲۰۱۴ء) کی نگرانی میں ”نذیر احمد۔شخصیت اور کارنامے“ تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۷۱ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ یہ مقالہ اپریل ۱۹۷۴ء میں یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ کی جزوی مالی امداد سے شائع ہوا۔ یکم اگست ۱۹۷۲ء کو شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ میں اردو لکچرر کے عہدے پر تقرر ہوا اور خدمات انجام دے کر یہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔ شبلی کالج میگزین کے مدتوں مدیر بھی رہے۔

ڈاکٹر اشفاق کو شاعری اور افسانہ نگاری سے شروع ہی سے دل چسپی رہی ہے۔ ان کے لکھے افسانے تو شائع نہیں ہوئے مگر ان کا کلام اردو رسائل کے اوراق کی زینت بنتا رہا۔ انھوں نے ناول نگاری میں بھی اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ ترجمے بھی کئے ہیں۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر افشار احمد صاحب بھی صاحبِ لیاقت اور درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔

گورکھ پور کے زمانۂ قدیم میں شاعری کی طرف رغبت ہوئی۔ ایم کوٹھیاوی راہی سے کلام پر اصلاح کی اور ساری عمر دوشیزۂ سخن سے ربط وتعلق باقی رکھا۔ انھوں نے مشاعروں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا کیوں کہ موجودہ زمانے کے مشاعرے ادب فروش ہو چکے ہیں۔ اردو کے دبستانی ادب سے انھیں ایک گونہ دلچسپی تھی۔ باغ وبہار اور فسانۂ عجائب کا تنقیدی جائزہ ان کی ایک مختصر سی کتاب ہے اس سے ان کے علم وخبر پر روشنی پڑتی ہے۔ طلبہ کے لئے یہ کتاب بڑی کارآمد ہے۔ علامہ اقبال ان کے محبوب شاعر تھے۔ اقبال کے تصور زمان ومکان پر ان کے نتائج فکر کے بعض حصے چھپے ہیں۔ انھوں نے تنقید وتحقیق کے میدان میں اپنی موجودگی کا احساس کرایا اور مختلف موضوعات پر مضامین لکھے جو اردو کے رسالوں میں اشاعت پذیر ہوئے۔ اس کی وجہ سے انھیں اردو دنیا میں وقار واعتبار حاصل ہوا۔ ان کے سب سے زیادہ مضامین انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے لسانی ترجمان ہماری زبان (ہفتہ وار) دہلی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ شاعر بمبئی، نوائے ادب، شب خوں الہ آباد، سب رس، کتاب لکھنؤ، جامعہ دہلی، زبان وادب اور خبرنامہ یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ میں بھی چھپا کئے ہیں۔ ان کے مضامین کا تعلق زیادہ تر تدریسی مزاج وضرورت سے رہا ہے۔ انھوں نے دبستان شبلی کے نثری کارناموں پر بھی ایک ضخیم کتاب مرتب کی تھی جو ابھی تک تشنۂ اشاعت ہے۔

انھوں نے ڈاکٹر جانسن کے ناول "ریسلاس" کی ترتیب وتدوین کی ہے۔ ان کی نثری نظموں مجموعہ "یہ داغ داغ کہانی" ۲۰۰۳ء میں چھپ چکا ہے۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے مرتب کیا تھا جو ابھی تک منتظر اشاعت ہے۔ معلمی کے پیشے سے منسلک ہونے کی وجہ سے ان کے علمی وادبی، شعری وفکری ذوق کی تہذیب ہو چکی تھی۔ اسی لئے ان کی نگارشات میں

بعض مقامات پر کچھ ایسی باتیں آ گئی ہیں جو ذہن وفکر کو چونکا دینے والی ہیں اور ان سے انسانی تخیل کو کچھ نئی جہتیں ملی ہیں۔

اشفاق نے غزلیں کہیں، حمد ونعت سے بھی شغف رکھا، آزاد اور پابند نظمیں بھی ان کے زیرِ قلم آئیں۔ انھوں نے کچھ شعری تجربے بھی کئے۔ ان کے دور میں سائنس کے جو تجربے ہوئے، ٹکنالوجی نے انسانی زندگی میں جو تبدیلیاں کیں، بساط سیاست پر جو نئے چہرے اور مہرے آئے۔ وقت کی تیز گامی نے جو صدیوں کو دہوں میں، دہوں کو مہینوں میں اور مہینوں کو دنوں اور لمحوں میں سمیٹ کر رکھ دیا وہ سب ان کی نگاہ میں روشن ہیں۔ وہ واقعات وحادثات کی جزئیات اور تاریخ کی کڑیوں سے اخذ ہونے والے نتائج وافکار کو بھی موضوع بناتے ہیں۔ انسانی کمالات، تہذیبی اقدار، جمالیاتی احساس، سماجی شعور اور مذہبی واخلاقی رجحانات وتصورات پر ان کی نظر ہے اور ان کی شاعری میں ان سب کا عکس واثر موجود ہے۔ انھیں غزل سے زیادہ انس رہا۔

انھوں نے بعض نظمیں نثری آہنگ میں کہی ہیں، بعض میں مصوری سے کام لیا ہے۔ بعض بیانیہ رنگ لئے ہوئے ہیں، بعض میں علامتیں اور استعاراتی روشنیاں اور رنگینیاں پڑھنے والے کا دامنِ دل اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے

چند تصویر جنوں

کمروں کی ان دیواروں پر/ کتنے چہرے آویزاں ہیں/ دلکش رنگوں والے چہرے/ دیس دیس کے/
ہر مذہب کے/ کچھ لافانی فنکاروں کے/ راہبروں کے/ غم خواروں کے/ کتنے چہرے/
میرے جانے پہچانے سے/ اور اسی سونے کمرے میں/ بکھری ہیں جو چند کتابیں/ وہ کہتی ہیں/
لوگ تھے کیسے کیسے وہ بھی/ کیسا کیسا دل لائے تھے/ سر میں ان کے اک سودا تھا/ دل میں زخم کوئی گہرا تھا/
اور کہتی ہیں/ ان لوگوں نے/ چل کے زمیں سے/ جب تاروں پہ سانس لیا تھا/ کتنے جواں تھے ان کے ارادے/
اور کہتی ہیں/ وہ بیچارے/ سب کے لئے تھے/ لیکن ان کا کوئی نہیں تھا/ (۱)
اور کہتی ہیں/ وہ بیچارے/ سب کے لئے تھے/ لیکن ان کا کوئی نہیں تھا/ (۱)

گر آپ چاہتے ہیں کوئی ایسی کتاب   جس میں تمام دور کی تہذیب کا ہو ذکر

آجائیں پھر تو پاس مرے غم نہ کچھ کریں
اتنی سی بات کے لئے اتنی بھی کیا ہو فکر
عنوان زندگی پہ میں ایسا بیان دوں
پڑھنے کے لئے آپ کو ہندوستان دوں
کیا پرندے اڑتے ہیں تخئیل میں
جھیل سے اٹھتے ہیں گرتے جھیل میں
ہوگیا ہے نیلگوں پانی کا رنگ
اپنی گہرائی سے بہتا نیل میں
دیکھ کر خاموش کیوں ہو دوستو
کیا لکھا ہے اس نئی انجیل میں
اپنی ناکامی پہ ہے اب شرمسار
زندگی! یہ فن تیری ترسیل میں
روشنی کرتی ہے کس گھر کا طواف
خون کس کا جلتا ہے قندیل میں
زندگی ہے صدہا قرنوں کا سفر
قید کب ہوتی ہے سنگِ میل میں
دردوغم، محرومیاں، ناکامیاں
کیا نہیں وقت کی تحویل میں(۲)
ڈھلتی ہوئی ہے دھوپ اترتا شباب ہے
نشہ میں تیز تر ہے پرانی شراب ہے
اپنے گھروں میں جس سے اجالا رہے سدا
اپنی نظر میں ایک وہی آفتاب ہے
بچوں کی آنکھ دیکھ کے جلتے ہیں اب بزرگ
دنیا میں ایک یہ بھی بڑا انقلاب ہے

حواشی:

(۱) ماہنامہ شاعر بمبئی اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۳۵

(۲) اعظم نامہ، اعظم گڑھ فروری ۱۹۸۹ء ص ۲۰

اشہدؔ - مولوی حکیم اشہد حسن اشرفی

۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء ـــــ ۱۰/فروری ۲۰۱۴ء/۹/ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ دوشنبہ ۱۲/بجے دن

یہ حکیم نہیں تھے مگر عوام میں حکیم اشہد کی عرفیت سے جانے جاتے تھے۔ ان کا دادیہال ونانیہال دونوں حیثیت عرفی کا مالک تھا۔ تاریخی نام شیخ اشہد حسن تھا جس سے ۱۳۳۸ھ کا مادۂ تاریخ برآمد ہوتا ہے۔ آپ کے والد شیخ محمد امین انصاری بن حافظ عبدالواحد مرحوم اپنے دور ودیار کے بڑے باوقار اور رعب وداب کے زمیندار ورئیس تھے جن کا تاریخی نام مظفر امین (مادۂ تاریخ

۱۳۲۱ھ) تھا۔ وہ ایک مدت تک چیرمین اور آنریری مجسٹریٹ ہی نہیں تھے بلکہ اہالیانِ قصبہ کے بلاشرکت غیر قائد ورہنما بھی تھے جن کی دانشمندی وخوش تدبیری، مصالح بینی وحکمت اندیشی کے معترف بڑے بڑے زعمائے وقت بھی تھے۔ اور اس اعتراف واقرار اور اظہار وبیان میں اپنے پرائے کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ امین صاحب (۱۹۰۱ء۔ ۲۹/اگست ۱۹۶۸ء) تقریباً ۱۳۴۳ھ سے اپنی وفات تک مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم کے صدر رہے۔ ان کی مضبوط قیادت کے ذریعے مدرسہ اشرفیہ کی ترقی واستحکام اور اہل سنت وجماعت کے تحفظ وبقا کو حتمی بنانے کے تعلق سے مفتی عبدالمنان اعظمی رحمہ اللہ ارقام فرماتے ہیں کہ "حسنِ اتفاق بالائے اتفاق یہ ہوا کہ اس خاندان (شیخ عبدالوہاب صاحب گرہست بن شیخ علیم اللہ بن شیخ عبدالسبحان گرہست متوفی ۱۸/اکتوبر ۱۹۲۳ء)(۱) سے جو فرد اس کام کے لئے آگے بڑھا وہ نہایت جری، انتہائی ہوش مند، پُرجوش اور مُتَہَوِّر تھا، میری مراد مرحوم محمد امین صاحب گرہست انصاری سے ہے جن کی شعلہ بیانی اور پُرجوش قیادت نے تقریباً چوتھائی صدی پورے مبارک پور کو زندہ اور متحرک رکھا، افسوس آج مرحوم ہم میں نہیں ہیں مگر ان کے زریں کارنامے مبارک پور کی پیشانی پر سنہرے حروف سے لکھے ہوئے ہیں........ہم ان تک اپنے جذبات احترام واخلاص پیش کرتے ہیں کہ مبارک پور میں گری ہوئی سنیت کو سنبھالا بلکہ عروج وارتقا بخشنے والوں میں ان کا نام بھی سرفہرست ہے۔(۲)

محلہ پرانی بستی میں پرانے مدرسہ کی دومنزلہ سفالہ پوش عمارت موقوفہ ۲۰/مارچ ۱۹۲۲ء/۱۳۴۱ھ اور گولا بازار محلہ پورہ رانی کا احاطہ موقوفہ ۲۷/ستمبر ۱۹۳۴ء اسی خاندان کے ایثار کا نشانِ عظمت ہے۔ اسی دور میں امین صاحب کا گھر صدر مدرس اور طلبہ کا بھی مامن ومسکن بنا ہوا تھا۔ کیوں کہ انھوں نے کئی برسوں تک حضرت مولانا حافظ عبدالعزیز بھوج پوری مرادآبادی (۱۸۹۴ء- ۳۱/مئی ۱۹۷۶ء) کی مہمان نوازی اور ان کی اقامت گزینی نیز طلبہ کے قیام وطعام کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی۔ انھوں نے ہر موقع پر انتہائی خوش دلی کے ساتھ اپنی جماعت کی مالی واخلاقی مدد، قانونی وسیاسی حمایت وقیادت فرمائی۔

آپ کے نانا مولوی محمد احمد (۱۸۶۶ء - ۱۹۴۱ء) ساکن آصف گنج عرف دلال محلہ اعظم

گڑھ کے مشہور علمی وتجارتی گھرانے کے شاعر وادیب، صحافی وناول نگار، اردو، عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی کی تعلیم سے بھی آراستہ تھے۔ وہ کلکتہ میں انگریزوں کے چمڑے کے گودام کے منیجر تھے۔ اس زمانے میں ان کی تنخواہ ایک ہزار روپئے تھی۔ یہ بہت خوش حال تھے ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں ماجدہ اور عالیہ تھیں۔ یہی بڑی بیٹی ماجدہ اشہد کی والدۂ مکرمہ تھیں۔ عالیہ محمد اسلم انصاری مالک ہمدرد دواخانہ اعظم گڑھ سے منسوب تھیں جو مہراج گنج کے نہایت اعلیٰ مرتبت خاندان کے چشم وچراغ تھے پہلی بیوی کی وفات کے بعد محمد احمد اعظم گڑھی نے دوسری شادی مہراج گنج میں کی جن سے تین لڑکیاں تولد ہوئیں۔ ایک کی شادی خاندان ہی میں حقیقی بھتیجے عبدالحی انصاری سے ہوئی تھی جو جنگ آزادی کے مجاہد، اور ضلع کانگریس کے بڑے لیڈر رہی نہیں تھے وہ انگریزوں کے دور میں جیل کی صعوبتوں سے بھی گزر چکے تھے۔ بڑی بیٹی کی شادی امین گرہست کے چھوٹے بھائی محمد عمر سے ہوئی تھی۔ تیسری مولانا ظفر ادیبی کے حبالۂ عقد میں تھیں۔ مولانا محمد احمد کے صرف ایک لڑکے جو دوسری اہلیہ کے بطن سے تھے للن نام کے تھے جو پیدائشی گونگے تھے۔

حکیم اشہد نے مدرسہ اشرفیہ میں پرائمری کی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۳۴ء میں اعظم گڑھ شبلی جارج ہائی اسکول میں مولانا مظفر حسن ظفر ادیبی (۲۰؍دسمبر ۱۹۱۹ء - ۳۰؍جنوری ۲۰۰۶ء) کے ساتھ داخلہ لیا۔ اس کے بعد فارسی وعربی تعلیم کے لئے مدرسہ اشرفیہ کی طرف مراجعت ہوئی تو اپنے پھوپھی زاد بھائی مولانا ادیبی کے ہمراہ مولانا سید شمس الحق گجہڑوی (۱۱؍صفر ۱۳۲۰ھ - ۷؍دسمبر ۱۹۷۳ء) سے آمدنامہ، فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب، گلزار دبستاں، گلستاں، بوستاں اور ابتدائی عربی کی میزان، منشعب کا درس لیا۔ ہدایت النحو، مرقاۃ، شرح جامی، شرح تہذیب میں مولانا ثناءاللہ مئوی (۲؍جولائی ۱۹۱۰ء - ۱۵؍اگست ۱۹۹۰ء) سے کسب فیض کیا۔ مولانا عبدالمصطفیٰ اعظمی (۱۹۱۴ء - ۱۹۸۶ء) سے ہدایہ اولین، مشکوٰۃ شریف کے اسباق پڑھے، مولانا سید سلیمان بھاگلپوری متوفی ۲۶؍مارچ ۱۹۷۷ء کی مجلس درس میں ہدایۃ الحکمۃ، عقائد نسفی، شرح مرقاۃ اور صدریٰ کے علمی نکات سیکھے۔ حافظ صاحب، مولانا عبدالعزیز مرادآبادی (۱۸۹۴ء - ۳۱؍مئی ۱۹۷۶ء) سے ملاحسن اور تفسیر جلالین میں استفادہ کیا۔ ابھی شرح سلم اور ملاحسن، تفسیر جلالین اور ہدایہ آخرین

تک ہی استفادہ کر سکے تھے کہ عائلی ذمہ داریاں آپ کے سپرد کردی گئیں۔ ان تعلیمی مراحل میں علامہ ظفرادیبی ہم قبیلہ تو تھے ہی ان کے ہم نوالہ وہم پیالہ اور ہم سبق بھی رہے۔

۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء میں انجمن اہل سنت واشرفی دارالمطالعہ کے قیام کے بعد جلوس عید میلادالنبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کونکالنے کا فیصلہ طلبہ نے کیا تو انھوں نے اپنے والدامین صاحب سے اس کی اجازت چاہی مولانا قاری محمد عثمان گھوسوی (۱۹۱۸ء - ۱۱/اگست ۱۹۹۵ء) مولانا علی احمد قریشی مبارک پوری (صدر انجمن) کے ساتھ مل کر انھوں (یہ سکریٹری انجمن تھے) جلوس نکالا جس میں مولانا قاری محمد عثمان نے بڑی جدوجہد کی تھی، وہ خوش خط اور خوش آواز تھے۔ قاری صاحب نے طلبہ کی جماعت کو لے کر حفیظ جالندھری کے سلام سے اس کا آغاز کیا

"سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی"

انھوں نے زیادہ عرصہ تک انجمن اہل سنت واشرفی دارالمطالعہ کی قیادت بحیثیت سکریٹری فرمائی۔ اپنے والد مکرم کی وفات ۲۹/اگست ۱۹۶۸ء کے بعد اشرفیہ کی صدارت کے لئے کثیر ووٹوں سے منتخب ہوئے اس انتخاب میں مولانا حافظ عبدالعزیز مرادآبادی کو صرف تین ووٹ حاصل ہوئے تھے۔ ایک نام پیش کرنے والے کا، دوسرا کسی بیرونی طالب علم کا جو کسی طرح مٹنگ میں آ گیا تھا، تیسرا کسی ایک صاحب کا۔ باقی تمام ووٹ حکیم جی کے حصے میں آئے۔ حافظ صاحب بدمزہ ہو کر اس انتخابی مٹنگ میں سے اٹھ کر چلے گئے۔ ۱۹۴۴ء میں بنارس میں سنی کانفرنس ہوئی تھی اس میں مدرسہ اشرفیہ کے اس وقت کے استاد تجوید وقرأت حضرت مولانا قاری محمد عثمان گھوسوی کے ہمراہ شرکت فرمائی۔ ان کی شادی ۱۹۴۵ء میں محلہ کھیری باغ مئوناتھ بھنجن کے مشہور ومعروف رئیس حاجی محمد سعید سوداگر مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ایک لڑکے محمد حسان اور تین بیٹیاں ان کی جسمانی یادگاریں ہیں۔

ہولی کانڈ کے بعد آپ نے ۱۹۵۹ء میں مئو میں سکونت اختیار کر لی اور اپنا کاروبار شروع کیا۔ وہاں ۱۹۶۲ء میں جلوس عید میلادالنبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا آغاز کیا۔ جس میں مبارک پور اور گھوسی کی اچھی نعت خواں ٹیمیں شریک کی جاتی تھیں۔ انھیں سیاست سے بھی دل چسپی وراثت میں ملی تھی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۲ء تک وہ کانگریس کمیٹی مبارک پور کے سکریٹری رہے۔ یتیم خانہ مدرسہ

اسلامیہ اشرفیہ میں مدرس بھی رہے۔ عرس مخدوم سمنانی کے موقع پر مبارک پور سے کچھوچھہ کے لئے بسیں بھی جاری کراتے تھے۔

انھوں نے طالب علمانہ زندگی ہی میں شاعری شروع کردی تھی۔ اپنے کلام پر رحمت الٰہی برق اعظمی سے اصلاح لیتے تھے۔ ان دنوں ان کا کلام حاجی عبدالعزیز عزیزؔ برقی جلسوں، مشاعروں اور محفلوں میں صدا بند کرتے تھے۔ انھوں نے نعت وقصائد سے زیادہ شغف رکھا۔ غزل گوئی کی طرف کبھی کبھی ہی اعتنا فرمایا کرتے تھے۔

زمانۂ آغازِ سخن میں اشعار خود بخود نازل ہوتے تھے۔ طبیعت جوش پر رہتی تھی۔ دماغ حاضر رہتا تھا۔ خوب شاعری ہوتی تھی مگر ہائے رے ظالم سیاست۔ زندگی کے خارزار میں ایک شاعر الجھ کر رہ گیا۔ اور ایک اچھی شاعری کی جو امید تھی وہ ختم ہوگئی۔ ان کی ایک غزل یوتھ لیگ مبارک پور کی شائع کردہ "منزل کی طرف" میں صفحہ ۱۸ پر اور وہی نمود سحر، مرتبہ شرر مصباحی میں صفحہ ۸۶ پر چھپی ہے۔ جس کا ردیف وقافیہ شبنم رہنے دے، ماتم رہنے دے وغیرہ ہے۔

اشہد کی شاعری میں حالات ورفتار زمانہ کی چاپ محسوس ہوتی ہے۔ وہ ولولہ اور جذبہ وحوصلہ کے شاعر تھے۔ ان کی فکری بنیاد حالات کے جبر کے خلاف احتجاج کی زمین پر قائم تھی۔ انھوں نے سیاسی بازیگروں اور ارباب اقتدار کی غیر جمہوری ذہنیت کے بین السطور کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ہر استحصال اور ذہنی غلامی کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت رکھتے تھے۔ وہ انحرافی شاعری کے باغیانہ تیور کو شعر کا جامہ پہنانے میں لگے تھے۔ وہ رنگین مزاج ضرور تھے مگر ان کے اشعار حسن وعشق کی پارینہ داستان نہیں ہوتے تھے وہ مدبر کے انداز میں حالات کا تجزیہ کر کے شعر کہنا چاہتے تھے۔ ان کے سماجی شعور کی بیداری ان کی شاعری کی جہتیں بدل رہی تھی۔

نمونۂ کلام

ساقی نے مجھ کو جام دیا اس ادا کے ساتھ — زاہد نے توبہ توڑ دی حسن خطا کے ساتھ
اس طرح سے وطن میں رہوا یکتا کے ساتھ — رہتے ہیں جیسے پھول چمن میں صبا کے ساتھ
اتنا وقار اہل خرابات کم نہیں — بادہ کشوں کا ذکر بھی ہے پارسا کے ساتھ

پاتا نہیں میں کس لئے آخر سکونِ دل جب دشمنی نہیں مری ارض وسما کے ساتھ
نخوت کے پھول دل میں اُگاؤ نہ دوستو زیبا غرور وکبر ہے بس کبریا کے ساتھ
کردار سے پلٹ دو زمانے کی تم ہوا کب تک اڑا کروگے یونہی ہر فضا کے ساتھ
اشہدؔ سر اپنا حق پہ کٹاتا ہے کون آج جذبہ وہ سوگیا ہے شہِ کربلا کے ساتھ

ہاں پھونک دے گرمی محفل میں اب گریۂ شبنم رہنے دے
نغموں میں شرارے پیدا کر، یہ شیوۂ ماتم رہنے دے
طوفان کو رعشہ آجائے وہ شمع فروزاں ہوتی ہے
بے سود ہے ہمدم پھونک تری، اب کوشش پیہم رہنے دے
جاتی نہیں دل کی نادانی سمجھاتا ہے مجھ کو محشر میں
نازک ہے مزاجِ حسن بہت، یہ شورش پیہم رہنے دے
اِک ایک ستارہ ڈوب گیا اللہ رے شب کی تنہائی
اے چاند چلا جا تو بھی کہیں، یہ تیرگی غم رہنے دے
تاریک سہی ماحول مگر جذبات کی رو میں بہتا جا
ہر داغِ جگر کو روشن کر، تارے ہیں جو مدھم رہنے دے
یہ اشک متاعِ الفت ہے اشہدؔ نہ اسے یوں ضائع کر
ہے عکسِ جمالِ یار اس میں یہ دیدۂ پُرنم رہنے دے

حواشی:

(۱) عبدالمجید کی قلمی ڈائری میں شیخ عبدالوہاب کی تاریخ وفات اکتوبر درج ہے مگر سنہ مذکور نہیں۔

(۲) مدرسہ اشرفیہ سے الجامعۃ الاشرفیہ تک مطبوعہ ۲۰۱۳ء ص ۱۸-۱۹

اصغرؔ - سید اصغر حسین ماہلی

سید احتشام حسین صاحب کے اسلاف میں ان کے جد بزرگوار سید اصغر حسین ماہلی بھی شاعر تھے اور عموماً فارسی میں فکر سخن کرتے تھے۔ اب ان کے خاندان والوں کے پاس کچھ نہیں

ہے۔کبھی کبھی اولاد اصغر صاحب کے والد ابو محمد عیشؔ ماہلی ان کے اشعار سنایا کرتے تھے۔(۱)

حواشی:

(۱) مکتوب سید اولاد اصغر بنام راقم یکم جولائی ۱۹۸۱ء

اصغرؔ - سید اولاد اصغر ماہلی

یکم دسمبر ۱۹۱۵ء ـــــ یکم رنومبر ۱۹۸۶ء/ ۲۸رصفر ۱۴۰۷ھ

عیشؔ ماہلی کے بیٹے بڑے صاحبِ لیاقت اور علمی وادبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مشہور نقاد اور ماہر لسانیات سید احتشام حسین کے چچازاد بھائی اور حقیقی بہنوئی تھے۔خاندانی روایات سے متاثر ہوکر ۱۹۳۷ء سے شاعری کرنے لگے۔غزلیں خوب کہتے تھے۔انھوں نے قصائد بھی کہے ہیں جو مذہبی رسالوں کی زینت بن چکے ہیں۔ایک زمانے میں مبارک پور میں محکمۂ غذا اور رسد کے افسر بن کر قیام پذیر تھے۔یہ تقریباً ۱۹۵۲ء کے آس پاس کی بات ہے۔مبارک پور نوٹی فائڈ ایریا کے بخشی بھی رہے۔مبارک پور کی اہم شخصیتیں ان کی نشست گاہ سے تعلق رکھتی تھیں۔مولانا مظفر حسن ظفرؔ ادیبی، ملا یونس شکیب، قاری محمد یحیٰ تنہاؔ، مولانا محمد شفیع نیرؔ (قاضی شریعت) ایوب مبارک پوری، علی مختار مبارک پوری کی علمی وادبی مجلسیں اکثر ان کے یہاں گرم رہتی تھیں جن میں علم ودانش اور شعر وادب کا تذکرہ ہوتا تھا۔اس دور میں ان کی وجہ سے یہاں ادبی فضا میں بڑی خوش گواری آ گئی تھی۔طرحی نشستیں بھی ہوا کرتی تھیں۔علی جواد زیدی نے ان کے مجموعہ قصائد "نقوش تولا" کی ترتیب کی اطلاع دی ہے مگر چھپنے کی خبر نہیں ہوسکی۔یہ ملازمت سرکاری کے بعد دفتر ہفتہ وار سرفراز لکھنؤ میں بھی معاون مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔

سید اولاد اصغر کے کلام میں زبان کا شائستہ وشستہ انداز ملتا ہے۔انھوں نے لفظوں کو اس چابک دستی سے برتا ہے کہ اس سے شرفائے انجاب کی مجلسی مہک آتی ہے۔انھوں نے لفظوں، ترکیبوں، تشبیہوں اور محاوروں کا برمحل استعمال کیا ہے۔قصائد میں ان کی فکر کی جولانی اور طبیعت کی روانی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ان کی باتیں بڑی پہلودار اور معنویت سے بھری ہوتی ہیں۔اچھے اور

ادبی وعلمی گھرانے کی تہذیب وشائستگی ورثے میں ملی تھی جس کی اساس پر ان کے فکر وخیال کی دنیا آباد واستوار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام پڑھتے ہوئے کسی مقام پر طبیعت مکدر نہیں ہوتی اور شعری کم وکیف سے اہتزاز ذہنی اور انشراح قلبی کی دولت ونعمت حاصل ہوتی ہے۔ ان کی مذہبی شاعری میں محاکات نے واقعات کے دلکش پہلو کو روشن کیا ہے اور اختصار واجمال میں غور وفکر کی کئی تہیں پوشیدہ رکھی ہیں۔ ان کی شاعری میں معنی تلاش کرنے والوں کی تسکین کے بہت سے سامان ہیں۔

ان کے یہاں تشبیہ واستعارہ کے استعمال میں تخلیقی شعور اور زبان وبیان پر کامل دستگاہ کی کارفرمائی کا احساس ہوتا ہے۔ فنی وعروضی اور لسانی احساسِ جمال کی بیداری اور ذہنی سطح کی ارتقاعی کیفیت نے ان کے اشعار کو دوآتشہ بنا دیا ہے۔ کسی مقام پر عجز بیان اور محتاجی الفاظ کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں اتنے شعری امکانات موجود ہیں کہ مشکل مقامات اور سنگلاخ زمین کو بھی لالہ زار بنا دینے کا معجزۂ فن ظہور پزیر ہوتا رہتا ہے۔ خیالات کے اظہار اور شعر گوئی کے لمحات میں لفظوں کا در و بست، صوتی واستعاراتی نظام، لسانی درک وشعور، روایات کے ذخیرے سے استعارہ کا ملکۂ خداداد ان کا عناں گر اور معین ومددگار رہتا ہے۔ سرعت انتقال ذہنی اور ذکاوت حسی انھیں ہر دم تازہ دم اور بیدار رکھتی ہے۔ انھوں نے اعتقادی شاعری کی جوئے کم آب کو طوفان آشنا، اور رسمی وروایتی اصناف سخن کی یکرنگی ویکسانیت کو درد وداغ وسوز وساز وجستجو وآرزو کا حوصلہ دے کر نئے امکانات کے لئے راہیں ہموار کی ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری کو اک نئے انقلاب کی بشارت اور اک قطبی فکر کو ہمہ جہت وہشت پہلو ہونے کی ضمانت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سید اولاد اصغر ماہلی کو تاریخ گوئی میں بھی مہارت کاملہ حاصل تھی وہ بہت جلد مادۂ تاریخ برآمد کر لیتے تھے۔ بہت تلاش کے بعد بھی ان کی غزلوں کے اشعار دستیاب نہیں ہو سکے۔

لسان اللہ۔ عین اللہ، وجہ اللہ، اُذن اللہ ۔۔۔ خدائی متحد ہے کس قدر نقش پیمبر سے
جلیس مجلس النبی، انیسِ مجلسِ قدسی ۔۔۔ ہر اک جا روشنی ان کی ہے بڑھ کر مہر انور سے
تعالیٰ اللہ بچپن میں یہ ہیبت شیرِ داور کی ۔۔۔ ابھی سے لو، درِ خیبر کی چولیں ہل گئیں ڈر سے
نہ جانے جَو کی روٹی میں نہاں تھی کس قدر طاقت ۔۔۔ علی کی قوتیں پوچھے کوئی جبریل کے پر سے

تجھے زیبا ہے دعوائے سلونی جانِ پیغمبر　　زمانہ پوچھ لے جو چاہے شہرِ علم کے در سے(۱)

حریم باغِ جناں سے سلام لائی ہے　　اجل نوید حیاتِ دوام لائی ہے
فغاں کا شور خیامِ امام سے اٹھا　　سحر کی روشنی کیسا پیام لائی ہے
یہ تشنگی جسے پالا ہے ریگِ صحرا نے　　غضب کا تیر چھ ماہے کے نام لائی ہے
یہی ہے ماحصلِ کارہائے بنتِ علی　　بچا کے موت سے اپنا امام لائی ہے
نہ بھولے تم کو عزادارو تیغ کے نیچے　　تمہیں حسین کا زینب سلام لائی ہے(۲)

نہیں ہے حق کو فنا یہ پیام بخش گئے　　حسین روحِ یقیں کو دوام بخش گئے
بس اس لئے کہ ابد تک یہ کارواں نہ رکے　　مسافروں کو مذاقِ خرام بخش گئے
عجیب شرطِ سفر تھی کہ چل کے تیغوں کو　　وفا کو ایک دلِ برق گام بخش گئے
وفور تشنہ لبی کا تھا اور ہی عالم　　مگر دلوں کو حقیقت کا جام بخش گئے
اب اور اس کے سوا چاہئے بھی کیا اصغر　　نبی کا اسوہ، خدا کا کلام بخش گئے(۳)

ہم ماتمِ شاہِ شہداء کرتے رہیں گے　　تخلیق کا حق اپنی ادا کرتے رہیں گے
الفاظ میں ڈھالیں گے دل وجاں کا تموج　　احساس کو پابند بکا کرتے رہیں گے
اشکوں کو زباں دیں گے کہ ٹوٹے نہ تسلسل　　آنکھوں کو یونہی نوحہ سرا کرتے رہیں گے
لو اور بڑھائیں گے غمِ ابنِ علی کی　　طوفان میں روشن یہ دیا کرتے رہیں گے(۴)

گل ریز صبح اور گہر ریز شام ہے　　مسرور ہر صحابیِ خیرالانام ہے
حورو ملک کا آج یہ کیوں اژدہام ہے　　کیسی یہ فاطمہ کے یہاں دھوم دھام ہے
بیت الشرف لائے کسے فخرِ انبیا
دستِ نبی پہ کون ہے یہ درِ بے بہا
کیا فاطمہ کا چاند سا یہ گلعذار ہے　　یا سلک پنجتن کا درِ شاہوار ہے
یا رحل پہ صحیفۂ پروردگار ہے　　یا دوشِ مصطفیٰ کا کوئی شہسوار ہے
تیور تو کہہ رہے ہیں کہ ذی احترام ہے
آغوش میں رسولِ خدا کے امام ہے(۵)

ناکامیاب رہتا ہے لشکر کبھی کبھی ہوتے ہیں کام گار بہتر کبھی کبھی

حواشی:

(۱) قصیدہ نگاران اتر پردیش۔علی جواد زیدی باردوم ۱۹۸۳ء ص ۹۲

(۲) ہفتہ وار سرفراز لکھنؤ۔محرم نمبر بابت ۱۳۹۶ھ ۲ر جنوری ۱۹۷۶ء/ ۲۹ر ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ ص ۹۲

(۳) ہفتہ وار سرفراز لکھنؤ۔ذبحِ عظیم نمبر ستمبرا کروبر ۱۹۸۴ء ص ۸۲)

(۴) ہفت روزہ سرفراز۔محرم نمبر ۲ر مارچ ۱۹۷۰ء/ ۲۳ر ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ ص ۱۶۴)

(۵) ماہنامہ واعظ لکھنؤ۔سبط اکبر نمبر جون، جولائی ۱۹۸۳ء ص ۹۱)

اطہرؔ - مولانا قاضی عبدالحفیظ مبارکپوری

۴ر رجب ۱۳۳۴ھ/ ۷ر مئی ۱۹۱۶ء ـــــ ۲۸ر صفر ۱۴۱۷ھ/ ۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء

قاضی اطہر مبارکپوری کے نام سے علم وادب کی دنیا میں ان کی تحریریں سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی تھیں۔والد کا نام میاں جی محمد حسن تھا۔آپ کا خاندان بانی قصبہ مبارک پور حضرت راجہ سید مبارک شاہ (متوفی ۲ر شوال ۹۶۵ھ) کے ہمراہ مانکپور سے مبارک پور آکر آباد ہوا اس خاندان میں عہدۂ قضا انگریزی تسلط کے آخری دور تک تھا اور مسلمانوں کے معاملات دینی ودنیاوی اسی خاندان سے متعلق تھے۔مولانا کا ننہال اپنا ایک الگ علمی و دینی پس منظر رکھتا تھا اس میں صاحب تصنیف وتالیف مدرس ومعلم اور شاعر گزرے ہیں۔مولانا کے ذہنی افق پر ننہال کے علمی و ادبی شفق زار کا جو عکس ورنگ تھا وہ ہمیشہ ان کی شناخت کراتا رہا۔

ابتدائی تعلیم گھر کی شروعات تھی۔پرائمری وناظرہ سے فراغت تک کے تمام تعلیمی مراحل مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا شکر اللہ مبارک پوری، مولانا بشیر احمد، مولانا محمد عمر مظاہری، مولانا نعمت اللہ مبارک پوری، مفتی محمد یٰسین مبارک پوری اور مولانا محمد یحییٰ رسول پوری کے زیر نگرانی طے ہوئے۔آخری سال ۱۳۵۸ھ کے دورۂ حدیث میں داخل ہوکر جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد سے ۱۳۵۹ھ میں سند فراغ حاصل کی۔علوم مشرقیہ کی نصابی تکمیل تعلیم کے بعد شوال ۱۳۵۹ھ میں

مدرسہ احیاء العلوم کی خدمت تدریس پر مامور ہوئے۔ تعلیم وتدریس سے ازلی انس وعشق ہونے کے باوجود انھیں جنوری ۱۹۴۷ء میں امرتسر اور لاہور کا سفر کرنا پڑا۔ وہاں مدیر زمزم لاہور مولانا محمد عثمان فارقلیط کی نیابت ادارت ملی۔ تقسیم ہند کے ہنگاموں نے نومبر ۱۹۴۷ء میں ہفت روزہ انصار بہرائچ سے منسلک کر دیا۔ شوال ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء سے شعبان ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۹ء تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی مسند درس سنبھالی یہاں تقریباً ایک برس کی وابستگی کے بعد وہ ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ/ نومبر ۱۹۴۹ء کو عروس البلاد بمبئی کے لیے عازم سفر ہوئے۔ روز نامہ جمہوریت بمبئی کا اجرا ۱۵ رجون ۱۹۵۰ء کو ہوا تو مولانا اس کے نائب مدیر تھے۔ مولانا یہاں سے منتقل ہوکر فروری ۱۹۵۱ء میں روز نامہ انقلاب بمبئی کے نشان صحافت کو بحیثیت نائب مدیر روشن کرنے کی مہم میں لگ گئے اور ۲۳ رفروری ۱۹۵۱ء سے ۱۰ راپریل ۱۹۹۱ء تک احوال ومعارف کے کالم کے علاوہ چند اور کالم کے ذریعہ اپنے علم وفکر کی دولت تقسیم کرتے رہے۔ ۱۴ رمئی ۱۹۵۴ء کو ہفتہ وار البلاغ بمبئی اور ماہنامہ البلاغ بمبئی کی پہلی اشاعت ایک ساتھ عمل میں آئی تو قاضی صاحب کا خونِ جگر اس نقشِ ناتمام کو بھی تمام کرنے میں صرف ہونے لگا۔

مولانا بچپن ہی سے قرطاس وقلم کے حوالے سے اردو زبان کی عروس نثر ونظم کو اپنی حریم ناز میں بار دے چکے تھے۔ انھوں نے پہلے شاعری کی پھر مضمون لکھنے کا سلسلہ جاری کیا ان کی پہلی نظم ''مسلم کی دعا'' ماہنامہ الفرقان بریلی جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ ج ۵ ش ۶ کے صفحہ ۳۲ پر چھپی تھی۔ مولانا کا ایک مختصر مضمون الجمعیۃ دہلی میں واردھا کی خطرناک تعلیمی اسکیم کے عنوان سے چھپا تھا مگر تاریخ اشاعت نامعلوم ہے۔ اس کے بعد ایک صفحے کا مضمون مساوات کے زیر عنوان رسالہ مومن بدایوں میں ۱۳۵۳ھ کے کسی شمارے میں اشاعت پذیر ہوا۔ دوسرا مضمون اسی رسالہ میں "رہا دین باقی نہ اسلام باقی" کے عنوان سے دو صفحے میں چھپا۔

مولانا کا قلم بڑا رواں اور مزاج تحقیقی تھا، اسی کے ساتھ تخلیقی وجدان وشعور سے بھی بہرہ ور تھے، عبارتوں میں سادگی تھی مگر انھوں نے مختلف موضوعات پر جب قلم اٹھایا تو علم وتحقیق کے ایسے نامعلوم در کھلنے لگے جنھیں اردو میں آمد بہار کا نیا منظر نامہ تشکیل دینے کی بشارت کے مفہوم میں

لیا گیا۔ اب تک ان کی تقریباً نصف صد کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں ان میں عرب و ہند عہد رسالت میں، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، خلافت راشدہ اور ہندوستان، خلافت عباسیہ اور ہندوستان، خلافت بنوامیہ اور ہندوستان، دیار پورب میں علم اور علماء تذکرہ علمائے مبارک پور، مآثر ومعارف، آثار واخبار، تدوین سیر ومغازی، خیر القرون کی درس گاہ ہیں (یہ سب اردو میں ہیں) العقد الثمین، جواہر الاصول فی علم حدیث رسول، رجال السند والہند (عربی زبان میں) کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام بھی مئے طہور کے نام سے اپریل ۲۰۰۶ء میں راقم کے مقدمہ کے ساتھ منظر عام پر آچکا ہے۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا مزاج شعر وشاعری سے ہم آہنگ تھا۔ انھوں نے کسی سے اس فن میں باضابطہ اصلاح نہیں لی مگر لاہور کے دور قیام میں انھوں نے احسان دانش کی شعری ولسانی نکتہ آفرینیوں سے ضرور استفادہ کیا تھا۔ علمائے اسلام کی خونیں داستان کا جو ناقص نسخہ راقم کی نظر سے گزرا ہے اس میں جگہ جگہ احسان دانش نے مولانا کی نثری قبائے گل میں اپنی ترمیمات کے ستارے ٹانکے ہیں۔ مولانا نے غزل، نعت، نظم، قطعے، وفات نامے، بچے بچیوں کی پیدائش اور چندے کے اشعار کہے ہیں۔ یہ سہ لسانی شاعر تھے اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی ان کے آثار افکار موجود ہیں۔

اطہر نے اپنی علمی مصروفیات کی وجہ سے شاعری کی وادی سے بہت جلد خود کو دور کر لیا تھا پھر بھی ان کے کلام کی اچھی خاصی تعداد تھی ان کی بیاض بمبئی سے وطن واپس ہوتے ہوئے ٹرین میں بھول چوک کی وجہ سے چھوٹ گئی تھی جس کا سراغ پھر کبھی نہیں ملا۔ وہ اس شعری سرمائے کی گمشدگی پر ہمیشہ افسردہ رہے۔ کہتے تھے مفقود الخبر بیاض میں جوانی کے دور کی یادگار غزلیں اور نظمیہ شاعری کے نمونے تھے۔

اطہرؔ اپنے دور کے اسالیب اور طرز نگارش کا احترام کرتے ہیں انھوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں، شعری رویوں اور سیاسی وسماجی شعور کی رو کو سمجھا تھا۔ ان کا دور نئی نئی تبدیلیوں کا تھا۔ اور اخذ وترک، رد وقبول کے مرحلوں سے گزر رہا تھا۔ اطہر نے زبان واسلوب

اورطرز ادا [redacted] کے علائم واستعارات اور زبان و بیان کی توسیع معنی کرنے والی [redacted]
کی [redacted] زیادہ استفادہ نہیں کیا مگرانھوں نے اس دور انقلاب کے [redacted]
[redacted] کشمکش اور دین ومذہب کی اصلاحی و دعوتی تحریکوں میں [redacted]
[redacted] تھا۔ وہ اتحاد ملت اور اخوت وحقوق انسانی کے تحفظ میں [redacted]
[redacted] سالمیت واستحکام اور ترقی سے انس تھا۔ وہ یہاں کے موسم
[redacted] دیکھتے تھے ان کی بعض نظمیں جو امتداد زمانہ کے
[redacted] کی خوشبو سے لگاؤ کو ظاہر کرتی تھیں۔

[redacted] انھوں نے عمر بھر یادِ ایام کو سینے سے لگائے
[redacted] کی ان تہذیبی بنیادوں کو تلاش کر کے سامنے
[redacted] تعمیر انسانیت اور ذہنی تشکیل کے مرحلۂ شوق
[redacted] کتابیں دیکھنے کے بعد ہمارے اس تاثر کو
[redacted] ماضی پرست اور عظمت رفتہ کے نوحہ
[redacted] کی چادر میں اپنی ذات کو لپیٹ کر
[redacted] ماضی کے دریچوں کے ان اجالوں پر
[redacted] عناصر میں ظہور ترتیب کے لئے
[redacted] تمنا کی چہل پہل کے لئے ماضی سے
[redacted] اور حال کے غیر جذباتی مگر دانشورانہ
[redacted] ہیں۔ مستقبل کی بہتر صورت گری اسی وقت
[redacted] حاصل ہو۔ ماضی کے تعاون کے بغیر مستقبل کی افق
تابی کا منصوبہ تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے۔

زندگی کے سفر میں نشانِ راہ کی تلاش ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔ وہ قومیں زندہ قوموں کا نمونہ ہوا کرتی ہیں جو اپنے ہم عصر مسائل کی گتھی کو سلجھانے کے لئے ماضی کے ذخیرۂ مشاہدات

وتجربات میں سے اپنے فائدے کی چیزیں تلاش کر لیتی ہیں۔ ماضی کو جن لوگوں نے واقعات کا ملبہ سمجھ رکھا ہے وہ زندگی کا صحیح مصرف بھی نہیں تلاش کر پائے اور ہمیشہ ناکام ونامراد رہے۔

تجربات ومشاہدات کی زندگی میں اور زندگی کے تمام میدانوں میں کتنی اہمیت ہے اس کا احساس کچھ انھیں لوگوں کو ہوتا ہے جو دیدۂ بینا اور شگفتہ دماغ کے حامل ہوتے ہیں۔ دنیا تجربات سے بھری پڑی ہے۔ انسان ماضی کے تجربہ سے فائدہ نہ اٹھائے اور دوسروں کے تجربات ومشاہدات کو درکنار کر کے خود اپنے کئے ہوئے تجربات کو ضروری سمجھے تو یہ کوئی دانائی کی راہ نہیں ہوگی۔ کیوں کہ بعض ایسے بھی تجربے ہیں جن کو حاصل کرنے میں ایک انسانی زندگی ختم ہوجائے گی۔ اس لئے دانش مندی کا تقاضا ہے کہ انسان دوسروں کے تجربات کو بھی اپنی ہی متاع حیات اور سرمایۂ دانش سمجھے اور اس طرح اپنی زندگی کو دوسرے قسم کے تجربات کو حاصل کرنے میں لگا دے۔ مولانا کی شاعری بھی ماضی کو اسی نظریئے سے دیکھتی ہے کہ ہم عصر زندگی میں نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے عہدِ گزشتہ کے خزانے سے کیا کیا ساز وسامان لئے جاسکتے ہیں۔

مولانا نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے ماضی کی بازیافت بھی کی ہے اور اپنے نشاط عہد رفتہ کی شناخت وتشخص کا احساس دلا کر اپنی عظمتوں کے نشانات کو قائم کرنے کی تمنا بھی ظاہر کی ہے۔ وہ سرمایۂ بزم دوشیں کے ساتھ ایک دولت دانش عصر بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے ماضی کی راکھ کو بار بار کرید کر اپنے اسلاف کے جواہر پاروں کو نکالنے کا حوصلہ دکھایا تھا اس لیے ان کے کلام میں ماضی کی چنگاری کی حرارت موجود ہے۔ زبان صاف، سادہ، رواں اور عربی وفارسی لغات وتراکیب سے پاک ہے۔ وہ اپنی پشت پر علمی قافلے رکھتے ہیں مگر ان کی شاعری بوجھل نہیں اور نہ اس کی فضا ناگوار خاطر ہے۔ ذیل کے نمونۂ کلام میں کلام کا وہ نمونہ بھی درج کیا جا رہا ہے جو منصۂ ظہور میں نہیں اور بعد کی بازیافت ہے۔

نمونۂ کلام

جب اپنے آپ سے برہم ہیں ظالم! تیرے دیوانے عجب کیا ہے؟ اگر کچھ بن گئے اپنے بھی بیگانے

یہ مانا فطرت نغمہ بدل سکتے تو ہیں ، لیکن! زباں کو بند کر دیتے ہیں ، کچھ صیاد کے دانے
قفس کی نیم جانی بھی کہیں دوزخ نہ بن جائے نہ چھیڑ اے ہم نشیں! بربادیٔ گلشن کے افسانے
جنھیں کل ہم نے میخانے میں دیکھا تھا تعجب سے وہی حضرت چلے ہیں آج ہم رندوں کو سمجھانے
کسی دن خود بھی پھُنک جائے گی اطہرؔ! رونقِ محفل سدا یوں ہی اگر پھُنکتے رہے محفل میں پروانے (۱)

پلا وہ جام جس میں آتش سیال ہے ساقی!
وہ ساغر جس میں آزادی کا خدو خال ہے ساقی!
بہار مئے پرستی ہے، بلند اقبال ہے ساقی!
شراب شوق کا پیمانۂ لبریز دے ساقی!

خِرد کو نیند آ جائے جنوں بیدار ہو جائے
سکونِ راہ ، وقفِ گرمیٔ رفتار ہوجائے
جمود مستقل ، آمادۂ پیکار ہوجائے
یہ ہلکی مے نہیں ہے راس، اس سے تیز دے ساقی!

نگاہِ مے پرستی پھونک ڈالے زر پرستی کو
عصائے موسوی ویراں کرے سانپوں کی بستی کو
چھڑا دوں جو رو استبداد سے انساں کی ہستی کو
وہ رنگیں جرعہ دے جو مستیٔ خوں ریز دے ساقی!

جبین میکدہ پر حریت کا چاند لہرائے!
قضا سر پر ستمگاروں کے رنگیں رقص فرمائے
پریشاں عنصرِ انساں نئی ترتیب پھر پائے
بدل دے جو دماغ و دل وہ عنبر بیز دے ساقی!

فضائے امن پر خونیں غبار جنگ اٹھتا ہے
ستم ایجاد دیوِ زر بلند آہنگ اٹھتا ہے
سرِ میخانہ بھی شور رباب و چنگ اٹھتا ہے
تقاضا ہے زمانے کا ، طرب انگیز دے ساقی! (۲)

محبت دل میں کر لیتی ہے گھر آہستہ آہستہ یہ دنیا ہوتی ہے زیر و زبر آہستہ آہستہ
قریب آنے لگا اب ان کا در آہستہ آہستہ کہ خم ہوتا چلا جاتا ہے سر آہستہ آہستہ
کچھ ایسی یاس سے کھینچی ہے میں نے آہ زنداں میں کھلا جاتا ہے خود زنداں کا در آہستہ ہستہ
سبک جو ہو گئے اک دار میں وہ اور ہی ہوں گے یہاں تو کام کرتی ہے نظر آہستہ آہستہ
اثر بے تاب ہوگا تیری ہر ہر آہ مضطر کو محبت کرتی ہے ناداں! اثر آہستہ آہستہ
ہوا زنداں کی بھی ہے شعلہ افشاں جیسے اے اطہرؔ جلے جاتے ہیں میرے بال و پر آہستہ آہستہ (۳)

گھٹا جس وقت لہراتی ہے متوالی ہواؤں میں
بہار رنگ جب آتی ہے گلشن کی اداؤں میں
ستاروں کی ضیا ہنستی ہے جب کالی فضاؤں میں
تو پھر کالی سی کملی کی وہ رنگت یاد آتی ہے

کسی کی یاد جب آتی ہے میرے قلب محزوں میں
جلا محسوس جب کرتا ہوں اپنے بخت شب گوں میں
بپا طوفان جب ہوتا ہے دل کے قطرۂ خوں میں
تو پھر اصحابؓ پیغمبرؐ کی الفت یاد آتی ہے

اتر آتے ہیں جب دل میں شب ظلمات کے جلوے
برس جاتے ہیں جب آنکھوں پہ کالی رات کے جلوے
مری محفل پہ چھا جاتے ہیں جب برسات کے جلوے
تو پھر صدیق کی وہ لیل ہجرت یاد آتی ہے

امڈ آتے ہیں جب طوفاں سورج کے بیاباں میں
بکھر جاتے ہیں جب حدت کے جذبے زور طوفاں میں
شرارے لوٹتے ہیں جب ہر اک ذرہ کے داماں میں
تو پھر فاروق کی شامی سفارت یاد آتی ہے

برستا ہے سحر کو جب چمن پر گریۂ شبنم !
گلوں میں جب کہ ہوتا ہے گذشتہ رات کا ماتم
صبا جب لے کے آتی ہے پیام زیست کا عالم
تو پھر عثمان کی صبح شہادت یاد آتی ہے
فضائے دہر پر جب خیمۂ ظلمات تنتا ہے
مزار روز روشن جب شفق کے دل میں بنتا ہے
فلک کی جالیوں سے رات کو جب نور چھنتا ہے
تو پھر شیر خدا کی شام غربت یاد آتی ہے(۴)

معراج کی شب

ستارے آسماں پہ وجد میں ہیں رقص کرتے ہیں زمیں کے نقش خا کی ہر طرح بنتے سنورتے ہیں
فضاؤں میں تجلیات کے جلوے بکھرتے ہیں مسلسل نور کی برسات سے ذرے نکھرتے ہیں
ہزاروں برکت و انوار سے پُر آج کی شب ہے
شہِ کونینِ عالیجاہ کی معراج کی شب ہے
مقدر تھا اسی شب میں امام انبیا ہونا نبوت کے خدائی کارواں کا رہنما ہونا
مقدر تھا نہفتہ راز سے یوں آشنا ہونا کہ ظاہر اہل ظاہر پر ہو لولاک لما ہونا
اسی شب روحِ رحمت ، پیکر نوری میں بھرنی ہے
نبوت کی قبا حق کو پئے احمدؐ کترنی ہے
وہ جس کی دید کو موسیٰ جہاں میں عمر بھر ترسے اور ارماں بن کے قطرے دیدۂ یعقوب سے برسے
وہ جلوہ آج در آیا تماشا بن کے اس در سے جسے تعبیر کر دیتے ہیں ہم اپنے پیمبر سے
حجاب درمیانی اٹھ گیا حرف مشدد سے
کہ وصل عاشقانہ ہے احد سے اور احمدؐ سے
ملا صدقہ تمام عالم کو اسرائے محمدؐ سے فرشتوں میں تقدس آیا سو وائے محمدؐ سے
شرف افلاک نے پایا تماشائے محمدؐ سے بلندی عرش نے پائی کفِ پائے محمدؐ سے

نماز آئی کہ معراج امتِ مرحوم نے پائی
تجلی طور کی ہر دیدۂ محروم نے پائی(۵)

حضرت علی رضی اللہ عنہ

بزم مقاصدہ مبارک پور کے لئے لکھے گئے جو بتقریب ولادت حضرت علی رضی اللہ عنہ ۱۳/رجب ۱۳۷۰ھ کو منعقد ہوئی۔

مئے دوشیں سے ہے لبریز بزمِ جاں کا پیمانہ — تصور پڑھ رہا ہے عشرتِ ماضی کا افسانہ
تری محفل میں آکر کون ہے اپنے میں اے ساقی — جوفرزانہ ہے دیوانہ، تو دیوانہ ہے فرزانہ
الجھ جاتی ہیں تدبیریں، سلجھ جاتی ہیں تقدیریں — شہنشاہی سے ٹکراتی ہے جب شانِ گدایانہ
علی ابن ابی طالب، پناہ فقر وسلطانی — چراغِ اہل بیتِ پاک، نورِ شمع کاشانہ
نگارِ دلقِ مصطفوی، بہارِ گلشنِ ملت — متاعِ چادرِ زہرا، مرادِ شمعِ پروانہ
خداہی جانتا ہے اس کی رفعت جس کے صدقے میں — زباں پر ہے فلک کی آج پھر کعبہ کا افسانہ
قیامت بھی اگر ڈھونڈھے تو اس کو پا نہیں سکتی — تری صبح حرم میں کھوگئی یوں شامِ بت خانہ
ہے میخانے کا فیض اطہر یہ سیرابی مری، ورنہ — کہاں تشنہ لبی میری، کہاں اس کا یہ پیمانہ(۶)

ہنگامۂ کن ہے جس کے لیے وہ مردِ مسلماں سوتا ہے
بیدار ہے جس سے بزم جہان وہ نور چراغاں سوتا ہے
دنیا کی اندھیری وادی کو فردوس بنایا تھا جس نے
اب صبح کے رنگیں دامن میں وہ ناز گلستاں سوتا ہے
دنیا کی فضاؤں میں جس نے تنویر کا پرچم لہرایا
صد حیف ہے وہ آئینۂ عکسِ جلوۂ فاراں سوتا ہے
پروانۂ شمع دین ہدیٰ بیدار تھی جس سے بزم جہاں
غفلت کی اندھیری راتوں میں انوار بداماں سوتا ہے
گم قافلۂ ملت ہے شبِ ادبار کی پیچاں راہوں میں
اور موجِ صبا کی مستی میں ملت کا حدی خواں سوتا ہے

صد حشر بداماں ہے منظر یہ گردش چرخ کہنہ کا
بیدار ہے کافر کا ارماں اور عزم مسلماں سوتا ہے

جو شیر نیستانِ بطحا، مغرب میں گرجتا تھا کل تک
مشرق کے گھنیرے جنگل میں وہ شیر نیستاں سوتا ہے

ہنگام سحر جس کی تھی تلاوت نغمۂ لحنِ داؤدی
اب چھانو سے مسجد کی ہٹ کر وہ قاری قرآں سوتا ہے

دجلہ کے کناروں پر جس نے توحید کا نغمہ گایا تھا
گنگا کے سنہرے گھاٹوں پر وہ بندۂ یزداں سوتا ہے

پھر کون جگائے گا یا رب ! انسان کی سوئی بستی کو
سالار عرب سردار عجم، جب سر بہ گریباں سوتا ہے

سوئے ہیں نظارے قدرت کے جوابیدہ ہیں آنکھیں الفت کی
اب نیل کی رنگیں راتوں میں ، خود یوسفِ کنعاں سوتا ہے

کیا صوفی و ملا ، کیا واعظ ، کیا مفتی و عالم کیا زاہد
جب وقت پڑا ہے اے اطہرؔ ہر صاحب ایماں سوتا ہے

آہِ سحر کی قیمتیں دے نہ سکیں گے دوجہاں ۔۔۔ سازِ شکستہ پر نہ جا، رازِ شکستگی سمجھ
حسنِ نظر سے کام لے، غیرکا اعتبار کیا ۔۔۔ حسنِ ایاز پر نہ جا، دیدۂ غزنوی سمجھ
درد سے آہ تک آہوں سے فغاں تک پہنچے ۔۔۔ خیر سے اب تو یہ مجبور یہاں تک پہنچے
اپنی منزل سے گئے، تھک کے جو ہمت ہارے ۔۔۔ اور جو چلتے رہے، کون ومکاں تک پہنچے
ترازوؤں پہ مصلحت کی تولئے نہ ہوش کو ۔۔۔ پکار پر نہ آیئے، پکار بن کے آیئے
تمہاری یاد کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں ۔۔۔ ہم اپنے آپ کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں
گلستاں میں بہار آئی کہ اک دورِ نفاق آیا ۔۔۔ گلِ اخلاص میں بوئے ریا معلوم ہوتی ہے
سبو پر، جام پر، مے پر، نشہ پرخواب چھایا ہے ۔۔۔ نہ میخانے میں گزری تھی کبھی ایسی سحر سونی

سکوتِ مصلحت آمیز کب تک اے جنوں کا رو
مبادا ہو نہ جائے محفلِ روح ونظر سونی
بہارِ بوئے کہنہ سے ہے شرمندہ گلِ تازہ
نئے سر سے کوئی پھر بندشِ گلزار کر جائے

اک نشانی کوئی چھوڑ جاؤ
شمع ہو ، روشنی چھوڑ جاؤ
اپنی سوغات ہی چھوڑ جاؤ
چاند ہو ، چاندنی چھوڑ جاؤ
دل یہ بستی تمھاری ہے اس کو
یوں نہ اجڑی ہوئی چھوڑ جاؤ

ہمیں اس بات کا دعویٰ نہیں کہ ہم نہیں پیتے
مگر اتنا تو کرتے ہیں کہ بے موسم نہیں پیتے
ہمیں پینے سے کب انکار ہے، ہردم نہیں پیتے
مگر جب بیٹھ جاتے ہیں، کسی سے کم نہیں پیتے
طبیعت آ گئی تو پھر کسی موسم کی کیا حاجت
طبیعت جب نہیں آتی، کئی موسم نہیں پیتے

عام حسنِ فریبِ نظر ہے
دیکھتا ہوں جہاں سے جہاں تک
کون پھر آئے سننے سنانے
ہے یہ محفل مری داستاں تک
چار تنکوں کی ہمت تو دیکھو
اڑ گئے خود ہی برقِ تپاں تک
نہ اس جہاں کی محبت، نہ اس جہاں کی طلب
مرا مقام تو آگے ہے دونوں عالم سے

حواشی:

(۱) روزنامہ انقلاب بمبئی تاریخ نامعلوم

(۲) روزنامہ انقلاب بمبئی ۲۵/اگست ۱۹۵۲ء

(۳) روزنامہ انقلاب بمبئی ۴/مارچ ۱۹۵۲ء

(۴) روزنامہ انقلاب بمبئی ۲/دسمبر ۱۹۵۲ء

(۵) روزنامہ جمہوریت بمبئی ۴/مئی ۱۹۵۰ء/ ۲۶/رجب ۱۳۷۰ھ جمعرات

(۶) روزنامہ انقلاب بمبئی۔ ۲۰/اپریل ۱۹۵۱ء

اظہرؔ-مولوی سید علی اظہر کیدلی پور، اعظم گڑھ

۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء ---------------- ۱۱/ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۸ء

سکونت کیدلی پور میں تھی۔ مگر پیدائش محمد آباد گوہنہ کی تھی۔ فارسی اور عربی میں صاحب

استعداد تھے۔فقیہ وزاہد تھے۔ابتداء میں سرکاری ملازمت کی۔پھر ملازمت ترک کرکے خانہ نشین ہوگئے۔شعروشاعری سے بھی تعلق رکھتے تھے۔اوراچھا کہتے تھے۔زبان صاف،براہ راست اور غیر استعاراتی ہوتی تھی۔ذیل میں جوقصیدہ درج کیاجاتا ہے وہ ۱۳۰۳ھ میں دیوگام ضلع اعظم گڑھ کی ایک محفل میلاد میں یومِ غدیر کے سلسلے میں تصنیف کیا گیا ہے۔

نمونۂ کلام

ساقی پلادے جام کہ عیدِ غدیر ہے　　مشتاق اس کا آج صغیروکبیر ہے
اکمال پایا دینِ محمد نے مرحبا　　ثابت محدثوں سے ہے، قرآں بشیر ہے
احمد سے دیں ملا تو علی سے جلا ملی　　کیسا وہ بادشاہ، یہ کیسا وزیر ہے
اظہرؔ ہے نام میرا چھپانے سے کیا غرض　　ہر خاص وعام کی تو زباں پر شہیر ہے(۱)

حواشی:

(۱) بشکریہ سید جواد علی زیدی

اظہرؔ-منشی محمد اظہر علی سمبھی

ان کا نام کہیں اظہر علی اور کہیں اظہر حسین لکھا ہوا ملتا ہے۔افتخار سخن مالیگاؤں فروری ۱۹۲۳ء کے صفحہ ۵ پر ان کی غزل اظہر حسین کے نام سے چھپی ہے۔اور پیامِ یار لکھنؤ کے مختلف شماروں میں محمد اظہر علی کے نام سے غزلیں شائع ہوئی ہیں۔پیامِ یار کے متعدد شماروں میں آپ کو خلف اصغر وشاگرد مولوی غلام عباس صاحب مبارک پوری بتایا گیا ہے لیکن پیام یار کے شمارۂ اپریل ۱۹۰۴ء ص ۷ پر انھیں خلف اوسط وشاگرد جناب عباس مبارک پوری لکھا گیا ہے اور بعض جگہ جیسے شاہد اضطراب جون پور ۱۹۰۶ء ج ۱ نمبر ۲۳ ۱۳ھ، پیام یار ستمبر ۱۹۰۵ء ص ۱۱، پیام یار دسمبر ۱۹۰۵ء ص ۱۱، پیام یار فروری ۱۹۰۶ء ص ۹ پر خلف وشاگرد کی صراحت موجود ہے۔بہر حال اس میں تو کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا ہے کہ آپ مولوی غلام عباس مبارک پوری کے فرزند ارجمند تھے اور شاعری کی دنیا میں انھیں سے فیض سخن بھی حاصل کیا تھا۔ان کے بڑے بھائی منشی محمد غلام حسین

عاشق جنھیں پیام یار مئی ۱۹۰۴ء ص ۱۱ پر خلف اکبرو شاگرد جناب عباس مبارک پوری لکھا گیا ہے، بھی شاعر تھے اور اپنے والد سے ہی فن شاعری کے رموز ونکات سیکھے تھے۔ ان کے والد مولوی غلام عباس اصلاً مبارک پوری تھے۔ ترک سکونت کر کے بمبئی میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔

پیام یار میں شائع ان کی بعض غزلوں سے متبادر ہوتا ہے کہ اظہر اگست ۱۸۹۷ء سے فروری ۱۹۰۶ء تک بمبئی میں سکونت گزیں تھے اور افتخار سخن فروری ۱۹۲۳ء کے اندراج سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں اظہرؔ بمبئی آ گئے تھے۔ ان کے نام میں منشی کے لفظ سے قیاس ہوتا ہے کہ سلسلۂ تدریس سے اظہر کا تعلق رہا ہوگا۔ کیوں کہ ان کے دور میں فارسی داں اور معلم کو منشی کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا۔

اظہر کے یہاں پرانی بوتل میں نئی شراب ہے۔ یعنی ان کے الفاظ و کنایات سارے کے سارے قدیم دبستانی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ مناسبت لفظی کے ساتھ کہیں کہیں مضمون آفرینی اور بلند خیالی بھی ملتی ہے۔ گورِ غریباں، شہرِ خموشاں اور تربت وغیرہ موضوعات پر اردو کے قدیم شاعروں نے بڑی گوہر افشانی کی ہے۔ ان موضوعات پر غزل مسلسل بھی کہی گئی ہیں۔ اظہرؔ نے بھی ایک غزل کہی ہے جس میں پیوندز میں مالک تخت و تاج پر عبرت آموز اشعار کہے ہیں اس غزل کے بیشتر اشعار زندگی کی بے وفائی، ارد و دنیا کی بے ثباتی کی کہانی سناتے ہیں۔ ان کے کلام میں ان کے زمانے کی معاشرت سانس لے رہی ہے۔ ان کے اشعار مروجہ مزاج و معیار اور اقدار و کردار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے شاعری میں بعض اضافات بھی کئے ہیں

نقشے جمے ہیں دل میں رخ وخط وخال کے ہم شیفتہ ہیں یار تمھارے جمال کے
آئے ہیں زلف کو رخِ روشن پہ ڈال کے مضموں ہیں شام وصبح کے یہ اتصال کے
قسمت میں میری کچھ بھی بجز رنج وغم نہیں نکلے شبِ وصال بھی پہلو ملال کے(۱)
پیچ سنبل میں نہیں ہے ترے گیسو کی طرح گل میں خوشبو نہیں رخسار کی خوشبو کی طرح
خواب میں دیکھ کے میرے بتِ مہ رو کی طرح سجدے کرتے ہیں مسلمان بھی ہندو کی طرح
جلوہ گر ہوتا ہے دن صورت روئے روشن رات آتی ہے مرے گھر میں تو گیسو کی طرح

کیوں نہ حیران و پریشان کریں لیل ونہار
ایک ہے رخ کی طرح، ایک ہے گیسو کی طرح

دل کو بے چین کئے رہتا ہے عشقِ ابرو
ڈنک پہ ڈنک لگاتا ہے یہ بچھو کی طرح

خاک جی بہلے گا جنت میں مرا اے واعظ
حورِ فردوس نہیں جب مرے مہرو کی طرح

آنکھیں اظہرؔ سے لڑاتے ہو مگر یاد رہے
سرمہ آنکھوں کا یہ ڈھل جائے گا آنسو کی طرح (۲)

جو جاں تھی وہ نذر ادا ہوگئی
خفیف آکے میری قضا ہوگئی

شب وصل ارمان نکلیں گے خاک
نگہبان ان کی حیا ہوگئی

گڑی کربلا میں جو اظہرؔ کی لاش
تو خاک اس کی خاکِ شفا ہوگئی (۳)

تسکیں وہاں وعدۂ قاتل میں نہیں ہے
ہاں نام سکوں کا دلِ بسمل میں نہیں ہے

وہ سر نہیں جس سر میں نہیں ہے ترا سودا
وہ دل نہیں الفت تری جس دل میں نہیں ہے (۴)

دوڑا ہوا کیوں جاتا ہے تو ناقے کے ہمراہ
اے قیس کوئی پردۂ محمل میں نہیں ہے

الفت شمشیر نے کھینچا مجھے
خود میں سوئے کوچۂ قاتل ہوا

میرے گھر مہماں ہوا وہ سروقد
نخل الفت کا ثمر اب مل گیا

فصلِ گل آگئی اک جوش ہے دیوانوں میں
تار باقی نہیں رہنے کا گریبانوں میں

اللہ اللہ جو کل تک رہے خس خانوں میں
قبر میں آج وہ سوتے ہیں بیابانوں میں

شاہ اورنگ نشیں ہیں جو ہوں دیوانوں میں
سکہ چلتا ہے مرا خاص بیابانوں میں

سنتے ہیں حشر میں عاشق کا نہیں ہوگا حساب
لیکن مل جائے نہ زاہد ترے دیوانوں میں

شمع جل جل کے جو روتی ہے مری تربت پر
اشک سے آگ لگی جاتی ہے پروانوں میں

آتے ہیں گھر وہ مرے وصل کی شب بن ٹھن کر
آج خوشیاں ہیں سرِ شام سے ارمانوں میں

صاحبِ تاج وعلم آج ہیں تکیوں میں پڑے
غیر تنہائی نہیں کوئی نگہبانوں میں

لب جاں بخش کا ترے جو اشارہ ہوجائے
جانِ جاں! جان ابھی آئے ترے بے جانوں میں

خلد وعرش، حرم ودل کو بہت ڈھونڈھا مگر
جلوہ اس بت کا نظر آتا صنم خانوں میں

بت پرستی کی تمنا ہے، نہیں حق کا خیال
نام باقی نہیں ایماں کا مسلمانوں میں

لاکھ وعدے کئے پر ایک بھی پورا نہ کیا
استواری نہیں اس بت کے ہے پیمانوں میں

چشمِ میگوں کے تصور میں رہا کرتے ہیں مست
اس میں جو مے ہے وہ ہرگز نہیں پیمانوں میں
مصحفِ روئے حسیں کا جو میں شیدائی ہوں
سورۂ شمس پڑھا کرتا ہوں قرآنوں میں
عشقِ کامل نے مجھے بخشا ہے ہر فن میں کمال
میں ولی ولیوں میں ہوں، مست ہوں مستانوں میں
نازپروردہ ہیں یہ لختِ جگر اے اظہرؔ
یہ غزل لے اڑی بلبل بھی گلستانوں میں
حضرت اوج کے شاگرد نے بخشا یہ عروج
اوجؔ کیوں کر نہ ہوا ظہرؔ کے سخن دانوں میں (۵)

بدلا ہوا ہے رنگ زمانے کا آج کل
شاید وہ آسمان نہیں یا زمیں نہیں
کس کس سے وعدہ وصل کا وہ مہ لقا کرے
عاشق ہے اک جہاں فقط اظہرؔ تمھیں نہیں (۶)

وعدہ جو کل کیا تھا بھول گئے
پھر وہ امیدوار کرتے ہیں
کس پہ دیتے ہیں جان حضرتِ دل
کس ستم گر کو پیار کرتے ہیں
حق وفا ایک بھی نہیں کرتے
اور وعدہ ہزار کرتے ہیں
دل کا احوال اپنے اے اظہرؔ
اشک سے آشکار کرتے ہیں (۷)

قمر یا مہر یا کیا جانے کیا ہے؟
رخِ روشن ترا کیا جانے کیا ہے؟
وہ آتا ہے سنور کر عاشقوں میں
ارادہ یار کا کیا جانے کیا ہے؟
جسے ہو چاٹ حورانِ ارم کی
وہ کوئی دلربا کیا جانے کیا ہے؟
جو تیرے عشق کا کل میں ہے آزاد
وہ دل قیدِ بلا کیا جانے کیا ہے؟
جسے غم خون ناحق کا نہیں ہے
وہ بت خوفِ خدا کیا جانے کیا ہے؟
بتوں کی چاہ میں ڈوبا ہے اظہرؔ
وہ عشقِ کبریا کیا جانے کیا ہے؟ (۸)

بسترا کوئے صنم میں نہ لگائیں کیوں کر
جی نہیں چاہتا فردوس سے جائیں کیوں کر
ملک الموت ٹھہر جا ارے جلدی کیا ہے
وہ تو آتے نہیں ہم جان سے جائیں کیوں کر
لوگ کہتے ہیں کہ قصہ تو وہ سنتے ہی نہیں
داستانِ دلِ پُردرد سنائیں کیوں کر
خط رخسار کا بوسہ نہیں لے سکتے ہم
دیکھ کر زہر بتادیجئے کھائیں کیوں کر
دل ملانے کا طریقہ انھیں معلوم نہیں
خاک میں عاشقِ بے دل کو ملائیں کیوں کر (۹)

وہ نقابِ رخ کو سرکاتا نہیں چاند سی تصویر دکھلاتا نہیں
رخ پہ کیوں آئی ہے یہ زلفِ سیاہ کعبے میں ہندو کبھی جاتا نہیں
سوئے جنت جائے زاہد شوق سے میں ترا در چھوڑ کر جاتا نہیں
کوچۂ دل دار ہے باغِ ارم جو یہاں آتا ہے وہ جاتا نہیں
قبر کا احوال اظہرؔ کیا لکھے جو وہاں جاتا ہے پھر آتا نہیں(۱۰)

حواشی:

(۱) پیام یار لکھنؤ اکتوبر ۱۸۹۷ء ص ۶-۷
(۲) پیام یار لکھنؤ مارچ ۱۹۰۵ء ص ۱۰
(۳) پیام یار لکھنؤ دسمبر ۱۹۰۵ء ص ۱۱
(۴) ایضاً ستمبر ۱۹۰۳ء ص ۵
(۵) گلدستہ شاہد اضطراب۔ مطبوعہ رہبر پریس مراد آباد ج ا نمبر ۹۔ جون ۱۹۰۶ء/ ۱۳۲۳ھ ص ۴
(۶) گلدستہ شاہد اضطراب۔ مطبوعہ رہبر پریس مراد آباد ج ا نمبر ۹۔ ۱۳۲۳ھ
(۷) پیام یار لکھنؤ۔ اپریل ۱۹۰۴ء ص ۷ مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ
(۸) پیام یار لکھنؤ۔ ستمبر ۱۹۰۵ء ص ۱۱، از سبھی)
(۹) پیام یار لکھنؤ۔ نومبر ۱۹۰۳ء ص ۷
(۱۰) پیام یار لکھنؤ۔ فروری ۱۹۰۶ء ص ۹

اظہرؔ- سید ارادت حسین بھیروی

بھیرہ ضلع اعظم گڑھ کے متوطن تھے مگر جھانسی میں رہائش تھی۔ گلدستہ پیام یار لکھنؤ میں ان کی جو طرحی غزلیں شائع ہوئی ہیں وہ سب جھانسی سے بھیجی گئی ہیں۔ البتہ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اظہرؔ کن اسباب کی وجہ سے جھانسی میں رہے، ملازمت تھی یا کوئی دوسری وجوہات تھیں ان کی ایک طویل غزل پیام یار لکھنؤ کے شمارہ جولائی ۱۹۰۵ء میں صفحہ ۹ ر پر موجود ہے جولت پور سے اشاعت کے لیے بھیجی گئی ہے اس سے متبادر ہوتا ہے کہ یہ جھانسی کے علاوہ للت پور میں بھی رہے اور وہاں بھی

شاعری کے نگارخانے کو اپنے اشعار کی رنگین تصویروں سے سجاتے رہے اور طویل غزلیں کہہ کر اپنی قادرالکلامی کا ثبوت فراہم کرتے رہے۔ انھیں قطعۂ تاریخ میں بھی مہارت حاصل تھی۔

اظہرؔ سید عباس حسن فصاحت لکھنوی (۱۸۵۷ء۔۱۹۳۰ء) کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ انھوں نے ایک غزل کے مقطع میں کہا ہے

تجھ کو معلوم ہے کچھ فیض فصاحتؔ کے سبب اظہرؔ اقلیمِ سخن میں تری عزت کیا ہے؟

دوسری غزل کے مقطع میں کہتے ہیں

حساد مقر کیوں نہیں اظہرؔ کے سخن کے اشعار میں کیا طرز فصاؔحت نہیں آئی؟

اظہرؔ نے فصاحت لکھنوی کی شاگردی سے پہلے نصرت لکھنوی کو کلام کی اصلاح کے لئے منتخب کیا تھا۔ پیام یار لکھنؤ فروری ۱۹۰۴ء ص ۱۲ پر ان کے نام کے بعد شاگرد جناب نصرت لکھنوی (ا) اور پیام یار جنوری ۱۹۰۵ء ص ۳ پر سابق شاگرد نصرت لکھنوی از جھانسی لکھا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنوری ۱۹۰۵ء سے کچھ پہلے نصرت لکھنوی سے ترک اصلاح کر کے کچھ ہی دنوں بعد فصاحت لکھنوی کے شاگرد ہوئے ہوں گے۔

اظہرؔ نے قطعۂ تاریخ میں بھی اپنے شعری اظہار کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا جو کلام پیام یار کے حوالے سے ہم دست ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اظہر نے اپنی غزلوں میں سیاسی وسماجی، اور تہذیبی وتاریخی انقلاب آفرینیوں سے اغماض برتا ہے۔ ان کی فکر اور غزلیہ شاعری کی کل کائنات وہی چند افکار وخیالات ہیں جو بعض مقامات پر اشارات واستعارہ کا ساتھ چھوڑ کر براہ راست چوما چاٹی اور ہم آغوشی کی سرمستیوں میں تہذیبی رکھ رکھاؤ کو بھول جاتے ہیں نتیجے میں سوقیانہ پن اور بازاری شاعری کو راہ مل جایا کرتی ہے۔ البتہ بعض اشعار میں زبان کی شائستگی وشستگی، فکر میں ندرت اور خیالات میں پہلوداری کی بڑے اچھے حوالے مل جاتے ہیں۔ اظہرؔ کے عہد میں شاعری کی جو سمت ورفتار متعین ہو چکی تھی اس کے منظر نامہ پر اگر غور کیا جائے تو ان کے اکتسابات وتجربات اور ان کے الفاظ وکنایات میں نئی کروٹوں اور تبدیلیوں کی کسمساہٹ کا احساس ہوتا ہے اور یہ تاثر ابھرتا ہے کہ نئے دور کی صبح بشارت روشن ہونے والی ہے۔ اور اس خرابے کے کھنڈر پر بلند عمارتوں

کی بنیاد پڑنے کی تمہید شروع ہوچکی ہے۔ پیام یار کے مختلف شماروں سے ان کا جو کلام دستیاب ہوا ہے وہ ان کی ابتدائی شاعری کا نمونہ محسوس ہوتا ہے۔ اگر ان کی غزلوں کی اچھی خاصی تعداد ہم دست ہوتی تو شاید اس سرمائے سے ان کی فکری وفنی اور شعری صلاحیتوں کی نشان دہی زیادہ واضح صورت میں ہوتی اور یہ اندازہ بہتر طور پر ہوسکتا کہ ان کے یہاں اپنے دوروا سلوب اور طرز وشعور کو متاثر کرنے کی کتنی صلاحیت تھی۔

نمونۂ کلام

ملنے رندوں سے یہاں رحمت حق آئی ہے — خوب مے خانے پہ گھنگھور گھٹا چھائی ہے
اور تو کوئی نہیں پاس ہمارے ہمدم — شمعِ بالینِ شبِ غم، مونس تنہائی ہے (۲)

اس مست کے ہے ہاتھ میں ساغر شراب کا — یا شاخ گل پہ پھول کھلا ہے گلاب کا
ثابت ہوا جو رندوں نے مے چاندنی میں پی — محتاج آفتاب بھی ہے ماہتاب کا
گلچیں اسی سے مردۂ بلبل کو غسل دے — شبنم سے جو بھرا ہے کٹورا گلاب کا
بینی الف ہے، میم دہن، لام زلف ہے — روئے حبیب ہے ورق ام الکتاب کا
ہو خاکِ آستانِ علی طوطیائے چشم — اظہرؔ غلام ازل سے ہوں میں بوتراب کا (۳)

بولے وہ شب وصل گلے میرے لپٹ کر — جاتی ہے حیا آنکھ سے، شوخی نہیں جاتی
ابرو چمن و سرد ہوا ہے تو ہمیں کیا — بے یار کے ساقی کبھی مے پی نہیں جاتی (۴)

فتنے نہیں اٹھے کہ قیامت نہیں آئی — عاشق پہ ترے کب نئی آفت نہیں آئی
کیا کہئے کسی شوخ کے آنے کا تو کیا ذکر — افسوس قضا بھی شبِ فرقت نہیں آئی
ہر اک سے کم اپنے کو سمجھتا ہوں میں اظہرؔ — سر میں مرے، توبہ، کبھی نخوت نہیں آئی (۵)

افشائے رازِ عشق ہوا اشک و آہ سے — بگڑا مرا مقدمہ ان دو گواہ سے
گھبرا گیا دل اس صفِ مژگاں کو دیکھ کر — تنہا یہ خاک لڑتا ہجوم سیاہ سے
دن کو فراق یار میں خورشید، شب کو ماہ — دونوں ہوئے سیاہ مرے دودِ آہ سے
آنسو کی طرح ہائے نہ پھر خاک سے اٹھے — اظہرؔ گرے ہم ایسے کسی کی نگاہ سے (۶)

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات حضرت مظفرالدین شاہ ایرانی

قضا جو کی شہِ ایراں مظفرالدیں نے — تو سب کو غم ہوا بے انتہا و بے پایاں
وفات کا یہ لکھا سال کلکِ اظہرؔ نے — خدا کے چھوڑ کے بس کل من علیہا فان (۵)

حواشی:

(۱) غالباً یہ یعقوب علی نصرتؔ (ولادت ۱۱۲۹ھ/ ۵۶ - ۱۹۵۵ء) ہوں گے جن کی ایک مثنوی محمڈن یونین پریس لکھنؤ سے چھپی تھی اس میں دورِ نبوی کے تمام غزوات کو ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں نصرت نے نظم کیا ہے۔(اردو مثنوی کا ارتقاء۔شمالی ہند میں۔سید محمد عقیل رضوی۔طبع دوم ۱۹۸۳ء اردو اکیڈمی لکھنؤ ص ۴۲۳) یادگار ضیغم ص ۳۳۶ کے حوالے سے علی جواد زیدی نے لکھا ہے کہ غالباً یہ وہی مثنوی جو ۱۳۰۴ھ میں "غزوات حیدریہ" کے نام سے طبع ہوئی (مثنوی نگاری مطبوعہ ۱۹۸۴ء ص ۵۲۰) غالباً نصرت کی ولادت اور اشاعت مثنوی کے سنہ میں زیدی صاحب سے سہو ہو گیا ہے۔

(۱) پیام یار لکھنؤ نومبر، دسمبر ۱۹۰۷ء ص ۹
(۲) پیام یار لکھنؤ دسمبر ۱۹۰۸ء ص ۱۵
(۳) ایضاً جولائی، اگست ۱۹۰۸ء ص ۱۴
(۴) پیام یار لکھنؤ جولائی، اگست ۱۹۰۸ء ص ۲۵۔۲۶
(۵) پیام یار لکھنؤ ستمبر، اکتوبر ۱۹۰۸ء ص ۱۵
(٦) پیام یار لکھنؤ جون ۱۹۰۷ء ص ۱۵

اظہرؔ- مولوی رفیع الدین مبارک پوری

— ۲۹/ ذوقعدہ ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۵ء

ان کے والد گرامی کا نام حسیب اللہ تھا۔ پورا دیوان گولہ بازار میں ان کا خاندان آج بھی ہے اور ان کا مکان بھی موجود ہے۔شیخ عبدالمجید مبارک پوری کی ڈائری میں اور پھر قاضی اطہر مبارک پوری (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۹۶ء) کے تذکرۂ علمائے مبارک پور میں ان کا نام مولوی رفیع الدین زیر قلم آیا ہے۔مگر ان کا ایک نام اظہر حسین بھی ہے۔اسی نام سے اپنے وطنِ ثانی ہگلی (مغربی بنگال) میں معروف تھے۔ان کے چھوٹے شاعر بیٹے انورالحسینی (مولانا سراج احمد ۱۹۳۴ء۔۱۹۹۸ء) کی

نسبت حسینی بھی اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے"صدائے العطش"مطبوعہ ۱۹۷۶ء میں صفحہ ۲۱ پر انور کے حالات زندگی میں والد کا نام اظہر حسین لکھا گیا ہے۔ان کے کلام میں تخلص اظہر آتا ہے اور کبھی کبھی اظہر حسین بھی ۔بقول مولانا مفتی عبدالمنا ن مبارک پوری صاحب (۲۶/نومبر ۱۹۲۵ء۔ ۲۹/نومبر ۲۰۱۲ء) یہ اشرفیہ کے ابتدائی خوشہ چینوں میں سے تھے" بتایا جاتا ہے کہ مولانا نور محمد امام وخطیب جامع مسجد راجہ مبارک شاہ المتخلص بہ خاکی متوفی ۱۳۶۰ھ اور حکیم الٰہی بخش (۱۲۸۰ھ۔ ۱۳۵۶ھ) سے بھی فیضِ تعلیم پایا تھا۔اس کے بعد فراغت کی سند احسن المدارس کانپور سے حاصل کی تھی ۔ ۱۹۰۴ء کے بلوہ کے بعد معاشی پریشانیوں سے تنگ آ کر نقل مکانی کر کے رشڑا ضلع ہگلی (مغربی بنگال) چلے گئے اور وہیں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔انھوں نے تقویٰ شعار زندگی کے ساتھ دین ودانش سے بھی شغف رکھا اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلائی اور گھر کا ماحول علمی ومذہبی نہج پر ساز گار بنایا۔درس وتدریس کے ذریعے ذہن سازی کی مہم شروع کی اور اسی کو اپنی علمی ومعلمانہ زندگی کا وظیفہ قرار دیا۔منصبِ امامت بھی آپ ہی کو تفویض تھا اور انھوں نے اس کے شرائط ومطالبات کو بہ احسن طریقے سے پورا کیا۔اظہر نے رشڑا میں تقریباً دس برس تک سکونت اختیار کی اور اسکے بعد یہاں سے مارواڑی کل، حاجی نگر ضلع شمالی چوبیس پرگنہ جا کر بود وباش اختیار کر لی۔

ان کی پہلی شادی بہادر گنج ضلع غازی پور میں جو مئوناتھ بھنجن کی ہمسایہ آبادی ہے ،ہوئی تھی۔دوسری کلکتہ میں ہوئی تھی ۔ان کی چار اولادیں تھیں دو اولاد ذکور اور دو اولاد اناث، بڑے بیٹے مولانا نثار احمد انصاری متوفی ۱۹۷۹ء/۶صفر ۱۴۰۰ھ اشرفیہ مبارک پور کے فاضل دینیات دوسرے صاحب زادے مولانا سراج احمد انور الحسینی (۱۹۳۴ء۔ ۱۲/مارچ ۱۹۹۸ء) فاضل علومِ دینیہ اور اردو کے شاعر تھے۔دو لڑکیاں تھیں بڑی لڑکی فاطمہ زوجہ محمد علی تھیں جن کے تین بیٹے پورہ صوفی میں بھونو قریشی بابا کے صحن میں تھے (۱) رحمت اللہ (۲) حشمت اللہ (۳) برکت اللہ پسران محمد علی تھے۔دوسری باجرہ نوادہ میں منسوب تھیں جن کی بڑی بیٹی نذیر احمد فراز (یکم مارچ ۱۹۳۳ء ۔ ۲۷/فروری ۱۹۸۷ء) سے اور دوسری بیٹی فراز کے چھوٹے بھائی کامریڈ شبیر احمد کے حبالۂ زوجیت میں تھیں۔

رحمت کرہانی کے بقول اظہر شاعری میں خلیفہ بندہ علی شاہ کو پا گنج سے اصلاح لیا کرتے

تھے۔نورالعین قوال مبارکپوری نے راقم سے بتایا تھا کہ یہ پیرمحمد خلیفہ کے تلمیذِ سخن تھے۔ چمنستانِ اظہر (نعت) خیالِ اظہر (کجلی) وصالِ دلبر (کجلی) کے نام سے ان کے مختصر کتابچے شائع ہوئے تھے جواس وقت معدوم ہیں۔قوال ان کا کلام اکثر گایا کرتے تھے۔اردو،عربی،فارسی تینوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔

مولانا قاضی اطہر کا بیان ہے کہ ۱۳۱۷ھ میں جب مدرسہ احیاء العلوم کا اجراء ہوا تو وہ اس کے محصل مقرر کئے گئے اور مدرسہ کی طرف سے کلکتہ وغیرہ چندہ وصول کرنے جایا کرتے تھے (۱)ان کا تذکرہ شیخ عبدالمجید انصاری بن حافظ عبدالرحمٰن بن عبدالوہاب (۱۸۵۲ء - ۱۴راگست ۱۹۳۶ء ر جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ) ساکن محلہ پورہ صوفی متصل بھونو قریشی بابا نے اپنی ذاتی یادداشتِ قلمی میں ۱۹۰۴ء ر ۱۳۲۲ھ کے بلوا کے سلسلے میں کیا ہے۔جس کی عبارت یوں ہے

"۲۹رمئی ۱۹۰۴ء بروز اتوار یہ بلوا جو مبارک پور میں ہوا عجیب بلوا تھا۔بڑے بڑے لوگوں کا اشارہ تھا اور چھوٹے چھوٹے لوگوں نے یہ سوچا کہ سرکاری انتظام کی وجہ سے کچھ نہیں ہوگا اگر لوگ یہ جانتے کہ ہم لوگ ظلم کرتے ہیں سزا پائیں گے تو ہرگز ہرگز ایسا نہ کرتے ۔ چک سکٹھی کی زمینداری میں پوکھرے کے پاس باغ کی مسجد میں طاقچہ پر ایک سر سور کا دیکھا گیا۔مسلمان برہم ہوگئے مگر یہ نہ سمجھا کہ آیا یہ کس کا فعل ہے ۔یہ سور کا سر جناب خدابخش ولد فتح قلندر میاں مصطفیٰ آباد کا فعل تھا۔اس نے ایسی بدعنوانیاں اس غرض کیا تھا کہ بابو رام بلی سنگھ گوجر پاروالے سے رنجش رہی۔اسی بنیاد پر سوچا کہ سور کا سر رکھ دینے سے مبارک پور کے مسلمانوں کو جا کر سمجھا کر کہہ دیں گے کہ یہ فعل رام بلی کا ہے،پس ہم الگ ہوجائیں گے اور بدلہ بھی رام بلی سنگھ سے مل جائے گا۔ خیر ایسا الٹا ہوا کہ تمام مسلمانانِ مبارک پور گرفتار اسی روز پانچ بجے دن سے ہونے لگے اور جو گرفتار ہوتے فوراً اعظم گڑھ چالان چلی جاتی۔یہاں تک کہ بازار گولہ میں سوائے عورت کے مسلمان مرد نظر نہیں پڑتے تھے۔اور بڑے بڑے صاحب بہادر یہاں ٹھاکر دوارہ میں مقیم تھے۔ پولس ہر جا کی یہاں تعینات ہوئی تھی ۔جو لوگ نہیں ملتے ان کے مکان کی تلاشی ہوتی تھی۔پورہ دیوان جناب مولوی رفیع الدین کے مکان پر یہ لوگ انسپکٹر حلقہ موہن سنگھ و داروغہ دوست محمد خاں پولس کے

جوان دس یا بارہ تھے و چوکی دارو غیرہ بہت تھے۔ جب یہاں تھانہ نہیں تھا چوکی تھی۔ مکان میں تلاشی لیا اور ہمارے قرآن مجید (کو) مکان کے اندر سے لے آ کر آنگن میں پھینک دیا اور پیر سے موہن سنگھ نے کچلا۔ دیکھ کر نہایت دل دکھا۔ ہم موجود تھے وہاں۔ اس مقدمہ میں ۱۹؍دسمبر ۱۹۰۴ء بروز سوموار کو سزا ہوئی قیدیوں کی تفصیل یہ ہے (۱) میاں خدابخش ولد فتح قلندر زمیندار مصطفیٰ آباد، ڈھائی برس قید سخت اور دوسو روپئے جرمانہ، اسی کم ذات کا سب فعل تھا (۲) حاجی عبدالحق ولد والی محمد پورہ رانی قصبہ مبارک پور دو برس قید سخت چار سو روپئے جرمانہ (۳) سید ولد حبیب اللہ خونی محلہ پرانی بستی دو برس قیدِ سخت چار سو روپئے جرمانہ (۴) عبداللہ ولد میاں جی لعل محمد (۱) محلہ پورہ صوفی دو برس قید سخت پچاس روپئے جرمانہ (۵) عبدالحق ولد جان محمد محلہ شاہ محمد پور، دو برس قید سخت (۶) فرحت حسین موضوا ملو تین برس قید سخت چھ سو روپئے جرمانہ (قید خانہ میں انتقال کیا)

دوسری جگہ عبدالمجید نے اپنی ڈائری میں ۲۱؍جون ۱۹۲۵ء کو لکھتے ہیں "۲۱؍جون ۱۹۲۵ء بروز اتوار بوقت ساڑھے ۶؍بجے دن کو بابورام بلی سنگھ گوجر پاروالے مرے اور اسی شب کو دوہری گھاٹ لے جا کر پھونک دیا۔ یہ شخص بہت بڑا ظالم تھا اور اس کی زمینداری بہت بڑی تھی اور اب تک ہے مگر ظالم ایسا شخص تھا کہ کچھ عزت واقبال نہیں تھا" ان کے لڑکے جگدیو سنگھ کو بھی انھوں نے ظالم لکھا ہے۔

مولوی رفیع الدین صاحب کلکتہ جا کر بس گئے وہیں ان کا بھرا پُرا خاندان آج بھی ہے اور علم و اہل علم کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ مولانا رفیع الدین صاحب کلکتہ میں مولانا اظہر حسین کے نام سے معروف تھے۔ شاید نام کی یہ تبدیلی حفظ ماتقدم کے خیال سے رہی ہوگی کہ پھر نصیبِ دشمناں کسی اورنا کردہ گناہی کی سزا نہ مل جائے اور بلا وجہ کسی ناگہانی میں گرفتارِ آزار ہو جائیں۔ انھوں نے رِشڑا ضلع ہگلی (کلکتہ) میں مختصر دنوں تک اقامت اختیار کی تھی۔ قیاس و اندازہ ہے کہ دس برس تک رِشڑا میں ان کا قیام رہا ہوگا۔ اس کے بعد انھوں نے مارواڑی کل حاجی نگر ضلع شمالی چوبیس پرگنہ (کلکتہ) میں اقامت گزینی اختیار کر لی تھی۔ یہیں ۱۹۲۹ء میں انجمن فلاح المسلمین کی تاسیس فرمائی جو تادمِ تحریر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی مقدس خدمت انجام دے رہی ہے۔ جامع مسجد مارواڑی کل کے لئے زمین وقف کی خصوصاً موسمِ سرما میں اس ادارے کی طرف سے ناداروں میں

کمبل وغیرہ اور عید کے موقع پر کپڑوں کی تقسیم کی جاتی ہے۔ اسی تنظیم کے انتظام میں مدرسہ جمالیہ نثارالعلوم مارواڑی کل جاری ہے۔ یوسف جمال عرف چشمہ شاہ بابا رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا نثار احمد انصاری صاحب جو مولانا اظہر کے خلفِ اکبر ہیں، کے ناموں کے اشتراک سے یہ مدرسہ موسوم ہے۔ جمال شاہ متوفی ۱۹۷۲ء مدفون مارواڑی کل ایک خدارسیدہ بزرگ تھے اور عوام وخواص میں بڑی مقبولیت رکھتے تھے۔ مجذوبیت غالب تھی حال یہ تھا کہ جس کو اپنے عصا سے مار دیا کرتے تھے اس کی مراد من جانب اللہ پوری ہوجاتی تھی۔ یہ مولانا اظہر صاحب کے زمانے میں اپنے وطن بہار سے آکر رہ بس گئے تھے مولانا اور ان کے فرزندوں سے اتنے مستحکم روابط تھے کہ جب حیات تھے دونوں طرف سے ان تعلقات میں گرمیِ محبت کی کمی نہیں ہوئی۔ طویل عمر پاکر اس دنیا سے کوچ فرمایا۔ ان کے وصال کے بعد ۱۹۸۱ء میں مدرسہ جمالیہ نثارالعلوم کے نئے نام سے مدرسہ معروف ہوا، اور اس نام سے پہلے یہ مدرسہ اسلامیہ کے نام سے جاری تھا اور مولانا اظہر حسین صاحب معلمی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

مولانا اظہر حسین کے حقیقی پوتے ارشاد احمد انصاری بن مولانا نثار احمد انصاری درس وتدریس سے منسلک تھے۔ بحیثیت مدرس پیشۂ تدریس سے سبکدوش ہونے کے بعد فی الحال میونسپل بورڈ ضلع شمالی چوبیس پرگنہ (مغربی بنگال) کے وائس چیرمین کے معزز عہدے پر منتخب ہیں۔ یہ انجمن فلاح المسلمین مارواڑی کل حاجی نگر کے طویل عرصہ تک ناظمِ اعلیٰ رہے اس کے علاوہ سماجی وفلاحی، ثقافتی وملی اور سیاسی اداروں اور تحریکوں سے تعلق ہے۔

مولانا اظہر فارغ التحصیل عالم تھے۔ شاعر بھی اچھے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے تھے۔ ان کے خالہ زاد چھوٹے بھائی رحمت اللہ رحمت کرہانی ان کے کلام کو عموماً محفلوں میں ترنم سے سنایا کرتے تھے بعد میں رحمت نے شاعری میں انھیں سے شرف تلمذ بھی حاصل کیا۔ وہ کلکتہ میں مولوی رفیع الدین کے یہاں رہ کر کسی عربی درسگاہ میں تعلیم پاتے تھے۔ اظہر کا بہت سا کلام مبارک پور کے مشہور قوال نورالعین نظر کے پاس موجود تھا وہ خیال وغیرہ جو اس دور کی پسندیدہ عوامی صنف سخن تھی اور عام لوگوں میں مروج ومتداول تھی کثرت سے کہتے تھے۔

اس قسم کی شاعری میں فنی قیوداور عروض و بلاغت کے قواعد کی زیادہ پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ اظہر کا کلام بھی اس قسم کے عیوب سے محفوظ نہیں۔ ان کی شاعری کو ایسی شعری یادگار سمجھنا چاہئے جس نے قصبات و دیہات کے عام محنت کش اور مزدور طبقہ کو اردو شاعری سے وابستہ رکھا اور عام لوگوں کی زندگی کو اردو سے کنارہ کش یا لاتعلق نہیں ہونے دیا۔ یہ کم اہم نہیں ہے۔

نمونۂ کلام

اول ما خلق اللہ را خواندہ ام فرمان تو لائق وصف وثنا توئی آمد قرآں درشان تو

دین میں ہرگز جاتے نہیں،نہیں پھرتے دنیادار میں ہم
نہیں کسی کی خواہش ہم کو رہتے کوئے یار میں ہم

وسامعك خيالين حين فى العربى اذاسمعت هما فا يصيبك القربى

خوب معراج کی دھوم گھر گھر ہوئی،شور گردوں پہ قدسی مچانے لگے
فرش سے عرش پر شان وشوکت سے جب یار سے یار ملنے کو جانے لگے
پایا حضرت اس وقت سوئے ہوئے، آئے روح الامیں ام ہانی کے گھر
جب جگانے میں ان کو تامل ہوا، حکمِ باری ہوا کہ ملو اپنا سر
دونوں پاؤں کے تلووں میں جب جب سر ملے،سرد کافور سا پہنچا اس کا اثر
خوابِ راحت سے اٹھ کر لگے پوچھنے، اے برادر کہو لائے ہو کیا خبر
آج کی رات معراج کی ہے شہا تھا جو پیغامِ باری سنانے لگے
اشتہاری نے شہرت دیا ہر طرف، مشعلِ نوری ہر سمت جلنے لگے
کچھ شجر اور حجر وجد میں جھومتے جانور بھی خوشی میں اچھلنے لگے
اشتیاقِ محمد میں فرشی تو کیا بلکہ عرشی کے بھی رنگ بدلنے لگے
اور عذابِ جہنم ہوئی ملتوی شوق سے دوزخی بھی مچلنے لگے
جنتی زیب وزینت میں مشغول تھے خوب فردوس کو وہ سجانے لگے
الغرض تحت سے عرش تک ہی نہیں لا مکاں تک یہ شہرت بپا ہوگئی
ہرطرف دھوم معراج کی ہوگئی، کل خلائق میں غیبی ندا ہوگئی

آج کی رات اپنے عذابوں سے بھی امت مصطفیٰ کُھل رہا ہوگئی
آپ کو دولتِ بے بہا مل گئی،اور کبریٰ شفاعت عطا ہوگئی
ہر طرف مرحبا کی صدا گونج اٹھی طائرانِ چمن چہچہانے لگے
رات بہتر تھی وہ لیلۃ القدر سے،جس میں حق سے ملے جاکے محبوبِ رب
تیس میں تین کم یعنی سات اور بیس تھی یہ تاریخ اور وہ تھا ماہِ رجب
تاجدارِ مدینہ گئے عرش پر، ماوراء الوریٰ تک کیا سیر سب
حق نے ان کو وہیں کردیا مالا مال پائے حد سے زیادہ وہ امی لقب
خیریت ہم سبھوں کی اے اظہر حسینؔ بارگہ عالیہ میں سنانے لگے

بطحا کے بانکے انوکھے سجن سلطان العربی والعجمی
ترست ہے نینن دے دو درشن سلطان العربی والعجمی
تمیں دونوں جہاں کے راجا ہو اور خاص دؤ کے دلارے ہو
آدم کی خلقت کے سبب اور شفیع حشر ہمارے ہو
عبداللہ کے لختِ جگر اور آمنہ بی کے پیارے ہو
مجھ ایسے بے کس کے شہا دونوں جگ میں سہارے ہو
بس کیوں نہ ہو قرباں جان وتن سلطان العربی والعجمی

جہاں رہے نہ کسی گل میں خار ہوکے رہے　　گلوں میں رنگ ،چمن میں بہار ہوکے رہے

قطعہ

زمیں سے عرشِ پاک غوغا مرحبا صل علیٰ ہے　　نسیم فیض کی تاثیر سے دیکھو شجر پھولا پھلا ہے
چہکتیں عندلیبانِ چمن ہیں جھوم کر ساری خوشی میں　　بلوریں جھاڑ نکلے ہیں فلک پر روشنی بھی برملا ہے

اظہرؔ - سید علی اظہر محمد آبادی

انداز اً ۱۸۸۸ء ـــــ ۲۳؍رجب ۱۳۸۰ھ/ ۱۴؍دسمبر ۱۹۵۸ء

ان کا ایک پورا دیوان قصائد مرتب تھا۔ رسمی قسم کے قصائد لکھتے تھے۔ رسول اللہ اور اہل بیت کے علاوہ کسی اور کی مدح میں زبان نہیں کھولی۔ فن شاعری پر عبور تھا۔ اور فکر کی گہرائی کے ساتھ کلام کہتے تھے۔ نکتہ آفرینی، زبان کی صفائی، تشبیہات واستعارات کی خوش سلیقگی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھی۔

ایس علی جواد زیدی نے قصیدہ نگاران اتر پردیش طبع اول ۱۹۷۸ء ص ۸۲ پر ان کا نام سید اظہر حسین محمد آبادی لکھا ہے۔ اور نمونۂ کلام درج نہیں کیا ہے، لیکن طبع دوم ۱۹۸۳ء ص ۹۳ پر ان کا نام سید علی اظہر محمد آبادی لکھا ہے اور سال ولادت ووفات دونوں درج کیا ہے لیکن غلطی سے سنہ ولادت ۱۸۸۸ء کے بجائے ۱۹۸۸ء درج ہو گیا ہے۔ زیدی نے نمونۂ کلام کے طور پر دو نعتیہ قصیدوں کے کل سات شعر تحریر کئے ہیں۔ ان کے بارے میں مزید تحقیق نہیں ہوسکی ممکن ہے یہ وہی سید علی اظہر ہوں جن کا طاعون نامہ محمد آباد کے رؤسا کی صحبتوں میں اثنائے گفتگو گردش کرتا تھا۔ جن کا تذکرہ ابھی گزرا ہے۔ یا یہ کوئی دوسری شخصیت ہوں۔ دونوں کے زمانۂ وفات میں معلوم ذرائع کے مطابق صرف دو برس کا فرق ہے محمد آبادی اہل علم اگر توجہ دیں تو وضاحت ہوسکتی ہے۔

محمد آباد گوہنہ کے پڑھے لکھے اور صاحب لیاقت خانوادے کے فرد تھے۔ راجہ نانپارہ کے یہاں ضلع دار تھے۔ انھوں نے ایک ''طاعون نامہ'' کو نظم کا لباس پہنایا تھا۔ یہ نظم دستاویزی حیثیت رکھتی ہے اس میں اظہر نے تقریباً ڈیڑھ سو اشعار کہے ہیں اور ان اشعار میں طاعون کی ہلاکت خیزی، اس بیماری کی وجہ سے بستی کی بستی کا اجڑ جانا، سفر کی صعوبت، جن لوگوں نے اظہر کی مدد واعانت کی ان کا تذکرہ، تعریف اور مدح سرائی جن افراد یا خاندانوں نے ان کی کوئی مدد نہیں کی اور اپنے طرز عمل سے بیزاری ظاہر کی ان کی ہجو اور مذمت کی گئی ہے۔ اس نظم میں امارت وغربت کی کشمکش کو بہت اچھے پیرائے میں منعکس کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ خاندانی وجاہت وسیادت غربت

کی وجہ سے دوسروں پر اثر انداز نہیں ہوسکی اور اس اقتدار وافتخار کے سارے ہنگامے ناکام ہوگئے۔اس نظم میں کہا گیا ہے کہ جب طاعون کی ہلاکت سے بچنے کے لیے دوسرے مقام پر جا کر عافیت مندانہ زندگی کے ایام گزارنے کی نیت سے سکونت اختیار کرنی چاہی تو کسی نے کوئی مدد نہیں کی اور کوئی دستِ تعاون دراز نہیں ہوا۔پوری نظم پرحزن وملال کی فضا چھائی ہوئی ہے۔اس کا انداز پیش کش سراسر حزنیہ ہے۔منظر نگاری بھی اس نظم کی ایک خصوصیت اور شاعرانہ خوبی ہے۔شاعر نے لفظوں کے انتخاب میں مناسبت خیال کا التزام رکھا ہے راقم کو سید علی جواد زیدی سے اس نظم کے صرف تین شعر دستیاب ہوئے ہیں جو یوں ہیں۔

نمونۂ کلام

آئے دنیا میں نبی رحمت عالم بن کر ۔۔۔ امتی کیسے پھر آلودۂ عصیاں ہوجائے
دیکھ پائے جو ترے عارضِ تاباں کی جھلک ۔۔۔ غش میں موسیٰ کی طرح یوسف کنعاں ہوجائے
تیری پیشانی پہ وہ نور ہے اے نورِ خدا ۔۔۔ جس گلی سے تو گزر جائے چراغاں ہوجائے
کاسرِ اصنام کعبہ ہوگا یہ نام خدا ۔۔۔ ہرصنم سوئے زمیں باقلب زار آنے کو ہے
تا قیامت خلق میں باقی رہے گا جس کا دیں ۔۔۔ آمنہ کی گود میں وہ ہونہار آنے کو ہے
ماہتاب دیں بھی ہے وہ آفتاب حشر بھی ۔۔۔ وہ سوارِ ابلق لیل ونہار آنے کو ہے
گھر میں عبداللہ کے اے اظہرؔ شیریں سخن ۔۔۔ فضلِ حق سے شافعِ روزِ شمار آنے کو ہے(۱)
جب تک کہ اقتدار نہ ہو سرنوشت میں ۔۔۔ جانا کہیں روا نہیں دنیائے زشت میں
باور نہ ہو تو پوچھ لو برنا و پیر سے ۔۔۔ کیا ہم برے تھے صحبت قوم اہیر سے
بیٹھے تھے وہ تو سامنے حقہ دھرے ہوئے ۔۔۔ ہم چپ کھڑے تھے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے

حواشی:

(۱) قصیدہ نگاران اتر پردیش۔علی جواد زیدی باردوم ۱۹۸۳ء، اردو اکیڈمی لکھنؤ ص ۹۳

اظہرؔ

انداز اً ۱۹۲۰ء ---------------

جوگری کے رہنے والے تھے یہ گاؤں اکونا ضلع اعظم گڑھ کے قریب واقع ہے۔ ان کا کلام قوالی کی محفلوں میں خوب گایا جاتا تھا۔ یہ قوالی کے اکھاڑہ کے نمائندہ شاعر تھے اور اپنے دور کے قوالوں میں متداول پچرا، کجری، خیال وغیرہ کی صنف میں اظہار خیال کرتے تھے۔ کلام میں فنی نقائص اور عیوبِ سخن بھی راہ پا گئے ہیں۔ سامنے کے مضامین نظم کیا کرتے تھے۔ اشعار میں عام لوگوں کی دل چسپی کے مضامین اور خیال ہوتے تھے۔ لیکن زیادہ کہنے کی وجہ سے برجستہ گوئی پیدا ہوگئی تھی۔

نمونۂ کلام

زیرِ شمشیر قاتل دیا ہے حق کا پیغام شبیر تونے
دے کے اسلام کو زندگانی پی لیا موت کا جام تونے

رکھ لیا تونے شانِ امامت دے دیا سر مگر کی نہ بیعت
اپنی قربانیوں سے کیا ہے عزمِ باطل کو ناکام تونے

تھی چچا کے لئے اک قیامت تھی شکستہ بھتیجے کی میت
کربلا کی زمیں سے اٹھائی کس طرح لاش گلفام تونے

بل نہ اصغر کے چہرے پہ آیا مسکراتے ہوئے تیر کھایا
جو نہ ابتک کسی سے ہوا تھا دشت میں وہ کیا کام تونے

جذبۂ عشق یارب سلامت رہے ان سے جب بات ہو آمنے سامنے
وہ شرابِ محبت پلاتے رہیں ہاتھ میں ہاتھ ہو آمنے سامنے
دردِ دل داستانِ الم جب سنیں ان کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگیں
میں بھی رونے لگوں وہ بھی رونے لگیں خوب برسات ہو آمنے سامنے
کس کو قاتل کہوں کس کو الزام دوں خون کا اپنے میں کس سے دعویٰ کروں
پوچھ لینا اے اظہرؔ یہ ان سے کبھی جب ملاقات ہو آمنے سامنے

درد وغم رنج ونالے ملیں گے نت نئی اک مصیبت ملے گی
ان بتوں سے لگاؤ گے دل تو ہر قدم پر قیامت ملے گی
ناروا ظلم وجور وتشدد دل میں ان کے کدورت ملے گی
ان حسینوں میں اور کیا ملے گا بے وفائی کی عادت ملے گی

ہو کے خنجر بکف وہ چلے ہیں زلف بکھری ہے تیور چڑھے ہیں
آج نکلے گا کس کا جنازہ خاک میں کس کی میت ملے گی

بعد تیرے تجھے کون اظہرؔ پوچھے گا مطلبی ہے زمانہ
جن لبوں پہ ہیں تیرے ترانے کل انھیں پر شکایت ملے گی

اظہرؔ - اظہر حسن انصاری کوپاگنج

تخمیناً ۱۹۲۳ء ــــــ ۲۸؍جنوری ۲۰۰۳ء

اظہر حسن اظہرؔ انصاری کوپاگنج ضلع مئو کے باشندے شعروشاعری سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ اور آج کے بدلتے ہوئے ذہن ومزاج، نئی تعبیرات وعلامات، جدید حسیات ونفسیات کی بہترین نمائندگی کرتے تھے۔ وہ اپنی شعری خوش قامتی اور فنی جہات سے کوپاگنج کے شاعروں میں نمایاں تھے۔ ماہر عبدالحئی انصاری سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ناتمام صفر ۱۹۹۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ جس کے دوسو صفحات ہیں غزل، نظم اور قطعہ نگاری سے شغف رکھتے تھے۔ غزلیں اچھی کہتے تھے۔ موجودہ دور میں زبان وبیان اور غزلیہ لہجے میں جو تبدیلی پیدا ہوئی ہے اس کی نمائندگی کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ان کے یہاں تازگی اور انفرادیت کی نمود ہے۔ وہ آج کے بھرپور سماجی انسان تھے۔ آج کے علم، آج کی آگہی اور آج کے شعور کی کسوٹی پر ان کی انفرادیت قابلِ قدر ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ علم ودانش اور تہذیب وتاریخ انسانی کے تسلسل وتواتر کی لذیذ تر حقایت سناتا ہے۔ اس پر ماضی کی ۔۔۔۔۔۔ حیات انسانی کے مسائل کا تجزیہ ان کے شعری پیکروں موجود ہے وہ اپنی عصری زندگی کی سمت ورفتار کو دیکھ کر جو محسوس کرتے تھے اس کو پیش کرنے کی اچھی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ ان کا شعری شعور بالیدہ وپاکیزہ تھا۔ زندگی کی سنگینی کو اس خوبی کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ فنی سانچوں کی نگہداشت کا فریضہ بھی ادا ہو جاتا تھا اور شعر کے تیور میں تیکھاپن بھی آجاتا تھا۔

نمونۂ کلام

کرے گی حمد وثنا لاکھ کائنات تری
بیان کر نہ سکے گی مگر صفات تری
یہ صبح وشام کی گردش ہے تیری پروردہ
سحر میں نور ترا ہے، سیاہ رات تری
بجھاؤں تشنگیِ قلب مضطر
عطا مجھ کو بھی ہو صہبائے کوثر
شہنشاہوں نے کی جس کی غلامی
وہی ہوگا شفیعِ روزِ محشر
اپنی کوئی پہچان بنالوں ناممکن سا لگتا ہے
لوگوں کے احسان اٹھالوں ناممکن سا لگتا ہے
رفتہ رفتہ تلخیِ غم سے دل میرا مانوس ہوا
غم سے اپنی جان بچالوں ناممکن سا لگتا ہے

تمام عمر کیا میں نے ناتمام سفر
جو قرض سعی وعمل کا تھا سب اتار دیا
یہ کچی عمر کے بچے تو گیلی مٹی ہیں
انھیں جو چاہو بناؤ کمہار کی صورت
ریشمی کپڑوں میں درد وکرب چھپ سکتا نہ تھا
لوگ کیوں مصروف چہروں کی نمائش میں رہے
اس شہر میں وہ شخص جسے کہتے ہیں اظہرؔ
آزاد کسی مردِ قلندر کی طرح ہے
سلگتا مسئلہ دانشوروں تک آیا ہے
یہ شیشہ وہ ہے جو خود پتھروں تک آیا ہے
تلاش جس کی تھی، خنجر بکف تھے جس کے لئے
وہ شخص آج تمہارے گھروں تک آیا ہے
حصار تیرہ شبی ٹوٹ جائے گا خود ہی
سحر کا نور لئے منظروں تک آیا ہے
شہر کی صورت حالات نہ دیکھی جائے
حادثوں کی یہ کرامات نہ دیکھی جائے
رام کے دیس میں راون کے بجاری ہیں
ان کی ہر لمحہ خرافات نہ دیکھی جائے

اعجاز ـــــ سید اعجاز الحسن

۱۹ء ـــــ ء

اعظم گڑھ کے ایک مضافاتی علاقے بگہی ڈانٹر/متصل چاند پٹی کے پڑھے لکھے ممتاز فرد تھے۔ بگہی ڈانٹر کو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ یہ علاقہ مسلح مجاہدین آزادی کی سرگرمیوں کا بہت اہم مرکز تھا۔ پیشۂ معلمی کو جن لوگوں نے اعتبار

ووقار بخشا ہے اُن میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ انگریزی ادبیات سے گہری وابستگی تھی۔ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ میں شعبۂ انگلش کے ہیڈ تھے۔ ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ انگریزی ادبیات میں انھیں بڑا تبحر علمی حاصل تھا۔ ان کے دور میں شبلی کالج اطراف کے معاصر کالجوں میں اپنے معیار تعلیم کی بلندی اور اساتذہ کی کامیاب تدریس کی بنا پر دور دور تک شہرت رکھتا تھا۔ اسٹاف کی دل چسپیوں اور ذہن سازیوں کی وجہ سے طلبہ کی سرگرمیاں نقطۂ عروج پر تھیں۔ اچھے اساتذہ کی ایک کہکشاں تھی جو طلبہ کی خفیہ صلاحیتوں کو جگمگانے کے مواقع فراہم کر رہی تھی۔ سید اعجاز الحسن کی ذات اپنی علمی قامت کی وجہ سے اساتذہ وطلبہ میں بہت نمایاں اور لائق احترام تھی۔ انگریزی کے تمام مشکل اور ادق اسباق کی تعلیم وتفہیم آپ ہی کی عبقریت اور علمیت کے حوالے تھی۔ علمی نکات پر یوں لب کشا ہوتے تھے کہ ذہین شاگردوں کو لطف آجاتا تھا۔ مفہوم کی گرہ اس طرح کھولتے تھے کہ کڑی منزلیں بھی طلبہ کے لئے آسان ہوجایا کرتی تھیں۔ ادبی مسائل پر جب تجزیاتی روشنی ڈالتے تو ذہن وفکر کی پوری طرح صیقل گری ہوجاتی تھی۔ امتحانی سوالات کے بارے میں اپنے طلباء کو اکثر متنبہ کیا کرتے تھے اور سوال حل کرنے کے بارے میں گائڈ لائن دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر سوال کو سمجھ کر جواب دوگے تو غلطی کے بعد بھی نمبر ملے گا اور اگر سوال کو بغیر سوچے سمجھے جواب دوگے اور اس کے سیاق وسباق پر توجہ نہیں دوگے یا متعلقہ اقتباس پر ضروری باتیں درج نہیں کروگے تو صحیح جواب پر بھی کم نمبر پاؤگے۔ ذہین طلباء کو بہت توجہ سے پڑھاتے تھے۔ کھیل کود میں لگے رہنے والے اور کم فہم شاگردوں کو ان کی ذہنی سطح کی رعایت سے ایسے انداز میں پڑھاتے تھے کہ حصول علم کی طرف رغبت ہو اور شوق علمی بیدار ہوجائے۔

یہ اردو شاعری سے بھی عملاً وابستہ تھے۔ انگریزی ادبیات نے ان کے احساس جمال اور ادبی وفکری استعداد پر جلا کی تھی اس لئے اردو کی غزلیہ شاعری کی فنی اقدار کو مغربی تصور ادب کا پُٹ دے کر خاصے کی چیز بنا ڈالا تھا۔ سماجی وسیاسی نظریات اور معاشی وطبقاتی کشمکش کو ادبی پیرائے میں بیان کرتے تھے۔ وہ لفظوں کے اطراف سے بڑا کام لیتے تھے اور اپنے حاشیۂ خیال کو روشن بنانے کے لئے بڑا ریاض کرتے تھے۔ غور وفکر کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ وہ معمول کے واقعات وحالات

پر گہرائی سے سوچنے لگتے تھے۔

نمونۂ کلام

کوئی بھی ناز نیں نہیں جس کی جبیں پہ چیں نہیں — جو مائل نیاز ہو ایسا حسیں، حسیں نہیں
قُلّۂ کوہِ طور کیا، نزدیک اور دور کیا؟ — جلوؤں کا ہے قصور کیا، سجدوں کی وہ جبیں نہیں
چہرہ دھواں دھواں بھی ہے، آنکھوں سے غم رواں بھی ہے — یہ کیفیت وہاں بھی ہے، یہ کیفیت یہیں نہیں
چھلکی ہوئی شراب دیکھ، ساقی ہے آب آب دیکھ — زاہد بہشت خواب دیکھ، چھوڑ دوں یہ، نہیں نہیں
اے جس کا دیں میں نام ہے، اے جس کا کفر کام ہے — وہ بھی تو اک مقام ہے جس میں کہ کفر و دیں نہیں

حواشی:

(۱) شبلی نیشنل کالج میگزین اعظم گڑھ ۱۹۵۸ء۔ ۱۹۵۹ء ص ۱۰۸

اعجاز- مرزا انوار الحق بیگ چغتائی

فروری ۱۹۱۸ء/ ۱۳۳۸ھ ـــــ ۲۲/ اگست ۱۹۴۰ء/ ۱۳۶۰ھ

قصبہ سرائمیر سے تقریباً سات کلومیٹر دور میں خانماں برباد اور زمانے کے ستائے ہوئے مغلوں کی ایک چھوٹی سی آبادی ہے جو مرزا پور کے نام سے اعظم گڑھ کے اکناف واطراف میں مشہور ہے۔ یہ بستی کب اور کیسے بسی اس کے بارے میں کوئی صحیح بات معلوم نہیں ہوسکی۔ تاہم مغلوں کے اس خاندان کا سلسلۂ نسب مرزا محمد ابراہیم بیگ مرحوم سے ملتا ہے جو موضع ابڈیہہ (۱) کے بانی تھے، انھیں مرزا محمد ابراہیم کے صاحبزادے مرزا پرویز بیگ نے موضع ریورا پرویز پور اور پوتے مرزا عبدالغنی بیگ نے موضع مرزا پور کو آباد کیا۔ مغلوں کی پہلی آبادی اَ گسرا میں تھی جو ابڈیہہ ابراہیم پور کے جنوب میں کنور ندی کے بائیں کنارے پر واقع ہے اوراب ویران جنگل ہے۔

مغل قوم اپنے عروج میں اصحاب کمال وفن اور ارباب علم وفضل کو جنم دیتی ہی رہی ہے، لیکن نکبت اور ادبار کے دور میں بھی اس نے ایسے "مرد زمانہ ساز و زمانہ ستیز" پیدا کئے جن کی ذات وصفات سے تاریخ ہند میں کئی درخشاں باب کا اضافہ ہوسکتا تھا، مگر زمانے کی ناقدری، اور

ارباب قرطاس وقلم کی بے اعتنائی نے انھیں عنوان تاریخ بننے سے روک دیا، اب ان کے کارنامے اور شخصیتوں کے نقوش جو ذہنوں اور سینوں کی دنیا آباد کئے ہوئے تھے عدم کے مسافروں کے ساتھ رخصت ہوگئے، اب نہ داستان رہی اور نہ داستان گو۔

مرزا معروف بیگ اپنی گونا گوں خوبیوں کی وجہ سے علاقے بھر میں ممتاز تھے اور نہایت قابل احترام بزرگ سمجھے جاتے تھے، انگریزی دور کے اعلیٰ افسران بھی آپ کو عزت کی نظر سے دیکھنے اور ادب کی زبان سے مخاطب کرنے پر مجبور تھے، ان کے دولڑکے مرزا حبیب اللہ بیگ اور فصیح اللہ بیگ اپنے وقت کے کامیاب مختار تھے اور باپ کی عزت و وجاہت اور فضیلت و مزیت کی وراثت وامانت کو سنبھالے ہوئے تھے۔ مولانا عبدالحمید فراہی (۱۲۸۰ھ۔۱۳۴۹ھ) انھیں مرزا فصیح اللہ بیگ کے نواسے تھے، انھیں کے صاحبزادے مولانا مرزا حسین بیگ تھے، جو اپنے وقت کے ایک اچھے شاعر تھے، وہ جذبۂ حریت اور نشۂ وطنیت سے سرشار تھے، ان کی ایک وطنی مثنوی "نظام الہند" کے نام سے شائع ہوئی تھی، لیکن اس میں اہلِ وطن کو انگریزوں کے خلاف جہاد پر اکسایا گیا تھا، اوران کی غلامی کے جوئے کو گردن سے اتار پھینکنے کی ترغیب دی گئی تھی، اس لئے "نظام الہند" کے شائع ہوتے ہی انگریزی سرکار نے اس کے جز وکل کی ضبطی کا حکم کر کے اس کی طباعت واشاعت پر پابندی عائد کردی، اس طرح یہ تاریخی اور دستاویزی مثنوی بالکلیہ معدوم ہوگئی۔

مرزا انوارالحق بیگ المتخلص بہ اعجاز چغتائی مرزا حبیب اللہ بیگ کے پوتے اور مرزا عبدالسلام بیگ کے اکلوتے صاحبزادے تھے، ان کی والدہ زبیدہ خاتون مولانا فضل الکریم افضل کونروی متوفی ۱۹۴۰ء کی صاحبزادی تھیں (۲) اعجاز فروری ۱۹۱۸ء کی کسی تاریخ میں اس عالم رنگ وبو کی پہلی صبح دیکھی۔ مولد ومسکن مرزا پور ضلع اعظم گڑھ ہے۔ پیدائشی طور پر پیروں سے مفلوج اور چلنے پھرنے سے معذور تھے، بچپن کا بیشتر حصہ اپنے شفیق نانا فضل الکریم کی پرورش وپرداخت میں گزرا، اور انھیں کے سایۂ عاطفت میں رہ کر علوم وفنون کے رموز وغوامض سے آگاہی حاصل کی۔ مولانا افضل ان سے فارسی میں گفتگو کرتے اور چیزوں کی شناخت فارسی لب ولہجہ اور لغت میں کراتے۔ اس طرح زبانِ فارسی کی شیرینی اور شیفتگی ان کی گھٹی میں پڑگئی اور اس نظامِ تربیت سے

ایک حد تک فارسی ان کی مادری زبان بن گئی، پیروں سے مفلوج ہونے کی وجہ سے گانو کے ہم عصر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کودنے، ملنے جلنے، اٹھنے بیٹھنے اوران سے کچھ کہنے سننے کے مواقع بھی بہت کم پیش آئے اس لئے ان کی زبان زبانِ غیر کے اختلاط واثرات سے محفوظ رہی۔

اعجاز جب پانچ برس کے ہوئے تو رواج کے مطابق منشی عبدالقدیر صاحب ساکن سیدھا سلطان پور سے بسم اللہ کرائی گئی، اس کے بعد انھوں نے نظام آباد کے مرزا شبلی بیگ سے قرآن مجید، اردو، فارسی اور دینیات وغیرہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی، مرزا شبلی بیگ بھی شعروشاعری سے شغف رکھتے تھے۔اورانھیں تعلیم وتعلم کا بہت اچھا انداز معلوم تھا، اس لئے اعجاز نے ان کی شخصیت سے بہت سے اثرات قبول کئے۔لیکن بیماری کی وجہ سے اخذفیض کا یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ چونکہ اللہ نے ذہانت وفطانت اور علم کی طرف رغبت کی نعمت سے نوازا تھا اس لئے بیماری کے ایام میں بھی مطالعے کے شغل کو برابر جاری رکھا۔اور مطالعے کے لئے ہمیشہ معیاری اور پُراز معلومات کتابوں کا انتخاب کیا، اس انتخاب نے ان کی معلومات کو قابلِ قدر بنادیا۔ جب بیماری سے نجات ملی تو ۱۹۲۲ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں داخل ہوئے، اُس وقت مدرسۃ الاصلاح اپنے نصابِ تعلیم اور باصلاحیت اساتذہ کی وجہ سے بڑا مردم ساز، عہد آفریں، انقلاب انگیز اور زمانہ شناس سمجھا جاتا تھا۔اور اہلِ علم کے نزدیک اس کے طریقۂ تعلیم کو بڑی خصوصیت حاصل تھی۔ لیکن بیماری نے اس قلعۂ علمی میں بھی ان کو مامون نہیں چھوڑا۔عارضۂ چشم اور بینائی کی کمزوری نے انھیں طبیبوں کا مشورہ ماننے اور سلسلۂ تعلیم بند کردینے پر مجبور کردیا، اس لئے عربی دوم سے آگے نہیں بڑھ سکے، پھر بھی چند ہی برسوں میں یہ مدرسۃ الاصلاح کی لائبریری "دارالمعلومات" کے ذخیرۂ کتب سے اتنا استفادہ کر چکے تھے اوراپنے ظرف کو اس سمندر سے اتنا پُر کر چکے تھے کہ زندگی میں انھیں علم سے محرومی کا کوئی زیادہ شکوا بھی نہیں رہا۔

اعجازؔ کا شمار اُن شاعروں میں کیا جاسکتا ہے جو اپنی بادِنفس سے شعلہ نوائی اور چمن آرائی کے راستے نکال لیا کرتے ہیں۔ یہ ذہنی اور فطری شاعر تھے، خدا نے انھیں وہ ملکۂ شاعری بخشا تھا کہ اگر عمر نے وفا کی ہوتی اوران کے فکروفن پر کسی اچھے شاعر نے اپنی تربیت سے جلا کی ہوتی تو

یقیناً یہ اُن اہم شاعروں میں شمار کئے جاتے جو اپنی شاعری کو اپنے زمانے کی رفتار سے بھی آگے رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور جن کے گنجینۂ معنی کے طلسم کا راز پنہاں مستقبل کے انکشافات محسوسات ہی کھول سکتے ہیں۔ اعجاز اگرچہ کسی کے باضابطہ شاگرد نہیں تھے لیکن حضرت افضلؔ کونڑوی کی تربیتِ ذہن وزبان اور اقبال سہیل کے مفید مشوروں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سہیل مرحوم کی جوہر شناس نظر نے اس بیش قیمت گوہر کی قدر و قیمت کو آنک لیا تھا، اس لئے وہ ان سے بہت محبت رکھتے تھے اور ملاقات کے لئے اعجازؔ کے گھر چلے جایا کرتے تھے حالانکہ سہیل کے مقابلے میں اعجاز کی علمی وشعری حیثیت بہت کم تھی۔

اعجازؔ چغتائی کی انجذابی اور آخذ طبیعت نے جن شخصیتوں کے اثرات قبول کئے ان میں مولانا عبدالحمید فراہی (۱۸۶۲ء۔ ۱۹۳۰ء) مولانا محمد شفیع (۱۸۶۶ء۔ ۱۹۴۵ء) مولانا اختر حسن اصلاحی (۱۹۰۱ء ۔ ۱۹۵۸ء) حضرت افضل کونڑوی (۱۸۵۳ء ۔ ۱۹۴۰ء) اور اقبال سہیل (۱۸۸۴ء۔ ۱۹۵۵ء) تھے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ان تمام لوگوں کو شہرت و ناموری سے کافی تنفر تھا، ان لوگوں نے ہمیشہ اپنی شخصیتوں کو چھپایا اور انتہائی خاموشی کے ساتھ دین و دیانت اور علم وادب کی گرانقدر خدمات سرانجام دیں، اعجاز مرحوم بھی اس اساطینِ علم کے فیضِ صحبت کے اثر سے نام ونمود کی خواہش سے کوسوں دور رہنا چاہتے تھے اور گمنامی کی زندگی پسند کرتے تھے، غالباً یہی سبب رہا ہوگا جو وفات سے کچھ دنوں پہلے انھوں نے اپنے تمام نقوشِ سخن حرف غلط کی طرح مٹادینے کی کوشش میں اپنی والدۂ مکرمہ کے بار بار منع کرنے کے باوجود اپنی شعری کائنات کو نذرِ آتش کردیا، اب ان کے وہی کلام محفوظ رہ گئے ہیں جو لوگوں کی زبان پر چڑھ چکے تھے یا پرزوں کی شکل میں بچ گئے تھے، انھیں کی مدد سے مولوی منظور دوعالم صاحب نے اپنی طالبعلمی کے زمانے میں اپنے جدامجد فضل الکریم کے حالات "حیات افضل" میں چند نظمیں نقل کی ہیں اور ص ۴ پر ان کے مختصر حالات بھی لکھ دیئے ہیں (۳)

اعجازؔ مرحوم نے ۲۲/اگست ۱۹۴۰ء کو انتقال کیا اس وقت ان کی عمر پچیس برس کی تھی (۴)۔

اعجازؔ مرحوم کی شاعری کا وقفۂ حیات مختصر رہا لیکن اسی مختصر وقفے میں انھوں نے شاعری کے اچھے نمونے چھوڑے ہیں، یہ نمونے ان کی ذہنی بیداری اور ان کے شاعرانہ مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ انھوں نے الفاظ کی تراش خراش، موزونیت، مناسبت مقام کو پہچاننے اور موسیقیت کو باقی رکھنے میں اپنے پختہ شعور کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ انھوں نے لفظوں کے استعمال میں احتیاط برتی ہے اور مقام و محل کے اعتبار سے آہنگ شعری اور رنگ سخنوری کی تخلیق کی ہے۔ ان کی شاعری اثر آفرینی کی موجِ زیریں سے بھی معاملہ رکھتی ہے۔ ان کا فارسی کلام بھی ان کی قادرالکلامی کی دلیل اور زبان پر ان کی ماہرانہ دسترس کی تصویر ہے۔ وفات سے چندروز پہلے جو فارسی غزل کہی تھی اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

الست بربکم مارا بوجد آرد گہ بے گہ — دگرآں نغمۂ دوشیں شنیدم آرزو دارم
زمیں جنبد، فلک لرزد، جہاں دراضطراب آید — بامید سکوں چنداں تپیدن آرزو دارم
نمی خواہم چوں گل اعجازؔ پیوندِ زمیں گشتن — نسیم آسا ازیں گلشن پریدن آرزو دارم

اعجاز مرحوم نے دردمند طبیعت پائی تھی، ان کی قوت احساس قوی تھی، وہ ذراسی بات کو گہرے تاثر کے ساتھ محسوس کر لیتے تھے، ان کی یہ ذکی الحسی ان کے کلام میں بھی درآئی ہے۔ اس لئے ان کا کلام ان کے محسوسات و تفکرات کا آئینہ خانہ بن گیا ہے۔ ان کے فکر و شعور اور دل و دماغ کی تشکیل ایک دیندار اور مذہبی ماحول میں ہوئی تھی، اور خود ان کی فطرت بھی دین و مذہب کے تصورات سے مناسبت رکھتی تھی، اس لئے انھیں مذہب سے بڑا انس تھا اور جب کوئی مذہبی تصورات واصول پر کسی طرح کی بھپتی کستا تو ان کے ذہن و دماغ میں ابال پیدا ہوجاتا اور ان کی باطنی دنیا میں ارتعاش واہتزاز کی کیفیت نظر آنے لگتی۔ وہ اصول دین کے رموز شناس تھے اس وجہ سے لادینی تصورات رکھنے والوں پر مشتعل ہوجایا کرتے تھے۔ کسی نے روزہ کی فرضیت کے انکار میں یہ شعر کہا

رکھ کے روزہ ہم خلافِ حکمِ قدرت کیوں کریں — جب خدا کھانے کو دے کفرانِ نعمت کیوں کریں

اعجاز مرحوم نے اس کا جواب شعر میں دیکر "نہی عن المنکر" کا فریضہ اس طرح ادا کیا

امارت میں خدا کو یاد رکھنا عینِ حکمت ہے — بھلا دینا خیالِ مفلسی، کفرانِ نعمت ہے

۱۹۳۶ء میں چند"اصحاب زہد وتقویٰ" نے علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی کی بعض عبارتوں کو توڑ مروڑ کر، سیاق وسباق سے کاٹ کر اور اپنی طرف سے غلط معنیٰ پہنا کر ان اساطینِ امت کو کافر قرار دے کر اپنی کافر گری کی مہم میں ایک اور کامیابی کا اضافہ کیا تو اعجاز مرحوم کو ملت کے پاسبانوں کو اس رویئے پر سخت ذہنی کوفت ہوئی، انھوں نے ایک تاثراتی نظم کہی، جو اپنے انداز اظہار واسلوب، اور متانت وسنجیدگی کے اعتبار سے اچھی تاثراتی نظموں میں گنی جانے کی مستحق ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

تعجب ہے جگر لالے کے پتھر ہوتے جاتے ہیں — تماشا ہے یہ پتھر لعل وگوہر ہوتے جاتے ہیں
تمیز یا وہ گوئی تک نہ تھی حاصل جنھیں کل تک — وہ اب زینت دہِ محراب ومنبر ہوتے جاتے ہیں
بچے گی آبروئے علم وفکر وآگہی کب تک — اسیرانِ گماں بھی جب پیمبر ہوتے جاتے ہیں
یہ اندازِ فریبِ ظلمتِ شب، اف، معاذاللہ — چراغِ بزمِ کشتہ، ماہ واختر ہوتے جاتے ہیں
کچھ اس انداز سے وتی ہیں بحثیں کفر وایماں کی — کہ منکر نیکیاں، معروف منکر ہوتے جاتے ہیں
زبانوں پر ہیں قالَ قال کے حیران کن نکتے — اور اندازِ بیاں، شمشیر وخنجر ہوتے جاتے ہیں
میاں امبیڈکر اسلام میں آئیں بھلا کیوں کر — کہ فرزندانِ ابراہیم، آذر ہوتے جاتے ہیں
ائمہ، اتقیا، اصحاب کافر ہیں تو پھر غم کیا — اگر شبلی، حمیدالدین، کافر ہوتے جاتے ہیں
جوابِ جاہلاں باشد خموشی ہے بجا لیکن — ہوئے اعجاز مضطر، اب سخنور ہوتے جاتے ہیں

علامہ اقبال کی شخصیت نے ہر طبقے پر اپنے اثرات مرتب کئے، وہ ایک ایسا سورج تھے جس سے ہر طرح کے لوگ کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ سورج حیات کا سرچشمہ ہے اور اقبال بھی حیات فکری کا منبع ہیں، اس منبعِ فکر سے اعجاز کو بھی ایک ربط خاص تھا۔ انھوں نے اقبال کی وفات پر ایک طویل رثائیہ کہا تھا جس کے چند ہی متفرق اشعار ذہنوں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔

بحرِ چشم خوں فشاں گرمِ خروش وجوش ہے — نغمۂ دوشیں کی یادِ آشفتگیِ گوش ہے
روح بیزار نشاط ونشۂ صہبائے کیف — دل ہلاک تلخیٔ آوازِ ناؤ نوش ہے
نالۂ بلبل ہے شیون، جلوۂ گل گرد ہے — اب گلستاں سے یہ خاموشیِ چشم وگوش ہے

آہ اے اقبال! یہ سب کچھ ترے ماتم میں ہے — گریۂ پیر فلک خوں بار ترے غم میں ہے
دل کو تو نے شیشۂ رخسارِ جاناں کردیا — قلب کو آزردگیٔ چشمِ حیراں کردیا
بجلیوں کے مغربی لمپ اس کے آگے ہیچ ہیں — ایشیا میں جو دیا تونے فروزاں کردیا
مردِ مومن کو بتایا رمزِ دیں، سرّ حیات — امتِ مرحومہ کی مشکل کو آساں کردیا
کس طرح تو نے دیا مزدور کو پیغامِ عزم — مور بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کردیا
گونجتی ہے دشت میں جب تک تری بانگِ درا — جادۂ منزل سے بھٹکے گا نہ ہرگز قافلہ

نمونۂ کلام

تہ مزارِ شہیدانِ ناز اٹھ بیٹھے — صبا جو آئی زیارت کو کوئے قاتل سے
آبلہ پائی مری اعجازؔ ہے اک ساحری — اک گلستاں اُگ رہاہے وادیٔ پُرخار میں
مرے آئینۂ دل پر پڑی ہیں کس کی تنویریں — کہ مٹتی جارہی ہیں ظلمتِ عصیاں کی تصویریں
مجھے دشتِ بقا کی سیر سے کیوں کر فنا روکے — جدا پائے جنوں سے آپ ہوجاتی ہیں زنجیریں
تجلی گاہِ ایمن ہورہا ہے ایک اک ذرہ — نگاہوں میں ہیں کس کے جلوۂ رنگیں کی تصویریں
لب خاموش کیوں ہو شکوہ سنج گردشِ دوراں — مرے عشقِ تپاں سے جل گئیں قسمت کی تحریریں
فقط اک حرف تھی وہ سرگزشت وادیٔ ایمن — کتابِ عشق کی کیا پوچھتا ہے مجھ سے تفسیریں
تپشِ حسن سے معمور ہوا جاتا ہے — داغِ دل جلوہ گہِ طور ہوا جاتا ہے
پوچھ مت وجہ خودبہائے تمنا یعنی — ذرہ ذرہ مرا منصور ہوا جاتا ہے
گرمیِ جوشِ جنوں، وقتِ طرب، فصلِ بہار — خونِ دل بادۂ انگور ہوا جاتا ہے
ناشکیبائی وبے تابی وبے صبریٔ دل — جو کچھ ہوتا تھا بدستور ہوا جاتا ہے
فسانہ کب تک آخر قیس کی صحرانوردی کا — نئی دنیا کوئی کو سوز، وساز عشق سے پیدا
ابھی رہنے دے اے اعجازؔ کیا سمجھے اسے کوئی — کہ نازِ حسن ہوتا ہے نیازِ عشق سے پیدا
میں اس طرح ہوں ترے حسنِ پائدار میں گم — بقا کی فکر نہ اندیشۂ فنا معلوم
نہ وہ نیاز ہے باقی مرا، نہ ناز ترا — وفورِ جوشِ جنوں، حسن کی ادا معلوم
کمالِ عشق کی مت پوچھ خود فراموشی — نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

ہوا ہے حسن کا کس کے ظہور آنکھوں میں	کہ عرش وفرش ہیں سب نور نور آنکھوں میں
عبودیت مری اور تیری شانِ معبودی	نیاز دل میں بھرا ہے، غرور آنکھوں میں
بتا تو ذوقِ کلیمی چلوں میں کس جانب	کہ ذرہ ذرہ ہے وادیِ طور آنکھوں میں
کمالِ رفعتِ میخانۂ خیال نہ پوچھ	چھلک رہی ہے شرابِ طہور آنکھوں میں
حریمِ حسن میں اعجازؔ بریاب ہوا	چمک رہا ہے مسرت کا نور آنکھوں میں

حواشی:

(۱) مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کی تحقیق میں ابڈیہہ، آبدیدہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

(۲) حیات افضل قلمی ص ۴

(۳) مکتوب مولانا محمد اجمل اصلاحی

(۴) مولوی ابوہارون مجاہد اعظمی

اعجازؔ اعظمی - اعجاز احمد

یوم عیدالفطر ۱۹۳۰ء ـــ ۲/جولائی ۱۹۹۷ء

کمراواں کے رہنے والے تھے، عمر کا بیشتر حصہ بمبئی، ڈھاکہ، برما، ملیشیا اور سنگاپور میں گزرا، مختلف رسالوں میں چھپتے تھے، نثری نظمیں کہتے تھے، عمر کے آخری حصے میں اپنے گانو آکر فوت ہوئے۔ ان کے بھائی بھی شاعری کرتے تھے جن کے نام وکلام اور حالاتِ زندگی کی کوشش جاری ہے، ان کے بھائی کے بارے میں علم نہیں ہوسکا کہ رسالوں میں چھپے تھے یا نہیں۔ اعجاز نے ۱۹۵۰ء میں شاعری کا آغاز کیا اور ۱۹۵۳ء سے رسالوں میں کلام چھپنے لگا۔ اس وقت یہ ڈھاکہ میں تھے۔ ان کی شعری وتخلیقی صلاحیتوں کو ملیشیا میں جلا ملی انھوں نے وہاں کے غیر اردو دانوں میں اردو زبان وادب کے فروغ کا کام کیا۔ ان کی یہ خدمت نا قابلِ فراموش ہے کہ ملیشیا میں ہندو پاک کے علمی وادبی رسالے منگواتے تھے اور وہاں مطالعۂ اردو کے دائرے کو وسعت دیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اردو کا رشتہ دیارِ غیر سے جوڑنے میں کامیابی حاصل کی۔

اعجاز کم آمیز، سنجیدہ، خاموش، متین اور بڑے رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ انسانی و اسلامی اقدار کے نمائندہ تھے۔ دینی و مذہبی فکر کے حامل، اخلاقِ حسنہ اور خدا شناسی کے علمبردار اور تقدیس مشرق کے ثنا خواں شاعر تھے۔ ان کے کلام میں دیہات کی معصوم فضا بھی ہے اور شہر کی سڑکوں کے جوش و خروش، چائے خانوں کے شور، دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کی چیخیں اور کلبوں کے ہنگامے بھی سنائی دیتے ہیں۔ اعجاز اگر ہنگاموں میں بھی رہے تو ایک اجنبی کی طرح سب سے الگ تھلگ رہے۔ وہ عمر بھر دیہات کے ایک معصوم بچے کی طرح بھولے بھالے اور سیدھے سادے انسان بنے رہے، انھوں نے زندگی کو اس کے اوریجنل رنگ میں دیکھنے کی عادت ڈالی تھی اسی لئے زندگی بھی ان کے سامنے ہمیشہ اپنی اصلی حالت میں ہی نظر آئی۔ ان کے والد شیخ محمد ادریس بچپن ہی میں انھیں زندگی سے نبرد آزمائی کے لئے تنہا چھوڑ کر اپنے اخروی سفر پر چلے گئے۔ لہٰذا اعجاز عمر کے اولین مرحلے میں مفلسی کی گرفت میں رہے اور بہت سے سرد و گرم جھیلے۔ وہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک ڈھاکہ میں رہے اور اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں ملیشیا کا سفر کیا۔

انھوں نے آزاد و معریٰ اور پابند نظمیں سانیٹ، غزل، کلام شعراء پر تضمین وغیرہ اصناف کو وسیلۂ اظہار قرار دیا تھا مگر ان کا اصل جوہر غزل کے میدان میں کھلتا ہے۔ ان کی غزلوں میں داخلیت اور اپنے من میں ڈوب کر دنیا کو دیکھنے کا جذبہ ملتا ہے۔ ان کی نظمیں خارجی مناظر اور باہر کے منظر ناموں کا منظوم بیانیہ ہیں۔ انھوں نے کاروبار کی بھاگ دوڑ میں بھی شعر گوئی کا شغل جاری رکھا اور محنت و مشقت کے بعد وقت نکال کر فکر سخن کو اپنی تھکن کو دور کرنے کا ذریعہ بنایا۔ مگر یہ بھی خوبی تھی کہ شاعری ان کے لئے سستی تفریح نہیں تھی بلکہ انھوں نے فن سخن کو ذہنی اشتغال اور فکری مراقبے کا وسیلہ بنایا تھا۔ اسی لئے ان کے کلام میں زندگی کے گہرے تجربات اور سچی بصیرت کی فراوانی ہے ان کا مجموعۂ کلام "اعجازِ سخن" کے نام سے ۲۰۰۸ء میں ان کے بیٹے طارق اعجاز اعظمی کے اہتمام و ترتیب سے ۳۶۸ صفحات پر مشتمل اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام

بہتے پانی پہ جس کی ہے بنیاد — خام مٹی کا وہ مکاں ہوں میں

آندھی تھی سخت، پیڑ تناور اکھڑ گئے
لیکن گلاب اپنی جگہ برقرار ہے
قدروں کے جو پہاڑ تھے، کٹ کٹ کے بہہ گئے
اس سیلِ ارتقا کے کٹیلے بہاؤ سے
آنکھیں ملاکے ہاتھ ملانا تو رسم ہے
آنکھوں کے ساتھ دل بھی ملے تو مزا ملے
یہ حکم ہے کہ کوئی وصیت اگر لکھوں
قاتل کا ذکر آئے جہاں چارہ گر لکھوں
مٹی کے اس حصار میں مدت سے قید ہوں
حاصل ہو گر قرار تو اپنی خبر لکھوں
آنکھوں سے کیسے نوچ لوں عکسِ سراب کو
صحرائے جسم وجاں کو میں کس طرح گھر لکھوں
بپھرے سمندروں کی نہ بڑھ جائیں شورشیں
ساحل کے ڈوب جانے کا منظر اگر لکھوں
اعجازؔ میں ہوں گھور اندھیرے کی داستاں
کس دل سے اس کہانی کا عنواں سحر لکھوں
اکتاکے اٹھ نہ جائیں ترے غم گسار بھی
اب داستانِ کرب کو اتنا بھی دے نہ طول
ہے شمع وہی جو جل بجھ کر محفل میں اجالا کر جائے
جو آگ میں اپنی جلتے رہیں اعجازؔ وہی ہیں پروانے

اعجازؔ - اعجاز حسین اعظمی

۱۹۳۶ء ـــــ فروری ۲۰۰۱ء

پہلے تخلص ناشاد تھا ۱۹۵۵ء یا ۵۶ء میں اعجاز تخلص اختیار کیا، میاں صاحب اسلامیہ کالج گورکھپور سے انٹر، مہارانا پرتاب ڈگری کالج گورکھپور، اور گورکھپور یونی ورسٹی سے بی،اے۔ایل ٹی کیا۔ گورکھپور میں ان کے استاذ مجنوں گورکھپوری کے درس نے ان کے ذوقِ شعروادب کو جلا بخشی۔ سب سے پہلے ملازمت خیر کالج بستی میں ٹیچر کی ملی یہاں دو سال رہے، اس کو ترک کیا، اور دیہی ترقیاتی محکمے میں آ گئے، گورکھپور، ٹانڈہ، بستی، گونڈہ، بارہ بنکی اور دیوریا میں رہے، اس کے بعد ان کا مستقل قیام گورکھپور میں تھا۔ وہ ایک معروف شاعر تھے۔ اختر بستوی کے گہرے دوست تھے۔

"گل سخن" اعجاز اعظمی کی غزلوں کا مجموعۂ اول جو ایک چار صفحات پر مشتمل ہے ڈاکٹر اختر بستوی کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۹۹ء میں یو پی اردو اکیڈمی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے ان کی موت سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔

اعجاز اعظمی ۱۹۴۷ء میں جب آٹھویں درجے کے طالب علم تھے شعر کہنے کی طرف مائل ہوئے لیکن والد امتیاز احمد صاحب تعلیم کے معاملے میں بہت سخت تھے اور ان کی نگرانی سے اعجاز خائف بھی رہتے تھے اس لئے ذوقِ سخن گوئی کی آگ سینے میں گیلی لکڑی کی طرح دھیمی دھیمی سلگتی رہی اور پدر بزرگوار سے چھپ چھپا کر کچھ کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کے بہنوئی حکیم عبدالباقی نامی اعظمی بھی شاعر تھے وہ گورکھپور میں خدمت تدریس پر مامور تھے۔ اعجاز ان کی صحبت میں پڑ کر ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء میں با قاعدہ شاعر بن گئے اور زمانۂ ستر وغیبت کا پردہ چاک کر کے ظہور میں آ گئے، شاعری کی روایتی ڈگر جو پہلے دن تھی وہ آخر تک ان کی سمت سخن اور فکری جہت کو تبدیل نہیں کرسکی۔ البتہ رہ گزر خیال میں مزاجِ وقت کے تبدیل ہوجانے سے ہوا کے کچھ تازہ جھونکے انھیں ضرور ملے۔

اعجاز نعت، غزل، نظم کہتے تھے، مگر ان کے مجموعے میں نظمیں نہیں ہیں، کیونکہ وہ آج کل کے شعری منظر نامے سے مختلف ہیں، البتہ تبرکا اس میں ایک نعت ہے، اعجاز غزلوں کے شاعر تھے انھیں تغزل عزیز تھا، ان کے یہاں دردِ جگر، زخم دل، ہجر یار، شب فراق، یادِ صحبت یار کے تلخ اور رسیلے تذکرے ہیں، وہ محبت کی راہوں سے گزر کر زندگی کی سچائیوں تک پہنچے ہیں، ان کے یہاں اور غزم گویوں کے برخلاف المیہ شاعری اور حزنیہ لے کے بجائے طربیہ اور نشاطیہ رنگ بہت شوخ اور گہرا ہے۔ وہ حسن کی تلاش میں ایک سرور ازلی محسوس کرتے ہیں، ان کی غزلیں ان کے جذبات عشق اور وارداتِ قلب کا بے تکلفانہ اظہار ہیں، وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں پوری سچائی کے ساتھ تکلف وتصنع اور ظاہر داری سے بلند ہو کر بے جھجھک کہہ ڈالتے ہیں، انھوں نے وہی کہا، دل میں جو احساس اور ذہن وفکر میں جو خیال پیدا ہوا۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی بات سیدھے سادے انداز میں کہہ ڈالی ہے جس میں نہ شاعرانہ اہتمام ہے نہ تشبیہ واستعارہ کا غازہ وگلگونہ۔ رخسار غزل کا حسن نکھانے کے خیال سے مناسب الفاظ ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کا طرزِ گفتگو اور شعری اسلوب اکہرا ہے۔ نفسیاتی گہرائی اور جذباتی تموج، تہ بہ تہ خیال وتصور کی نکتہ آفرینی سے ان کا کلام کوئی خاص علاقہ نہیں رکھتا۔ سادگی، برجستگی، بے ساختگی اور معصومیت فکری ان کی غزلوں کی اساس ہے۔ وہ زندگی کے کٹھن

راستوں کو بھی خوشی اور تمکنت سے طے کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ وہ نہ غمِ جاناں سے افسردہ ہوتے ہیں اور نہ ہی غمِ دوراں انھیں شکستہ حال بناتا ہے، وہ زندگی کو اپنے ڈھب پر گزارنے کے ہنر سے واقف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ حالات کی تند و تیز آندھی بھی شمعِ وفا اور چراغِ محبت کو نہیں بجھا سکتی، انھوں نے بھرے پرے شہر میں بھی زندگی کو اکیلا محسوس کیا ہے۔ سڑکوں پر اور گلیوں میں انسانوں کی بھیڑ تو دیکھی ہے، مگر بوئے وفاداری اور رسمِ محبت سے عاری لوگوں کا ہجوم ہی انھیں نظر آیا ہے۔

نمونۂ کلام

محبت ہے اک ایسی روشنی جو کم نہیں ہوتی
ہوائے غم میں بھی شمعِ وفا مدھم نہیں ہوتی

ستم کوئی نیا ایجاد کرنے کا ارادہ ہے
ادھر ورنہ نگاہِ ناز، اے ہمدم نہیں ہوتی

برے وقتوں میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
شعاعِ مہر، گل پر آئے تو شبنم نہیں ہوتی

اگر ہوتا نہ ان کے دل میں الفت کا شرر زندہ
لب نازک پہ میری بات یوں پیہم نہیں ہوتی

ہماری آہ نے اعجازؔ دکھلایا اثر ورنہ
وہ چشمِ ناز یوں ہی بے سبب تو نم نہیں ہوتی

زندگی ساری گزاری ہے طلب میں جس کی
یہ تمنا ہی رہی وہ کبھی میرا ہوتا

تمھاری یاد میں لذت بہت ہے
کہ میرے درد میں شدت بہت ہے

وہ آئے دل کو مرے کس قدر قرار ملا
سلگتی ریت کو جوں موسمِ بہار ملا

سنور گئی مری قسمت بھی یہ گماں گزرا
جو میرے ہاتھ تری زلف کو سنوار آئے

وہی صحرا وہی پُرخار راہیں
وہی پھر جادہ پیمائی ہے، میں ہوں

کیا کیوں میں نے اظہارِ محبت
اک عالم تماشائی ہے، میں ہوں

ہر اَلم، ہر رنج، ہر غم سہہ گئے
آپ کا منھ دیکھ کر چپ رہ گئے

ہائے بے تابی کہ ان کے سامنے
ان کی باتیں ہم انھیں سے کہہ گئے

اب اپنی دعاؤں میں اثر دیکھ رہا ہوں
بدلی ہوئی کچھ ان کی نظر دیکھ رہا ہوں

بربادیِ عُشاق کے اعجازؔ نظارے
دیکھے نہیں جاتے ہیں مگر دیکھ رہا ہوں

کس کی محبت، کیسا پیار
جھوٹا ہے سارا سنسار

آجاؤ اب آؤ بھی
مان لیا تم کو خود دار

ہم ہمیشہ اشکِ غم پیتے رہے جانے کس امید پر جیتے رہے
غم نے ہر گام پہ یوں مجھ کو جھنجھوڑا اعجازؔ پہرے والا ہو کوئی جیسے جگانے کے لئے
گھروں کو لوگ کچھ اس ڈھنگ سے سجاتے ہیں کہ روح وقلب کے رنگیں قفس بناتے ہیں

اعزازؔ - اعزاز حسین عباسی اعظمی

اعظم گڑھ ان کی جائے ولادت تھی۔ تعلیم و تعلم کے بعد کٹرہ بوتراب خاں لکھنؤ میں رہتے تھے۔ شیعہ مرکزی وقف بورڈ لکھنؤ میں ہیڈ اسسٹنٹ کے عہدے پر تعینات تھے۔ ان کا کلام ہفتہ وار سرفراز لکھنؤ میں شائع ہوتا تھا۔ نوحہ وسلام کی صنف میں سہل ممتنع میں عوام کے معیار و مزاج کی رعایت کرتے ہوئے اچھا کہتے تھے۔ ان کا کلام مدرستہ الواعظین کے ترجمان ماہنامہ الواعظ لکھنؤ کے مشترکہ شمارہ فروری، مارچ ۱۹۷۱ء ص ۵۷ پر و شمارۂ اپریل ۱۹۷۱ء ص ۱۳ پر بھی راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ اس میں اعزاز عباسی اعظمی درج ہے جبکہ سرفراز محرم نمبر ۱۳۹۹ھ ص ۹۴ پر پورا نام اعزاز حسین اعظمی لکھا گیا ہے اس میں عباسی کی نسبت نہیں ہے۔ حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔

اشک جب بہنے لگیں ماہ محرم دیکھ کر محوِ حیرت کیوں زمانہ ہو نہ یہ غم دیکھ کر
رحمتیں خود اپنی نازل کرتا رہتا ہے خدا چشمِ مومن کو غم سرور میں پُرنم دیکھ کر
ہے بلا کا جذب غم میں آپ کے مولا مرے گھٹ گئے اپنے مصائب آپ کے غم دیکھ کر
واقعاتِ کربلا کو گو ہوئیں صدیاں مگر سانحہ لگتا ہے تازہ شورشِ غم دیکھ کر
شہ نے بھی دکھلا دیا انصار کو باغِ جناں شوقِ نصرت اور ان کا عزم محکم دیکھ کر
کربلا ہے اک صحیفہ اہل حق کے واسطے درسِ ایماں لیتے رہتے ہیں اسے ہم دیکھ کر
قبر میں جس دم فرشتے آئیں گے اعزازؔ کی یہ تو مومن ہے کہیں گے داغِ ماتم دیکھ کر (۱)
وارث علم لدُنّی، حامل علم الکتاب نور چشمِ مصطفیٰ، شبیر ابن بوتراب
صبر جس کا دیکھ کے ظلم وستم تھے آب آب جس کی قربانی سے چمکا دینِ حق کا آفتاب
جس کو خالق نے کہا قرآن میں ذبحِ عظیم
جان دے کر جس نے دکھلائی صراطِ مستقیم

ذکر سے جس کے کہ ہوتی ہے سدا تبلیغ دیں
اپنا مذہب حق ہے، اس کا ہوتا ہے یقیں
چھوٹنے پاتی نہیں ہے ہاتھ سے حَبل المتیں
دیتی ہیں ہم کو دعائیں فاطمہ جنت مکیں

کرتے ہیں ہم سب حسین ابن علی کا تذکرہ
اس طرح سے اجر کرتے ہیں رسالت کا ادا

حواشی:
(۱) سرفراز محرم نمبر ۱۳۹۹ھ، ۲ر دسمبر ۱۹۷۸ء رذی الحجہ ۱۳۹۸ھ ص ۹۴

اعظم خاں ثانی

ــــ ۱۷۷۱ء

اعظم خاں ثانی جہانگیر خاں کا بیٹا تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے۔ اعظم خاں ثانی بن جہانگیر خاں بن ارادت خاں بن مہابت خاں بن عظمت خاں (برادر اعظم خاں، بانی اعظم گڑھ) بن وکرم جیت سنگھ (انھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا اور جب وطن واپس آئے تو ایک نومسلم راجپوت کی لڑکی سے نکاح کرلیا) بن دھرڑی سنگھ بن ہری بنس سنگھ بن ساگر سنگھ بن چندرسین سنگھ۔

مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں کالپی کی جنگ کے بعد گوتم راج پوت خاندان کے راجہ سہد یو سنگھ کے چھوٹے بھائی چندرسین سنگھ اپنے وطن ضلع فتح پور سے منتقل ہوکر ضلع اعظم گڑھ کے موضع کھجوری مینہ نگر میں آبسے۔ انھیں چندرسین سنگھ کے بیٹے ابھیمن سنگھ عہدِ جہانگیری میں کسی ضرورت سے آگرہ گئے تو اسلام کی عالم گیر تعلیم اور اخوت وروا داری کے پیغام سے متاثر ہوکر اسلام مذہب قبول کرلیا۔ قبولِ اسلام کے بعد سلطان جہانگیر نے راجہ نادر دولت خاں کے خطاب سے سرفراز کیا اور چوبیس پرگنوں کی جاگیر انعام میں دی۔ بعد میں ۱۶۱۲ء مطابق ۱۰۱۲ھ میں دولت خاں کو دربارِ جہانگیری سے صوبہ الہ آباد سرکار جون پور کی فوجداری کے منصب پر ممتاز کئے جانے کا فرمان جاری ہوا اور ان کے منصب ہزاری میں پانچ سو کا اضافہ کیا گیا۔ یہی خاندان بعد میں ۱۶۶۵ء ر ۱۰۷۶ھ میں اعظم گڑھ کا بانی ہوا۔

اعظم خاں ثانی نے اپنے چچازاد بھائی جہاں خاں کی ریاست پر جو مدھوبن پرگنہ گھوسی سے لے کر پرگنہ اترولیہ ضلع گورکھپور(۱) تک پھیلی ہوئی تھی، قبضہ کرنا چاہا مگر ناکام رہے اوران کو جون پور میں پناہ لینی پڑی لیکن جب انگریزوں کے مقابلہ میں شجاع الدولہ نے ۱۷۶۴ء میں بکسر کے معرکے میں شکست کھائی تو اعظم خاں ثانی نے اپنی موروثی جائداد پر قبضہ کرلیا۔ یہ اعظم خاں ہندی کا شاعر بھی تھے، "سنگار درپن" ان کی ہندی کی تصنیف ہے۔ جو شاہ محمد بادشاہ دہلی کے حکم سے ۱۷۸۶ء بکرمی میں لکھی گئی (۲) ان کے درباری شاعر برجو مصرانے اعظم خاں کی تعریف میں "اعظم خانی ستاسائی" لکھی جس کے صلہ میں شاعر نے ۱۱۷۹ فصلی/۱۷۷۱ء میں راجہ کے بھائی جہاں یار خاں سے ۵۲ بگہہ زمین انعام میں پائی (۲) جہاں یار خاں کچھ ہی دن حکومت کر سکے تھے کہ ۱۷۷۳ء/۱۱۸۶ھ میں نواب اودھ کے وزیر ایلچ خاں نے ان سے یہ علاقہ چھین کر نوابی اودھ میں شامل کرلیا۔

علامہ سید سلیمان ندوی "سنگار درپن" کو ہندی زبان کی شاعری بتاتے ہیں حالانکہ یہ اودھی زبان میں ہے جو ضلع اعظم گڑھ، مئو، غازیپور وغیرہ اضلاع کے مسلم گانو میں بولی جانے والی اودھی ہے۔ ان علاقوں میں یہ زبان اصلی حالت میں بولی جاتی ہے اور اسی شکل میں اعظم گڑھ کے مغرب میں فیض آباد، سلطان پور اور لکھنؤ کے دیہات میں بھی بولی جاتی ہے بلکہ بنارس اور الہ آباد کا بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہی حال ہے یہاں تک کہ مدھیہ پردیش کے نصف شمالی حصہ میں بھی ہندو مسلمان دونوں کی بولی ایک ہے جو ذرا سے علاقائی فرق کے ساتھ اودھی ہی ہے (۳)

ڈاکٹر فخر عالم اعظمی بھی سنگار درپن کو اودھی کا بہترین نمونہ بتاتے ہوئے اعظم خاں ثانی کو اودھی کا بلند پایہ شاعر کہتے ہیں (۴)۔

حواشی:

(۱) اس وقت اعظم گڑھ ضلع نہیں بنا تھا۔

(۲) حیات شبلی سید سلیمان ندوی ص ۵۴

(۳) بزم شبلی کی آخری شمع۔ امجد غزنوی۔ ڈاکٹر فخر عالم اعظمی ص ۲۱

(۴) ایضاً ص ۲۴

اعظمؔ - علی اعظم

(۱۹۱۶ء میں حیات)

ماہنامہ العلم اعظم گڑھ (مدیر محمد مبین چریاکوٹی) کے شمارۂ اول مئی ۱۹۱۶ء کے ص ۵۳ پران کا جو کلام شائع کیا گیا ہے اس میں ان کے نام کا اندراج یوں ہے "از جناب مسٹر علی اعظم صاحب اعظمؔ بی،اے۔ایل،ایل بی۔وکیل اعظم گڑھ"

اعظم خوش فکر شعراء میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ پڑھے لکھے اور صاحب ذوق شاعر تھے۔اعظم گڑھ میں پیشۂ وکالت سے وابستہ تھے اس لئے اہل اعظم گڑھ کے مسائل ومعاش اور واقعات وحالات سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔نعت نگاری میں پایۂ اسنادر کھتے تھے اور نعتیں عشق ومستی میں لطف لے لے کر بہت اچھی کہا کرتے تھے۔ان کا کلام سہل گوئی اور سلیس نگاری کا عمدہ نمونہ ہوتا تھا۔زبان طبقۂ شرفاء سے تعلق رکھتی ہے،عموماً نعت گوشعراء جدت زبان،رفعت خیال اور بات سے بات پیدا کرنے کے فن سے قاصر رہتے ہیں لیکن اعظمؔ نے جہاں گنجائش دیکھی وہاں زبان کی سادگی اور قریب الفہم الفاظ کا جادو جگاتے ہوئے مضمون آفرینی،شاعرانہ نازک خیالی اور فنی سحر کاری پر اپنی قدرت کی گہری چھاپ ڈالی اور فکری وفنی انفرادیت کے نقوش ابھارنے کی کوشش کی، ان کی نعت نگاری کا ایک وصف سیرت نگاری بھی ہے، ان کی نعت سے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذاتی اوصاف،اخلاقِ حسنہ،حیاتِ طیبہ کی تصویر سازی،خصائصِ نبوت اور شخصیت آفرینی وعہد سازی پر روشنی پڑتی ہے،اور بہت حد تک منظوم سیرت نگاری کا حق ادا کرتی ہے۔

ذیل کی نعت شریف سے پتہ چلتا ہے کہ اعظمؔ کو زبان وبیان پر قدرتِ کاملہ حاصل تھی اور وہ اپنے خیالات سادہ وشیریں زبان میں ادا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ان کی اس پوری نعت میں کہیں ابہام،ژولیدگی یا لہجہ میں لکنت نہیں ہے اور نہ کہیں تعقید معنوی ہے اور نہ کہیں تعقیدِ لفظی کا کوئی عیب،نعتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سراپا کچھ اُن لفظوں اور تشبیہ واستعارہ کی مدد سے

بعض شاعروں نے بیان کیا ہے کہ بجائے ثواب ملنے کے آخرت کی بربادی کا اندیشہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ یقیناً رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی سیرت جمالی میں وحید المثالی کے مرتبۂ کمال پر ہیں اس کا ذکر میں سنجیدہ لفظوں میں شوخ لسانی سے گریز کرتے ہوئے ایسے ادب واحترام کے ساتھ ہونا چاہئے کہ بازاریت وسوقیت کا شائبہ وہم وگمان میں نہ آئے۔ کچھ نے شاہدان بازاری کے حسن وجمال کی طرح اس باب کو بھی اپنی نعتوں میں کھولا ہے جو سراسر حضور ختم المرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علوئے مرتبہ کے منافی ہے۔ اعظمؔ کی زیرِ نظر نعت اس عیب سے یکسر پاک ہے۔

دربارِ رسالت

دل وجاں سے طالب ہے امت نبی کی — اطاعت خدا کی، محبت نبی کی
پکار اٹھی محشر میں رحمت نبی کی — یہ امت نبی کی، یہ جنت نبی کی
نہ پوچھو کہ ہم کیسے جنت میں آئے — خدا کی عنایت، شفاعت نبی کی
فرشتے ہوئے میری چتون کے گھائل — کھنچی تھی دمِ نزع صورت نبی کی
نقیبوں سے حالِ شہنشاہ پوچھو — نبی دیتے آئے شہادت نبی کی
وہ پیوند کُرتے کے۔ پتھر شکم کے — ادھر آؤ دکھلائیں شوکت نبی کی
عوض میں دعائیں ملیں گالیوں کے — یہ عادت شفق کی، یہ ہمت نبی کی
کئے آپ فاقے نہ سائل کو پھیرا — جہاں میں ہے یکتا سخاوت نبی کی
یتیموں کے والی، غلاموں کے مولا — غریبوں کی ملجا مروت نبی کی
خراجِ زرِ ہفت اقلیم دیکھو — توکل نبی کا، قناعت نبی کی
اگر سرمۂ شوق ہو چشمِ دل میں — خدا کو دکھا دے، شریعت نبی کی
بہار ان کی توحید، بلبل خدا ہے — گلوں سے نرالی ہے رنگت نبی کی
کوئی ان کا عاشق، کوئی ان کا شیدا — فرشتوں میں ہے آدمیت نبی کی
کوئی رمزِ معراج اب تک نہ سمجھا — یہ الفت خدا کی، یہ صورت نبی کی
نظر آج آئی ہے تعبیر ہستی — ملی خواب میں مجھ کو تربت نبی کی
اُسے دل کے سجدے کا کعبہ بناؤں — ہوئی جس کو حاصل زیارت نبی کی

چھلک جائے یا رب مرا جامِ ہستی بھری ہے مرے دل میں حسرت نبی کی
کوئی مجھ سے پوچھے خدا کی حقیقت محبت نبی کی، محبت نبی کی
حجابِ دوئی خود بخود اٹھ رہا ہے محبت خدا کی ہے الفت نبی کی
جو پوچھو تو ہے یہ بڑی بات اعظمؔ زبانِ قلم اور مدحت نبی کی(۱)

حواشی:

(۱) ماہنامہ العلم ماہ مئی ۱۹۱۶ء ج ا ش ا ص ۵۳

اعظمؔ - سید اعظم حسین کرہانی

۳/جنوری ۱۹۰۸ء ــــ ۸/اکتوبر ۱۹۵۶ء

سید علی جواد زیدی نے جن کا اعظم کے خاندان سے نانہالی رشتہ ہے یہی تاریخ ولادت لکھی ہے جو خاندانی دستاویزات کی رو سے بھی درست ہے۔ ساز خاموش وغیرہ میں ۱۶/فروری ۱۹۱۱ء از روئے سند ہے جس کی تصدیق اعظم کے فرزند و مرتب ساز خاموش سید اعظم عباس شکیل کرہانی نے بھی راقم سے ۱۷/جولائی ۲۰۱۳ء کو بائی موبائل اپنی بات چیت میں کی۔

آپ کا تعلق موضع کرہاں کے ایک ایسے صاحب علم رئیس زمیندار گھرانے سے تھا جس میں فارسی و اردو کے کئی اچھے شاعر، شعر و ادب کی روایات قائم کر چکے تھے۔ والد کا نام سید محمد اختر تھا، مشہور صاحب طرز شاعر شمیم کرہانی کے بڑے بھائی، ممتاز ادیب اور مشہور افسانہ نگار علی عباس حسینی کے حقیقی بھانجے تھے۔ تعلیم کے سلسلے میں لکھنؤ گئے اور وہیں شاعری کی تحریک پیدا ہوئی۔ ۱۹۲۳ء سے باقاعدہ غزل کہنے لگے لیکن اپنی ادبی زندگی کا سرگرم آغاز ۱۹۲۹ء سے کیا، وہ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں

"میں لکھنؤ سے ایک ادبی رسالہ "ادب" کے نام سے نکالا، اس سے پہلے کوئی صحافتی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن ادبی صلاحیت اور علمی ذوق فطرت میں موجود تھا، جس کو چمکانے کے لئے بزرگ رفقائے کار کا ایک اچھا حلقہ مل گیا، اس لئے اس کو ایک اعلیٰ معیار پر تین سال تک شائع کیا۔ ۱۹۳۲ء میں عام اقتصادی تباہی اور میری بیماری کی شدت نے مل کر اس رسالہ کو بند

کرادیا۔۔۔"ادب" کی سہ سالہ زندگی کا زمانہ میرے خاص ادبی شغف کا دور رہا۔ ۱۹۲۹ء سے میں نے اپنا کلام صفیؔ لکھنوی کو دکھانا شروع کیا جس کا سلسلہ ۱۹۳۱ء تک قائم رہا۔ ۱۹۳۱ء میں آرزوؔ لکھنوی کلکتہ سے لکھنؤ آ کر مقیم ہوئے اور "ادب" کی نگرانی قبول کی۔ مکان سے قریب ہی موصوف کا قیام بھی ہوا، سہولت کی وجہ سے اپنا کلام آپ کو دکھانے لگا، جس کا سلسلہ ۱۹۳۴ء تک قائم رہا، اس کے بعد آپ لکھنؤ سے پھر کلکتہ تشریف لے گئے اور اس وقت سے نہ کسی کو کلام دکھاتا ہوں اور نہ اتنا کہتا ہی ہوں کہ کسی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔"(۱)

اعظم نے غزل، نظم، گیت، مثنوی، قصیدہ، سلام، نوحہ، مرثیہ، رباعی ہر صنف کو ہاتھ لگایا اور کامیابی کے ساتھ ان کے ادبی وفنی تقاضوں کو پورا کیا۔ انھوں نے مذہبی شاعری بھی بہت کی تھی مگر افسوس کہ وہ محفوظ نہ رہ سکی کچھ نوحے اور قصائد بہر حال ان کی بیٹیوں کے پاس لکھے ہوئے ہیں ویسے تو وہ بنیادی طور پر صحافی وشاعر تھے لیکن ان کے بیٹے سید اعظم عباس شکیل کرہانی نے ان کے ایک آدھ افسانے بھی ماہنامہ آج کل دہلی کے بہت پرانے شماروں کی ورق گردانی میں پائے تھے۔ انھیں قدرت کی طرف سے ہوش وخرد چھین لینے والی آواز ملی تھی آپ کو کلاسیکی موسیقی سے بھی وابستگی تھی۔ گھر کی روایت اور گردوپیش کی علمی وفنی قدروں سے اپنے علم ووجدان کے لئے غذا فراہم کی تھی۔ ان کی شاعری پر ان سب کا تاثر چھایا ہوا ہے۔ ان کے کلام میں ان کی آواز کا رس، نغمے کا لوچ، اور موسیقیت کا جادو رچ بس گیا تھا، غزلیں کچھ تو اپنی افتادِ طبیعت اور کچھ استاد آرزو لکھنوی کے اثر سے سادگی اور صفائی کے ساتھ کہتے تھے، لیکن ان کی نفاست، اور تغزل کی تمام نزاکت سمودینے کی کوشش میں رہتے تھے۔ عصری رجحان اور ادب کی بدلتی ہوئی قدروں سے بیگانہ نہیں تھے۔ صحت مند تجربوں، جدید نہجوں، لہجوں، اسلوبوں اور نئے زاویوں کو قبول کر لینے میں انھیں کوئی تکدر اور پس وپیش نہیں ہوتا تھا۔ کلام رواں، سبک اور عام فہم ہوتا تھا۔ خیال کی کوئی پیچیدگی، بیان میں کوئی ابہام، اور لہجے میں کوئی الجھاؤ نہیں رہتا تھا۔ اس کی کوشش میں بعض مقامات پر ان کے یہاں راست بیان کی خشکی بھی پیدا ہوگئی ہے، اور شعریت جس حسن مجبوب کی طالب ہوتی ہے اُس کا رکھ رکھاؤ نظر نہیں آتا۔ شعر میں ابہام کا نہ ہونا ہی اس کا کمالِ فن نہیں ہے بلکہ بیان میں اس کی طرفگی

کا ہونا بھی ضروری ہے، جسے تہہ داری اپنی آغوش میں تربیت دیتی ہے۔خیالات وجذبات میں ہم آہنگی ہونے کے ساتھ لفظ کی مناسبت شعر کے افسوں کو بڑھا دیتی ہے۔ یبوست کا یہ عیب اعظم کی شعروسخن سے اس بے التفاتی کا نتیجہ بھی ہے جو آخر وقت میں نثر وصحافت سے زیادہ شغف رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی۔ اگر انھوں نے شاعری سے اپنے عہد و پیمان کو کچھ اور نباہا ہوتا تو ان کی شاعری کا افق کچھ اور روشن اور وسیع ہوگیا ہوتا۔ دیہی طرزِ معاشرت کی معصومیت اور خاندانی وضع وشرافت سادہ لوحی کا جو ہر لکھنؤ کے ہنگاموں میں بھی انھوں نے نہ صرف یہ کہ بچائے رکھا بلکہ اپنے اکتسابی شعور اور انجذابی صلاحیتوں کی مدد سے اس جوہر کو نئی آب و تاب دے کر اور بھی چمکا دیا تھا، ان کی نثر ہو، یا نظم ہر جگہ ان کی فطرت کا اپنا پن برقرار رہتا ہے، کوئی تصنع ،تکلف اور نمود ونمائش کا جذبہ ان کے یہاں نہیں ہے۔ اعظم کا کلام لکھنؤ کے بدلتے ہوئے لہجے، رواج پاتے ہوئے رجحان، اور تشکیل پاتے ہوئے پیمانے کی نمائندگی کرتا ہے، انھوں نے ادب وشعر کی دنیا میں مختصر سی عمر پائی لیکن اپنی صلاحیتوں سے لازوال اثر چھوڑا۔

اعظم ایک کامیاب اور صاحب صلاحیت صحافی تھے، انھوں نے لکھنؤ سے ماہوار ادبی جریدہ "ادب" ۱۹۲۹ء میں شائع کر کے دھوم مچادی تھی۔اس کے بعد روزنامہ سرفراز لکھنؤ کی ادارت قبول کی، پھر ہفتہ وار "الہادی" جونپور کے مدیر ہوئے۔ بعد میں اپنا ذاتی اخبار استقلال اور روشنی نکالا۔ ۱۹۵۶ء میں ہفتہ وار "وطن" کا اجراء کیا، اس کی دوسری یا تیسری اشاعت ہونے والی تھی کہ ابدی نیند سو گئے۔

ان کے کلام کا ایک مجموعہ "ساز خاموش" چھپ چکا ہے، بہت سا کلام اور مضمون تشنہ اشاعت پڑا ہے۔علی جواد زیدی جو اعظم کے علمی گھرانے کے صاحب قلم نواسے ہیں، اظہار افسوس کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ "اب ان کی تحریروں کی جامعیت کا، ان کی نثر کے متوازن اور سنجیدہ لب ولہجہ کا، ان کے قلم کی بے خوفی اور بے باکی کا، خاص خیالات سے وابستگی کے باوجود مرنجاں مرنج طرز نگارش کا لطف اٹھانے والے بھی کم ہوتے جارہے ہیں" (۲) اس کے بعد پھر لکھتے ہیں "اعظم اُس دور کے نمائندے ہیں جب لکھنؤ کی ادبی اور صحافتی مرکزیت مسلم تھی اور اس مرکزیت کو بنائے رکھنے میں ان کی کوششوں کا بھی حصہ رہا ہے" (۳)

جوش ملیح آبادی ان کی صحافت کے بارے میں رقم طراز ہیں

"اعظم صاحب بہت اچھے ادبی ذوق کے بھی مالک ہیں اور ان کی نثر تو ایسی ہوتی ہے کہ انھیں بجاطور پر صاحب طرز کہا جاسکتا ہے، میرے نزدیک وہ اخبار بہت جواں مرد ثابت ہوگا جو ان کی سیاسی وادبی خدمات سے فائدہ اٹھائے گا" (۴)۔

مسعود حسن رضوی ادیب کا بیان ہے کہ" وہ سادہ اور پاکیزہ اردو لکھتے ہیں اور اس میں ایسا ایسا دردبست اور زور ہوتا ہے جو شاذ ہی دیکھنے میں آتا ہے۔۔۔۔اعظم کو اپنے قلم پر غیر معمولی قدرت بھی حاصل ہے، ان کی تحریریں محتاط بھی ہوتی ہیں منطقی فکر، متوازن قوت فیصلہ، اور سلجھے ہوئے اور شستہ طرز اظہار کی بدولت ان کا شمار کامیاب صحافیوں میں ہوتا ہے۔(۵)

اردو کے ان مقتدر ادیبوں اور شاعروں کے تبصروں کی روشنی میں اگر اعظم کرہانی کی نثری وصحافتی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو بڑے اچھے نتائج برآمد ہوں گے اور اردو کی نثر وصحافت کی تربیت میں جن اسالیب اور نہج ووضع کا حصہ رہا ہے ان کو جانچنے، پرکھنے میں بہت مدد ملے گی۔

نمونۂ کلام

اعظم یہ تو رستہ ہے ایک ملا اک چھوٹا ہے
جان دے کر مل گئی جو اے خضر وہ حیاتِ جاودانی اور ہے
آپ تنہا نہیں کہ آپ کے ساتھ کاروانِ شباب جاتا ہے
محبت کے قابل جفا ہے تمہاری محبت مری پیش کردو سند میں
بس اک دل ہی ساتھی تھا وہ ساتھ بھی چھوٹ گیا
کیا اندھیرے میں ازل کے تھا اگر جلوۂ رنگینِ آب وگل نہ تھا
حقیقت کب بدل سکتی ہے لفظوں کے بدلنے سے دہکتی آگ کو آبِ رواں کہنے سے کیا حاصل
محو رہتے ہیں تصور کے پری خانوں میں تیرے دیوانوں کو الجھن نہیں زندانوں میں
بارہا ہاتھ بڑھا، رک گیا لیکن بڑھ کر پھول توڑے نہ گئے ہم سے گلستانوں میں
بیدار ہونے والی ہے انسانیت کی روح گھبرا نہ انقلاب کے آثار دیکھ کر

تنظیم سے اجزا کی تحریک ہے وابستہ / موجیں جنھیں کہتے ہیں قطروں کی روانی ہے
جب سے چپ لگ گئی مجھ کو وہ ستمگر ہے اداس / میری باتوں میں اثر تھا مجھے معلوم نہ تھا
کسی نے سیکھ لی طرزِ فغاں مری تو کیا / وہ دل میں سوز، طبیعت میں وہ گداز کہاں
آوارہ ہی رکھنا ہے تو دیوانہ بنادے / یوں اُٹھ کے تری بزم سے جاؤں گا کہاں اور
نبھ گئی ساری زندگی ان کی ہماری دوستی / ان کو نہ اعتماد ہو ہم کو تو اعتماد تھا
کبھی دل ڈھونڈھنے لگتا ہے اس آوازِ وسعت کو / زمیں ہوتی جہاں کوئی، نہ کوئی آسماں ہوتا
پرتو ہیں ہراک آج پہ گزرے ہوئے کل کے / میں آئینہ خانے سے کہاں جاؤں نکل کے
کٹی ہے عمر مری جس سیاہ خانے میں / تم اس مکاں میں بسر ایک رات کر نہ سکے
کیا عجب صبحِ ازل کی یہ شناسائی ہو / جوبھی صورت ہے وہ اک طرح سے پہچانی ہے
ہم مسافر ہیں، بڑھاؤ نہ محبت ہم سے / کیا خبر جاکے اُدھر کبھی پھیرا ہوگا
افسانۂ محبت جو لکھ گیا تھا رو میں / اب خود ہی رورہا ہوں پڑھ کر کہیں کہیں
یہی موہوم تھی ہستی، یہی قیدِ تنہائی / قفس سے چھوٹ کر چشم وچراغ آشیاں ہوتا
بشر پہ سرِ وجودِ عالم اسی جہت سے عیاں نہیں ہے / کہ ابن آدم طلسمِ ہستی کا راز ہے، راز داں نہیں ہے
یہاں تڑپتی ہے روحِ آدم، سکونِ خاطر یہاں نہیں ہے / مقامِ سعی وعمل ہے دنیا، نشاط گاہِ جناں نہیں ہے
منارۂ روشنی بنے گی، ہراک نئے راہ رو کی خاطر / جوکام آجائے جستجو میں، وہ زندگی رائگاں نہیں ہے(۶)

حواشی:

(۱) بحوالہ دیباچہ، ساز خاموش مرتبہ اعظم عباس شکیل فروری ۱۹۸۱ء ص ۱۳
(۲) علی جواد زیدی۔ مقدمہ ساز خاموش ص ۱۸
(۳) ایضاً ص ۱۹
(۴) ایضاً ص ۲۱
(۵) ایضاً ص ۲۱
(۶) حالات قصیدہ نگارانِ اتر پردیش، علی جواد زیدی طبع اول ۱۹۷۸ء ص ۸۲، وطبع دوم ۱۹۸۳ء ص ۹۵، ساز خاموش، مرتبہ اعظم عباس شکیل

اعظمی - حضرت مولانا عبدالمصطفیٰ گھوسوی

سنہ ۱۹۱۴ء —— ۱۵؍ مئی سنہ ۱۹۸۶ء؍ ۵؍ رمضان سنہ ۱۴۰۶ھ

علمائے اہل سنت میں آپ کے علم وخبر، اخلاق وسیرت، درس وتدریس، وعظ وخطابت، خدا ترسی ومنکسر المزاجی، تصنیف تالیف اور دیگر محاسن اخلاقی وروحانی اور فضائل ومناقبِ انسانی کی بڑی دھوم رہی۔ جس میدانِ علم کی طرف گل گشت کی اس کو سرسبز وشاداب بنا ڈالا۔ بڑی صلاحیتوں اور خداداد بصیرتوں کی حامل شخصیت رکھتے تھے۔ جہاں رہے اور جس حال میں بھی رہے علم ودانش اور دین ودیانت کے چراغوں کی لَو دھیمی نہ ہونے دی۔ علی گڑھ، اجمیر اور بریلی سے مشرقی درسیات کی دولت سمیٹی اور علومِ دینیہ میں اپنی محنت شاقہ اور تکرار ومطالعہ سے زبردست تبحر حاصل کیا، آپ کی علمی مجلسیں اور درس کی ساعتیں پُراز معلومات اور عصری تناظر کی رعایت سے ہوتی تھیں۔ اس لئے اہل علم وخبر کے علاوہ عام مسلمانوں کے لئے بھی بے پناہ مفید اور سبق آموز ہوا کرتی تھیں۔ آپ کی تقریروں میں زورِ خطابت اور لذتِ تقریر تو ہوتی ہی تھی سیکڑوں اوراقِ پارینہ اور علوم سینہ کے عطر کی خوشبو بھی رچی بسی رہتی تھی۔ جن لوگوں نے ان کی تقریر سننے کی سعادت حاصل کی ہے وہ اس کے معترف ہیں کہ اعظمی صاحب کے لبوں سے علم وحکمت اور اسرارِ قرآنی واحادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پھول جھڑتے تھے اور چشم ورخسار سے خدا کا نور برستا تھا۔ درسِ نظامی اور عالمیت وفضیلت کے نصاب پر آپ کو کامل دسترس ہونے کے علاوہ تفہیم کا ایسا ملکہ حاصل تھا کہ کج فہم اور غبی ذہن کا طالب علم بھی نشاط وانبساط محسوس کرنے لگتا تھا اور درس سے اٹھنے کی طبیعت نہیں چاہتی تھی۔ آپ کے فیض درس سے بہت سے مدارس وجامعات نہال وشادکام ہوئے۔ آپ کا شمار ان اکابر علمائے درس میں ہوتا ہے جن کے تشریحی پہلو درہائے بستہ کو وا کرتے ہیں۔ اور علوم پر حاوی ہونے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ ان کی درسگاہ سے ایسے ایسے صاحبانِ علم وفکر اور خدایانِ شعور دانش اٹھے جنھوں نے مسلمانوں کے عہدِ رفتہ کی ساری علمی سرگرمیوں اور بزمِ دوشیں کی بساط رنگیں کی تمام رونقوں کو زندہ کردیا۔ یہ انھیں جیسے بزرگوں کا فیض ہے کہ تہذیب مغرب کی

آندھیوں کی تیزی بھی محراب ومنبر اور خانقاہ ومدرسہ کی شمعوں کو اپنی طاغوتی فراوانی وسائل کے باوجود بجھا نہ سکی اوران کی آہ نیم شبی سے قرطاس وقلم کے مقدر جاگ اٹھتے ہیں۔

اعظمی صاحب نے مبارکپور میں بھی اپنی مسندِ درس بچھائی تھی اور دارالعلوم اشرفیہ کے درودیوارقرآن واحادیث اورعلومِ دینیہ اورمشرقیہ کےنور سے جگمگا اٹھے تھے۔اہل مبارکپور میں انھیں بہت زیادہ اثرونفوذ حاصل ہو چکا تھا مگر سیاست کی کرامت نے ایسا ظہور فرمایا کہ اس سراپا علمی شخصیت کو دردِ ہجرت سے تڑپنا ہی پڑا۔اہل مبارکپور کے لئے مقامِ حیرت ہے کہ خونِ صد ہزار انجم سے علم کی جو صبح درخشاں پیدا ہوئی اس کی ساری افق تابی کیسے صرف ایک ہی رنگ،ایک ہی جلوہ اور ایک ہی شخصیت سے منسوب ہو کر رہ گئی ہے۔علم وعرفان اورشعور ووجدان کے گہرے رنگوں کی یکجائی سے اورسادات کچھوچھہ کے فیضان نظر اورفغان درویشی کی برکتوں سے اشرفیہ کی علمی شہرت کی جوست رنگی دھنک اہل سنت والجماعت کے دینی منظرنامے پر نمودار ہوئی اس کے سارے رنگ اوراس کی ساری جلوہ آرائیاں کیسے ایک نام سے معنون ہو کر رہ گئیں۔ہم عصر وہم درس علماء ادب واحترام کا پاس ولحاظ کرسکتے ہیں،مگر علمی وتعلیمی اعتبار سے ہم قبیلہ ہونے کی نسبت نہ کسی دوسرے اہل علم کو اپنے ہی ہم مجلس کا ذہنی غلام بنا سکتی ہے اور نہ درس میں ہم جماعتی کی قدر اشتراک کسی طرح کی برتری کا نفاذ کرنے والے منشور کامحکوم کسی دوسری عظیم علمی ودینی شخصیت کو بنا سکتی ہے۔یہ کام تلامذہ کے مسند درس وافادہ پر متمکن کرنے کے بعد آسان تر ہوسکتا ہے۔اعظمی صاحب بھی چراغ بن کر تنہا فصیل شب پر شبخون مارنے والے تیز جھونکوں کا مقابلہ کب تک کرتے۔آخر انھیں بھی اس گلستاں سے جانا ہی پڑا۔

اعظمی صاحب کی شخصیت،علمیت ومشیخیت،ظاہر وباطن اورشریعت وطریقت کا سنگم بن کررہی۔ان کی نگاہِ علم کے سامنے منطق وفلسفہ،ہیئت وفلکیات،لغات وجغرافیہ،ریاضی واقلیدس،قواعد وانشاء،عروض وبلاغت،بحر وقوافی،علم معانی وعلم لسانی کی خوش ادائیاں بھی تھیں اورتصوف ومعرفت کی سرمستیاں اورخودفراموشیاں بھی تھیں مگر وہ سب اپنے حدود اربعہ میں ایک توازن اور اعتدال کے ساتھ تھیں۔

عشق ومعرفت،جوش ترنم اورحسن غنا کی آغوش میں پرورش بھی پاتے ہیں اورتربیت

وتہذیب بھی حاصل کرتے ہیں۔اعظمی صاحب کی طبیعت کے اسی خاصے نے انھیں شعروشاعری کا بھی دلدادہ بنادیا تھا۔ وہ ایک شعور دیوانگی سے آشنا ذہن وذہانت کے مالک ہیں۔ان کی روحانی بھوک شعری لحن کے زیر وبم اورصوت وآہنگ کے پیچ وخم سے تسکین پاتی ہے۔انھوں نے ۵رستمبر ۱۹۸۰ء کے اپنے کرم نامے میں راقم کولکھا تھا کہ ”میں نے نعت اورغزل کی صنف میں بہت کم اشعار کہے ہیں۔افسوس کہ میری بیاض ضائع ہوگئی۔نعت کے کچھ اشعار میری تقریر کی کتابوں میں درج ہیں۔شاعری میں کچھ دنوں بیدل بدایونی سے جودھپور میں اصلاح لی تھی“۔

اعظمی صاحب کوتصنیف کا بھی شوق تھا اور انھوں نے اس کام کوعبادت سمجھ کرنہایت اخلاص وللٰہیت کے جذبات سے مملو ہوکر کیا۔ان کی کتابیں وقت وحالات کے تقاضوں اورسماجی تبدیلیوں، مسلمانوں کے مزاج میں پیدا ہونے والے تغیرات کی مناسبت سے ہیں۔انھوں نے اپنی کتابوں اورقلم کے نقوشِ تحریر کے ذریعہ اسلامی مزاج، اسلامی اقدار، اسلامی ماحول، اسلامی شخصیت کی تشکیل اور دینی ومذہبی رجحانات کوقوی کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ان کی عبارتوں میں تاثیر، روانی، برجستگی اور شگفتگی ہے۔ان کی عبارتیں سادہ وسلیس اورعوامی سطح کی مناسبت سے ہم آہنگ ہیں مگر دل نشیں ہیں۔اور پیرایۂ بیان دلچسپ ہے۔انھوں نے پرورشِ لوح وقلم کرکے اہل سنت والجماعت پر لگے الزام کا داغ دھونے کی کوشش کی ہے کہ اس جماعت کے آرام طلب، تعیش پسند اور تساہل آشنا علماء اپنے عقیدت مندوں کے حصار سے باہر نکل کر خونِ دل میں انگلیاں ڈبونے کے حوصلے اورنوشتۂ دیوار بننے والی تحریروں کی صلاحیت واہلیت سے یکسر عاری ہیں۔ان کے خلوت کدے، صریر خامہ کی نوائے سروش سے خالی ہیں۔ان کا سارا رقص بسمل اورانسانی سکون کو برباد کرنے والا شور وغوغا، صوتی آلودگی سے ذہنی اذیت پیدا کرنے والا تقریری ہنگامۂ محشر صرف اسٹیج تک ہے۔ان کی علمیت کا بھرم قلم کوجنبش نہ دینے سے ہی قائم ہے۔اعظمی صاحب نے حال کے تناظر میں ایسے لٹریچر کا انبار لگادیا جس سے اسلام کی تعلیمات اور دینی واخلاقی اقدار کوفروغ حاصل ہونے میں کافی مدد ملی۔انھوں نے زمانہ کے تقاضوں کومحسوس کرکے جوکتابیں تصنیف کی ہیں ان کو پڑھنے کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اپنے نوکِ قلم سے قوم وملت کی ٹھنڈی ہوتی

ہوئی ذہنی راکھ کو اس لئے کریدا ہے کہ اس میں جو چند چنگاریاں بچی ہیں انھیں سے قوم میں حرارت دینی پیدا کرنے کا کام لیا جائے۔

اعظمی صاحب کی تصنیفات کے نام یہ ہیں: (۱) سیرت المصطفیٰ (۲) کرامات صحابہ (۳) نوادرالحدیث (۴) اولیاء رجال الحدیث (۵) روحانی حکایات اول ودوم (۶) معمولات البرار (۷) مشائخ نقشبندیہ (۸) قیامت کب آئے گی (۹) ایمانی تقریریں (۱۰) نورانی تقریریں (۱۱) حقانی تقریریں (۱۲) قرآنی تقریریں (۱۳) عرفانی تقریریں (۱۴) موسمِ رحمت (۱۵) جنتی زیور (۱۶) بہشت کی کنجیاں (۱۷) خطراتِ جہنم (۱۸) سامانِ آخرت (۱۹) عجائب القرآن (۲۰) غرائب القرآن۔

اعظمی صاحب کو قدرت نے شاعرانہ مزاج، ادبی شعور کی بالیدگی، فنی باریکیوں کی آگہی کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ وہ اسلوبِ سخن پر مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔ فکر وخیال کی رعنائیاں، لفظ واستعارہ کی شادابیاں، نغز بیانی و پُرگوئی اور زودنویسی کی ساری خوبیاں ان کے تصرف کے لئے باندی بنادی گئی تھیں اسی لئے ان کے کلام کا وزن شعروادب کی میزان میں بھاری لگ رہا ہے۔ انھوں نے اعتقادی شاعری کو جہانِ تازہ کی نمود کا پتہ دیا ہے۔ روایت وتقلید سے مثبت انحراف مولانا کی شاعری کا روشن پہلو ہے۔ دنیا کے سب سے بہتر انسان کی نعت کے لئے پیرایۂ بیان بھی نہایت اعلیٰ بے پناہ پاکیزہ اور انتہائی ادبی معیار کا ہونا چاہئے۔ کہیں سے فقر لفظی اور ژولیدہ لسانی کا عیب نظر نہیں آنا چاہئے تبھی نعت نگاری اور دین اسلام کے روشنی کے مناروں کی توصیف کا حق ادا ہو سکے گا۔ اعظمی صاحب نعت ومنقبت کے لئے جب محوِ فکر ہوتے ہیں تو اس عالم میں بھی ان کے شعور کی پختگی اور شعری احساس کی بیداری اپنے مرکز ثقل سے علیحدہ نہیں ہوتی۔ ان کے ذہنی افق کی وسعت نئے ابعاد اور پھیلتے حدود اربعہ کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ان کے یہاں لفظوں کی معصومیت ان کے سادہ لوح عاشق صادق ہونے کا انداز ہر مقام اور ہر حال میں اپنے رنگ بہار اور حسن جمال لئے ہوئے ہے اور اس دولت سے وہ کہیں بھی محروم نہیں ہے۔ شاعری احساسِ جمال اور ذوقِ حسن کی لفظی رونمائی اور ادبی اظہار کا نام ہے اس کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ اعظمی صاحب کی شاعری

ہمارے جذبات عقیدت کو ہی متحرک نہیں کرتی بلکہ وہ ہمارے شعور اور درونِ نفس کی خفیہ صلاحیتوں کو جگانے کا ذریعہ بھی ہے۔ ان کا کلام ان کی شخصیت کا نگارخانہ اور اشعار ان کے ذوق وشوق کی مستی وکیفیت کا آئینہ خانہ ہیں۔

دعا

اے خداوند جہاں، اے کردگار تری رحمت کا ہوں میں امیدوار
گوکہ میں اک بندۂ ناکارہ ہوں بے کس ومجبور ہوں، بے چارہ ہوں
تری رحمت سے مگر دل شاد ہوں نعمتوں کے باغ کا شمشاد ہوں
تونے ایسا فضل مجھ پر کردیا رحمتوں سے میرا دامن بھردیا
میری قسمت اس طرح نوری ہوئی سیرۃ ختم الرسل پوری ہوئی
کس زباں سے شکر تیرا ہو ادا میں ترا بندہ ہوں،تو میرا خدا
اے خدا جب تک رہیں لیل ونہار دوجہاں میں ہو یہ میری یادگار
غنچۂ امید کھل کر پھول ہو نور کی سرکار میں مقبول ہو
آنکھ روشن پڑھ کے ہو، دل سیر ہو اور میرا "خاتمہ بالخیر" ہو
ہوں مرے ماں باپ یا رب جنتی ازطفیل "رب ھب لی امتی"
میرے سب استاذ بھی احباب بھی جنت الفردوس پاجائیں سبھی
کر دعائے اعظمی یا رب قبول بہرِ اصحابِ نبی، آلِ رسول(۱)

حمد باری تعالیٰ

پوچھا گل سے یہ میں نے کہ اے خوبرو تجھ میں آئی کہاں سے نزاکت کی خو
یاد میں کس کی ہنستا مہکتا ہے تو ہنس کے بولا کہ اے طالب رنگ وبو
اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ

عرض کی میں نے سنبل سے اے مشکبو صبح کو کرکے شبنم سے تازہ وضو
جھوم کر کون سا ذکر کرتا ہے تو سن کے کرنا لگا دم بدم ذکر ہو
اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ

جب کہا میں نے بلبل سے اے خوش گلو	کیوں چمن میں مہکتا ہے تو چار سو
دیکھ کر گل کسے یاد کرتا ہے تو	وجد میں بول اٹھا وحدہٗ وحدہٗ
اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ

جب پپیہے سے پوچھا کہ اے نیم جاں	یاد میں کس کی کہتا ہے تو "پی کہاں"
کون ہے پی ترا کیا ہے نام ونشاں	بول اٹھا بس وہی، جس پہ شیدا ہے تو
اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ

میں نے قمری سے کی جاکے یہ گفتگو	گاتی رہتی ہے کوکو تو کیوں کو بہ کو
ڈھونڈھتی ہے کسے، کس کی ہے آرزو	بولی سن کے میرا نغمہ ہے حق سرّہٗ
اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ

آکے جگنو جو چمکا مرے روبرو	عرض کی میں نے اے شاہد شعلہ رو
کس کی طلعت ہے تو، کس کا جلوہ ہے تو	یہ کہا جس کا جلوہ ہے ہر چار سو
اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ

میں نے پوچھا یہ پروانے سے دو بدو	کس لئے شمع کی لَو پہ جلتا ہے تو
شعلۂ نار میں کس کی ہے جستجو	جلتے جلتے کہا اس نے یا نورہٗ
اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ

اعظمیؔ گرچہ بے حد گنہ گار ہے	مجرم وبے عمل ہے خطاکار ہے
حق تعالیٰ مگر ایسا غفار ہے	اس کی رحمت کا نعرہ ہے لاتقنطوا
اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ اَللّٰہُ

اے مرے معبود حق اے کردگار	سارے عالم کا تو ہے پروردگار
فضل سے ترے ہی اے رب کریم	گلشن ہستی کی ہے ساری بہار
کردیا مجھ کو غلامِ مصطفیٰ	ہوگیا میں دوجہاں کا تاجدار
تیرے سجدوں نے وہ رفعت دی مجھے	رفعتِ افلاک ہے مجھ پر نثار
خاکِ بوس طیبہ ہے یہ اعظمیؔ	حشر میں یا رب نہ ہو یہ شرمسار

نگارِ طیبہ ازل سے ہے آرزو تیری | مرے وجود کا مقصد ہے جستجو تیری
ترا سکوت ہے لطف وکرم کی اک دنیا | نسیم خلد کی جنت ہے گفتگو تیری
نسیمِ خلد نے مانگی ہے بھیک خوشبو کی | کھلی مدینہ میں جب زلف مشکبو تیری
گناہ کرکے بھی امیدوارِ جنت ہوں | سنا ہے جب سے کہ لطف وکرم ہے خو تیری
یہ حالت ہے، اب سانس لینا گراں ہے | مگر آپ کا نام وردِ زباں ہے
وہ فانوسِ فطرت ہیں دونوں جہاں میں | اُنھیں کی تجلی یہاں ہے، وہاں ہے
کفِ دستِ رحمت میں ہے سارا عالم | زمیں آپ کی، آپ کا آسماں ہے
نہ پوچھ اعظمیؔ منزلِ سربلندی | مرا سر ہے، محبوب کا آستاں ہے
حاجیو اب گنبدِ سرکار تھوڑی دور ہے | رحمتِ حق کا علمبردار تھوڑی دور ہے
ہے خریدارِ گنہ رحمت کا تاجر جس جگہ | عاصیو! وہ مصطفیٰ بازار تھوڑی دور ہے
عشق ومستی میں قدم آگے بڑھا کر دیکھ لو | گنبدِ خضریٰ کا وہ مینار تھوڑی دور ہے
نعمتِ کونین ملتی ہے گدوؤں کو جہاں | وہ محمد سا سخی دربار تھوڑی دور ہے
وہ شہیدانِ محبت کی مبارک خواب گاہ | وہ بقیع پاک خلدآثار تھوڑی دور ہے
چل پڑا ہوں گرتا پڑتا سوئے طیبہ المدد | اے مسیحا! اب ترا بیمار تھوڑی دور ہے
دشتِ طیبہ ہے، یہاں چل سر کے بل اے اعظمیؔ | مصطفیٰ کا جنتی دربار تھوڑی دور ہے
مبارک! آگئے مکہ مدینہ دیکھنے والے | خدا کا گھر، رسولِ حق کا روضہ دیکھنے والے
حریمِ کعبہ میں مستوں کا میلہ دیکھنے والے | مزارِ مصطفیٰ پر حق کا جلوہ دیکھنے والے
لپٹ کر رونے والے کعبۂ جاں کے غلافوں سے | نبی کے در پہ رحمت کا برسنا دیکھنے والے
جمالِ روضۂ اقدس بسا ہے ان کی آنکھوں میں | حقیقت میں ہیں یہ جنت کا نقشہ دیکھنے والے
کمالِ شوق سے ہم ان کو سوسو بار دیکھیں گے | بڑے پیارے ہیں یہ مکہ مدینہ دیکھنے والے
ملا ہے اعظمیؔ مکہ مدینہ سے شرف ان کو | نگاہِ دل سے دیکھیں، ان کا رتبہ دیکھنے والے
مفت بھی لیتے نہیں عاشق، حیات خضر کو | خالی جینا اور ہے مر مر کے جینا اور ہے
جنتی پھولوں کی خوشبو تو مسلم ہے مگر | نکہتِ گل اور ہے ان کا پسینہ اور ہے

اعظمیؔ تھی نوح کی کشتی میں عالم کی نجات　　اہلِ بیتِ پاک کا لیکن سفینہ اور ہے
فراقِ یار میں مرمر کے جینا　　"یہی بامِ حقیقت کا ہے زینہ"

منقبت درشان حضرت بدرالطریقۃ صدرالشریعۃ علامہ امجد علی صاحب قبلہ علیہ الرحمۃ

آہ اے صدرشریعت صدر بزم اہل دیں　　آہ اے بدرِ طریقت، مردِ میدانِ یقیں
آہ اے غمخوارِ ملت، عالمِ شرعِ مبیں　　آہ اے احمدرضا خلد آشیاں کے جانشیں
سرزمینِ ہند رحلت سے تری مہجور ہے
اب جہانِ زندگی بے کیف ہے بے نور ہے

آہ اے مسند نشینِ مسندِ علم وعمل　　لے گئی آغوشِ رحمت میں تجھے تیری اجل
ڈھونڈ کر لائیں کہاں سے ہم کوئی تیرا بدل　　تیری رحلت سے نظامِ سنیت میں ہے خلل
جنت الفردوس میں تیرا بسیرا ہوگیا
یہ جہانِ رنگ وبو لیکن اندھیرا ہوگیا

آہ گلشن میں گلوں کی حکمرانی کیا ہوئی　　گلستاں میں بلبلوں کی نغمہ خانی کیا ہوئی
آسماں والو! قمر کی ضوفشانی کیا ہوئی　　اے زمینِ ہند تیری شادمانی کیا ہوئی
ذرہ ذرہ کس لئے عالم کا شیون جوش ہے
ہائے کس عالم کی میت آج زیبِ دوش ہے

آہ رخصت ہوگیا وہ فخرِ دیں، فخرِ وطن　　کون سینچے گا بھلا احمدرضا خاں کا چمن
مٹ گئی ہندوستاں سے درسگاہِ علم وفن　　آہ سونی ہوگئی اب فضلِ حق کی انجمن
خاک میں اب یادگارِ بزمِ خیرآباد ہے
آپ اے دستِ اجل فریاد ہے فریاد ہے

مجلسِ تدریس کی نکتہ بیانی اب کہاں　　آہ بحرِ معرفت کی وہ روانی اب کہاں
میکشو! پیرِ مغاں کی ارغوانی اب کہاں　　اٹھ گیا اپنا مسیحا زندگانی اب کہاں
لٹ گئی بزمِ طرب، مے ہے، نہ اب مے نوش ہیں
میکدہ سونا ہوا، جام وسبو خاموش ہیں

اپنے رنج وغم کا دکھڑا اب سنائیں گے کسے　　بے کسی میں مونس وغم خوار پائیں گے کسے
جب پڑے گی کوئی مشکل ہم بلائیں گے کسے　　آپ! ہم گم گشتہ ہیں رہبر بنائیں گے کسے
آج دشمن ہر طرف بیٹھے ہوئے ہیں تاک میں
ہائے اپنا میرِ لشکر سو رہا ہے خاک میں

سرزمینِ ہند میں اب اس کا ثانی کون ہے؟　　ہو مسلم سب کو جس کی نکتہ دانی کون ہے؟
بھر دے جو اک لفظ میں لاکھوں معانی کون ہے؟　　کر دے جو تقریر سے پتھر کو پانی کون ہے؟
صد محاسن، صد فضائل، کس کی تنہا ذات تھی
کون ہے وہ جس کی ہر ہر بات میں اک بات تھی

یادِ عہدِ رفتہ دل میں لیتی ہے انگڑائیاں　　درسگاہِ علم کی وہ انجمن آرائیاں
وہ رخِ انور پہ جس کی کھیلتی رعنائیاں　　وہ لباسِ سادگی میں سیکڑوں زیبائیاں
ہائے وہ رخسار کتنا جاذب وخود دار تھا
وقت خفگی ہر شکن میں جس کی لاکھوں پیار تھا

آہ اب دنیائے دل اک دوسرے عالم میں ہے　　اک نرالا جوشِ گریہ دیدۂ پُرنم میں ہے
نبض ساقط ہر تنفس غرق بحرِ غم میں ہے　　آہ! اپنی بزم ہستی مجلس ماتم میں ہے
چشمِ گریاں، قلبِ مضطر، ناطقہ خاموش ہے
اللہ اللہ انجمن کی انجمن بے ہوش ہے

رحلتِ صدرِ شریعت، الاماں فریاد ہے　　چشمِ پُرنم، ہوش گم، دنیائے دل برباد ہے
آج تک ہر قلب میں اس غم کی تازہ یاد ہے　　ذرہ ذرہ سرزمینِ ہند کا ناشاد ہے
اس کا ثانی اب کہاں سے لائے گا ہندوستاں
تا قیامت مٹ نہیں سکتی یہ غم کی داستاں

اے امیرِ کاروانِ اہل سنت الوداع　　اے علم بردارِ قوم وملک وملت الوداع
واقفِ دیں، ہادیِ راہِ شریعت الوداع　　عارفِ حق، محرمِ رازِ طریقت الوداع
الوداع، اے صاحب فضل ومعانی الوداع
الوداع، اے گلشنِ امت کے مالی الوداع

السلام اے صدرِ ملت، ہادیِ حق، پیشوا　　السلام اے ناخدائے کشتیٔ دینِ ھدیٰ
السلام اے نورِ چشمِ حضرت احمد رضا　　السلام اے فخرِ دیں پروردۂ غوث الوریٰ
السلام اے اعظمی کے دین ودنیا کے ولی
السلام اے حضرتِ علامۂ امجد علی

منقبت درشان محمد یارعلوی براؤں (۱۳۰۷ھ۔ ۲۲؍محرم ۱۳۸۷ھ/ ۴؍مئی ۱۹۶۷ء)

آج طیبہ سے خدا جانے ہوا کیسی چلی　　کھل گئی گلشن امید کی ہر ایک کلی
ٹوٹ پڑتے ہیں مرے قلب میں ارمانِ دلی　　سیکڑوں عارف دیں عارف حق اور ولی
مہبط جلوۂ فردوس بنی تیری گلی
مرحبا یار علی یار علی یار علی

واہ تقدیر براؤں کی بھی ہے کتنی بھلی　　اس میں آسودہ ہے اللہ کا ایک پیارا ولی
علم وتقویٰ بھی ملا جس کو ولایت بھی ملی　　جس پہ اسرار تصوف کی حقیقت بھی کھلی
جوش میں جس نے کہا یارعلی یارعلی
فضل حق اس پی ہوا، اس کی مصیبت بھی ٹلی

مرحبا کتنی مبارک ہے براؤں کی زمیں　　بن گیا فیض الرسول (۲) اس کی شرافت کا نگیں
سیکڑوں بن گئے یاں عارف حق، عالم دیں　　کیوں نہ ہو یارعلی جب ہیں یہاں صدرنشیں
ان کی چوکھٹ سے جو، چمٹے رہے، صدیق ہوئے
جن پہ پھٹکار پڑی اُن کی، وہ زندیق ہوئے

روضۂ یار علی جلوہ کا سامان ہوا　　شعلۂ طور اسی سے یہ بیابان ہوا
کیسا خواجہ کا کرم، غوث کا فیضان ہوا　　جو یہاں بیٹھ گیا صاحب عرفان ہوا
جس کے گنبد پہ عجب جلوۂ رعنائی ہے
گویا ویرانے میں فردوس اتر آئی ہے

علم واعمال کے دریا کی روانی ہے یہاں　　حکمت دیں کی صدا نکتہ بیانی ہے یہاں
طرز اسلاف کی ہرایک نشانی ہے یہاں　　جلوۂ دین ودیانت کی جوانی ہے یہاں

طالب دین یہاں عالم ذی شان ہوئے
سیکڑوں آ کے یہاں صاحب ایمان ہوئے
گلشن فیضِ رسول اس میں وہ زیبائی ہے　　فصل گل جس کا قدم دیکھ کے شرمائی ہے
علم دیں، جوش دیانت کی فضا چھائی ہے　　علم والوں کی یہاں انجمن آرائی ہے
جو یہاں آیا وہ اللہ کا مقبول بنا
اعظمی غنچہ تھا جب پہنچا یہاں پھول ہوا

حواشی:

(۱) سیرت المصطفیٰ۔عبدالمصطفیٰ اعظمی اشاعت ۱۹۸۵ء ص ۶۵۴،۶۵۵

(۲) دارالعلوم فیض الرسول براؤں ضلع سدھارتھ نگر قائم شدہ ۱۳۵۶ھ

اعمیٰ - حافظ محمد تقی مبارکپوری

۱۹۲۷ء ــــ ۲۴ر دسمبر ۱۹۹۲ء

اعمیٰ پیدائشی نابینا نہیں تھے بعد میں ان کی بصارت عہدِ طفلی میں ختم ہوئی۔ انھوں نے موضع املو مبارکپور کے منشی ساجد علی ولد ذاکر علی سے نوادہ میں فارسی آمدنامہ تک کی تعلیم حاصل کی تھی جہاں منشی ساجد مرحوم نے تقریباً بیس برس تک نونہالان قوم کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیا تھا۔

مبارکپور کے موضع نوادہ کے باشندہ تھے مگر سروہی، بھدوہی اورالہ آباد میں مستقل رہنے لگے تھے اور عملیات میں مہارت کی وجہ سے بڑی شہرت کے حامل تھے۔ وہاں کے ہندو مسلم انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور پیار سے بھیا جی کہتے تھے۔ حافظ قرآن تھے مگر تراویح نہیں سناتے تھے۔ کبھی کبھی وطن مراجعت کرتے تھے۔ جہاں بھی رہے کتابوں کا ذخیرہ کیا اور دوسروں سے پڑھوا کر سنتے رہے۔ تفسیر وحدیث، تاریخ وتذکرہ، ادب وفقہ اور دوسرے اسلامی علوم وفنون پر ان کے یہاں قیمتی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا جو اخلاف کی بدذوقی کی وجہ سے بھدوہی اور الہ آباد میں ہی رہ گیا ہے۔ جبکہ ان کے معتقدین کی خواہش تھی کہ اعمیٰ صاحب کی یاد باقی رکھنے کے لئے مبارک

پورنوادہ میں ایک قطعۂ اراضی خرید کر اسی میں لائبریری قائم کی جائے اور ساری کتابیں اس میں منتقل ومحفوظ کر دی جائیں۔مگر ان کے بھائی نے اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔مبارک پور میں نوادہ روڈ پر مدرسہ اشرفیہ سراج العلوم کے بغل میں ان کا مزار ہے جہاں سال میں ایک بار ان کے معتقدین جمع ہوکر مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں اور لنگر وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں۔مزار میں قلت عمارت کے سبب سے آنے والے معتقدین کا قیام مدرسہ سراج العلوم میں رہتا ہے۔

حافظ محمد تقی امٰی علمِ تصوف اور عملیات وروحانیت سے شغف رکھتے تھے۔یہی ان کا ذریعۂ معاش بھی تھا۔ذہن کے بڑے تیز اور زیرک تھے۔شاعری کا ذوق بچپن سے رہا، ان کی شاعری عموماً مذہبی ہوا کرتی تھی۔فرمائش کرنے پر بڑی دل چسپی سے اپنا کلام سناتے تھے۔ترنم بھی ماشاء اللہ بہت اچھا تھا۔محلہ شاہ محمد پور کے مقاصدوں میں بڑی چاہت اور عزت سے مدعو کئے جاتے تھے۔انھوں نے متعدد اصناف کو لائق توجہ سمجھا اور اس میں شاعری کی۔ان کا کلام اپنے رنگ وانداز کے اعتبار سے منفرد اور دلچسپ ہوا کرتا تھا۔تاریخی حوالوں سے ان کے اشعار دستاویزی حیثیت کے حامل بھی ہوتے تھے۔ان کا مطالعہ گہرا تھا کلام میں بھی اس کے اثرات نمایاں تھے۔نعتیہ شاعری میں تاریخ وتذکرہ، سیرت وتفسیر اور احادیث کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے اور ان سے ہٹ کر کچھ نہیں سوچتے تھے۔بات میں بات بھی پیدا کرلیا کرتے تھے اور دوسرے مخفی پہلو بھی ابھارتے تھے۔عقیدت ووارفتگی اور جذبہ وتاثر ان کی فنی اساس ہے۔جو کچھ کہتے تھے سنبھل کر اور سوچ سمجھ کر کہتے تھے۔انھوں نے بہت کچھ کہا تھا مگر اب وہ کسی کو کہیں دستیاب نہیں۔جو کچھ بھی کہتے تھے ذہن میں محفوظ رکھتے تھے آنکھ کی معذوری کی وجہ سے کلام پابند کتابت نہ ہوسکا اس لئے زیادہ حصہ ضائع ہوگیا۔ان کے بھائی عبدالقیوم جو معمولی نوشت وخواند سے واقف ہیں مگر انگریزی ڈسپنسری سے کسب معاش کرتے اور ڈاکٹری کے پیشہ سے منسلک ہیں،امٰی کے کلام اور ان کے ذریعہ انجام پانے والے دوسرے کام سے بھی کوئی خاص دل چسپی نہیں رکھتے ورنہ اب بھی کلام کی حفاظت وفراہمی کی سبیل پیدا ہوسکتی ہے۔اس صارفیت کے دور اور بازاری مزاج نے ہر کام کو نفع ونقصان اور مادی منفعت کی ترازو اور میزان قدر کے پلڑے میں رکھ دیا ہے۔

نمونۂ کلام

زندگی میں نے اب تک نہ پائی موت عشقِ نبی میں ہے آئی
نعتیہ شعر لکھتا ہے اعمیٰؔ یہ ہے کتنی مبارک کمائی
چھپر بھی میسر ہمیں رہنے کو نہیں ہے گھر کو ترے آنند بھون ہم نے بنایا
یہ دیکھتے تھے آتشِ نمرود میں خلیل دوزخ ہے اپنی گود میں جنت لئے ہوئے
فائز فروف شاخ مرے آشیاں کی ہے بجلی اسے جلائے وہ ایسی کہاں کی ہے
ہردم مجھے تلاش نئے آسماں کی ہے منزل قدم قدم پہ یہاں امتحاں کی ہے

نعت پاک

دنیا کو سبق دیتے ہیں حیرت کی یہ جا ہے سرکارِ دوعالم نے لکھا ہے نہ پڑھا ہے
کہتے ہوئے یہ اہل بصیرت کو سنا ہے جو نعت ہے سرکار کی، وہ حمدِ خدا ہے
اس کا تو ہمیشہ برا حشر ہوا ہے سرکار کے جو نام سے بیزار رہا ہے
یہ فخرِ سلیماں کی غلامی کا صلہ ہے پانی پہ حکومت ہے تو مٹھی میں ہوا ہے
یہ کہہ کے ملک نے میرا منھ چوم لیا ہے توہے تو محمد کا، برا ہے کہ بھلا ہے
اللہ جہاں ہے وہیں محبوب ہے ان کا کب نورِ نبی نورِ الٰہی سے جدا ہے
کیا شان ہے ان کی جو ہیں بیمارِ محمد ان کے لئے دنیا میں دوا ہے نہ دعا ہے
اس کا ہمیں اقرار ہے اے واعظِ ناداں سب کچھ تو انھیں بعدِ خدا ہم نے کہا ہے
ہر بات ہے نایاب مدینے کے دھنی کی قرآن سے ملتی ہوئی ہر ایک ادا ہے
دستورِ محمد ہے اٹل اپنی جگہ پر قانونِ شریعت نہ گھٹا ہے نہ بڑھا ہے
اس پر تو مسلمان کا ایمان ہے اعمیٰ جو حکمِ محمد ہے، وہ فرمانِ خدا ہے

نعت شریف

جب میری سمجھ میں کچھ ان کا نہ مقام آیا حیرت سے زباں پر بس اللہ کا نام آیا
ہاں میں نے نمازِ حق اس وقت ادا کی ہے جب میرے تصور میں نبیوں کا امام آیا
بے عشقِ شہِ بطحیٰ عقبیٰ میں منافق کو قرآن نہ کام کام آیا، ایمان نہ کام آیا

یہ رحمتِ عالم کی ہے دین زمانے کو جمہور کے ہاتھوں میں دنیا کا نظام آیا
اخلاص کی دنیا میں کچھ قدر نہیں اس کی جو ظرف مدینے کے بازار سے خام آیا
واللہ فرشتوں میں اک شور ہوا برپا انساں کی زباں پر جب خالق کا کلام آیا
تاثیر تو یہ دیکھو اخلاقِ محمد کی قاتل کے بھی ہونٹوں پر مقتول کا نام آیا
اللہ رے یہ عظمت ملت کے مجاہد کی تلوار کے سائے میں جنت سے سلام آیا
سرکار کے صدقے میں زاہین صفت ہوں میں صیاد یہاں لے کر بیکار ہی دام آیا
جب دین کی عظمت پر آنچ آئی کبھی اعمیٰ بے ساختہ ہونٹوں پہ سرکار کا نام آیا

افتخارؔ/انورؔ - افتخار احمد اعظمیؔ

۱۹۳۲ء(ا) —— ۲/اپریل ۱۹۹۴ء

بلا کے ذہین وفطین اور نہایت خوبصورت، خوب رو، طویل القامت اور متاثر کرنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ چہرے کی جاذبیت میں حسن یوسف کا پرتو نظر آرہا تھا۔ جے گہاں ضلع اعظم گڑھ (بندوی کے پاس) ان کا وطن تھا۔ ضلع کی مشہور شخصیت ڈپٹی عبدالغنی کے بھتیجے تھے۔ عبدالغنی صاحب مشہور شاعر وادیب اقبال سہیل خاں ۱۸۸۴ء۔نومبر ۱۹۵۵ء کے سمدھی تھے۔اس نسبت سے یہ اقبال سہیل کے بھی قرابت دار ہوئے۔

افتخار اعظمی اردو کے اچھے شاعر وادیب تھے۔ ابتدا میں تابش سہیل (اقبال سہیل کے مجموعہ غزلیات) اور ارمغانِ حرم (اقبال کے مجموعہ نعت) کے مرتب ومقدمہ نگار کی حیثیت سے اردو میں معروف ہوئے، کئی اردو وانگریزی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا ولایت کا سفرنامہ اردو دنیا میں بہت مقبول ہوا۔ وہ اپنی علمی وشعری فتوحات، جہانِ تازہ کی تلاش وجستجو کرنے، تازہ ہواؤں کے جھونکوں کے لئے ذہن کے دریچوں کو کھلا رکھنے اور تنقیدی ونظری جہات کی تخلیق وتشکیل کی وجہ سے اردو کے اہم اربابِ فکر ودانش کی صف میں ممتاز مقام کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا، نئے اور پرانے ادب پر گہری نظر تھی۔ تنقید وتحقیق کے اصول ونظریات اور تاریخ وتحریک

کے نشیب وفراز کی واقفیت کے ساتھ لسانیات سے بھی ذہنی وابستگی رکھتے تھے۔اس موضوع پر ان کا ایک مضمون" زبان کی ابتدا کیوں کر ہوئی" ماہنامہ المعارف اعظم گڑھ ش ۵ جلد ۲۷ نومبر ۱۹۵۳ء ص ۳۶۴ تا ۳۷۰ میں شائع ہوا ہے جس سے ان کی لسانیات جیسے خشک موضوع سے دل چسپی کا پتا چلتا ہے۔مضمون نگار کے بارے میں مدیر معارف نے نوٹ لکھا ہے کہ" افتخار اعظمی ایک ہونہار نوجوان ہیں ان میں فیلا لوجی اور شعروادب کا اجتماع ضدین ہے۔فیلا لوجی سے ذوق ہمارے سابق مولانا ابوالجلال صاحب ندوی کے فیض صحبت کا نتیجہ ہے اور ذوقِ شعری مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل کی تربیت کا"۔ یہ مضمون افتخار کی عربی دانی اور کتب تفسیر وحدیث نیز لغت وغیرہ کے گہرے مطالعے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔اس میں زبان کی ابتداء، انسان نے کیسے بولنا سیکھا، زبان کی تدریجی ارتقا کی تاریخ اور بچے کی ابتدائی حلقی آوازوں اور ان کی فطری بے معنی غوں غاں والی بولیوں کے سلسلے میں سوالات ومسائل اٹھا کر ان پر بامعنی اور نکتہ آفریں بحث کی ہے۔اسی طرح ان کا ایک مضمون" مصراور نیا ادب" علی گڑھ میگزین شمارۂ اول ۱۹۵۷ء میں صفحہ ۵۵ سے ۶۹ تک شائع کیا گیا ہے۔اس مضمون میں شعور وفکر کی پوری بیداری اور تحقیق وتنقید کی بھرپور توانائیوں کو انھوں نے صرف کیا ہے۔اس سے ان کی وسعتِ مطالعہ اور علم وخبر میں ان کی گہرائی اور بصیرت کی شہادت ملتی ہے انھوں نے مصر میں نپولین کی آمد کو نئے سیاسی اور فکری انقلاب کی تمہید بتایا ہے۔محمد علی کے دورِ حکومت کو بہت سی چھوٹی بڑی اصلاحات کا دور کہا ہے اور لکھا ہے کہ اسی زمانے میں سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔ان کی تحقیق کے مطابق جدید عربی ادب کی تحریک کے پسِ منظر میں دو اسباب وعوامل کارفرما ہیں (۱) مذہبی اور سماجی اصلاح کا جذبہ اور (۲) لبنان سے آنے والے روح عصر کے ادا شناس اور روشن خیال قلم کار ہیں۔انھوں نے جدید عربی تحریک کے دو رخ کی بھی نشان دہی کی ہے۔ایک خیال یہ تھا کہ نئے افکار وخیالات کی ترجمانی قدیم اسلوب میں کی جائے کلاسیکی ادب کے نمائندے فکر وخیال سے زیادہ زبان اور طرزِ ادا کو اہمیت دیتے تھے۔حسنِ ادا اور رنگینی الفاظ ان کے نزدیک سرمایۂ فن تھے۔دوسرا طبقہ فکر وخیال کے تغیر کے ساتھ اسلوب وہیئت کی تبدیلی پر بھی اصرار کرتا تھا۔انھوں نے علمیت کے ساتھ فن کو ہم

آہنگ کرنے، مشرقِ وسطیٰ کے تمام مسائل پر تجزیاتی نظر ڈالنے، وسعتِ مطالعہ اور دقتِ نظر سے کام لینے، آورد وتصنع، آمد و برجستگی، مغرب ومشرق کی آویزش، جذبہ وفکر کی آمیزش، قرآنی تمثیلات وتشبیہات اور قرآنی بلاغت کا تجزیہ، جدید تنقیدی نظریات کی روشنی میں کرنے، تخلیقی وتاریخی بصیرت رکھنے، طنزیہ ومزاحیہ اور سنجیدہ ومتین لہجہ اختیار کرنے والے، صحافتی وخطابتی انداز واسلوب کے حامل، عرب قومیت کا احساس جگانے والے، انحراف وبغاوت کی لے میں زور پیدا کرنے والے ادیب وشاعر، صحافی ودانشور اور نثر ونظم کی تمام اصناف کے نمائندوں پر بڑی جچی تلی رائے ظاہر کی ہے۔

ان کی قوتِ حافظہ اور قوتِ آخذہ بڑی بیدار تھی۔ ذہانت وذکاوت کی بھی کمی نہیں تھی۔ مقدمات کی ترتیب اور سوالات قائم کرنے کے شعور سے بھی مالا مال تھے۔ ان کی ادبی بحث ماحول، خاندان، نسل وعلاقہ، تاریخ وتمدن، سیاسی وسماجی حالات، معاشی وتجارتی تعلقات، کشمکش، خبر واستیلا، جغرافیائی وحرفی یعنی پیشہ ورانہ مصروفیت اور وسائل پیداوار پر قبضہ وتصرف نیز تفریحی وسائل ومسائل کی روشنی میں ہوا کرتی تھی۔ مختلف علوم کی مدد سے وہ ایسے نتائج نکالتے تھے جن کی اہمیت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ جو کچھ دیکھتے یا سنتے تھے اور جو کچھ پڑھتے تھے وہ سب ان کے خزانۂ عامرہ کا حصہ بن جایا کرتا تھا اس خصوصیت نے ان کے علمی سرمائے میں اہم اضافہ کیا۔

اردو کے معتبر جدید شاعر عبدالاحد سازؔ نے راقم کو اپنے مکتوب مورخہ ۱۵؍جون ۲۰۱۳ء میں ان کی ادبیت وعلمیت اور صلاحیت کے اعتراف میں لکھا ہے کہ ”ان کے ساتھ میری بیسیوں طویل شامیں گزری ہیں سیر حاصل ملاقاتوں میں، میں ان کے افکار خیالات، گفتگو اور مباحث سے حد درجہ مستفیض ہوا ہوں۔ عصری اردو اور انگریزی شعر وادب، عصری احساس وادراک کی بابت میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور جانا، مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ جدید اردو شاعری کی طرف میرا میلان انھیں کے توسط سے پیدا ہوا“۔

افتخار اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ۱۹۵۷ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اچھے متعلم تھے، اسی دور میں اقبال سہیل پر ان کے کئی اچھے مضامین سہ ماہی اردو علی گڑھ وغیرہ میں شائع ہوئے تھے، علی

گڑھ کی علمی وادبی سرگرمیوں میں شریک رہا کرتے تھے، لکھنؤ میں بھی تعلیم پائی تھی، اپنے اساتذہ سے علم وفن کے حوالے سے اچھا خاصا اکتسابِ فیض کیا تھا وہاں اپنے چچا ڈپٹی عبدالغنی کی کوٹھی میں سکونت رکھتے تھے۔لکھنؤ والوں کی زبان ومعاشرت سے بھی بہت کچھ حصہ پایا تھا۔

افتخار اعظمی کی پہلی شادی عربی زبان وادب کے مشہور اسکالر اور لکھنؤ یونیورسٹی کے استادِادب خلیلِ عرب کی بیٹی عطیہ خلیل سے ہوئی تھی جو بعد میں پاکستان چلی گئی تھیں۔ وہ صاحبِ اولاد تھیں اردو شعرونثر میں لکھتی تھیں۔اقبال سہیل پر بھی ان کا مضمون آیا تھا۔ پاکستان جانے کے بعد افتخار سے ان کے تعلقات استوار نہیں رہے بعد میں افتخار نے لندن میں ایک انگریز خاتون ریچل (RAECHAL) سے شادی کر لی جس سے دو بیٹیاں رابعہ اور مریم پیدا ہوئیں۔

جب تک لکھنؤ میں رہے بمبئی آنا جانا لگا رہا۔بمبئی میں ان کے عزیز دار اور ملنے جلنے والے تھے ۱۹۶۹ء میں عبدالاحد سازؔ کے والد مرحوم عبدالرزاق سعید سے ملنے ان کے گھر گئے تو عبدالاحد ساز سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی سعید صاحب سے زیادہ وہ سازؔ صاحب کے دوست ہو گئے تھے۔بمبئی میں ان کے بھائی انوار اعظمی لکھنؤ چکن کے کرتے کا اچھے پیمانے پر کاروبار کرتے تھے، افتخار ۱۹۶۹ء سے غالباً ۱۹۷۹ء تک لکھنؤ سے بمبئی آتے جاتے رہے اس کے بعد وہ لندن منتقل ہو گئے اور بی بی سی ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے منسلک ہو گئے وہاں ہندوستان کی لوک کہانیوں کے انگیزی ترجمے کرنے پر بھی مامور تھے۔(۲)

افتخار اعظمی اور انور کے تخلص سے شاعری کرتے تھے مگر افتخار سے زیادہ شہرت تھی۔غزل اور نئی طرز کی پابند نظمیں کہتے تھے۔ان کی بعد کی شاعری میں بڑی پختگی اور انفرادیت ہے۔ وہ حالات کی سنگینی، وقت کے جبر اور مسائل حیات کے ساتھ اپنی جمالیاتی حس کی آمیزش سے اچھے فن پارے پیش کرتے تھے۔ان کی زندگی عیش وعشرت کے جن چمنستانوں، ناز ومسرت کے جن شبستانوں سے گزری تھی اس کی اس کی پرچھائیاں ان کے یہاں ملتی ہیں۔زندگی وقت کی رفتار کا نام ہے افتخار کے نگار خانۂ سخن اور شیشہ گہ میں ان کی تصویریں موجود ہیں۔انھوں نے انسانی حیات اور مسائل کو کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔مادی ترقیات کی تمام آسودگیوں اور برکتوں پر ان کی

نظر ہے۔مگر انھوں نے آسمان پر جانے والوں کے کردار کو دیکھا تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ ان عرش نشینوں کو زمین کے مسائل پر غور کرنے اور انھیں حل کرنے کی فرصت نہیں ۔وقت کے شکنجے اور خواہشات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا انسان اپنی ذات کے حصار سے نکل نہیں پاتا۔وہ ہر خدمت کی قیمت اور ہر کام کی اجرت وصول کرنا چاہتا ہے۔

آلات اور مشینوں نے اس کے احساسِ مروت کو کچل ڈالا ہے ۔اس دور میں رشتوں اور قرابت داروں کی لاشوں کی بھی تجارت ہوتی ہے عقیدوں اور خواہشوں اور مذہبی اقدار کی نیلامی کی جاتی ہے۔راتیں بکتی ہیں دن خریدے جاتے ہیں۔غم اور خوشی جیسی فطری کیفیت بھی جنس بازاری بن چکی ہے۔ افتخار نے ان امور پر توجہ مرکوز کی ہے انھوں نے تیسری دنیا کے وسائل ومسائل کا بھی تجزیہ کیا ہے۔وہ جذباتی موڑ پر بھی اپنی مشرقیت کو کسی نہ کسی حد تک باقی رکھی ہے۔ انھوں نے شاعری،شاعری کی زبان اور اس کی تعبیرات میں آنے والی تبدیلیوں اور بدلتے ہوئے مزاج ورجحان کا استقبال بہت کھلے دل اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ کیا ہے۔ان کی شعری فضا اور ذہنی وفکری اور ادبی ورفنی موسم میں بڑی خوشگواری اور بے پناہ رنگینی ہے۔وہ تلخئ زیست اور حالات کی سنگینی کو شیریں انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ ادب،سماج، زندگی اور فن کے رشتوں کو سمجھتے ہیں۔شاعری میں سماجیات اور جمالیات کو شعور کی کس رو سے جوڑا جائے کہ فن سماجی شعور کی ترجمانی کرنے لگے اور اس میں حقیقت کا رنگ ابھر آئے اس کو وہ خوب جانتے تھے۔

افتخار کے ذہنی پسِ منظر میں مناظرِ فطرت کی تمام تر رعنائیاں اور رنگینیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں۔وہ کبھی اپنے گانو کے مضافاتی حسن سے لاتعلق نہیں رہتے تھے۔ان کے دل ودماغ پر اس کے اتنے گہرے نقوش ثبت ہیں کہ وہ جب فکرِ سخن میں ہوتے ہیں تو ان کے لفظوں میں بھی وہ اپنی جھلک دکھا جاتے ہیں جو ان کی حسنِ قدرت سے شدید ذہنی وابستگی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ فضا،غرقِ تجلی،نورِ سحر،صبحِ خنداں،گل ولالہ،ذوقِ نظارہ،مستیِ نرگسِ غماز،رات، چاندنی،شبنم، بہارِ سبزۂ وگل،شبابِ سرو وسنبل،گلِ رنگیں،دشت وکہسار،سایۂ ابر،نغمۂ ونور،سکوتِ سحر وشام، چہرۂ صبحِ حقیقت،خوشبوئے خیال، بادِ صبا،سایۂ گل، برگِ گلِ تر، چراغاں، گہر افشاں، جیسے لفظ اور ترکیبیں ان

کے شعری مزاج کی ساخت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان کی تمثیلات، تشبیہات، استعارے اور علامتیں ان کے بہاریہ اسلوب کی پہچان ہیں۔ وہ اظہارِ غم میں بھی انھیں علامتوں سے کام لیتے ہیں۔
اس سب کے باوجود اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت پر انھوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔

نمونۂ کلام

گمرہی کو پیمبری جانو — یہ حقیقت ہے ہر صدی کا گناہ
غم نہیں ہے کہ ہیں ظلمت کے جہاں ایک سے ایک — مشعلِ عشق جلائے ہیں جواں ایک سے ایک
اس طرف بھی کبھی ہلکی سی نظر ماہ وشو! — دل کے بازار میں ہے جنس گراں ایک سے ایک
پیار کے بول، محبت کی نظر، چاہ کے گیت — آج بازار میں دیکھی ہے دکاں ایک سے ایک
چارہ گر ہاتھ تو رکھ، ہاں مگر آہستہ — دل کی بستی میں ہیں نازک بدناں ایک سے ایک
دولت دل کا کوئی ان میں خریدار نہیں — یوں تو دنیا میں ہیں صاحب نظراں ایک سے ایک
میں ترے شیوۂ خاموش کے صدقے، لب کھول — تیری خاموشی پہ آتے ہیں گماں ایک سے ایک
کیا کہیں جنسِ وفا، دولتِ اخلاص ملی؟ — افتخار آپ نے دیکھی ہے دکاں ایک سے ایک
فضا غرقِ تجلی ہے فروغِ روئے جاناں سے — کہ ہے نورِ سحر پھیلا نمود صبحِ خنداں سے
گل ولالہ پہ وقت صبح شبنم بن کے وہ چمکے — جو تارے شب کو ٹوٹے تھے فلک انجمنستاں سے
بہار آئی ہے سارے سبزۂ وگل لہلہاتے ہیں — الٰہی اب یہ دیوانے کہاں جائیں بیاباں سے
ہے دردِ عشق گو پنہاں مرے سینہ میں اے ہمدم — عیاں ہوتا ہے لیکن گاہے گاہے چشمِ گریاں سے
بہارِ سبزۂ وگل ہے شبابِ سرو وسنبل ہے — جدا ہوتی ہے ایسے وقت میں بلبل گلستاں سے
وہ گلگونی ہے ان کے عارض سادہ پہ اے انورؔ — نمایاں ہو شفق جیسے جبینِ صبحِ خنداں سے (۳)
دل بری عام سہی، رسمِ وفا عام نہیں — لذتِ درد کا دنیا میں کہیں نام نہیں
میری ہی بے خودیِ شوق کی تقصیر ہے یہ — یعنی تیری نگہِ ناز پہ الزام نہیں
ان میں اک ربط ہے، جیسے گلِ رنگیں میں شبنم — غمِ محبوب، حریفِ غمِ ایام نہیں
دشت وکہسار کی اب بھی ہے وہی تشنہ لبی — سایۂ ابر تو ہے، فیض مگر عام نہیں
جس کو توقیرِ جنوں کا نہ رہے کچھ بھی خیال — تیری محفل میں وہ شائستۂ اکرام نہیں

تو کہاں جائے گا کہ اے دلِ مضطر کہ تجھے گیسوئے یار کے سائے میں بھی آرام نہیں
دلِ فطرت کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے ایک نغمہ ہے، سکوتِ سحروشام نہیں
چہرۂ صبح حقیقت سے اٹھادی جو نقاب نور ہی نور ہے، اب ظلمتِ اوہام نہیں (۴)
کس کی آمد ہے کہ ہرسمت چراغاں ہے بہت دیدۂ تر بھی خوشی میں گہرافشاں ہے بہت
عرض غم،شکوۂ بیداد نہ کرنا تھا ہمیں چشمِ معصوم جھکی ہے کہ پشیماں ہے بہت
شہر کی آب وہوا راس نہ آئے گی کبھی مجھ سے دیوانۂ الفت کو بیاباں ہے بہت
سکوتِ درد کا عالم،یہ شب کی تنہائی جلے چراغ سے دل میں جو تیری یاد آئی
خموش بادِ صبا، دم بخود ہے سایۂ گل کہ سوگیا ہے تری یاد میں تمنائی
قفس نصیب نے پلکوں پہ رکھ لیا اس کو جو ایک برگِ گل صبا اڑا لائی

پیکاروگریز

شاہراہوں پہ، گزرگاہوں پر کچھ عجب شان تجمل سے حیات
ہنستی گاتی سی چلی جاتی ہے نغمۂ ونور کے اس عالم میں
مستیٔ نرگسِ غماز لئے خوش خرامی کے سب انداز لئے
حسن سج دھج کے طرب گاہوں میں شام ہوتے ہی نکل آتا ہے
نگہ شوق کا درباز کئے بادۂ عشرتِ امروز پئے
ذوق نظارہ کی تسکیں کے لئے لوگ تھم تھم کے چلا کرتے ہیں
یوں کیا کرتے ہیں وہ ذکرِ بہار جیسے آثارِ خزاں کچھ بھی نہیں
جادوئے نرگس شہلا کے قتیل حلقۂ گیسوئے پُرخم کے اسیر
بہرِ گلگشت۔ جوانانِ وطن جب نکلتے ہیں چمن زاروں میں
اُن کے اندازِ طرب آگیں سے ہر طرف کیف بکھر جاتا ہے
دل کو ہوتا ہے یہی وہم وگماں ان کے گھر شیش محل ہیں شاید
دیکھتاہوں انھیں جب جاکے قریب ٹوٹ جاتا ہے خیالوں کا طلسم
یہ تبسم، یہ تکلم،یہ خرام دل کو بہلانے کے سامان ہیں سب

اس طرح جبر کی ماری دنیا اپنے آلام چھپالیتی ہے
آفرینش کی یہ افتادِ عظیم سختیٔ دہر، یہ بیدادِ اجل
سحر وشام یہ پیکارِ بقا یہ غمِ عشق یہ آلامِ جہاں
اور یہ وقت کی زنجیرِ گراں! کتنے سنگین حقائق ہیں، جنھیں
دل سے کچھ دیر بھلانے کے لئے ہم بنالیتے ہیں اک راہِ فرار
زندگی ہے یہی پیکار وگریز یہی پیکار وگریز

خوشبوئے خیال

رات اڑتی رہی خوشبوئے خیال نکہتِ زلفِ معنبر کی طرح
شبنم آلود سی پلکوں پہ مری مسکراتا رہا تاروں کا جمال
اور جلتے رہے خوابوں کے دیئے نرم سایوں میں ابھرتا ہی رہا
ایک وہ نقش کہ کچھ یاد نہیں ہوکے سرشارِ محبت آخر!
چاندنی سوگئی پہلو میں مرے چاندنی میرا مقدر نہ سہی
رہ کے کچھ دیر مری باہوں میں میرے احساس میں وہ ڈھل تو گئی

حواشی:

(۱) عبدالاحد سازؔ صاحب نے وفات کے وقت ان کی عمر اکسٹھ برس کی بتائی ہے۔ میرا قیاس ہے کہ اس سے کچھ اوپر رہے ہوں گے۔

(۲) مکتوب عبدالاحد سازؔ بمبئی بنام راقم الحروف مورخہ ۱۵ر جون ۲۰۱۳ء

(۳) ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۵۳ء ص ۴۷۶

(۴) علی گڑھ میگزین شمارۂ اول ۱۹۵۷ء۔ ایڈیٹر قمر رئیس ص ۲۲۷

افتخارؔ - سید افتخار حسین اعظمیؔ

۱۹۳۵ء ـــ ۱۹۷۷ء کے بعد

ان کا تعلق موضع پتلا غوث پور متصل خطیب پور ضلع اعظم گڑھ کے سادات کے علمی

گھرانے سے تھا جس میں دین و دیانت اور علم وادب کی روایات کی توسیع ہوئی۔ نانہال املی پور میں ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سلطان المدارس لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ لیکن اس کا سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چلا۔ ترک تعلیم کر کے تلاشِ معاش میں بمبئی مقیم ہو گئے جہاں ان کے والد گرامی مولانا عبدالحمید شروع ہی سے بمبئی میں سکونت گزیں تھے اور امامیہ مسجد میں پیش امام تھے اور کسی خوجہ گھرانے کے مشیر بھی۔ ان کا گھریلو ماحول سخت مذہبی اقدار کا پابند تھا مگر ان کی باغیانہ فکر نے انھیں کمیونسٹ پارٹی کی طرف اتنا مائل کیا کہ باقاعدہ اس کے رکن بن گئے انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشستوں میں تواتر کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ان کا رویہ جدید شاعری کے حق میں نہیں تھا۔ دراصل یہ کسی سکہ بند اسکول اور دبستان کے منشور کے پابند نہیں تھے۔ انھوں نے کمیونسٹ تحریک سے دل چسپی رکھی اور سرگرمی سے اس کے نظریات کی تبلیغ کی۔ مزدوروں کی یونین سے وابستہ رہ کر امیروں اور سرمایہ داروں سے مزدوروں کے حق میں لڑائی لڑی۔ سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحل لدھیانوی اور دوسرے کمیونسٹ شاعروں، ادیبوں اور مفکروں سے رابطہ رکھتے تھے اور ان کی صحبت میں رہ کر زندگی، سماج اور ادب کے درمیان رشتوں کو پہچاننے کی کوشش کرتے تھے۔ کیفی اعظمی سے ان کی عزیز داری تھی، ان کے ملنے والوں میں کیفی اعظمی، راہی معصوم رضا، اجمل اجملی، سید مجاور حسین، سید اعجاز حسین، عباس حسینی، یعقوب راہی اور سلامت رضوی رہے۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں ان کا مجموعۂ کلام "کن" کے نام سے طبع ہو کر شعر وادب سے دل چسپی لینے والوں میں اعتبار حاصل کر چکا ہے۔

افتخار اعظمی زمیندار گھرانے کے تھے اور گانو میں بچپن گزرا اس لئے بمبئی جیسے بڑے اور تجارتی شہر میں رہ کر بھی گانو کی یاد ان کے دل سے محو نہیں ہوئی ان کے ذہن ودل کے دریچے گانو کی معطر یادوں سے مہکتے رہے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ "یوں تو دنیا میں اپنا گانو ہر ایک کو پیارا ہوتا ہے لیکن جس کے نصیبوں میں آگے چل کر شاعر بننا لکھا ہوتا ہے اسے کچھ زیادہ ہی پیارا ہوتا ہے۔ میلوں، کوسوں تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیت، لمبے چوڑے باغ، بڑے بڑے تالاب، برسات کے زمانے میں ان میں نہانا، چوپایوں کے ریوڑ کے ساتھ میدانوں میں پھرنا، سردیوں میں

آدھی آدھی رات تک آگ کے گرد بیٹھ کر کہانیاں سننا۔ یہ سارا موحول اس کا حسن اور سادگی میری رگ وپے میں سما گئے تھے"۔(۱)

یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں وطن کی مٹی کی سوندھی خوشبو، موسموں کی رنگینیاں، طبیعت کی معصومیت، سادہ لوحی اور باطن کی پاکیزگی کے ساتھ والہانہ پن اور معاملات کی صفائی اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہیں۔ ان کے فن میں خلوص کی گرمی، ذہن وفکر کی شادابی اور شعور کی بالیدگی ہے۔ کہنے کا انداز بہت سلجھا ہوا اور فن کارانہ ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۷ء میں جو پہلی نظم کہی تھی اس کا تعلق ۱۹۵۷ء کے جنرل الیکشن سے تھا اس نظم کا عنوان "فنکار تھا۔ فنکار کا نمونہ یہ ہے

ہر ایک گلشن ہمارا گلشن ہراک کلی کو ہے چاہ اپنی
ہرایک گل سے ہمیں محبت ہرایک دل میں ہے راہ اپنی
نشان جس میں ہیں سرحدوں کے مٹا رہاہے قلم ہمارا
تمام عالم وطن ہمارا عرب ہمارا عجم ہمارا

افتخار اعظمی انسانوں کی کبریائی، اونچے آستانوں پر سجدہ ریزی، بڑی حویلیوں کی دریوزہ گری، خوش پوشوں کے اشارۂ چشم وابرو پر رقص کرنے کی عادتوں، غیر ارتقائی اعتقاد، جامد تصورات سے منحرف تھے۔ ان کے یہاں باغی لہجہ ہے مگر اس میں کسی قسم کی درشتگی اور روکھا پن نہیں ہے۔ ان کے یہاں سوچ اور تعمیری ذہن کی جلوہ گری ملتی ہے۔ عہد سازی اور شخصیت آفرینی ان کے اہداف نظر ہیں۔ یہ جغرافیائی پابندیوں اور سرحدوں کی لکیروں کے خُاف تھے۔ وہ ذہن ودل کی راہوں کو کشادہ دیکھنے اور رکھنے کی تمنا رکھتے تھے۔ انھوں نے جنگوں اور اسلحوں کی تباہ کاریوں کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا تھا اسی لئے وہ غیر اخلاقی وابستگیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وطنیت کے موجودہ تصورات اور قومیت کے مفاد پرستانہ نظریہ سے انھیں شاید انھیں اختلاف تھا۔ وہ زمین پر خدا بننے کی خواہشات کو بڑی وحشت بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ ساری دنیا کو ایک کنبہ اور ہر خطۂ ارض کے باشندوں کو انسانی برادری کا فرد سمجھتے تھے اس لئے ان کے یہاں بڑی کشادگی، رواداری اور بڑی وسعت ہے۔ وہ ذہنی غلامی اور خواجہ تاشگی کے خلاف تھے۔ اسلام کی

مساوات جو مدرسوں کی تھی اور خانقاہوں کا ایک اہم تصور تھی وہ انھیں کمیونسٹوں کی صحبتوں میں ملی مگر وہ مذہب بیزاری اور دین کے عقائد وتصورات سے انحراف عقلی کی شکل میں ملی۔اس لئے روحانیت سے زیادہ ان پر مادیت غالب ہے۔خدا کے وجود کا تصور وعقیدہ ان کے یہاں کمزور ہے۔

افتخار اعظمی نظم وغزل دونوں کے شہسوار ہیں انھوں نے پابند،معریٰ اور آزاد ہر طرح کی نظمیں کہی ہیں۔نظموں میں ان کا جوہر زیادہ کھلا ہے۔انھوں نے اپنے فن کا رشتہ زندگی اور بدلتی ہوئی قدروں سے جوڑا ہے۔اس لئے ان کے یہاں ندرت وتازگی کا احساس ہوتا ہے اپنے خیال ونظریہ کے اظہار میں انھیں کوئی لسانی عجز مانع نہیں وہ علامت واستعارہ کا عرفان رکھتے ہیں اور ان سے کام لینے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔

انھوں نے لفظوں کے انتخاب اور لفظوں میں نئے ابعاد روشن کرنے میں اپنے تخلیقی شعور اور فن کارانہ مزاج سے کام لیا ہے۔عصرِ رواں کی سائنسی وعلوم مادی کی ترقیوں نے ان کی فکر ونظر کے ساتھ ان کے اسلوب اور وسیلۂ اظہار کو بھی متاثر کیا ہے۔پھر بھی وہ لسانی روایتوں اور فنی قیود کی پابندی کو ضروری قرار دیتے اور اس کے احترام کا احساس رکھتے ہیں۔ماضی کو وہ خدا نہیں مانتے ہیں بلکہ اس کے عرفان سے وہ عصری تقاضوں اور معاصر مسائل کے بیان کے لئے نئی راہوں کی تلاش میں مدد لیتے ہیں شعور کی اس پختگی نے ان کے تجزیہ وتبصرہ کو نئے لوازم شعری سے آراستہ کر دیا ہے۔

افتخار اعظمی غزل آزاد ومعریٰ نظم ہی کے شاعر نہیں تھے وہ مذہبی شاعری بھی کرتے تھے ان کی فکر کے چشمے سے قصائد،نوحے،سلام اور نعت بھی سیراب ہوتی رہی ہے۔ان کا اس طرح کا کلام اثنا عشری شیعہ ماہناموں میں شائع ہوتا رہا ہے۔

نمونۂ کلام

مقتل کے اس سکوت پہ حیرت ہے کیا کہیں — ایسی فضا تو ہو کہ جسے کربلا کہیں
یہ کاروانِ عمر، یہ صحرا، یہ خامشی — آتی ہے شرم خود پہ بس اب اور کیا کہیں
لوگ اس طرح سے گھبراتے ہیں — جرم ہو عرضِ تمنا جیسے
اس طرح شب خوں کی تیاری میں ہیں کچھ سر پھرے — آج کی شب وہ نہیں یا لشکرِ قاتل نہیں

میں قصیدہ خانیوں کے فیض سے واقف تو ہوں / کیا کروں لیکن مرا دل اس طرف مائل نہیں
شعروں کو دی وہ آب کہ تلوار ہوگئے / ہم روشنیِ جادۂ اظہار ہوگئے
کل تک جو ساتھ ساتھ ہر اک موڑ پر رہے / کیا وقت ہے وہ منزل دشوار ہوگئے
خوابوں کے گل فروش خدا جانے کس طرح / آنکھیں کھلیں تو دیدۂ خونبار ہوگئے
جستجوئے آگہی میں کھوگئے / نذرِ بیش وکم، دیوانے ہوگئے
دام اشکوں کے نہ لگ پائے تو کیا / داغ تو کم مائیگی کا دھوگئے
انتظارِ صبح میں تو ہم نفس / رات بھر جاگے، سحردم سوگئے
خنجرِ حرفِ وفا قلبِ سلاسل میں اتر / عمر کٹتی ہے اگر آج سزا کی مانند
اب کچھ اس طرح سے خاموش ہیں وہ / پہلے کچھ بھی نہ کہا ہو جیسے
آج جینا کمالِ حیرت ہے / آج مرنا کوئی کمال نہیں
سب سے خوش رہنا ہر ایک شخص کی عزت کرنا / ہم سے بنتا نہیں ہر اک سے محبت کرنا
اپنی ہی ذات سے ہرموڑ پہ ٹکرانا ہے / لوگ آسان سمجھتے ہیں بغاوت کرنا
کیمیا ہونے کی منزل ہے قریب / اپنی ہی آگ میں جلتے رہنا
توڑنا ٹھہرا ہے زنجیر، تب / اس قدر پابندی آداب کیوں
صبح تو ہر حال میں ہوتی، مگر / رات بھر آنکھیں رہیں بے خواب کیوں
بات جب سر کی چلی، راہ میں تنہا ہم تھے / یوں تو ہمراہ چلے تیرے طلبگار بہت
شمعِ یادِ لب رخسار بجھائے نہ بجھے / گرچہ کرتی رہی یلغار، شبِ تار بہت

کون بچھڑا سرِ بازار تمنا ہم سے/ سرنگوں جبر اجل/ دست مسیحا چپ ہے/ خشک ہیں چشم چمن کے آنسو/ شعلۂ رنگِ حنا ہے خاموش/ آہ افلاک سے ٹکرا کے پلٹ آتی ہے/ بند ہے بابِ اثر/ دست دعا ہے خاموش/ آج وہ گوہر نایاب ملا ہے اس کو/ کاسۂ دست زمیں/ جگمگاتا ہے ستارے کی طرح/ دست قدرت کی عطا پر دل دنیا خاموش۔

حواشی:

(۱) کن۔ افتخار اعظمی ص ۲۲

افسرؔ - سید علی امجاد زیدی محمد آبادی

۱۰/شوال ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۴ء ــــ ۱۵/ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ/ ۲/جون ۱۹۲۹ء(۱)

سید علی امجاد زیدی کے والد فارسی وعربی کے ماہر اور اردو کے شاعر تھے۔ان کے خاندان میں علم وادب سے وابستگی کی روایت بہت قدیم ہے۔ان کے ذاتی کتب خانے میں قدیم داستانوں اور ناولوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔طلسمِ ہوش ربا، الف لیلہ،فسانۂ آزاد،شرر،نذیر احمد اور طبیب کے ناول پسند کرتے تھے۔کم سنوں کی نظر سے بچے رہنے کے لئے ناولوں کو ایک الماری میں مقفل رکھتے تھے۔مذہبی کتابوں کا بھی کافی ذخیرہ تھا،وہ بڑے پیانے پر تجارت کیا کرتے تھے،اور فرصت کے اوقات فنونِ لطیفہ سے حظ اٹھانے میں صرف کرتے تھے۔سید علی جواد زیدی کا بیان ہے کہ "عنفوانِ شباب میں داغ وامیر کے رنگ میں چند غزلیں کہی تھیں جو میری غفلت سے ضائع ہوگئیں، وہ اچھے مصور بھی تھے۔رنگوں کی آمیزش اور خطوط کے استحکام کے لئے مشہور تھے۔ان کی تصویروں کا ایک البم بچپن میں دیکھا تھا وہ بھی دستبردِ زمانہ سے نہ بچ سکا"(۲)

زیدی صاحب نے اپنے والد کی جو چند غزلیں جمع کی تھیں، وہ بھی نذرِ حالات ہو کر کھو گئیں،انھیں ذیل کے صرف دو شعر یاد رہ گئے تھے۔انھوں نے صرف ۳۶/برس کی عمر میں انتقال کیا مگر سات اولاد اپنی یادگار چھوڑی جن میں علی جواد زیدی سب سے بڑے تھے۔بڑے پیانے پر تجارت کرتے تھے اس تعلق سے باہر جاتے تھے۔ان کی شادی طیبہ بی بی بنت سید جعفر رئیس کرہاں سے ہوئی تھی۔

نمونۂ کلام

سفر طویل ہے اے راہِ عشق کے رہرو ابھی زخمِ کفِ پا کو دیکھتا کیا ہے؟
دامن جھٹک کے چل بھی دیا وہ سبک خرام پھیلائے ہاتھ دیکھتے ہیں رہ گزر کو ہم(۳)

حواشی:

(۱) سید علی جواد زیدی نے خودنوشت حالات "غبارِ کارواں" مطبوعہ آجکل دہلی اکتوبر ۱۹۷۲ء ص ۱۳ پر ۱۹۳۰ء

لکھا ہے لیکن انھوں نے اپنے خط کے ذریعہ جو قمری تاریخ مجھے بھیجی ہے اس کا تطابق جب تقویم ہجری وعیسوی، محمد خالدی سے کرتا ہوں تو ۱۹۲۹ء ثابت ہوتا ہے۔

(۲) غبارِ کارواں۔ ماہنامہ آج کل دہلی اکتوبر ۱۹۷۲ء ص ۱۲

(۳) ماخذ۔ علی جواد زیدی کے خطوط بنام راقم مورخہ ۱۵؍مئی ۱۹۸۰ء و ۲۵؍دسمبر ۱۹۷۹ء

افسر اعظمی - افسر الدین

۱۹؍جولائی ۱۹۳۱ء ــــ ۲۰؍جنوری ۲۰۱۲ء

افسر اعظمی کی ولادت گھوسی کے ایک زمیندار گھرانے میں ۱۹؍جولائی ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ ان کے بڑے بھائی ظفر اعظمی بھی شاعر تھے۔ آزادی ہند سے قبل رئیسوں کے ذاتی مدارس ہوا کرتے تھے اسی طرح آپ کے آبا و اجداد نے بھی اپنے وسیع مکان کے ایک گوشہ میں ابتدائی تعلیم وتربیت کے لئے ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا جس کے مصارف خود برداشت کرتے تھے۔ جناب افسر نے مکتب کی تعلیم کا آغاز اسی ادارہ میں کیا ناظرہ اور اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد قرآن حکیم حفظ کرنا شروع کیا مگر چند پاروں کے حفظ کی نوبت آئی تھی کہ انھیں اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ مڈل اسکول گھوسی سے ۱۹۴۴ء میں مڈل کلاس کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ ۱۹۴۸ء میں جیون رام انٹر کالج مئو سے ہائی اسکول اور ۱۹۵۲ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔

رسمی تعلیم تو انٹر کے بعد ختم ہوگئی اور یکم جنوری ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ سروس میں آ گئے مگر ذوق مطالعہ اور توسیع معلومات کی اُمنگ باقی رہی چنانچہ دورانِ ملازمت ۱۹۵۷ء میں گورکھ پور یونیورسٹی سے بحیثیت پرائیویٹ امیدوار بی اے کی سند حاصل کی۔ اگست ۱۹۸۹ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

یوں تو شاعری کا آغاز دورانِ تعلیم ہو چکا تھا اور کلام کی اصلاح جناب مولانا محمد سعید قمر فتحپوری مرحوم سے لیتے رہے مگر جب مغلسرائے میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوئے تو ذوقِ

شعر گوئی کو خاصی معنویت حاصل ہوئی جہاں بزمِ ادب کے نام سے ایک شعری انجمن کا قیام عمل میں آیا جس کے ارکان میں افسؔر اعظمی کے علاوہ سحؔر کاظمی، برق رانی ساگری، عارف، حبیب جونپوری وغیرہ تھے۔ رفقائے بزم کی سرگرمیوں سے ہر ماہ شعری نشستیں اور گاہے گاہے مشاعروں کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں جناب افسر نے اپنا مجموعۂ کلام ایک جھلک کے نام سے مرتب کیا مگر وہ حکومت وقت کی اجازت نہ ملنے کے سبب طبع نہ ہوسکا اور جب پابندی ختم ہوگئی تو مسودہ ہی گم ہوگیا۔

افسر اعظمی نے غزلیں، قطعات اور نظمیں لکھیں مگر مغلسرائے میں تقرری کے بعد انھیں اپنے کلام کو اکٹھا کرنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ آلامِ روزگار کے تسلسل نے ان کے شعری ذوق بالخصوص غزل کی حزنیہ معنویت کو جلا ضرور بخشی مگر وہ حالات کی ستم ظریفیوں سے متاثر ہوکر غزلیں لکھتے رہے اور کتابِ زندگی کے اوراقِ پریشاں کی طرح منتشر کرتے رہے۔

کلام میں سادگی وسلاست کے ساتھ سوز وگداز اور غم کی خلش پائی جاتی ہے۔(۱)

نمونۂ کلام

وقت کو چپ سی لگی ہو یہ ضروری تو نہیں
آپ جو کہہ دیں وہی ہو یہ ضروری تو نہیں

اک گلی ہم جسے فردوسِ بریں کہتے ہیں
وہ تمہاری ہی گلی ہو یہ ضروری تو نہیں

تجرباتِ غمِ انساں کے ثبوت اور بھی ہیں
گرد ماتھے پہ جمی ہو یہ ضروری تو نہیں

آگ پھولوں سے بھی گلزار میں لگ سکتی ہے
کوئی بجلی ہی گری ہو یہ ضروری تو نہیں

وہ جو زندہ ہے زمانے میں خوشی کی خاطر
اس کی خاطر بھی خوشی ہو یہ ضروری تو نہیں

چند ہوتے ہیں جو سینے میں اتر جاتے ہیں
سب کی محسوس کمی ہو یہ ضروری تو نہیں

مرگِ پروانہ پہ اس درجہ پریشاں افسؔر
سب کا انجام وہی ہو یہ ضروری تو نہیں

میری بے بسی کا عالم کسی اور سے نہ پوچھو
میرا حالِ دل ستمگر میری شکل سے عیاں ہے

تو سکوں سے کھیلتا ہے میں سکون ڈھونڈتا ہوں
تیری زندگی تبسم میری زندگی فغاں ہے

میرا نقش آشیانہ نہ مٹے گا برقِ سوزاں
جلے ہوگیا زمانہ مگر آج تک دھواں ہے

غمِ یار سہتے سہتے جو قضا سے کھیل جائے
وہی عشق کامراں ہے وہی زیست جاوداں ہے

جہاں پاؤں ڈگمگائے وہیں عزم نے صدادی وہ چمک رہی ہے منزل جو غبارِ کارواں ہے
یہی حسن کی سیاست ہے سمجھ سے دور افسرؔ کبھی مجھ پہ مہرباں ہے کبھی مجھ سے بدگماں ہے(۲)

حواشی:

(۱) مولانا محمد عاصم اعظمی

(۲) مولانا اشتیاق احمد گھوسوی

افضلؔ کونروی - مولانا فضل الکریم

سنہ ۱۲۷۰ھ/ سنہ ۱۸۵۳ء —— سنہ ۱۳۶۰ھ/ سنہ ۱۹۴۰ء

پیدائشی نام فضل الکریم تھا، مگر فضل کریم سے بھی پکارے جاتے تھے اور بعد میں ترکیب فارسی وعربی دونوں نام کا جزو بن گئی۔ تخلص افضل۔ سلسلۂ نسب یہ ہے

فضل الکریم بن شاہ محمد بن پیر علی، بن حیات محمد بن دوست محمد بن رکن الدین بن پیر محمد بن محمد فاضل بن محمد معروف بن جمال محمد بن شیخ طیب بن شیخ داؤد بن عبدالحکیم بن بدرالدین بن شیخ صلاح الدین بن شیخ سراج الدین۔

موضع کونرہ گہنی(۱) میں سنہ ۱۲۷۰ھ/ سنہ ۱۸۵۳ء مین پیدا ہوئے۔ اس گانو میں سب سے پہلے شیخ سراج الدین آئے جن کے متعلق مشہور ہے کہ محمود شاہ تغلق (عہدِ حکومت ۸۴۴ھ - ۸۶۲ھ) کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے تھے اور کسی بڑے عہدہ پر فائز تھے۔ گانو کے بہت سے قدیمی تالاب اور کنویں آج بھی موجود ہیں جو آپ کی طرف منسوب ہیں۔

آپ کی دادی یعنی شیخ پیر علی مرحوم کی بیوہ خانماں برباد خاندان مغلیہ کی چشم وچراغ تھیں جو اپنے جواں سال بیٹے شاہ محمد اور بہو کے ساتھ گانو کے مشرقی کنارے پر رہا کرتی تھیں، یہ عبادت گزار اور صابرہ وشاکرہ خاتون تھیں۔ شاید ان بزرگ خاتون کے ظرف عبدیت کی ابھی اور آزمائش باقی تھی جو بیوگی کی مصیبتوں میں جواں سال بیٹے کی مفارقت کا بار بھی اٹھانا پڑا۔ اس تنہائی وپریشاں حالی کے ماحول میں بھی صبر وشکر اور توکل علی اللہ آپ کا تکیہ بنا رہا۔ دو بیواؤں کی دعائیں

باب اجابت تک پہنچیں اور اللہ تعالیٰ نے شاہ محمد کے انتقال کے چند ماہ بعد فضل الکریم کی شکل میں ان دونوں بیواؤں کے دامن امید کو اپنے فضل و کرم کے دریتیم سے نواز دیا۔

فضل کریم نے ابتدائی تعلیم گھر پر والدہ سے حاصل کی اس کے بعد فارسی کے مشہور استاد اور شاعر مولوی محمد مہدی ساکن موضع چتارہ سے فارسی پڑھی اور جلد ہی مہارت پیدا کر لی، ان سے عربی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں تعلیٰ کا سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ مولوی محمد مہدی چتاروی اپنے دو شاگردوں کی فارسی دانی کا بہت اعتراف کرتے تھے۔ ایک تو علامہ حمیدالدین فراہی دوسرے مولوی افضل۔ افضل نے مولانا محمد شفیع بانیٔ مدرسۃ الاصلاح، امام فراہی اور علامہ شبلی نعمانی کے دسترخوان علم وصحبت سے بھی کچھ ریزے چُنے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد گھر ہی پر سکونت اختیار کی اور تعلیم و تدریس کو اپنا مشغلہ بنایا۔ مولانا فراہی سے دوستانہ تعلقات تھے حیات افضل غیر مطبوع میں افضلؔ کے دو خطوط بھی ہیں جن میں ایک قطعی طور پر علامہ فراہی کے نام ہے خط کے آخر میں ایک شعر بھی ہے جس میں مولانا فراہی کی درازیٔ عمر کی دعا کی گئی ہے۔

از فلک تا برزمیں پرتوفگن پرویں بود - برسرما سایۂ حافظ حمیدالدین بود (۲)

مولانا اقبال سہیل افضل کی شاعری کے بڑے قدرداں تھے وہ اکثر کونرہ جاتے اور انھیں استاذ کہہ کر مخاطب کرتے اور عزت واحترام سے پیش آتے۔ اقبال سہیل کی بعض سیاسی سرگرمیوں پر افضل صاحب نے نظمیں بھی لکھیں۔ ۱۹۳۶ء میں یوپی کی اسمبلی کے لئے اقبال سہیل کے مقابلہ میں سید علی ظہیر امیدوار تھے۔ اس موقع پر مولانا افضل نے ایک نظم مولانا سہیل کو لکھ کر بھیجی تھی جس پر ۲۷؍فروری ۱۹۳۶ء کی تاریخ درج ہے۔ نظم کے ابتدائی شعر ہیں

فروبست شب رختِ خود را آفتاب　　برآمد زجوئے کنور(۳) آفتاب
بہر روشناں غلبۂ یافتہ　　زمشرق سہیل یمن تافتہ
بہرجا کہ شد کامگاری نمود　　چوں اقبالؔ اقبال یاری نمود
عدو ہمچو روباہ میداں گزاشت　　پئے ممبری چوں علم برفراشت

آخر میں یہ دعائیہ شعر ہے

بتو دائما باد فضل کریم　　دعا گوئے تو ہست فضلؔ کریم

مولانا فضل الکریم سادگی وصفائی، زہد وتوکل، جودوسخا، غرباء پروری وخدمتِ خلق جیسے اخلاق عالیہ سے آراستہ تھے۔ زیادہ تر وقت عبادت وتلاوت اورنوافل واذکار میں گزارتے تھے۔ تہجد کے پابند تھے، مسجدیں، تالاب، پُل اور کنویں تعمیر کرانے کا شوق تھا، گانو کے بہت سے تالاب اورکنویں آپ کی طرف منسوب ہیں۔ حج بیت اللہ کی خواہش تھی مگر پوری نہ ہوسکی۔ جیسا کہ ایک خط میں جوغالباً مولانا فراہی کے نام ہے تحریر فرمایا ہے۔

عالی جاہ، پشت پناہ!
تسلیم، بعداز خاکبوسی آستاں کہ توتیائے چشم راستاں اس معروض کنم ہزاراں ہزار شکر کہ جناب عزم مدینہ شریف می دارند، شوق ماہم ایں است کہ ماہم ہمراہ جناب شویم ولاکن کارہائے فراواں پانمی گزارند وآتش شوق چوں شمع می گدازد، خیر چوں درتقدیر مانیست تدبیر راہیچ یارہ نیست ونہ چارہ۔ خیرایں شعر از زبان ایں سراپا تقصیر
پزیرآبادبہ سلامت روی وبازآئی

عالی جاہ، پشت پناہ!
تسلیم! آپ کی چوکھٹ کی خاکبوسی کے بعد جوکہ اہلِ بصیرت کی آنکھ کے لئے سرمہ ہے، عرض کرتاہوں کہ ہزاروں شکر خداوندکریم کا کہ آپ حج کا ارادہ رکھتے ہیں، میری تمناہ ءکہ میں بھی آپ کے ہمراہ چلوں لیکن کام کی زیادتی مہلت نہیں دیتی، آتشِ شوق مجھے شمع کی طرح پگھلارہی ہے۔ خیر جب زیارتِ کعبہ ہماری تقدیر میں نہیں ہےتو تدبیرکونہ کوئی یارہ ہےاور نہ چارہ، خیر مجھ سراپا تقصیرکی زبان سے یہ شعر قبول فرمائیے۔ تمہارا سفر مبارک ہو۔ سلامتی کے ساتھ جاؤ اور بخیروخوبی واپس آجاؤ۔

مولانا فضل الکریم کی شادی مرزاپورضلع اعظم گڑھ میں ہوئی تھی، اولاد میں تین لڑکےاور چارلڑکیاں تھیں آپ کوشعر گوئی میں دل چسپی بچپن ہی سے تھی۔ عمر کی پختگی کے ساتھ یہ ذوق بھی پروان چڑھتارہا۔ مولوی محمد مہدی صاحب کی تربیت نے جوخودبھی صاحب دیوان شاعر تھے، جلا

بخشی۔ چونکہ طبیعت نام ونمود سے کوسوں دور تھی اس لئے کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہوگیا۔ جو کچھ منتشر اوراق اِدھر اُدھر پڑے تھے انھیں مولانا افضل کے پوتے مولوی منظور دوعالم صاحب اصلاحی نے مدرسۃ الاصلاح میں اپنی طالب علمی کے دوران جمع کئے، اور انھیں اشعار کو مرتب کر کے شروع میں حالات لکھے اس طرح "حیاتِ افضل" کے نام سے ایک ۵۶ صفحی کتابچہ تیار ہوگیا، اس میں ۲۸ صفحات حالات ہیں بقیہ کلام ہے۔

یہ مجموعہ مولانا بدرالدین اصلاحی صاحب کی نظر سے گزر چکا ہے، انھوں نے بہت سے اشعار میں کٹے پٹے یا مٹے ہوئے الفاظ کی تصحیح کی ہے۔ اس میں دوحمد، ۲ مناجات، چار نعتیں، ۲ سہرے، ۱۴ غزلیں، ۴ قطعات، اور ۳ نظمیں یعنی کل ۳۱ کلام شامل ہیں۔ یہ سارا سرمایہ فارسی میں ہے۔ اور ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اردو میں شاذ ونادر ہی طبع آزمائی کرتے تھے۔ اس زبان میں انھوں نے جو کچھ اشعار کہے تھے اب وہ بھی نہیں ملتے۔ ان کی فارسی غزلیں زیادہ تر اساتذہ کی زمینوں میں ہوتی تھیں۔ لیکن کہنے اور سوچنے کا انداز ان کا اپنا ہوتا تھا۔ بات کہیں بھی ہو سلیقے سے کہتے تھے، ابتذال نہ فکر میں ہے نہ ذکر میں۔ ان کی شاعری کا اصلی رنگ حمد ونعت میں کھلتا ہے۔ یہ اگرچہ کم ہیں مگر اپنی کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے غزلوں پر فوقیت رکھتی ہیں، ان میں روانی، برجستگی، سلاست اور فصاحت ملتی ہے، سوز وساز اور درد وداغ نے انھیں خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی رواں بحر استعمال کر کے دریا کو کوزے میں سمونے کا ہنر دکھایا ہے۔ لفظیات کے انتخاب میں شعور کی پختگی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ مادۂ تاریخ کی تخریج سے بھی آپ کو بڑی مناسبت تھی۔ بہت سے تاریخی قطعات اس کے شاہد ہیں۔ اردو کلام کی کمی سر دست فارسی سے پوری کی جارہی ہے۔

نمونۂ کلام

عشق در راه دل زند چوں پائے — صبر آہستہ پا برانگیزد

دل بود شمع انجمن آرائے سینہ ام — دردا میانِ کعبۂ وبتخانہ سوختم

دوش زاہد از منِ خستہ من نمی آئی — لیک چشم مرا تو بینائی

بگردوں خیمہ زد ابر بہاراں خیز اے ساقی　　بدہ مے وزسر مینا جدا کن ریش قاضی را

برآمد از سر نرگس خمار خود بینی　　چوں دید نرگس بیمار یار را بخمار

باز آں رشک بتاں آید ہمی　　جاں بلبل را باز جاں آید ہمی

نام تو تر از ہر زبانہا　　وصف تو کلید کام جانہا

اوصاف تو برسر جریدہ　　آثارِ بندگی آفریدہ

صنع تو رواں بتن دمیدہ　　دیبائے خرد ببر کشیدہ

ایں قصر بلند طاق مینا　　بے سنگ وستونش کرد برپا

باجود تو چشم ہروجو دست　　یم دیدہ بفیض تو نمود دست

آں سبزۂ نوکہ بر دمیدہ　　آب کرمت بداں رسیدہ

دانہ چوں بخاک سر بینداخت　　ابر لطفت سرش بیفراخت

سرِ سروراں، سرورِ سرفراز　　بلند افسر و خواجۂ پاکباز

ثریا علم، شاہِ گردوں سریر　　گرانمایہ، دریا دل و دستگیر

دم پاک او مردہ را جانفزائے　　مسیحائی بُد درلب نکتہ زائے

چہ امی کہ دستش قلم راندید　　بتوریت وانجیل خط در کشید

زپیغمبراں ایں ہوا داشتند　　بدل تخم ایں آرزو کاشتند

کہ اے کاش از امتش بودمے　　بگیتی بسے فخر بنمودمے

حواشی:

(۱) قدیم کاغذات میں کنورہ لکھتے تھے مگر آج کل کونرہ لکھتے ہیں۔ یہ جنوب مغربی اعظم گڑھ کا ایک گانو ہے، قصبہ پھول پور سے تقریباً پندرہ کلومیٹر جنوب میں آباد ہے۔

(۲) حیات افضل قلمی ص۱۹

(۳) ایک ندی کا نام

افغان اللہ خاں (پروفیسر) خالص پور

۳۱؍مارچ ۱۹۴۸ء ـــــ یکم مارچ ۲۰۰۸ء

ڈاکٹر افغان اللہ خاں کی پیدائش اعظم گڑھ کے موضع خالص پور تحصیل سگڑی میں ہوئی۔ ان کے والدِ گرامی محمد یحییٰ خاں مرحوم تھے۔

انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ایم اے کیا اور ۱۹۶۹ء میں اسی دانش گاہ سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ۱۹۸۰ء میں لکچرر کے عہدے پر تقرری ہوئی ترقی کر کے ۳؍فروری ۱۹۹۲ء میں ریڈر رہوئے۔ دہلی میں وفات پائی۔

فراق کی شاعری، انتخاب کلام فراق گورکھپوری اور لاتنقیص ان کی تصانیف ہیں۔

افغان اللہ خاں ایک تنقید نگار اور محقق کی حیثیت سے عام اردو داں حلقے میں معروف رہے مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کی شاعری کا علم ہو سکا ہے۔ وہ عام مشاعروں اور شعری نشستوں میں شریک ہونے اور اشعار سنانے سے محترز رہے۔ اسی لئے ان کی شاعری پر گمنامی کا پردہ پڑا رہا۔ مسلم انصاری نے ان کی ایک غزل کے پانچ اشعار نقل کئے ہیں جو ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان اشعار سے یہ علم ہوتا ہے کہ افغان اللہ صاحب میں شاعری کی بہت اچھی صلاحیت تھی۔ اگر اس کی طرف انھوں نے خاطر خواہ توجہ دی ہوتی تو وہ ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے بھی اردو دنیا میں ادیب و نقاد ہی کی طرح متعارف ہوئے ہوتے۔ ان کی غزلوں کا نہج و اسلوب اور طرز و انداز زمانے کے تقاضوں کی رعایت کی وجہ سے اپنے اندر خصوصی جاذبیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والی آواز کی طرف خصوصی توجہ دی اور جدید لب و لہجہ ہی نہیں نئی حسیت اور عصری مسائل و تلمیحات، الفاظ و استعارات، علامات و کنایات سے بھی استفادہ کیا۔ جدیدیوں نے میرؔ کے لہجے کی بازیافت کی افغان اللہ خاں نے بھی میرؔ کے انداز کو اہمیت دی اور ان کے رنگ میں غزل کہنے کی کوشش کی اور اپنے علم و مطالعہ کے سہارے اپنی کاوش میں بہت حد تک کامیاب رہے۔

نمونۂ کلام

ناکردہ گناہوں کی سزا ہم کو ملے ہے — احساس کے شعلوں میں بدن ہے کہ جلے ہے
ہر چہرہ یہاں قبر شکستہ کا ہے کتبہ — دل ٹوٹ کے رہ جاتا ہے جب کوئی پڑھے ہے
جسموں میں شب وروز بگولا سا ہے دہکا — اب وقت کی دھرتی میں فقط خوف اگے ہے
یادوں کے مہکتے ہوئے صندل کی دکاں میں — تنہائی کے سانپوں سے بھی آرام ملے ہے
اس دور میں تو شمر فقط ایک تھا یارو — اس دور میں ہر فرد تجھے شمر لگے ہے (۱)

حواشی:

(۱) دبستان گورکھپور۔مسلم انصاری مطبوعہ ۱۹۹۷ء ص ۵۶۳-۵۶۴

اقبالؔ - اقبال احمد کلاں

۱۹۳۰ء ــــ ۱۱؍مئی ۲۰۱۰ء

یہ مبارکپور کے ادبی حلقوں میں اقبال کلاں کے نام سے جانے جاتے تھے کیوں کہ یہاں کے کئی اقبال شاعری کی دنیا میں تھے۔

اقبال احمد اقبالؔ حاجی رحمت اللہ ولد عبدالسبحان صاحب کے بڑے بیٹے اور راقم الحروف کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔انھوں نے قرآن پاک کی تعلیم اپنے والدگرامی حاجی رحمت اللہ کی پھوپھی زاد بہن فاطمہ سے ان کے گھریلو مکتب محلہ حیدرآباد میں حاصل کی تھی۔اس دور میں قرآن پاک ناظرہ اور اردو کی ابتدائی کتابیں عموماً گھریلو مکتب میں پڑھائی جاتی تھیں۔آج کی طرح باقاعدہ تنخواہ دار مدرسین اور مدارس کا رواج بہت کم تھا۔عموماً مسلمانوں کے گانو گھر میں اسی طرح سے نجی مکتب بچوں کی تعلیم کا ذریعہ تھے۔ یہ فاطمہ جو اقبال کی پہلی معلمۂ قرآن تھیں غلام رسول مائلؔ ساکن محلہ اسلام پورہ کی والدۂ مکرمہ تھیں۔غلام رسول مائلؔ پارچہ بافی کے کام کے ساتھ کاروبار ذوق کے طور پر شاعری بھی کرنے لگے تھے اور غزلوں کے ساتھ زیادہ تر نعتیں کہتے تھے۔میلاد خوانوں کی ٹیم کے ایک رکن بھی تھے اور اچھا میلاد شریف پڑھتے تھے۔اقبال احمد نے ناظرہ کے بعد مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم

میں درجۂ چہارم تک تعلیم پائی اس زمانے میں اشرفیہ میں یہیں تک تعلیم کا انتظام تھا۔ انھوں نے کچھ فارسی بھی پڑھی تھی۔ ان کا نیا مکان واقع محلہ پورہ رانی ۱۹۳۶ء میں خرید ا گیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں ان کے دادا عبدالسبحان نے حج کا فارم بھرا تھا مگر وہ فوت ہوگئے تو حاجی رحمت اللہ نے ۱۹۴۶ء میں والد کا حج بدل کیا تھا۔ اور اس کے ایک سال بعد ۱۹۴۷ء میں اقبال احمد کی شادی محلہ حیدرآباد میں صالحہ بنت سلیم اللہ ساکن محلہ حیدرآباد، مبارک پور سے ہوئی تھی انھوں نے اپنی اہلیہ کے ساتھ ۲۰۰۳ء میں خود بھی حج کی سعادت حاصل کی۔

اقبال کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ جو کام کرتے تھے اس میں ایسے کھو جاتے تھے کہ انھیں دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں رہتی تھی یہی حال شاعری کا بھی تھا۔ ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہا کرتے تھے۔ اپنے خیالات میں گم، آس پاس کی زندگی اور اس کی سرگرمیوں سے بے نیاز، وہ ایماندار، محنتی اور معاملات میں بہت صاف تھے۔ وعدہ کے پکے اور اپنی زبان کے دھنی تھے۔ بنائی کے کام میں بھی انھیں بڑی مہارت تھی اور اس کی ایک ایک چیز سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کی نظر معمولی معمولی باتوں پر بھی رہا کرتی تھی۔ اسی لئے ان کے ذریعہ تیار کپڑے میں کوئی عیب نہیں رہا کرتا تھا یہی سبب تھا کہ وہ اپنے گرہست کے یہاں بہت قابل قدر سمجھے جاتے تھے۔ یہی فن اپنے بھائی اور بیٹے کو بھی سکھاتے رہتے تھے۔ وہ معاملات پر بہت گہرائی سے سوچتے تھے اور ہمیشہ امانت کی طرح لوگوں کو اچھا مشورہ دیا کرتے تھے۔

راقم الحروف میں بھی ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی تعلیم کا مشورہ دیا تھا راقم کی خواہش بھی ہوگئی تھی اور والد گرامی بھی کسی قدر ندوہ میں داخلہ کے لئے رضامند ہوگئے تھے مگر مسلکی عصبیت کے تحت ایک مولانا صاحب نے والد صاحب کو جو غلط رائے دی اس کی وجہ سے راقم ندوہ کی تعلیم سے محروم رہا۔

شاعری کے سلسلے میں بھی وہ بہت زیادہ غور وفکر کے عادی تھے۔ ہر صنف پر انھیں لکھنے کی قدرت تھی شاعری سے اُن کو فطری لگاؤ تھا اور اس کے عیب و ہنر سے آگاہ تھے۔ ایک ایک مصرعے پر بار بار غور کرنے کے عادی تھے۔ اور ہمیشہ اپنے کلام میں ترمیم وتبدیلی کیا کرتے تھے۔

ان کی کہی ہوئی ہزلیں مبارک پور کے ایک مزحیہ شاعر کی شہرت کی بنیاد ابھی تک بنی ہوئی ہیں وہ مزحیہ شاعری بہت شستہ وشائستہ انداز میں اور سماجی شعور کی پختگی کے ساتھ کرتے تھے۔ ان کی فکری وشعری قلمرو میں غزل، ہزل، نعت، رخصتی، سہرا، منقبت، تعزیتی نظم تھی۔ وہ عام بول چال سے ہٹ کر ذرا ادبی انداز لئے ہوئے طرزِ کلام کو پسند کرتے تھے۔ اور عوامی بولی کی شاعری سے وہ محترز رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا ذوق بہت اعلیٰ پیمانے کا تھا۔ انھوں نے غالب، اقبال اور جگر کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ اقبال کی بانگ درا، اور بابِ جبریل ان کے مطالعہ کی ترجیحات میں شامل تھیں۔ انھوں نے ہزل کے رنگ کو ادبی فضا دینے میں بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ اُن کا شعری مزاج ومذاقِ سخن شائستۂ تہذیب تھا۔ اُن کے کہنے میں بڑی برجستگی اور آمد تھی۔ کہیں سے ابتذال اور بازاری زبان ولہجہ یا فحش کلامی کی مثال نہیں دی جا سکتی تھی۔ ان کے کلام سے خندۂ زیر لب اور کبھی کبھی قہقہہ زائی کی پھلجھڑی پیدا ہوتی تھی۔ وہ مشاعروں میں موجودہ ہزل گوئی اور طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی اخلاق سوزی اور زبان وبیان میں ناہمواری کی مستحکم ہوتی ہوئی روایت، غیر ادبی روش اور ناپختگی کے مظاہرے سے بہت دل برداشتہ تھے۔

قومی آواز، لکھنؤ کے ضمیمہ یا دوسرے اخبار و جرائد میں شائع ہونے والے اچھے ظریفانہ نمونوں کے حوالے پیش کر کے پیش پا افتادہ باتوں سے بچے رہنے اور خیالات میں ادبی وفکری حسن اور فنی خوبیاں پیدا کرنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ ان کے اس طرح کے مزاحیہ کلام کا بیشتر حصہ ایک مقامی مزاحیہ شاعر کی تحویل میں ہے جسے وہ اپنا سرمایۂ سخن بنا کر مشاعروں میں خوب داد وتحسین حاصل کر رہا ہے۔

نمونۂ کلام

درِ صبح پر آفتاب آرہا ہے ‏ ‏ اندھیروں کے سر پر عذاب آرہا ہے
پلٹ کر کہاں ذہن پہنچا ہے اپنا ‏ ‏ تصور میں گزارا شباب آرہا ہے
چلے آرہے ہیں جلو میں اجالے ‏ ‏ کوئی نازشِ ماہتاب آرہا ہے
یہ کفرانِ نعمت ہے کیسا کہ لب پر ‏ ‏ ابھی شکوۂ اضطراب آرہا ہے

ہماری جنوں خیزیوں کی بدولت زمانے میں پھر انقلاب آرہا ہے

خوشا کہ دنیائے رنگ وبو میں خدا کے محبوب آرہے ہیں
انھیں کی تشریف آوری پرہم اپنی آنکھیں بچھا رہے ہیں
سرِ فلک آج ماہ وانجم کہاں کے جلوے لٹارہے ہیں
تمام عالم کے ذرے ذرے تجلیوں میں نہارہے ہیں

منبع لطف وعطا ہے زندگانی آپ کی — سایہ گستر ہے سبھی پر مہربانی آپ کی
سجدہ ریزی میں جہاں گزری جوانی آپ کی — ہے ابھی غارِ حرا میں وہ نشانی آپ کی
بادۂ حبِ نبی کا جام پی کر دیکھئے — پھر نہ تڑپا پائے گی تشنہ دہانی آپ کی
حشر میں کرلیں گے خود ہی جرم کا اقبالؔ ہم — دیکھ کر اہلِ خطا پر مہربانی آپ کی

چلو پھر سبز گنبد کا نظارا کرلیا جائے — ستارا اپنی قسمت کا مجلیٰ کرلیا جائے
یقیناً سہل ہوجائیں گی ساری مشکلیں اپنی — اگر اس جان رحمت پر بھروسہ کرلیا جائے
اٹھیں سنگ جفا یا ہم پہ سوفاروں کی بارش ہو — نبی کے واسطے سب کچھ گوارا کرلیا جائے
شعورِ بندگی جن کے وسیلے سے ملا ہم کو — انھیں کا نقشِ پا اپنا مصلیٰ کرلیا جائے
بڑی مشکل سے ایسے دن کسی مومن کو ملتے ہیں — حرم کے سامنے سجدہ پہ سجدہ کرلیا جائے
جہاں دارالشفا ہے اس مسیحائے دوعالم کا — وہیں آزار عصیاں کا مداوا کرلیا جائے
ہمیں اقبالؔ فکر روزِ محشر اور کب ہوگی — دمِ آخر تو کچھ سامانِ عقبیٰ کرلیا جائے

مرثیۂ قاضی ظفر مسعود ابن مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

بوئے سنبل نکہتِ ریحاں ظفر مسعود تھے — باغِ اطہر کے گلِ خنداں ظفر مسعود تھے
ان کی خوش گفتاریوں سے دور ہوجاتے تھے غم — کشتگانِ درد کے درماں ظفر مسعود تھے
سورما بھی مانگتے تھے ان کی جرأت سے پناہ — دل کے رستم، عزم کے سلطاں ظفر مسعود تھے
ابتدائے زندگی سے تا بہ ایامِ اجل — بے نیازِ گردشِ دوراں ظفر مسعود تھے
معترف اقبالؔ ہر ذی ہوش ہے اس بات کا — چند انسانوں میں اک انساں ظفر مسعود تھے

قطعہ بروفات حاجی علی حماد مبارک پوری

وہ نکتہ دانِ محفلِ ایجاد بھی گئے علم وعروض وبحر کے استاد بھی گئے
واحسرتا کہ اور کچھ احباب کی طرح ہم سب کا ساتھ چھوڑ کے حماد بھی گئے
زندگی بھر زندانی افکار تھا ان کا وجود گردشِ حالات سے دوچار تھا ان کا وجود
راہِ علم وفن کے درماندہ مسافر کے لئے زندگی بھر سایۂ اشجار تھا ان کا وجود

الصلوٰۃ والسلام

اے شفیعِ روزِ محشر الصلوٰۃ والسلام ساقیٔ تسنیم و کوثر الصلوٰۃ والسلام
خیر و برکت کے سمندر الصلوٰۃ والسلام رحمت و رافت کے گوہر الصلوٰۃ والسلام
خوش نصیبی آپ کے قدموں سے ہوتی ہے نصیب اے مقدر کے مقدر الصلوٰۃ والسلام
انبیائے ذی حشم بھی مقتدی ہیں آپ کے اے امامِ ہر پیمبر الصلوٰۃ والسلام
مسجدِ اقصیٰ میں اب تک گونجتی ہے یہ صدا اے شبِ اسریٰ کے اختر الصلوٰۃ والسلام
آپ سے مخفی نہیں عقدہ کوئی توحید کا محرمِ اسرارِ داور الصلوٰۃ والسلام
ذرے ذرے جگمگا اٹھے ضیا سے آپ کی غیرتِ خورشید خاور الصلوٰۃ والسلام
محسنِ صدیق اکبر اور دمساز عمر یاورِ عثمان وحیدر الصلوٰۃ والسلام
فتح ونصرت ہیں زمیں بوسِ قدم، غزوات میں سربراہِ بدر و خیبر الصلوٰۃ والسلام
راہِ حق ہر طبقۂ انساں نے پائی آپ سے جادۂ وحدت کے رہبر الصلوٰۃ والسلام
دولت ایماں عطا کی آپ نے کونین کو خازنِ خلاق اکبر الصلوٰۃ والسلام
دم میں دم جب تک ہے اے اقبالؔ ذاتِ پاک پر مستقل کیجے نچھاور الصلوٰۃ والسلام

گلہائے تمنا

بموقع رخصتی حذیفہ خاتون بنت مختار احمد پورہ رانی مبارک پور

مری دعا ہے کہ تم باوقار ہوکے رہو جہاں میں لائق صد افتخار ہوکے رہو
تم اپنے گھر میں عروس بہار ہوکے رہو قبائے گل کی طرح مشکبار ہوکے رہو
حریمِ شوق میں ایفا شعار ہوکے رہو تم اپنی ذات سے اک غمگسار ہوکے رہو

اسی میں خالقِ کونین کی ہے خوشنودی
شریکِ زیست کی طاعت گزار ہوکے رہو

تم اپنی خوبیٔ کردار سے زمانے میں
رخِ سحر کی طرح جلوہ بار ہوکے رہو

نہ چھوٹے ہاتھ سے دامن کبھی تحمل کا
ہمیشہ پیکرِ صبروقرار ہوکے رہو

خدا کرے کہ نہ اتراؤ سربلندی پر
بڑوں کے سامنے تم خاکسار ہوکے رہو

ملی ہے جس سے تمہیں روشنی محبت کی
اسی چراغِ مبیں پر نثار ہوکے رہو

خدا بچائے ہوائے سموم سے تم کو
ہمیشہ غیرتِ فصلِ بہار ہوکے رہو

یہی تو آیۃ لاتقنطوا کا حاصل ہے
خدا کے فضل کی امیدوار ہوکے رہو

تمہاری ذات صداقت کی ہو امیں ایسی
کہ ہر نگاہ میں با اعتبار ہوکے رہو

صحابیات کا اسوہ رہے نگاہوں میں
وفا ومہر کی آئینہ دار ہوکے رہو

سخن طرازیٔ اقبالؔ کا یہ مقصد ہے
کہ اپنے رب کی اطاعت گزار ہوکے رہو

ادا سے پھیر کر خنجر گلے پر وہ لگے کہنے
شہیدِ ناز بتلاؤ کہ اس میں دھار کیسی ہے

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہیدِ ناز کی تربت کہاں ہے

کشش نہ ہوتی اگر کائنات ہستی میں
زمیں سے سلسلۂ آسماں نہیں ہوتا

علیِ لافتیٰ کی روایت ہے زندہ
شہِ کربلا کی شجاعت ہے زندہ

معطر نہ کیوں ہو مشامِ زمانہ
گلِ باغِ زہرا کی نکہت ہے زندہ

کوئی شرپسندانِ باطل سے کہہ دے
ابھی اہلِ حق کی جماعت ہے زندہ

محرم کے ایام ہیں اس کے شاہد
ہراک دل میں شہ کی محبت ہے زندہ

فنا ہوگئی سب کی فرماں روائی
حسین آپ کی بادشاہت ہے زندہ

دلوں میں ابھی سرفروشی کا جذبہ
شہِ کربلا کی بدولت ہے زندہ

ہزاروں نشیب وفراز آئے لیکن
حسین ابن حیدر کی عظمت ہے زندہ

ازل ہی سے اقبالؔ دل میں ہمارے
حسین وحسن کی عقیدت ہے زندہ

وہ دانا ہوکے کرتے ہیں یہ نادانی زبردستی
مرے گھر آکے فرماتے ہیں مہمانی زبردستی

یقیناً متحد کردوں گا میں شیخ وبرہمن کو
پہن کر ایک دن دھوتی پہ شروانی زبردستی

کریں گے دن دہاڑے کھل کے اظہارِ محبت ہم
کھلے گی دوپہر میں رات کی رانی زبردستی

وہ بچے کی ولادت پر ہوئے ہیں اسقدر بلبل
پلائے جارہے ہیں سب کو اچھوانی زبردستی

میں حال کا مفتی ہوں کوئی پوچھ کے دیکھے
ہر فتویٰ بتادوں گا شریعت کے علاوہ

بندوق بھی پستول بھی چاقو بھی چھری بھی
سب کچھ تو مرے پاس ہے ہمت کے علاوہ

رکھے دُمِ عقرب کی طرح مونچھ جو منھ پر
اس دور میں ایسا کوئی مردانہ کہاں ہے

کوئی مے کدہ ہو ضروری کہاں
کہیں بھی چٹائی بچھالی گئی

سدا مونچھ پر تاؤ پھیرا گیا
ضرورت پڑے دم دبالی گئی

جس کو جھونٹا کہتے کہتے باپ داد مرگئے
نوجوانو! تم اُسے زلفِ پریشاں مت کہو

جب سے شادی ہوئی نائی کی ضرورت نہ پڑی
روز بن جاتی ہے گھر میں ہی حجامت میری

اقبالؔ - اقبال احمد سیٹھ

— ۸/اپریل ۲۰۱۰ء

اقبال سیٹھ پڑھے لکھے، مہذب اور بڑے نستعلیق قسم کے انسان تھے۔ پرائمری احیاء العلوم میں پڑھی اور ہائی اسکول تک عصری تعلیم پانے کے بعد کاروبار میں لگ گئے۔ کافی محنت کی اور اپنی یکسوئی کی وجہ سے اپنا ایک خاص مقام بنایا۔

اقبال احمد سیٹھ مبارک پوری بہت خوبرو، خوش پوشاک، خوش مزاج اور خوش اطوار انسان تھے۔ بہت ہنس مکھ اور خلیق تھے۔ اونچی سوسائٹی پسند کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کا بھی اچھا انتظام کیا تھا۔ ادبی نشستوں اور علمی مجلسوں میں ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد اردو شاعری میں جونئی نسل کی جدیدیت کی لہر آئی اور اردو رسالوں میں نئی پود کی نئے لب ولہجہ کی نمائندہ غزلیں شائع ہوئیں تو وہ اقبال کو بہت پسند آئیں اور خود بھی اسی رنگ میں کہنے کی کوشش کی۔ شاعری کی ابتدا تھی اور مشق ومزاولت میں ابھی عمر نہیں گزری تھی اس لئے وہ بات پیدا نہیں ہوسکی۔ مگر جدید غزلوں کی تکنک ان کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی رہی یہ

سلسلہ کچھ دنوں جاری رہتا تو نکھار پیدا ہوسکتا تھا۔

کچھ مقامی شاعری کا ماحول بھی ان کی ادبی نشونما کے لئے رکاوٹ رہا۔ فضا ابن فیضی، ایاز اعظمی جیسے ماہرین سخن کی معیت وصحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہوتا تو ان کی فکروزبان میں اور نکھار پیدا ہوا ہوتا۔ انھیں فضا ابن فیضی کے رنگ بیان، انداز فکر اور اسلوب سخن سے خاص دل چسپی تھی۔ ان کی بیماریٔ دل نے انھیں مبارک پور کے شعری منظرنامے سے بہت جلد ہٹا دیا۔ ورنہ ان سے اچھی اور عصری شاعری کی امیدیں وابستہ تھیں۔ حرکتِ قلب بند ہونے سے ان کی وفات ہوئی اور مبارک پور کا مشہور قبرستان اونچی تکیہ ان کا مدفن بنا۔

نعت ومنقبت اور غزلیں کہتے تھے۔ زیادہ دل چسپی غزل سے تھی۔ جوہر مبارک پوری، کوثر مبارک پوری اور مولوی محمد خلیل گوہر مبارک پوری کے شعری مثلث سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ یہ تینوں پرانے لہجہ اور قدیم رنگ کے نمائندہ شاعر ہیں مگر ان کے ان استادوں کے مقابلے میں اقبال کے یہاں کچھ زیادہ فکری تازگی اور نئی لہر کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ان کی علیحدہ سوچ اور نئی شاعری کے مطالعہ کی برکت تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کا سماجی شعور زیادہ بیدار تھا۔

اقبال کو تعلیم وتعلم اور سماجی فلاح وبہبود سے بھی دل چسپی تھی۔ مدرسہ احیاء العلوم، اقرأ پبلک اسکول اور حراء ہائی اسکول سے وابستہ رہے۔ وہ ان اداروں کی ترقی واستحکام کے لئے ہمیشہ سرگرم رہا کرتے تھے۔ احیاء العلوم کے خازن بھی رہے ہیں۔ ہر مشکل وقت میں ان کا مشورہ مشعل راہ ہوا کرتا تھا۔ حسن کہیں بھی ہو یا کسی صورت میں ہو انھیں اپنی طرف مائل کرتا تھا۔ اچھا کھانا، اچھا رہنا سہنا، اچھا پہننا، اچھا بولنا ان کے مزاج کے موافق تھا۔ ان کی نفاست طبع ان کے شعری پس منظر سے جھلکتی ہے۔

نمونۂ کلام

وقت کے ہاتھوں میں خنجر دے گیا اک پسِ منظر بھی منظر دے گیا
ہاتھ میں لوگوں کے پتھر دے گیا رکھ گیا سر پر مرے شیشے کا تاج
کب جلا آشیاں نہیں معلوم برق چمکی تھی یاد ہے اتنا

پانی حویلیوں کی چھتوں سے گزار کر
طوفان سوگیا ہے سمندر کی گود میں
مری بستی ہے دیہاتوں کے حسیں منظر میں
میں ملوں گا تجھے کشمیر کے آگے پیچھے
بھائیوں کی دلہنیں آنے کا منظر خوب تھا
اس بڑے آنگن میں دیواریں کہاں سے آگئیں
بدنصیبی اسے بسا نہ سکی
گھر کی دہلیز راس آ نہ سکی
ہم سفر نے ہی خود جلا ڈالا
جلنے والی جہیز لا نہ سکی
ناؤ کو پھونک دیا پار اترنے والا
راہ میں کون ملا جاں سے گزرنے والا
روک دی خضر نے گرتی ہوئی دیوارِ یتیم
زرِ معصوم تھا لمحے میں بکھرنے والا

نعت

کوئی توصیف کرسکتا ہے کیا حضرت محمد کی
خدائے پاک جب کرتا ہے خود مدحت محمد کی
بسائیں کیوں نہ اپنے دل میں ہم الفت محمد کی
رضائے حق اسی میں ہے کریں طاعت محمد کی
زمانہ رشک کرتا ہے تری خوبئ قسمت پر
حلیمہ تونے پائی بے بہا دولت محمد کی
اُفق پر جب ہلالِ عیدِ میلاد النبی چمکا
بیاں ہونے لگی کونین میں سیرت محمد کی
بیاں اس سے سوا خُلق نبی کا اور کیا ہوگا؟
کلام اللہ کی تفسیر ہے سیرت محمد کی
عذابِ قبر کیسا اور دوزخ کی سزا کیسی؟
ادا ہوجائے دنیا میں اگر سنت محمد کی
فصیحوں کی فصاحت اور عمر خضر ہو پھر بھی
بشر سے ہو نہیں سکتی بیاں عظمت محمد کی
وہ سب کے واسطے رحمت کے بے پایاں سمندر ہیں
نہیں محدود رنگ ونسل میں رحمت محمد کی
دعا اقبالؔ کرتا ہے کہ اے رب العلا مجھ کو
دکھادے خواب ہی میں ایک دن صورت محمد کی

اقتدارؔ - سید اقتدار حسین ماہلی

۱۹۲۷ء — ۱۹۹۶ء

سید ابوجعفر ماہلی کے سب سے چھوٹے بیٹے اور اردو کے نامور ناقد وماہر لسانیات پروفیسر سید احتشام حسین رضوی ماہلی (۲۱/اپریل ۱۹۱۲ء - یکم دسمبر ۱۹۷۲ء) کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ کل پانچ بھائی بہن تھے۔سید احتشام حسین، سید وجاہت حسین،

سید انصار حسین، سید اقتدار حسین اور ایک بیٹی تھیں۔ علمی دنیا احتشام صاحب سے اچھی طرح واقف ہے۔ سید وجاہت حسین ضلعدار کے عہدے پر ممتاز تھے۔ مغربی یوپی کو چھوڑ کر وہ اتر پردیش کے مختلف اضلاع میں تعینات رہے۔ سید انصار حسین مدتوں دفتر سرفراز لکھنؤ کی ذمہ داریاں نبھاتے رہے اور وہ اس کی شہرت وناموری کی بنیاد کا پتھر بنے اس کو اوج ثریا تک پہنچاتے رہے۔

سید اقتدار حسین ماہلی اپنے والد کے انتقال (۱۶/جنوری ۱۹۲۹ء) کے وقت صرف ۲ برس کے تھے۔ گھر کی مختصر سی زمینداری تھی جس سے گھر کے مالی اخراجات کو پوری طرح سے چلانا مشکل تھا۔ والد نے ملازمت کر کے گھر کے سفید خرچ کی کفالت کرنی چاہی تھی مگر وہ بھی رہ گرائے ملک عدم ہو گئے تھے۔ ساری ذمہ داریاں والدہ محترمہ کے ناتواں کاندھوں پر آ گئی تھیں۔ یہ بہت ذہین وفطین اور صاحبِ استعداد تھے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اخلاقِ حسنہ میں اسلاف خاندان کا نمونہ اور شرافت ووضعداری نیز تہذیب وتواضع کی پاسداری میں طبقۂ اشراف کا پرتو تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں دہلی میں رہے اور وہیں فوت بھی ہوئے۔

یہ باقاعدہ شاعر تو نہیں تھے مگر دل کے بہلاوے کے طور پر کبھی کبھی شاعری کی نازنین کو بھی وقت دے دیا کرتے تھے اور مزاحیہ رنگ وانداز میں شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ شعر گوئی سے ان کا معاملہ بس شوق کی حد تک رہا اور یہ مشغلہ کبھی مرحلۂ شوق سے گزر کر سنجیدگی کی منزل تک نہیں آیا۔ اگر تفننِ طبع اور تفریح کی طرف عنانِ شوق مُڑی تو کچھ کہہ لیا اور پھر سن سنا کر دل کی تسکین کا سامان پیدا کر لیا اور بس۔ اس لئے اب ان کا کلام ناپید ہے۔

اکبرؔ - سید اکبر حسین رضوی مٹھن پوری

مٹھن پور متصل نظام آباد کے باشندے تھے اور شاعری سے دل چسپی رکھتے تھے مگر ان کے کلام کا جو نمونہ ملا ہے وہ نعت کا ہے جس سے ان کی خوش عقیدگی اور پابند مذہب ہونے کا پتا چلتا ہے۔ دیگر حالات وکوائف کا علم نہیں ہو سکا۔

مدینے میں ہر گوشہ جنت ہوا ہے　　نفس حامل نورِ وحدت ہوا ہے

مفصل بیاں رازِ فطرت ہوا ہے مکمل نظامِ شریعت ہوا ہے
پیامِ حیاتِ دوام آرہا ہے
زمیں سے لئے رازِ کونین جائے فلک پر فرشتوں کے مابین جائے
جو تا منزلِ قاب قوسین جائے سرِ عرش پہنے جو نعلین جائے
زمیں پر وہ نازک خرام آرہا ہے(۱)

حواشی:

(۱) نعت خیر المرسلین نمبر دوماہی العلم بمبئی اگست ۱۹۹۴ء۔ مدیر سید جواد زیدی ص ۲۳۷، ۲۳۸

اکرامؔ - اکرامؔ اللہ (ملک) سگڑی

۷؍جولائی ۱۹۳۷ء ـــــ ۱۵؍دسمبر ۲۰۰۴ء

پرگنہ سگڑی مغلیہ دور میں سرکار جون پور میں شامل تھا۔ آئین اکبری میں اس کا نام سکڈی لکھا ہے اور یہاں راج پوتوں کی آبادی بتائی گئی ہے(۱) ان دنوں سگڑی ایک چھوٹا سا گانو اور تحصیل کا صدر مقام ہے۔ یہیں دیوان محمد رشید برونوی جون پوری (۱۰۰۰ھ - ۱۰۸۳ھ) کے خلیفۂ ارشد حضرت میر سید قیام الدین سگڑوی ثم گورکھپوری متوفی ۲۸؍صفر ۱۱۲۸ھ کا خانوادہ بھی آباد ہوا۔ اور اس دیار میں علم وعرفان کی روشنی پھیلاتا رہا۔

اکرام اللہ محلہ ملک ٹولہ قصبہ سگڑی ضلع اعظم گڑھ کے باشندے اور ملک عبدالحق کے فرزند ارجمند تھے یہ کل پانچ بھائی تھے جن کے علی الترتیب نام ہیں (۱) ملک عبدالخالق (۲) ملک عبدالکلام (۳) ملک اکرام اللہ (۴) ملک ضیاء الدین (۵) ملک ریاض الدین۔ ان کا خاندان تحصیل سگڑی کا ایک معزز اور نامور گھرانہ مانا جاتا ہے۔ اس خاندان میں مذہبی وسیاسی اور تعلیم وتعلم کے پیشہ سے منسلک شخصیتیں خاندانی وجاہت وسیادت کی روایتوں کو فروغ دے رہی ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا ملک ضیاء الدین ضیاؔ منظر اسلام بریلی کے فارغ التحصیل عالم دین اور اسلامی درسیات کے کامیاب مدرس ہیں۔ نعت ومنقبت کی صنف میں ان کی شاعری ادبی ومذہبی

حلقوں میں ایک خاص وزن ووقار رکھتی ہے۔ بساط سیاست کے منجھے ہوئے کامیاب سیاست داں اور یوپی کی سیاسی دنیا کے نامور آزمودہ کار لیڈر ملک مسعود انھیں کے خانوادے کی خوبصورت کہکشاں کے چمکتے ہوئے ستارے ہیں۔ انھوں نے تحصیل سگڑی کے اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا۔ پھر شبلی کالج اعظم گڑھ سے انٹر، بی اے، ڈبل ایم اے اور بی ایڈ کیا۔

اکرام اللہ نے محنت سے درسیات کی تکمیل کی۔ وہ تاریخ اور اردو میں ایم اے پاس تھے۔ پڑھانے کا اچھا تجربہ تھا۔ وہ انگریزی کی ادبیات سے خاص شغف اور اس زبان کی شاعری سے ذہنی وابستگی رکھتے تھے۔

تکمیل تعلیم کے بعد ۱۹۶۰ء میں جوبلی ہائی اسکول راناواد (کاٹھیاوار) میں بحیثیت پرنسپل ان کی تقرری عمل میں آئی۔ وہاں سے آئے تو مئوناتھ بھنجن میں مختصراً پڑھایا پھر ایم پی انٹر کالج مبارک پور میں درس وتدریس سے وابستہ ہوئے۔ ترقی کر کے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۳۰؍جون ۱۹۹۸ء کو سبکدوش ہوکر وظیفۂ حسن کارکردگی حاصل کیا۔ اور اشرفیہ انٹر کالج مبارک پور میں مدعو کئے گئے یہیں کے دورانِ تدریس میں داعی اجل کو لبیک کیا۔

ان کی شادی دریا دیال پور ضلع اعظم گڑھ میں شاہدہ جبیں بنت صدرالدین فاروقی قانون گو سے ہوئی جو چار بیٹوں میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ ماشاء اللہ ابھی تک باحیات ہیں۔ اب ان کے میکے والے محمد پور اعظم گڑھ میں سکونت اختیار کر چکے ہیں اور باروزگار ہیں۔

ان کی تعلیم وتربیت میں ان کی والدۂ مکرمہ کی بڑی قربانیاں اور دعائے سحرگاہی کی برکتیں شامل تھیں۔ وہ بھی اپنی ماں سے بے پناہ محبت رکھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے مختلف انداز میں کیا ہے۔ وہ اپنے مجموعۂ کلام "گلہائے رنگا رنگ" کا انتساب ان لفظوں میں کرتے ہیں "والدۂ مکرمہ مرحومہ کے نام جن کی تعلیم وتربیت نے مجھے زندگی کا رمز شناس بنایا" "تیری ہی عنایت سے تو ہم پہنچے یہاں تک"

ملک اکرام اللہ دردمند طبیعت کے مالک تھے۔ وہ طرز محبت اور آداب وفا کا پاس ولحاظ رکھنے والے تھے۔ اپنے احباب اور رشتہ داروں سے انھیں قلبی لگاؤ تھا۔ رسم رفاقت کو نبھانا انھیں

خوب آتا تھا۔ ان کے مجموعے میں کئی ایسی نظمیں ہیں جو متعلقین کی وفات یا ان سے گہرے ربط وتعلق کے اظہار کے حوالے سے کہی گئی ہیں۔

ان کی والدۂ گرامی نے طویل عمر پا کر جب اس عالم فانی سے کوچ فرمایا تو انھوں نے چودہ بند پر مشتمل ایک رثائی مسدس کو نظم فرمایا جس کے دو بند یہ ہیں

ایام ترے سائے میں بچپن سے گزارے ہر گام پہ ڈھونڈھے ترے دامن کے سہارے
آئے بڑی آفات کے، طوفان کے دھارے ڈھارس سے تری ہم کبھی ہمت نہیں ہارے
ہر وقت رہیں ساتھ تری نیک دعائیں
آتی رہیں ٹلتی رہیں کتنی ہی بلائیں

ہر سخت گھڑی اس کے لئے کرلی گوارا لیکن ہمیں تعلیم کے زیور سے سنوارا
ہم دکھ میں پڑے تو دل وجان کو وارا منجدھار میں کشتی کو دیا اپنی سہارا
گنواؤں میں وہ انگنت احسان کہاں تک
تیری ہی عنایت سے ہم پہنچے یہاں تک

اکرام اللہ کو شعر وادب سے اوائل عمری ہی سے شغف تھا۔ انھوں نے غزلیں، نظمیں، قطعے، وفات نامے، رخصتی اور خیر مقدمی اشعار موزوں کئے۔ انھیں موضوعاتی شاعری سے ایک خاص قسم کا اُنس رہا۔ خشک سالی اور مبارک پور کے بارے میں بھی ان کا منظوم تاثر اُن کے مجموعے میں موجود ہے۔ ان دونوں نظموں کے اشعار درج ذیل ہیں۔

تپش سے مہر کی دن میں جھلس رہی ہے زمیں اداس فصلوں کو اب زندگی کی آس نہیں
پڑی نہ ایک بھی ننھی پھوار پھولوں پر نظر نہ آئے حسیں نغمہ ریز جھولوں پر
شعاعِ مہر سے چنگاریاں برستی ہیں گھٹاؤ آؤ کہ آنکھیں تمہیں ترستی ہیں
اپنی عظمت کے لئے چاروں طرف مشہور ہے بستیوں میں ایک بستی یہ مبارک پور ہے
دل سبھی کے مذہبی جذبات سے معمور ہیں کیوں نہ ایسا ہو کہ یہ اہل مبارک پور ہیں
گرم رہتی ہے یہاں ہر محفل علم وادب خوبیاں اپنے ہنر کی جس میں دکھلاتے ہیں سب

مذہبی تعلیم کی ہیں درسگاہیں جابجا　　علم کے شوقین پاتے ہیں پناہیں جابجا
اس جگہ دیکھا گیا ساڑی کے فن کا وہ کمال　　جس کی باریکی تلک پہنچا نہ اوروں کا خیال

ان کی ایک نظم کا عنوان ہے"شریک حیات سے" اس میں جذبات نگاری کی بڑی اچھی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ زندگی کے مختلف ادوار میں ازدواجی تعلقات کے کیا کیا موڑ آتے ہیں۔ فطری شرم وحیا کے تکلفات سے بے تکلفی کی منزل تک آنے میں زن وشوہر کو کن کن نفسیاتی مراحل اور تجربات ومشاہدات کی کیسی کیسی اجنبی، گمنام اوران دیکھی راہوں سے گزرنا پڑتا ہے اس نظم میں ان تاثرات واحساسات کی پرچھائیوں کو قید کرنے اوراس کوادبی شہ پارہ بنانے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ فکری وفنی دونوں اعتبار سے ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔

رشتہ داروں کی طرف سے ملنے والی محبتوں کے اعتراف میں ایک نظم "ایک رشتہ دار" بھی ہے جواس پہلو سے خصوصی توجہ کی طالب ہے کہ موجودہ دور میں خاندانی رشتوں کا بکھراؤ، تعلقات میں نجی مفاد کا تحفظ، اسلاف کی روایات سے انحراف، اخلاقی قدروں کی پائمالی، سماجی زندگی کے تانے بانے کا الجھاؤ ایک ایسا المیہ بن گیا ہے جس کا شکوہ معاشرے میں عام ہے لیکن ہمارے شاعر کی یہ اخلاقی بلندی ہے کہ وہ اس کے شاکی نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے قرابت دار کی قدردانیوں کو استحسان بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

ہمیشہ اس بھری دنیا میں بسنے والوں کے　　ملے ہیں نقش محبت کے بے شمار مجھے
سحر ہو، شام ہو، جب بھی چمن سے گزرا ہوں　　گلے لگا کے گلوں نے کیا ہے پیار مجھے
رہِ وفا میں جنوں لے گیا جدھر مجھ کو　　پکارے بڑھ کے حسینان گل عذار مجھے
بھلے برے مجھے ہر طرح کے ملے انساں　　ملا نصیر سا لیکن نہ رشتہ دار مجھے(۱)

ان کے ایک بچپن کے ساتھی علوی صاحب تھے ان کے تعلق سے انھوں نے اپنے اور ان کے بچپن کی یادوں کو تازہ کرکے ایک نظم کہی ہے جس میں ترقی پسندوں کی زبان، ان کے محاورے اور تشبیہات وعلامات کو فنکارانہ رنگ میں استعمال کرکے اپنے اخذ وقبول کے ملکہ کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور مثبت تبدیلیوں کے رخ کو پہچان کر اس کے ساتھ ہوجانے کا جذبہ ظاہر کیا ہے۔

لمحات زندگی کے گزارے ہیں ساتھ ساتھ شاداب کتنے دونوں کے بچپن کے باغ تھے
کافی اگر نہ ہوتی تھیں بستی کی وسعتیں جولانیوں کے واسطے پھر کوہ راغ تھے
جن کے دروں تک اپنے نہ پہنچے کبھی قدم وہ بے مکیں مکاں کی طرح بے چراغ تھے

ان کی شاعری پر انگریزی شاعروں کے عکس صاف محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے ہیئت اور اسلوب کے تجربے سے زبان کے تخلیقی استعمال تک اپنی اثر پزیری اور انجذ ابی طبیعت سے پردہ ہٹایا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تغیرات اور تبدیلیوں کا دوسرا نام زندگی ہے۔ جمود اس کی موت اور سکون اس کے بے معنی ہوجانے کی علامت ہے۔

انھوں نے انگریزی نصاب میں شامل نظموں کے منظوم ترجمے بھی کئے ہیں۔ انٹر میں پڑھائی جانے والی سبھی انگریزی نظموں کے آزاد اور پابند الفاظ ترجمے کے علاوہ کچھ ہائی اسکول اور بی اے میں متداول نظموں کو بھی اردو نظم کا لباس پہنایا ہے۔ ۱۹۹۶ء میں ان کی دو منظوم کتابیں گلہائے رنگارنگ اور عکس ماضی کے نام سے منظر عام پر آچکی ہیں۔ گلہائے رنگارنگ میں انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کے علاوہ طبع زاد نظمیں، غزلیں اور قطعات بھی شامل ہیں۔ انھوں نے انگریزی شاعروں کی ترجمانی کے بارے میں لکھا ہے کہ انگریزی شاعری کے لہلہاتے ہوئے باغ کو دیکھ کر میرا بھی ذہن اس طرف مائل ہوا مگر انگریزی نظم کی ٹیکنک اور اس کے انداز بیان کے ساتھ چلنا بڑا دشوار معلوم ہوا۔ پہلا ترجمہ میں نے جان کیٹس کی مشہور نظم LA BELLE DAME SANS MERCI (ایک بے رحم حسینہ) کا کیا اس کے ایک بند میں چار مصرعے ہیں جس کے دوسرے اور چوتھے مصرعے ایک ہی ردیف وقافیے کے ہیں۔ میں نے یہ لحاظ برقرار رکھا ہے اور ایسا ہی تاثر پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر جن نظموں میں انگریزی کی اپنی خاص ٹیکنک ہے اور اردو میں کسی صنف کی ٹیکنک ایسی نہیں ہے وہاں میں نے اپنی زبان کی ٹیکنک اپنائی ہے۔ کچھ نظموں کا آزاد ترجمہ بھی کیا ہے۔ ہر لفظ کا ہو بہو ترجمہ تو میرے لئے مشکل معلوم ہوا مگر کوئی شعر یا مصرع چھوٹ نہیں پایا ہے (۲)

ارباب فن جنھیں ادب پاروں کے لفظی ترجمہ کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ اس

حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ شعری رموز وعلائم، استعارات وکنایات، تلمیحات واستعارات، الفاظ کے دروبست اور صوتی ولسانی حسن اور اس کی روح کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آبگینوں اور حبابوں کے درمیان سے گزرنے سے زیادہ نازک ہے بلکہ جگر صاحب کی زبان میں "اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے" اکرام اللہ کی ہمت سخن اور عزیمت فن کی داد دینی پڑے گی کہ ان کا حوصلۂ ترجمہ نگاری کسی موڑ پر سرد نہیں ہوا اور اپنی منزل پر بحسن وخوبی پہنچ گیا۔

انگریزی نظموں میں انسانی نفسیات، مظاہر فطرت، رموزِ کائنات، تاریخ وتہذیب عالم کی ابدی قدروں اور مشاہدات وتجربات کی جو متنوع دنیا آباد ہے ادب کا معمولی طالب علم بھی اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ انھوں نے اس میدان کی طرف قدم بڑھا کر اردو شاعری کے تنوع میں اضافہ کیا ہے۔

نمونۂ کلام

ہنری ایک ڈیروز یو کی نظم To The Pupil کا ترجمہ (شاگرد سے

گلاب کھلنے کا موسم ہے، آرہا ہے شباب
میں دیکھتا ہوں تمہاری خرد کی نشو ونما
بکھر رہا ہے وہ کمزور سحر کا بندھن
تمھاری عقل کی طاقت کو جس نے باندھا تھا
تمھارے ذہن کی وسعت کا اب یہ عالم ہے
ترقی جیسے پرندوں کے بچے پاتے ہیں
نکل کے جیسے نشیمن سے ڈالی ڈالی پر
پروں کو اڑنے کی خاطر یہ آزماتے ہیں
وہ کیسے مختلف حالات کی ہواؤں سے
بہار علم کی پہلے کی تازگی کی پھوار
ہیں جانے کتنے نئے تجربے اثرانداز
ہو سچ کی قوت اعلیٰ کے تم بھی سجدہ گزار
مری خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی
میں صبح فردا کا جب آئینہ اٹھاتا ہوں
یہ دیکھتا ہوں کہ شہرت کھڑی ہے ہار لئے
میں سوچتا ہوں کہ کچھ اور زندگی پاؤں

شریک حیات سے

رہ حیات میں جس دن تمھارا ساتھ ملا
نہایا پھول تھا کوئی حیا کی شبنم میں
تھیں تم پہ سایہ فگن اجنبی بہاریں وہ
تمھارے ساتھ ہی وہ بھی شریک تھیں غم میں
ہمارے بیچ سے ٹوٹا وہ غیریت کا طلسم
جھجھک جھجھک کے نظر کی نظر سے بات ہوئی

بھلا کے خود کو ہم اک دوسرے میں کھو بیٹھے
چراغ عشق سے روشن رہ حیات ہوئی

یہ دست شوق بڑھے پھر تمہارے شانوں پر
تمھیں کو ڈھونڈھ رہے تھے جو ایک مدت سے

یہ اجنبی تھے ہٹاتے رہے ہو گھبرا کر
تھے دونوں دیکھتے اک دوسرے کو حیرت سے

سمجھ لیا اسی منزل کا یہ بھی راہی ہے
جہاں اکیلے ہی چل کر پہنچ نہیں سکتے

بڑے ہی پیار سے بڑھ کر گلے لگا ہی لیا
وہ پیار جو کسی منزل پہ بھی نہیں تھکتے

رواں ہیں دونوں اسی راہ پر اسی دن سے
چبھے ہیں تلووں میں کتنے ہی اپنے خار الم

کلیجہ تھام کے کچھ دیر بیٹھنا بھی پڑا
پھر اٹھ کے جانب منزل رواں دواں ہیں ہم

وہ صبح وشام کے دلکش نظارے یاد آتے ہیں
کسی کی مست آنکھوں کے اشارے یاد آتے ہیں

مجھے تم ہوش میں لانے کو دیتے تھے ہوا جن سے
نہیں بھولا ہوں وہ دامن تمھارے یاد آتے ہیں

گزر اکثر ہوا کرتا تھا اپنا جن کی محفل میں
دیار حسن کے وہ ماہ پارے یاد آتے ہیں

جنھوں نے میری الفت کے سفینے کو ڈبویا تھا
بھرے طوفان سے وہ تیز دھارے یاد آتے ہیں

حوادث میں جنھوں نے زندگی اپنی گزاری تھی
نہ جانے کیوں مجھے وہ غم کے مارے یاد آتے ہیں

چمک کے چند لمحے ٹوٹنا جن کا مقدر تھا
مجھے تو آسماں کے وہ ستارے یاد آتے ہیں

یہی کیا کم ہے کہ اک آہ سی بھر لیتے ہیں وہ بھی
برے دن اب بھی جوان کو ہمارے یاد آتے ہیں

ہم اپنی زندگی میں کیسے کیسے موڑ سے گزرے
شب تنہائی میں ہم کو وہ سارے یاد آتے ہیں

وہ بیتے دن تو اب ہرگز پلٹ کر آ نہیں سکتے
چمن میں وقت جو ہم نے گزارے یاد آتے ہیں

دیار غیر میں خالی نہیں دل یاد سے اُن کی
مجھے اپنے وطن کے چاند تارے یاد آتے ہیں

ادائیں یاد ہیں ساری، نہ بھولے ہیں نہ بھولیں گے
حسینوں کے وہ چہرے پیارے پیارے یاد آتے ہیں

رہِ حیات میں جتنے بھی حادثات ملے
ہر اک کی تہہ میں چھپے رازِ کائنات ملے

مری نظر میں تو غم ہی کا نام ہستی ہے
انھیں یہ غم، غمِ ہستی سے کب نجات ملے

سکوں سے ایسی ہے محروم یہ حیاتِ بشر
کہ اس زمیں پہ اسے دن ملے نہ رات ملے

بہت ہیں زندگی جن کی ہے موت سے بدتر
وہ کم ہیں موت سے جن کو نئی حیات ملے

وہ حسیں حسیں مناظر نہ کہیں نظر سے گزرے
ترے بعد بھی ہم اکثر تری رہ گزر سے گزرے

نہ شباب حسن فطرت، نہ بہار سیر گلشن
نہ نسیمِ صبح آئے، نہ صبا ادھر سے گزرے

یہ کھری کھری سی باتیں نہ سناتے آج ناصح
نہ گلی تمہاری دیکھی، نہ تمہارے در سے گزرے

یہ اداو ناز وشوخی، تو ہمیں سے ان میں آئی
ہمیں جھک گئے ہیں لیکن، وہ جدھر جدھر سے گزرے

ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو
چاہا بہت کہ رازِ محبت عیاں نہ ہو

تم پر بھی آنچ آئے گی گرنے سے ایک پر
بجلی کی زد میں لاکھ ترا آشیاں نہ ہو

نہ جانے کیوں تجھے اپنا سمجھ رہا ہے یہ دل
یہ جانتا ہے کہ ملنا محال ہے تیرا

بدل دیا غم دنیا کو کیف ومستی میں
ہراک خیال سے بہتر خیال ہے تیرا

کمالِ اہل جنوں کو خرد بھی مان گئی
نگاہِ دوست بڑا یہ کمال ہے تیرا

کھلا گلاب، شگفتہ ہے یا گلِ نسریں
عجب بہار پہ رنگِ جمال ہے تیرا

جہاں سے بھی ترے خانہ خراب گزرے ہیں
لئے وہ ساتھ نئے انقلاب گزرے ہیں

نقاب میں بھی تو وہ بے نقاب لگتے ہیں
غلط یہ بات کہ وہ بے نقاب گزرے ہیں

جو زندگی کے بہت ہی عزیز ہوتے ہیں
ترے بغیر وہ لمحے عذاب گزرے ہیں

جنھیں سمجھتی تھی دنیا غبارِ راہ گزر
زمیں پہ بن کے وہی آفتاب گزرے ہیں

کیا بتائیں کہ اس خرابے میں
زندگی کس طرح گزرتی ہے

دردوغم کے اتھاہ ساگر میں
ڈوبتی ہے کبھی ابھرتی ہے

علم ودانائی وحکمت کا سہارا لے کر
دیکھئے آج کا انسان کہاں پہنچا ہے

خواب اب ہے مہ وپرویں سے بھی آگے کا
مشکلیں کرکے یہ آسان کہاں پہنچا ہے

اپنے دامن کو ہم اشکوں سے بھر لیتے ہیں
دو گھڑی بیٹھ کے تقدیر کو رو لیتے ہیں

اپنی قسمت میں وہ پھولوں کا کہاں ہے بستر
نیند آتی ہے تو کانٹوں ہی پہ سو لیتے ہیں

حواشی:

(۱) ماسٹر نصیر احمد ضلع مئو

(۲) گلہائے رنگا رنگ۔ پیش لفظ ص ۷-۸

اکرامؔ - مولانا اکرام الحق مجددی

۲۷؍ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ ـــ ۲۹؍ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ/۱۷؍دسمبر ۲۰۰۹ء

وطن مداپور شمس پور پوسٹ گھوسی ضلع اعظم گڑھ (اب مئو) آپ کے والد کا نام حافظ محمد طیب تھا جو ایک متقی پرہیز گار اور پابند صوم وصلوٰۃ انسان تھے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ فیض عام محلہ بیسواڑہ گھوسی میں مولوی سعید احمد فتح پوری (۱۹۰۰ء - ۸؍فروری ۱۹۵۶ء) اور منشی سید وہاج الدین کے زیر درس ہوئی۔ اس کے بعد ۱۳۴۸ھ میں بنارس کے مشہور ادارہ مظہر العلوم میں داخل ہو گئے وہاں فارسی درسیات سے درس نظامی تک کی تمام کتابیں حضرت مولانا حافظ محمد عمر گھوسوی (۱۳۰۰ھ - ۱۳۹۱ھ) مولانا عزیز الحق کوثر ندوی (۱۳۲۸ھ - ۲۳؍رمضان ۱۴۱۳ھ/ ۱۸؍مارچ ۱۸۸۳ء) مولانا حافظ عبد الحمید مکی (۱۹۰۸ء - ۴؍جنوری ۱۹۸۶ء) اور مولانا عبد الرحمٰن بادشاہ پوری کی مجلس درس میں حاضری دے کر پڑھیں اور ۱۳۶۱ھ میں یہیں سے سند فراغ پائی۔

فراغت کے بعد اپنی مادر علمی مظہر العلوم سے اپنی تدریسی خدمات کا آغاز فرمایا۔ تقریباً دو برس تک بحیثیت مدرس یہاں تعلیم دی۔ اس کے بعد اپنے وطن گھوسی کے مدرسہ عربیہ خیر المدارس مدا پور شمس پور میں منتقل ہو کر آ گئے۔ اس سے علیٰحدگی کے بعد ۱۳۸۱ھ میں دار العلوم خیریہ فیض عام گھوسی کی تاسیس فرمائی۔ آپ اس میں تاعمر بحیثیت صدر المدرسین وشیخ الحدیث اور سربراہ اعلیٰ رہے۔

آپ کو جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ کی درسی کتابوں کی تدریس کا ملکہ حاصل تھا مگر آپ اپنے دینی شغف اور رجحان طبع کی وجہ سے کتب حدیث وتفسیر وفقہ کے درس میں زیادہ نشاط محسوس کرتے تھے۔ فارسی زبان میں آپ کو مہارتِ تامہ حاصل تھی۔

مولانا تصوف آشنا طبیعت رکھتے تھے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت مولانا محمد عمر صاحب گھوسوی سے مرید تھے۔ یہ ایک سلیم الطبع، اعتدال پسند، منکسر المزاج، عبادت گزار اور خلق خدا کی بھلائی چاہنے والے مرد حق آگاہ اور وسیع النظر عالم دین تھے۔ زہد وتقویٰ کے ساتھ

ساتھ شاعری سے بھی شغف تھا مگر اس کا علم کم لوگوں کو تھا۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام" وارداتِ قلب" کے نام سے ۱۹۹۷ء میں سرفراز آفسیٹ پریس مئو سے چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔ اس میں اردو کے دوش بدوش عربی وفارسی میں بھی کہے گئے اشعار ہیں۔ یہ مجموعہ حمد ومناجات، نعت ومنقبت کے علاوہ کچھ دیگر اصناف پر مشتمل ہے۔

ان کے اشعار کی زبان سہل وسلیس اور سادہ ہے مگر وارداتِ قلب کے اظہار کی وجہ سے رنگین اور پُرتاثیر ہوگئی ہے۔ انھوں نے شاعری کو اپنی روحانی بالیدگی کے لئے منتخب کیا تھا اس کو وہ اپنی ذات تک محدود رکھتے تھے اسی وجہ سے بعض جگہ فنی اعتبار سے جھول پیدا ہوگیا ہے مگر یہ شاعری سچی اور حقیقی زندگی کا شعری اظہار ہے اس لئے قابلِ قدر ہے۔ نعت ومنقبت میں دل کی بات کہی گئی ہے۔ مبالغہ آرائی، اور زیب داستاں کے لئے استعمال میں آنے والے خیال ولفظ سے اجتناب برتا گیا ہے۔ ایک نظم ہندوستانی حالات کے سیاسی تناظر میں بھی کہی گئی ہے جس میں سیاسی شخصیتوں کے نراجی عمل کی مذمت کی گئی ہے۔ دوسری نظم میں نوجوانوں کو سیاست کی نئی جہت تلاش کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ یہ دونوں نظمیں شاعرانہ اعتبار سے گوکہ کوئی خاص درجہ نہیں رکھتیں لیکن جذبے کی صالحیت کی بنیاد پر اس کی بڑی اہمیت اور افادیت ہے۔ انھوں نے نعتوں میں صفات وکمالات محمدیہ پر ہی توجہ مبذول کی ہے۔ دوسرے پہلودار مضامین وخیالات سے صرفِ نظر کیا ہے۔

نمونۂ کلام

ہر صحابی نے بقدرِ حوصلہ دیکھا تمہیں — اصل صورت پر بلا شبہہ ہے پردہ نور کا
نور مطلق سے گیا ملنے کو صدر کائنات — لامکانی بزم ہے، منظر نرالا نور کا
راز کچھ کھلتا نہیں محبوب کا — اصطفا کے باغ کا ایسا ہے پھول
پیروی ان کی فلاح دوجہاں — معصیت ان کی سراسر ہے وبال
جان ودل کو اور دیں پر کر نثار — ان پہ مٹنا ہی تو ہے حق سے وصال
دوعالم کی چیزوں سے تشبیہ کیسی — کہ نور خدا ہو دوعالم سے بالا
وہ دل بن گیا عرشِ پاکِ الٰہی — جمالِ محمدہے جس میں سمایا

ہے رضا اللہ کی مرضی تمہاری بے گماں
بالاصالت ہو تمھیں محبوب ربانی حضور

خدا سب کا خالق ہے معبود یکتا
نبی عبد یکتا ہیں بے مثل انساں

جس کو اپنا دامن رحمت اڑھادیں مصطفیٰ
اس غلام بخت ور کی مرحبا کیا بات ہے

پرتوِ حسن ازل ہے روئے انور آپ کا
تابشِ رخ سے جہاں کی روشنی سب مات ہے

جبریل امیں پر بھی ہے فیضان محمد
کونین میں کس پر نہیں احسانِ محمد

ہے ارض وسما سے بھی پرواز آگے
وہ نورِ خدا رہروِ لامکاں ہے

کلامِ خدا ہیں تمہارے کلام
بلاغت کے چشمہ، فصاحت کے چاند

نگاہِ ترحم حبیبِ خدا
ہو اکرامؔ پر اے سعادت کے چاند

مری نظر میں وہ جلوے سمائے جاتے ہیں
ہٹائے جاتے ہیں پردے ہٹائے جاتے ہیں

ہنسی میں پھولوں کی، تاروں کی جگمگاہٹ میں
وہی تو ہیں جو نہاں ہو کے پائے جاتے ہیں

وہ لامکاں کے مکیں ہیں مگر یہ عالم ہے
حریمِ دل میں ہی آکر سمائے جاتے ہیں

ہٹا کے پردۂ غفلت کو دیکھ لے اکرامؔ
تلاش جن کی ہے، تجھ میں وہ پائے جاتے ہیں

اکرمؔ - مولوی محمد اکرم فاروقی محمد آبادی

۱۴؍اگست ۱۸۷۵ء؍ ۱۴؍رجب ۱۲۹۴ھ ـــ ۱۹۳۳ء

مولوی اکرم صاحب محمد آباد گوہنہ کے صاحب ثروت اور رئیس گھرانے کے فرد تھے۔ آپ کے دادا منشی اکرام فاروقی بہت بڑے زمیندار تھے۔ اعظم گڑھ اور محمد آباد میں کافی جائداد تھی۔ سٹھیا آن ضلع اعظم گڑھ میں بھی بہت بڑی زمینداری تھی جس کے کچھ حصے پر بابو لال سارائے کا خاندان قابض ودخیل ہوگیا ہے اور انھیں کی زمین پر کالج بھی قائم ہے/ ان کے تین اولاد تھی۔ عبدالغفور، عبدالرؤف اور عبدالشکور، آخرالذکران کی موجودگی ہی میں فوت ہو گئے۔ منشی اکرام بہت غریب ترس، حکام رس اور انگریزی حکومت میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔ علومِ مروجہ اور عربی وفارسی اور اردو میں صاحب لیاقت مانے جاتے

تھے۔ زیارت حج سے بھی مشرف ہو چکے تھے۔ جامع مسجد اعظم گڑھ کے پاس ان کی قبر ہے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد انتقال کیا۔ ان کی تعمیر کردہ مسجد سٹھیاؤں، اعظم گڑھ روڈ پر داہنی سمت سڑک کے کنارے واقع ہے جو منشی اکرام کی مسجد کے نام سے عوام میں مشہور ہے اس میں قاضی قاری عزیز الرحمٰن مبارک پوری امامت جمعہ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

آپ کے جد امجد مولوی منشی اکرام نے آپ کا نام محمد رکھا تھا۔ اکرم مولوی عبدالغفور فاروقی محمد آبادی کے صاحبزادے تھے۔ مولانا عبدالغفور صاحب لیاقت بزرگ اور کئی کتابوں کے مصنف گزرے ہیں۔ صدر الصدور کے عہدے سے سبکدوش ہو کر گھر رہنے لگے تھے۔ یکم جمادی الاول ۱۳۳۳ھ ان کی تاریخ وفات ہے۔ اکرم اپنے وقت کی نامور شخصیت تھے۔ محمد آباد اور اعظم گڑھ میں گھر پر اتالیق رکھ کر تعلیم پائی تھی۔ مولوی عبدالغفور صاحب جب راجہ پڈرونہ ضلع دیوریا کی ریاست سے سبکدوش ہوئے تو آپ کو بحیثیت منیجر وہاں رکھا گیا۔ آپ نے راجہ پڈرونہ کی ریاست کو اپنی خوش انتظامی سے معاشی استحکام بخشا۔ اس وجہ سے راجہ آپ سے بہت خوش رہتا تھا۔ اور وقتاً فوقتاً انعام سے نوازتا رہتا تھا۔ آپ راجہ کے بچوں کے اتالیق بھی تھے۔

مولوی اکرم طبعاً بہت ملنسار، ہنس مکھ، پُر مذاق۔ مہمان نواز اور ہمدرد واقع ہوئے تھے۔ قبرستان پابندی سے جاتے تھے۔ قبروں کی شکستگی کو دور کرنے اور اس کی مرمت سے انھیں خاص دل چسپی تھی۔ عرس اور قوالی کے بڑے شوقین تھے۔ تعزیہ داری کے بھی قائل تھے۔ باغبانی اور تعمیر مکان میں بڑی خوش ذوقی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ سیاسی وسماجی کاموں سے بھی خاص شغف رکھتے تھے۔ عوام وخواص میں بااثر اور ذی حیثیت سمجھے جاتے تھے۔ انگریزی حکومت نے ملکہ وکٹوریہ کی تاجپوشی کے زمانے میں خانصاحب کا خطاب بھی دیا تھا۔ پائجامہ، کرتا، شروانی اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ ہاتھ میں چھڑی بھی رہتی تھی، آپ کے چار ذکور اور چار اناث کل آٹھ اولادیں تھیں۔ سات اولادیں بچپن ہی میں فوت ہو گئیں۔ ایک لڑکی بدر النساء ۱۹۸۳ء تک زندہ تھیں اور ان کی عمر ستر کے حدود میں تھی۔ ان کا بہت بڑا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں قلمی مطبوعہ اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں تھیں۔ آپ طالب علمی ہی سے تنفس کے مریض تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ

پڈرونہ ضلع دیوریا میں گزرا۔ آخر عمر میں علیل ہوکر محمد آباد گوہنہ آئے اور استعفیٰ بھیج دیا۔

منشی اکرام کے روابط سرسید سے تھے اور انھوں نے علی گڑھ کی عصری درس گاہ کے لئے ان کی بھرپور معاونت کی تھی۔ اس سلسلے میں یہ حوالہ بڑا قیمتی ہے۔

سرسید نے اپنے کالج کی امداد کے لئے اعظم گڑھ کا سفر کیا تھا اور محمد آباد کے خاندان شیوخ کے سرخیل منشی محمد اکرام محمد آبادی وکیل وتعلقدار ورئیس محمد آباد کے مہمان تھے۔ سرسید نے مشرقی اضلاع کا اس سلسلے میں دورہ کیا تھا منشی اکرام نے انھیں شیخ جمن دلال جو شہر اعظم گڑھ کے عمائدین میں تھے اور کئی اونٹ گاڑیوں کے مالک تھے ان سے بھی سرسید کو چندہ دلایا تھا(۱)۔

منشی اکرم سے سرسید کے روابط کا ذریعہ شاید محمد آباد گوہنہ کے نامور فرزند محمد کریم کی ذات ستودہ صفات بنی ہو جو علی گڑھ کے ڈپٹی کلکٹر تھے اور علامہ شبلی نعمانی جب علی گڑھ گئے تھے تو انھیں کے مہمان ہوئے تھے۔

مولوی اکرم صاحب کے روابط چریا کوٹ کے آستان علمی سے بھی استوار تھے۔ محمد اعظم جلالی (۱۲۶۶ھ - ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۳ء) نے اپنے روزنامچہ میں جگہ جگہ ان کا نام لیا ہے۔ مولوی نجم الدین عباسی چریاکوٹی (۱۲۴۰ھ - ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۹ء) نے انھیں کے مشورے پر اپنے دواوین کے مشکل الفاظ واسماء اور بعض تصریح طلب امور کے معانی ومطالب کا اضافہ کیا تھا۔ ان کا ادبی مذاق بھی پختہ تھا۔

آپ کو اردو نظم ونثر سے دلچسپی تھی۔ راجہ پڈرونہ کے خاندانی حالات میں ثمر نایاب نامی ایک کتاب آپ سے یادگار ہے۔ دیوان وغیرہ ضائع ہوگئے، ختم خانۂ جاوید۔ لالہ سری رام دہلوی ج ۱ ص ۳۹۲ پر یہ دوسطری عبارت ہے کہ "اکرم تخلص ہے کسی خوش فکر باشندۂ محمد آباد ضلع اعظم گڑھ کا۔ زمانۂ حال کے موزوں طبع شعراء میں سے ہیں"۔ یہ خاصۂ افکار ہے۔

مستی پر وہ کیا پان کھائے ہوئے ہیں دھوئیں سے وہ شعلہ اٹھائے ہوئے ہیں
نہیں پاس دل بھی کروں پیشکش کیا مرے گھر وہ مہمان آئے ہوئے ہیں
مرکر بھی ترے زیرِ قدم گھر بنائیں گے قبر اپنی تیرے در کے برابر بنائیں گے

کہتا ہے ناز ان سے ذرا تم جواں تو ہو　　طرزِ ستم سکھاکے ستم گر بنائیں گے
ہنس کر وہ بولے تجھ کو رلاتے ہیں اس لئے　　ہم تیرے اشکِ چشم سے گوہر بنائیں گے
دنیا کی کج ادائی سے گھبرا گیا ہے دل　　دور فلک سے گھر کہیں باہر بنائیں گے(۲)

حواشی:

(۱) ابوعلی اثری پندرہ روزہ کانفرنس گزٹ علی گڑھ یکم جون ۱۹۷۴ء ص ۷، بحوالہ جون پور کا ایک سفر

(۲) خم خانۂ جاوید ص ۳۹۲

اکرمؔ صدیقی - غلام اکبر

یکم مئی ۱۹۱۴ء ـــــ ۱۴؍جنوری ۱۹۹۵ء

آپ نسباً صدیقی ہیں۔ اجداد میں سے ایک صاحب کو کسی بزرگ یا امیر نے خاں کا خطاب دیا تھا۔ آپ کے مورث اعلیٰ ابراہیم شرقی کے عہد میں سپاہ ابراہیم آباد کی چھاؤنی کے اعلیٰ افسر تھے۔ وہ جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اسی کو اپنا مسکن بنالیا۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں اس خاندان کو گزر بسر کے لئے معافی کی زمین ملی تھی۔ کم سنی ہی میں آپ کے والد حاجی حافظ غلام اطہر صدیقی ساکن موضع سپاہ ابراہیم آباد، پرگنہ وتحصیل گھوسی کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ شفیق چچا حاجی غلام اکبر مرحوم جو ریاست حیدرآباد دکن کے نواب کے سرکاری وکیل تھے اپنے یتیم و یسیر بھتیجے کو تعلیم و تربیت کے لئے حیدرآباد لے گئے۔ حیدرآباد میں اردو، فارسی، عربی کی تعلیم مولانا احمد مکرم عباسی چریاکوٹی سے حاصل کی۔ حیدرآباد میں سات سال تک قیام رہا۔ طویل علالت کی وجہ سے سپاہ لوٹ آئے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر مولانا احمد مکرم عباسی کی خدمت میں بغرض تعلیم حاضر ہوئے۔ مولانا اس وقت حیدرآباد سے مستقلاً اقامت گزینی کے لئے چریاکوٹ آچکے تھے۔ اور تدریس کا سلسلہ یہاں بھی قائم کر چکے تھے۔ انھوں نے دوبارہ اکرم صدیقی کو درسیات کی تکمیل کے لئے اپنے حلقۂ درس میں شامل کرلیا مگر یہاں بھی علالت آڑے آئی اور معالجوں نے دماغی محنت سے انھیں روک دیا۔ پھر بھی شوق مطالعہ کے سبب علم وادب سے شغف باقی رہا۔ ۱۹۵۵ء میں پرائیویٹ

طریقے سے ہائی اسکول پاس کیا اور وشارد میں بھی کامیابی حاصل کی جو سنسکرت کا کورس ہوتا ہے۔

آپ کے برادر کبیر مولوی غلام اظہر صاحب بھی ضلع رائے گیر حیدر آباد میں منصف کے عہدے پر تعینات تھے اس لئے خانگی امور کی انجام دہی اور زمینداری کی ذمہ داری آپ کے سپرد تھی۔ ان کی بڑی عزت وتوقیر تھی۔ چالیس سال تک بلا مقابلہ اپنے موضع سپاہ ابراہیم آباد کے پردھان منتخب ہوتے رہے۔ آپ کے مختلف شوق تھے مثلاً پرانے سکے، نوٹ کو جمع کرنا، ڈاک ٹکٹ، ڈاک لفافہ، مختلف ممالک کے سکے خاندانی شجرے، لوگوں کی ولادت ووفات کا اندراج وانضباط۔ چوں کہ آپ ایک ذمہ دارانہ عہدہ رکھتے تھے اس لئے بھی لوگوں کے احوال کی معلومات رکھتے تھے۔

ایک واقعہ ہے کہ آپ کی ڈائری جس میں ولادت ووفات کا اندراج ہوتا رہتا تھا عدالت میں پیش ہوئی تو ملزم بری ہو گیا۔

آپ شعروشاعری سے بھی وابستہ تھے۔ ۱۹۵۱ء میں آغازِ سخن کیا۔ اس میدان میں مشہور استاد شاعر رحمت الٰہی برق اعظمی کو اپنا رہنما بنایا تھا اور انھیں سے اصلاح لیتے تھے۔

سپاہ میں مشاعروں کا انعقاد کیا کرتے تھے۔ حمد، نعت، غزل اور قطعہ نگاری میں فکر سخن کرتے تھے۔ آپ اپنے کلام کے نیچے مقام وتاریخ لکھنے کے عادی تھے۔ آپ نے چند سال شاعری کی معلوم نہیں کیوں اس شوق کو ترک کر دیا۔

آپ نہایت ذکی اور پختہ رائے اور دور اندیش تھے۔ اپنے معمول کے پابند اور وقت کے قدرداں تھے۔ سونے میں تاخیر ہو سکتی تھی مگر روز نامچہ لکھے بغیر ان کے لئے سونا مشکل تھا۔ تاریخ کے مطالعے کا بے حد شوق تھا اسی ذوق کی وجہ سے تاریخی نوادرات اور یادگاریں سنبھال کر رکھتے تھے۔

منتخب کلام کا ایک مجموعہ "رنگ وبو" کے نام سے ۳۶ صفحات پر مشتمل غیر مطبوع حالت میں ان کے اخلاف کے پاس موجود ہے۔

نمونۂ کلام

میری دیوانگی کو پیار نہ کر — عشق کا راز آشکار نہ کر
چندروزہ ہے حسن کی شوخی — حسن کا کوئی اعتبار نہ کر

ان کی محفل میں ہم پہ جو گزری
تذکرہ اس کا بار بار نہ کر
میری راتیں تو کٹ ہی جائیں گی
اپنے ایام سوگوار نہ کر
دور وحشت کی یادگار ہے یہ
دامنِ غم کو تار تار نہ کر
پوچھ کر حال ہم غریبوں کا
اور بھی دل کو بے قرار نہ کر
آچکا آچکا وہ اے اکرمؔ
اس کے آنے کا انتظار نہ کر

ساقی بھی وہی محفل بھی وہی صہبا بھی وہی بادہ بھی وہی
تھی رونق میخانہ جن سے وہ رند نہیں وہ جام نہیں

دل ہی جب اپنا رہنما نہ رہا
ہم کو پھر غیر کا گلہ نہ رہا

فیضان ہے ان کا عام مگر محرومیِ قسمت تو دیکھو
گلزار محبت میں رہ کر فردوس بداماں ہو نہ سکا
زنجیر غلامی کٹتے ہی تخریب کا پرچم لہرایا
تعمیر کے دعویداروں سے کچھ کارنمایاں ہو نہ سکا

صنم خانے ہزاروں راہ میں آئیں تو کیا پروا
جبینِ حق شناس اپنی ہر اک جا خم نہیں ہوتی
خدا آباد رکھے روئے روشن کے تصور کو
مری شامِ الم صبحِ طرب سے کم نہیں ہوتی
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے محبت میں مرے سر سے
گزر جاتا ہے طوفاں، آنکھ لیکن نم نہیں ہوتی

اک نظر میری طرف فرمائیے
دل پریشاں ہے اسے سمجھائیے
ماہ بن کر گر نہیں آتے نظر
برق بن کر ہی نظر آجائیے
آپ ہی کا راز ہوگا آشکار
غیر کے آگے نہ منھ کھلوائیے

جدا سایہ بھی تاریکی میں ہوجاتا ہے اے اکرمؔ
برے دن جب بھی آتے ہیں کوئی پرساں نہیں ہوتا

اکرمؔ اعظمی - محمد اکرام

تخمینی ۱۹۵۲ء ـــ ۱۳ر نومبر ۲۰۱۳ء

قصبہ نظام آباد اور موضع لاہی جی کے درمیان ہمارے ضلع اعظم گڑھ کا ایک غیر معروف موضع وزیر پور ہے۔ محمد اکرام اکرمؔ اعظمی کا خاندان وہیں کا تھا۔ مشہور قصبہ سرائمیر کے پاس موضع اسرولی ان کا نانہال تھا۔ اکرم کی پرورش یہیں ہوئی۔ سرائمیر سے مڈل پاس تھے۔ لائف انشورنس

آف انڈیا (بھارتیہ جیون بیمہ نگم) کے ایجنٹ تھے۔ مستقل سکونت سرائمیر میں اختیار کر رکھی تھی۔ ان کے پسماندگان میں چھ بچے اور تین بچیاں ہیں۔ اہلیہ بھی حیات ہیں۔

انھوں نے شاعری میں رئیس احمد ایاز اعظمی تلمیذ رحمت الٰہی برق اعظمی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ان کے استاد ایاز اعظمی تو سماجیات ونفسیات کی گرہ کشائی سے دل چسپی رکھتے تھے مگر اکرم نے معاملات دل اور واردات عشق کو اپنی شاعری کا موضوع بنالیا تھا۔ ڈاکٹر شفیق اعظمی (پ ۱۹۴۹ء) سے بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ چوں کہ دونوں ایک ہی استاد کے خرمن سخن کے خوشہ چیں تھے اس لئے دونوں میں اور مستحکم رشتۂ رفاقت قائم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر شفیق اعظمی نے راقم سے فرمایا تھا کہ طویل رفاقت ومعیت میں کبھی ناخوش گواری یا گرانی طبع کا احساس مجھے نہیں ہونے دیا۔ کوئی بات ہوئی تو نہایت محبت کا سلوک ظاہر فرمایا۔ جب ملے تپاک اور گرم جوشی سے ملے۔ ان کے دل کی کتاب کا ہر ورق بے داغ وروشن تھا۔

اکرم بہت ہی ہنس مکھ اور ملنسار تھے۔ اخلاق ومروت اور دوستوں سے رسم وفا نبھانے والے انسان تھے۔ انھیں سماجی اور فلاحی کاموں سے بھی ایک خاص قسم کا تعلق تھا۔ وہ سماجی سرگرمیوں میں نمایاں دل چسپی لیتے تھے۔ وہ مترنم شاعر تھے اور مشاعروں میں اپنی رومانی اور عشقیہ شاعری کے دوآتشہ کی وجہ سے بہت پسند کئے جاتے تھے۔ جب جھوم کے پڑھتے تھے تو جذبات سے مملو اپنے کلام سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی دھڑکنیں بڑھا دیتے تھے۔ حسن وعشق کے مضامین سے ہٹ کر وہ ادب اسلامی کے شعور سے بھی رشتہ رکھتے تھے۔ اخلاق وتہذیب اور تاریخ وتمدن سے اپنی محاکاتی شاعری میں استفادہ کرتے تھے۔ آزادی کے بعد سیاسی گل یاروں اور حکومت کے ایوانوں میں رہنے والے ابنائے زمانہ نے مسلم معاشرہ کے مسائل کی فہرست کو طولانی بنانے کی جو خاموش مہم چھیڑ رکھی ہے اور اس نے مسلمانوں کے زوال کا کوئی بھی راستہ کھولنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ ان سب مصائب وشدائد کے مراحل ان کی شاعری کا عنوان ہیں۔ انھوں نے زندگی کی سلگتی ہوئی حقیقتوں کو اپنی علامتوں اور استعارہ کے پردہ میں واشگاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی زندگی قوم کے دھارے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اپنے معاشرہ کے

دکھ درد کو اپنے غم کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ ان کی زبان کا لہجہ رجائی ہے۔ ان کی نظر مستقبل کے اجالوں پر بھی ہے اسی لئے ان کے یہاں تیقن کی متاع گراں بہا موجود ہے۔ وہ صرف غزل کے شاعر تھے اور اسی صنف میں اپنی جودت طبع کے جوہر دکھاتے تھے۔

نمونۂ کلام

بدلا اس کا تیور ہے — چپ رہنا ہی بہتر ہے
کل کا دن ہے عید کا دن — چاند وہ دیکھو چھت پر ہے
سبق آموز ہے سو بار گرنا اور سنبھل جانا — مگر ننھی سی چیونٹی کا غذا لے کر نکل جانا
یقیناً سرخ رو ہوگا وہی اک دن زمانے میں — جسے آتا ہے اکرمؔ وقت کے سانچے میں ڈھل جانا
ابھی بے جا ہے اکرمؔ خوش گمانی — ابھی منزل نہیں یہ راستا ہے
چہرہ ابھی سے تیرا پسینے میں کیوں ہے تر — کرنا پڑے گا مجھ کو ابھی منزلوں سفر
آجائے جوش رحمتِ پروردگار کو — اکرمؔ مری دعاؤں میں اتنا تو ہو اثر
کھنچی کھنچی سی یہ ابرو غضب بھری آنکھیں — ضرور آج کہیں برق گرنے والی ہے
جو تنگ دل تھے انھیں خُم پہ خُم ملے لیکن — ہم اہل ظرف کے ہاتھوں میں جام خالی ہے(۱)

حواشی:

(۱) بشکریہ ڈاکٹر انور شفیق سرائمیر

اکرمؔ اعظمی - عبدالرحمٰن

شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ جب کا یہ کلام شامل کیا جا رہا ہے اس وقت یہ بی اے کے سالِ اول کے طالب علم تھے۔ ان کا کلام کالج میگزین سے لیا گیا ہے۔

جس طرح رات، دن کا ہو عنواں لئے ہوئے — ہر غم ہے یوں مسرت پنہاں لئے ہوئے
دل میں خیالِ عارضِ جاناں لئے ہوئے — صحرا میں گھومتا ہوں گلستاں لئے ہوئے
دستِ عطائے وقت کی فیاضیاں نہ پوچھ — دامن میں پھر رہا ہوں گریباں لئے ہوئے

للّٰہ اب تو گردشِ دوراں معاف کر
جاؤں کہاں کہاں غمِ احساں لئے ہوئے
شائد رفوئے چاک جگر کی ہوئی ہے فکر
دستِ جنوں ہے چاک گریباں لئے ہوئے
کچھ رہبرانِ وقت کو انعام دیجئے
انسانیت کی لاش ہے انساں لئے ہوئے
اکرمؔ کسی کی پُرششِ احوال کیا کہیں
ہم دل میں گھٹ کے رہ گئے ارماں لئے ہوئے (۱)

حواشی:

(۱) شبلی نیشنل کالج میگزین اعظم گڑھ سالانہ نمبر ۱۹۶۰ء ص ۶۸

اکملؔ - مرتضیٰ حسن (۱) اساڑھوی

۱۹۰۱ء ــــ ۲۵/جنوری ۱۹۷۵ء

مرتضیٰ حسن اکملؔ ضلع اعظم گڑھ کے ایک غیر معروف گانو"اساڑھا" میں ۱۹۰۱ء کے آس پاس پیدا ہوئے اور چوہتر برس کی عمر میں ۲۵/جنوری ۱۹۷۵ء کو اس دارِ فانی سے رحلت کر کے اپنے مولد"اساڑھا" ہی میں مدفون بھی ہوئے۔ان کے والد شیخ محمد عمر اطراف میں اچھے گھوڑسوار کی حیثیت سے معروف تھے۔

گھر کی ابتدائی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لئے مدرستہ الاصلاح سرائمیر بھیج دیئے گئے، جہاں انھوں نے اردو، فارسی اور عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ نامساعد حالات کے باعث سلسلۂ تعلیم قائم نہ رہ سکا، اور مدرستہ الاصلاح سے سندِ فراغت لئے بغیر اپنے وطن اساڑھا واپس چلے گئے۔ پھر اپنے آبائی پیشۂ زمینداری کے چکر میں کچھ ایسے پڑے کہ تعلیم و تعلم کی طرف لوٹنے کی مہلت نہ نکال سکے۔ تقریباً چودہ برس کی عمر میں رنگون چلے گئے۔ یہ ابتدائی دورِ سخن تھا۔ان کی شاعری کے تین دور ہیں پہلا از ابتدا تا ۱۹۳۰ء دوسرا ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۵ء تک تیسرا ۱۹۴۵ء سے وفات تک۔آخری دور کا کلام ان کے فرزند رشید ابوالاویس اثرؔ اعظمی کی تحویل میں ہے۔

اکملؔ کو شاعری سے لگاؤ بدوشعور ہی سے پیدا ہو چکا تھا، شاعری میں کسی کے باقاعدہ شاگرد تو نہ تھے لیکن مولانا اقبال احمد سہیلؔ (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۵ء) سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔

اور کبھی کبھی ان سے اصلاح بھی لے لیا کرتے تھے۔ اکمل کے بھانجے اور شاگرد بسمل اعظمی نے اپنے مجموعہ گزرگاہ خیال کے صفحہ ۱۷۲ کے حاشیے میں لکھا ہے کہ موضع اساڑھا کے پہلے شاعر جنھیں اقبال سہیل کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل تھا، ایک روایت ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں مولوی سعید احمد صاحب مرحوم موضع لپری ضلع جون پور سے اصلاح لیتے رہے، لیکن اس کی تصدیق خود اکمل کے کلام سے نہیں ہوتی۔ قیاس یہ ہے کہ اصلاح لینے کا یہ سلسلہ ایسے دور کا ہوگا جسے اکمل بالکل اہمیت نہ دیتے رہے ہوں، اور اس کا اظہار مناسب نہ سمجھتے رہے ہوں، شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے دستیاب کلام سے مولوی سعید احمد صاحب سے کسی طرح کی نسبت کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا، جبکہ اقبال احمد سہیل سے اکتسابِ فیض کا ذکر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ ایک مقطع میں وہ کہتے ہیں

در جہانِ شاعری اکملؔ ز فیضانِ سہیل ۔ خوشہ چیں خرمن شبلیؔ نعمانی منم

اکمل کے شاگردوں میں ممتاز احمد نشاطؔ، فخر الہدیٰ احمرؔ، محمد ایوب بسملؔ اعظمی، صاحبزادے ابوالاویس اثرؔ اعظمی شامل ہیں اور یہ سب انھیں کے موضع اساڑھا کے باشندے ہیں۔ شاعری کے ابتدائی دور میں اُن کا میلان طبع دیہات کی مشہور صنف شاعری ''خیال'' کی جانب رہا، اس دور میں ضلع اعظم گڑھ اور دوسرے مشرقی اضلاع میں ''خیال'' کو ان کی مقبولیت حاصل تھی۔ ہر چھوٹی بڑی تقریب میں قوالوں کو مدعو کیا جاتا تھا، اس کے اثر سے دیہی سماج اور تہذیب میں ''خیال'' کو رجوع عام نصیب ہو گیا تھا اور ہر شاعر اس صنف میں فکر کرنے کو اپنی شاعری کی معراج تصور کرنے لگا تھا۔ اکمل جن کی شاعری کی جولان گاہ دیہاتی زندگی اور جن کی فکر کی تربیت گاہ کاشتکار پیشہ بستی کی محدود فضا تھی، خیال کے خیال سے بے نیاز نہیں رہ سکے۔

اس دور کا کل سرمایۂ فکر اپنے ایک شاگرد کو دے دیا اس کے بعد پھر کبھی ''خیال'' کی طرف خیال نہ گیا اور یہ اردو شاعری کی اصناف کی طرف متوجہ ہو گئے، اردو شاعری کی شاید ہی کوئی صنف ہو جس میں اکمل نے طبع آزمائی نہ کی ہو، لیکن ان کے کلام کا مختصر حصہ ہی دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ سکا ہے۔ موجودہ غیر مطبوعہ مجموعۂ کلام غزلوں، نظموں، رباعیات، قطعات، مثنویات اور نعت و مناجات پر مشتمل ہے، نظموں کے موضوع بالعموم وہی ہیں جن سے وہ شب و روز دو چار رہا کرتے تھے، گانو

کے چھوٹے بڑے، اہم اور غیر اہم واقعات پر انھوں نے نظمیں کہیں ہیں۔ خاتمۂ زمینداری، پنچایتی الکشن، دیہاتی معاشرت وسیاست، کھیتی باڑی سے متعلق افراد کی امنگوں، آرزوؤں، دلچسپیوں، مناظر قدرت کی رنگینیوں اور مقامی میلوں ٹھیلوں سے موضوع ومواد حاصل کر کے نظیر اکبرآبادی کی مرنجان مرنج اور واقعاتی روایت کو نبھانے کی کوشش انھوں نے کی ہے۔ نظیر کی شاعری کا افق بہت وسیع ہے اور ان کے یہاں موضوعات کی ہمہ گیری ملتی ہے۔ اکمل نظیر کی نرم خوئی اور ذہنی لچک تو پیدا نہ کر سکے لیکن انھوں نے اپنی افتادِ طبع سے نظیر کی روایت کو پانے کی کوشش ضرور کی۔ ان کے کلام میں کئی ایسی نظمیں ہیں جو گانو کی الکشنی سیاست سے ان کی گہری دل چسپی کی آئینہ دار ہیں۔

کسی الکشن میں اکمل صاحب کی پارٹی کا انتخابی نشان "پھول" اور ان کی حریف پارٹی کا "چھتری" تھا۔ اکمل صاحب نے اپنے چناؤ نشان "پھول" کو اپنی شاعری کے زور سے عوام میں اور دلکش بنا کر پیش کیا۔ اسی طرح کا ایک شعر کہا ہے۔

کرتا ہے رنج وغم کو یہ اپنی مہک سے دور ۔ اس واسطے پسند ہے ہر آدمی کو پھول

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں اپنے حریف پہ فتح حاصل ہوگئی جس کے بعد فرمایا

پھول ہنستا رہ گیا اپنی جگہ پر برقرار ۔ اُڑ گئی یاروں کی چھتری بادِ طوفانی کے ساتھ

گانو کی سیاست اور معاملات سے دل چسپی کے باوجود ان کی طبیعت گانو کے محدود اور محبوس ماحول سے تادم آخر بیزار رہی، وہ اس تنگنائے سے نکلنے اور اپنے لئے نئی وسعتیں ڈھونڈھنے کی سبیل پیدا کرتے رہے مگر وہ اس ماحول کی دلدل سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکے۔ ان کے کلام میں بھی ایسی کسمساہٹ ہے جو اپنے تنگ دائرے کو توڑ دینا چاہتی ہے۔ مگر حالات کا جبر انھیں ایسا کرنے نہیں دیتا۔

اکملؔ کا تعلق اس دور سے ہے جب پرانی قدریں مٹ رہی تھیں اور ان کی جگہ نئی قدروں کا تعین اور تیقن ہو چکا تھا، مغربی تہذیب کا طوفان مشرق کے ہر خشک وتر کو بہا کر فنا کر دینے پر تلا ہوا تھا، اس کا اثر جس طرح سماج پر پڑا اُسی طرح ہماری ثقافت، ذہنی وفکری تاریخ اور شعر وادب کے نہج واسلوب میں بھی نمایاں ہوا۔ غالباً اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ اکمل نے قدیم پابندیوں سے آزاد

رہنے کی کوشش میں بعض جگہ صوتی قافیے کا استعمال کیا ہے مثلاً

چھوڑ دوں اور سب کو معاً چھوڑ دوں ۔ اب یہ ماحولِ ہمت شکن چھوڑ دوں

ان کے یہاں لفظ پرستی کا رجحان بھی نہیں ہے۔ یہ محاورات وتراکیب کے بت تراش کر ان کے آگے سر نیاز جھکانے کا جذبہ نہین رکھتے۔ اگرچہ یہ خیال وبیان کی اعلیٰ صلاحیتیں لیکر پیدا ہوئے تھے۔ پھر بھی کہیں کہیں زبان پران کی گرفت ڈھیلی ڈھالی محسوس ہوتی ہے۔لیکن انھوں نے دیہات کے جس جامد ماحول میں رہ کر شاعری کی زلفیں سنواریں اور جتنے خوبصورت اشعار کہے ان کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی خاص عیب نہیں ہے۔ اکمل نے شاعری کو تفریح طبع، وقت گزاری اور فرصتِ کار کو دلچسپ بنانے کے لئے ایک مشغلہ کے طور پر اپنایا تھا۔ وہ اس کو ہنگامہ ہائے زندگی، اور ہجوم افکار سے کچھ دیر کے لئے نجات پانے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ شاعری کے سماجی منصب کا عرفان وادراک نہیں رکھتے تھے۔خود کہتے ہیں

ہم نے مانا کچھ نہیں اکملؔ مآلِ شاعری ۔ کم سے کم اتنا تو ہے، اس سے بہل جاتا ہے دل

اگرچہ انھوں نے شاعری کو جزو پیغمبری بنا کر اس سے حال طرازی اور مستقبل سازی کا کام نہیں لیا اور نہ ہی انھوں نے کسی فلسفۂ زندگی کو اپنا کر نظریات تراشے پھر بھی ان کی شاعری کوئی بالکل سطحی اور تفریحی چیز نہیں ہے، انھوں نے اپنے رچے ہوئے شعور کو جا بجا اظہار کیا ہے۔ کیوں کہ شاعر کا شعور تربیت یافتہ ہو یا ناپختہ۔ اس کی نظر اپنے گردوپیش کی قدروں، خواہشوں، امنگوں، تبدیلیوں، شکستوں اور کامرانیوں پر گہری ہو یا سطحی، وہ مکمل طور پر اپنے ذہن وفکر کو ان سے علاحدہ نہیں رکھ سکتا۔ وہ کچھ نہ کچھ اپنے آس پاس کی زندگی کا عرفان وشعور اور ادراک واحساس ضرور رکھتا ہے۔ عام انسان بھی اپنے اطراف وجوانب اور پس وپیش کو اپنی ذاتی نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے جب وہ کچھ کہنا یا کرنا چاہتا ہے تو غیر شعوری طور پر بھی حیات انسانی کی ترجمانی ہو ہی جاتی ہو ہی جاتی ہے۔ شاعر جتنا باشعور ہوگا اس کا کلام زندگی سے اتنا ہی قریب ہوگا اور اکملؔ کے کلام کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں شاعرانہ شعور اور صلاحیتوں کی کمی نہیں تھی اگر کمی تھی تو تربیت اور ماحول کی۔ انھوں نے شاعری کو اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنایا

اوراس سے حیات وکائنات کی تفسیر وتنقید کا کام بھی لیا۔

ان کی ذات گانو کے جن مسائل سے دوچار تھی، حالات کے نشیب وفراز سے ان کا سابقہ پڑا تھا۔ ان کی دیہی زندگی جن نظریات وافکاراور محسوسات وجذبات سے عبارت تھی ان کی پرچھائیوں سے انھوں نے اپنی شاعری کے نگار خانے کوسجانے کی کوشش کی ہے۔ جو ان کے نکھرے ہوئے ذوق اورشاعرانہ کمال کا ثبوت ہے۔

انھوں نے مندرجہ ذیل شعر میں جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ بھی ہمارے ان احساسات وتاثرات کی توثیق کرتے ہیں۔

ہر شعر مرا ہے، مرے احساس کی تصویر - جادو نہیں، افسوں نہیں، اعجاز نہیں

نمونۂ کلام

فرط وحشت سے مرا جس دم مچل جاتا ہے دل مجھ کو لیکر جانب صحرا نکل جاتا ہے دل
آپ کا اک دل جس پر کچھ نہیں ہوتا اثر ورنہ عجز وانکساری سے پگھل جاتا ہے دل
گو کسی کا غم، کوئی اپنا نہیں لیتا مگر پُرسشِ احوال سے قدرے سنبھل جاتا ہے دل
شیشۂ دل پر جب آجاتا ہے انساں کے غبار شخص رہتا ہے وہی، لیکن بدل جاتا ہے دل
ہر چیز جب اپنی کھو بیٹھے تب جا کے کہیں یاد آیا انجام نظر پر کی نہ نظر، صدحیف دمِ آغازِ نظر
کشاف ہے حال پنہاں کا، مظہر ہے مزاجِ انساں رہتا ہے جو کچھ دل کے اندر، دیتا ہے بتا اندازِ نظر
جو برسا تو ابرِ کرم خوب برسا مرے دل کی کھیتی ہی ویران کردی
سربزم کل مجھ کو دیوانہ کہہ کر دوبالا مری آپ نے شان کردہ
ہم رکھتے ہیں پہلو میں دلِ حق آگاہ ابلیسِ لعیں کی نہیں ہم کو پرواہ
شیطان ہو انسان پہ غالب اکمل لاحول ولاقوۃ الا باللہ

مجھے اپنی ذات وصفات پر کوئی فخر ہے مہ غرور ہے
ہوں غلامِ سرورِ انبیاء، مجھے ناز اس پہ ضرور ہے

غلط ہے کہ غم یا خوشی ڈھونڈھتا ہوں میں دنیا ہی اک دوسری ڈھونڈھتا ہوں

پئے قلب تابندگی ڈھونڈھتا ہوں — اندھیرا ہے گھر، روشنی ڈھونڈھتا ہوں
جو کردے مجھے بے نیازِ دوعالم — میں وہ نشۂ سرمدی ڈھونڈھتا ہوں
رہوں روز وشب خود فراموش ہوکر — میں وہ عالمِ بے خودی ڈھونڈھتا ہوں
چھڑا دے جو ہر قید وبند جہاں سے — میں ایسی ہی وارفتگی ڈھونڈھتا ہوں
بشر ہی کو ہوتی تلاشِ بشر ہے — میں ہوں آدمی، آدمی ڈھونڈھتا ہوں
مسلسل تڑپ بے قراری کا عالم — ہو جس میں، میں وہ زندگی ڈھونڈھتا ہوں
جی میں آتا ہے اکمل وطن چھوڑ دوں — یہ نشیمن، یہ صحنِ چمن چھوڑ دوں
یک قلم سب علائق سے منھ موڑ لوں — دامنِ حبِ فرزند وزن چھوڑ دوں
عالم ہُو، میں چل کر کہیں سانس لوں — فکر اندیشۂ جان وتن چھوڑ دوں
خانۂ دل ہی اپنا مزین کروں — سعیٔ آرائشِ انجمن چھوڑ دوں
دوستوں کی خلش لے کے جاؤں نکل — قلبِ یاراں میں اپنی چبھن چھوڑ دوں
لا ریب سخن سنج، سخن فہم ہوں لیکن — حاشا مجھے اس فن پہ کوئی ناز نہیں ہے
اللہ نے کی ہے جو عطا مجھ کو بصیرت — میرا بجز اس کے کوئی دم ساز نہیں ہے
ہر شعر مرا ہے، مرے احساس کی تصویر — جادو نہیں، افسوں نہیں، اعجاز نہیں ہے
اشعار سے احباب کو محظوظ کروں کیا — دلکش مری آواز کا انداز نہیں ہے
ہے آج یہ عالم کہ نہیں جس میں ترنم — شاعر وہ کسی بزم میں ممتاز نہیں ہے
اکملؔ میں کروں بزم میں کیا نغمہ سرائی — افسوس سریلی مری آواز نہیں ہے(۲)

حواشی:

(۱) راقم کو راشد اعظمی کے ذریعہ جو حالات وکلام حاصل ہوئے تھے اس میں نام مرتضیٰ حسین اور سالِ وفات ۱۹۷۸ء درج تھا مگر اکمل کے حقیقی بھانجے اور شاگرد سخن محمد ایوب بسمل اعظمی نے جو بمبئی میں تدریس سے وابستہ ہیں حسین کے بجائے حسن اور سالِ وفات ۱۹۷۵ء بائی موبائل بتایا ہے۔

(۲) حالات وکلام بشکریہ اشتیاق احمد راشد اعظمی صاحب

اکملؔ رتشنہ - ڈاکٹر رحمت علی اعظمی

۱۹۳۵ء ـــــ ۱۹۹۱ء

یہ اردو کے مشہور شاعر رحمت الٰہی برق اعظمی (۱۹۰۵ء۔ ۴؍اکتوبر ۱۹۸۳ء) کے سب سے بڑے بیٹے تھے، نہایت صاف ستھرا شعری ذوق رکھتے تھے اور اردو کے علاوہ ہندی اور بھوجپوری میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

ان کی پیدائش قصبہ نظام آباد ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ بڑے ذہین وطباع اور قابل رشک قوت حافظہ کی دولت سے مالا مال تھے۔ اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی سے واقفیت تھی۔ اپنی خداداد ذہانت سے ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت میں بھی اہلیت پیدا کرلی تھی اور چاروں وید انھیں زبانی یاد تھیں۔ نظام آباد میں رہ کر وہیں سے انٹر کی سند حاصل کی تھی۔

گھر کا ماحول شاعرانہ تھا۔ انھیں بھی شاعری کی زلف گرہ گیر سلجھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اپنے والد برق اعظمی سے فیض اصلاح اٹھایا۔ پہلے تشنہ تخلص اختیار کیا تھا۔ برق صاحب نے برافروختگی کے انداز میں فرمایا کہ سارے شاعروں کا تخلص میں رکھتا ہوں۔ تم نے اپنی طبیعت سے تشنہ تخلص کرلیا ہے۔ تم عمر بھر تشنہ ہی رہ جاؤ گے۔ اس کے بعد ہی سے اکمل ہو گئے اور واقعی انھوں نے فن شاعری میں بڑی ترقی کی۔ تمام اصناف میں شعر گوئی کی۔ قوالیوں کی محفلیں بھی ان کے نغموں سے گونجیں اور مشاعرے بھی ان کے کلام سے آباد اور بارونق ہوئے۔ ہر رنگ میں بڑی روانی اور برجستگی سے شعر کہتے تھے۔ طبیعت میں کافی موزونیت تھی۔ لفظوں پر حکومت کرتے تھے۔ مضمون کو جیسے چاہتے تھے باندھ دیتے تھے۔ ان کے لئے کوئی بحر یا وزن اجنبی نہیں تھا۔ کلام میں بڑی سلاست اور طرفگی تھی۔ ان کے خیالات میں گہرائی ہوتی تھی۔ اردو شاعروں میں دوسری زبانوں کے اہل سخن کے مقابلے میں اشارت وایجازیت اور رمزیت وغنایت کا جو بالیدہ شعور ہوتا ہے اکمل اس سے بہرہ ور تھے۔

اس لئے ان کے کلام میں بڑی کشش اور جاذبیت ہوتی تھی۔ وہ لفظوں کے انتخاب اور اس کے استعمال میں اپنی خداداد صناعی کا اظہار کرتے تھے۔ انھوں نے نئے افکار اور جدید خیالات کو پرانے اسلوب میں ڈھالنے سے زیادہ سروکار رکھا ہے۔ وہ روایت اور متقدمین شعراء کے انداز وآہنگ سے بڑی قربت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں کبھی کبھی فکر وخیال کے تغیر کے ساتھ ساتھ اسلوب وہیئت کے تجربے بھی ملتے ہیں۔ لیکن ان کے کلام کے مطالعہ کے وقت یہ تاثر ابھرتا ہے کہ فکر وخیال سے زیادہ ان کے یہاں زبان اور طرز ادا کی وقعت واہمیت ہے۔ حسن ادا اور رنگینی بیان پر یہ جان چھڑکتے ہیں۔ انھوں نے تغزل میں بھی حالات وزمانہ کی رعایت رکھی ہے۔ اسی لئے بعض بعض مواقع پر تازگی فکر اور رعنائی خیال کی شفق پھوٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے کہنے کا اپنا ایک انداز اور بات سے بات پیدا کرنے کی اپنی ایک خاص ادا ہے۔ ان کی شاعرانہ طبیعت اور موزونیت پر ان کے ریاض اور مشق ومزاولت نے جلا کی ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری کا فطری حسن نکھر گیا ہے۔

نمونۂ کلام

ہے بات انصاف کی تو اے دل تجھی میں تابِ نظر نہیں ہے
وگرنہ اس رشکِ گل کا جلوہ کہاں نہیں ہے، کدھر نہیں ہے
روا روی میں فسانۂ دل میں کیا کہوں آپ کیا سنیں گے
سناؤں سننے کی جو ہو فرصت کہ حالِ دل مختصر نہیں ہے
جو تو ہی تو ہے ہر ایک شے میں تجھے زمیں کیا ہے آسماں کیا؟
یہ کیا شمس وقمر کا جلوہ اگر فریبِ نظر نہیں ہے
جو یاد سے تیری بے خبر ہے وہ بے خبر ہے یہ میں نے مانا
جو یاد میں تیری بے خبر ہے وہ دل مگر بے خبر نہیں ہے
ابھی جو چاہے تو دم کے دم میں فرازِ ہفت آسماں سے گزرے
بلند پروازیِ تخیل ہماری محتاج پر نہیں ہے

ایک ہی گھونٹ! شیخ حرم آیئے دیکھئے اب تکلف نہ فرمایئے
جب کہا ان سے اک بات بتلایئے جھٹ سے بولے کہ تشریف لے جایئے
اب بھی ہلکی سی جنبش رگِ جاں میں ہے اک ذرا اور تکلیف فرمایئے
لوٹنے ہوں اگر زندگی کے مزے ایک دن میکدے میں چلے آیئے
داستانوں میں اکملؔ کی ہے داستاں جی میں آتا ہے سنتے چلے جایئے
جادو نگہ وگل رخ وتابندہ جبیں اور اللہ کرے تجھ کو تو ہوجائے حسیں اور
پھولوں سے گلستاں کو اگر پیار نہ ہوتا کانٹوں کے لئے خوب تھی صحرا کی زمیں اور
افشائے غمِ عشق کا دھڑکا ہے جہاں پر کم بخت یہ دل اپنا دھڑکتا ہے وہیں اور
اس برقِ نشیمن کو کہاں ڈھونڈھتے پھرتے چھوٹا سا نشیمن تو بنالیتے کہیں اور
اکملؔ نے مگر پیروئِ پیرِ مغاں کی یہ سن کے ہوئے شیخِ حرم چیں بہ جبیں اور

الٰہیؔ ــــ مولانا الٰہی بخش کوپا گنج

۱۲۵۸ھ ــــ ۲۹ر محرم ۱۳۱۹ھ رمئی ۱۹۰۱ء

اپنے وطن کوپا گنج ضلع اعظم گڑھ (اب ضلع مئو) میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرلینے کے بعد مدرسہ امامیہ حنفیہ جون پور میں مولانا عبدالحلیم بن امین اللہ فرنگی محلی سے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ اسی زمانہ میں مولانا سخاوت علی سے بھی علمی استفادہ کیا۔ نصاب کی تکمیل رسڑا ضلع بلیا میں مولانا تراب علی لکھنوی مدفون محمد آباد گوہنہ سے کی۔ یہیں درس وتدریس کو رونق بخشی اس کے بعد گھوسی کے مدرسہ ناصرالعلوم کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ تقریباً چالیس سال تک خدمت درس انجام دی۔ ان کا آخری دور بڑی عسرت وتنگ دستی میں گزرا۔ ان کی گزر بسر کے لئے مولانا نصیر صاحب کے یہاں سے دس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا۔ مولانا کے شاگردوں میں مولانا امام بخش جون پوری کا نام لیا جاتا ہے۔ مولانا الٰہی بخش علوم وفنون میں ماہر تھے اور ان کا تبحر علمی لوگوں پر ظاہر تھا۔ مولوی ظفر احمد صدیقی گھوسوی استاد شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا بیان ہے کہ الٰہ آباد میں ان کا ایک منظوم میلادنامہ انھوں نے دیکھا تھا جو قلمی تھا۔

الیاسؔ - مولانا الیاس اصلاحی بمھوری

تخمینی ۱۹۰۵ء ـــــ نومبر ۱۹۷۵ء

مبارک پور سے متصل علمی گانو بمھور زادگاہ اور پدر بزرگوار کا نام حاجی محمد سلیمان تھا جن کی وفات ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ مولانا الیاس مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے فارغ التحصیل عالموں میں سے تھے۔ فراغت کے بعد اسی مدرسۃ الاصلاح میں کچھ دنوں تک سلسلۂ درس وتدریس میں مصروف رہے پھر گھر آئے تو گھر ہی کے ہو کر رہ گئے اور آخر عمر تک قدم اپنے موضع سے باہر نہیں نکالا۔ انھیں مولانا سید اسعد مدنی سے شرف بیعت حاصل تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا انیس احمد صاحب مولانا حسین احمد مدنی سے ٹانڈہ میں جا کر سلسلۂ چشتیہ میں بیعت ہوئے تھے۔ آخری عمر میں انھیں علماء کی طرف خاص توجہ ہوگئی تھی خصوصاً علمائے دیوبند کے ذکر پر آنکھیں اشک بار ہو جایا کرتی تھیں۔ انھیں ہومیوپیتھی طریقۂ علاج سے دلچسپی تھی اور خدمت خلق کی نیت سے مریضوں کو مفت دوائیں دیتے تھے۔ ان کے مفت علاج سے بہت سے نادار مریضوں کو فائدہ پہنچا۔ ان کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کبھی اپنے جیب میں پیسے سنبھال کر نہیں رکھے۔ جہاں ضرورت محسوس کی خرچ کرنے میں تامل نہیں کیا۔ الیاس مرحوم خاموش طبع، بردبار، اخلاص واخلاق کے مجسمہ اور طرزِ گفتار میں نرم خو بزرگ تھے، ان کے بیٹے محمد شمیم (م ۲۰۰۳ء) محمد حسن (م ۲۰۰۴ء) مولانا محمد مسلم (م ۲۰؍جولائی ۱۹۹۳ء) محمد عرفان، محمد احسان اور مولانا محمد رضوان ہیں اور ایک بیٹی بھی تھیں جن کا ابھی حال ہی میں غالباً ۲۰۰۸ء میں انتقال ہوا ہے۔

مولانا الیاس اردو کے شاعر و ادیب بھی تھے۔ ان کے مضامین نثر ونظم پسند کئے جاتے تھے، فصیح وبلیغ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ اپنی طالب علمی کے دور میں اقبال سہیل سے اصلاح لیتے تھے۔ جبکہ سہیل مرحوم کسی طالب علم کا کلام نہیں دیکھتے تھے مگر ان کی طرف ان کی توجہ خاص تھی اور اصلاح سخن کے لئے کسی حیلے سے انھیں کبھی ٹالا نہیں۔ نعت اور غزل کی صنف میں شعر کہتے تھے۔ اپنی بیٹھک اور چوپال میں گانو والوں کو کبھی کبھی اشعار سنایا کرتے تھے۔

امجدؔ - امجد علی غزنوی

۱۹۱۶ء ـــ ۱۶/۱۷/دسمبر ۱۹۹۶ء کی درمیانی شب

ان کے والد محترم اسد علی انگریزی دورِ حکومت میں ریلوے کے ایک ممتاز عہدے (Railway Track) پر فائز تھے۔ دوسرے ہم وطنوں کی طرح ان کے دل میں بھی آزادی کی تڑپ تھی۔ ایک بار ان کے والد دورہ کرتے ہوئے انداراا سٹیشن پر آئے تو یہاں پنڈت جواہر لال نہرو کو ٹرین چھوٹ جانے کی وجہ سے کافی پریشان پایا۔ انھوں نے پنڈت جی کو اپنی ٹرالی پر بیٹھا لیا اور پھپھونا اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گئے۔ پھپھونا والوں کو نہ جانے کیسے اطلاع ہو گئی کہ پنڈت جی ٹرالی سے آرہے ہیں۔ دو ہزار عوام ٹرین کی پٹری پر لیٹ گئے اور گاڑی کو اس وقت تک روکر رکھا جب تک جواہر لال نہرو پہنچ نہیں گئے۔ انگریزی حکومت نے اس بے تیر وکماں جنگ پر آپ کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ جنگِ آزادی کے سلسلے میں پیش کی گئی یہ قربانی پنڈت جی کی نظر میں اتنی گراں قدر ٹھہری کہ وہ امجد صاحب کے والد سے بہت قریب ہوتے گئے اور دوستی کا تعلق رشتۂ اخوت میں تبدیل ہو گیا۔ اس واقعے کا ذکر خان محمد صادق خان نے بھی اپنی اردو وانگریزی کتاب "گاؤں محمد پور عمر رفتہ سے" صفحہ ۹ پر کیا ہے۔

امجد نے فارسی کی تعلیم اپنے موضع محمد پور تحصیل صدر ضلع اعظم گڑھ میں پائی۔ ہائی اسکول شبلی کالج سے پاس کیا جو ان دنوں جارج ہائی اسکول کے نام سے موسوم تھا۔ بی اے کی تعلیم گورکھپور میں مکمل کی۔ اس زمانے میں بی اے کی تعلیم بہت اونچی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جب اس سے بھی ان کے وجدان وشعور کی تسکین نہیں ہوئی تو ایل ایل بی کی تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی اس کا علم ہو گیا انھوں نے پنڈت مدن مالویہ بانیٔ بنارس ہندو یونی ورسٹی کو خط لکھا کہ امجد کو یونی ورسٹی میں مفت تعلیم دی جائے اس طرح امجد ایل ایل بی کرنے کے لئے بنارس ہندو یونی ورسٹی میں داخل ہو گئے۔ ان دنوں ان کی کلاس میں صرف دو یا تین مسلم طلباء تھے مگر مالوی جی سے لیکر تمام اساتذہ وہندو طلباء ان کا بے حد خیال کرتے تھے۔ پرنسپل بھی اکثر لڑکوں سے کہا کرتے تھے کہ "

دیکھولڑکو" یہ امجد علی غزنوی" پنڈت نہرو کا لڑکا ہے۔ پنڈت جی برابر خط کے ذریعے اس کے حالات دریافت کیا کرتے ہیں"۔ یونی ورسٹی میں ملک کے بڑے بڑے رہنما اور دانشور آیا کرتے تھے۔ ان کی تقریروں سے امجد صاحب میں بھی حب الوطنی اور قومی خدمت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

امجد کی زندگی بڑی پہلو دار اور ہمہ رنگ تھی۔ ان کی شخصیت، ادب، سیاست، مذہب اور تعلیم کا نقطۂ اتصال تھی۔ انھوں نے ۱۹۴۱ء میں مدرسہ مدینۃ العلوم قائم کیا اس کے بعد ایک ہائی اسکول کی بنیاد رکھی۔ جو اس وقت انگریزی تعلیم کی ایک بڑی درس گاہ سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے قرب وجوار کے مواضعات میں بھی بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے مدرسے کھلوائے ہیں۔ یہ اپنے موضع محمد پور میں ایک بڑی عربی درس گاہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن قریب ہی دو عربی مدرسے ہونے کی وجہ سے اس خیال کو ترک کر دیا۔ شبلی اسکول اور شبلی کالج اعظم گڑھ کی مجالس شوریٰ اور منتظمہ کے بھی اہم رکن رہے۔ اعظم گڑھ شہر میں شعر و ادب کی محفلیں ان کے دم سے آباد تھیں۔

قانون کی اعلیٰ تعلیم نے ان کے فکر و ذہن کو استدلالی اور منطقی بنا دیا تھا۔ اخذ نتائج کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ سماجی کاموں سے دل چسپی نے انھیں سیاست کا بھی مرد میدان بنا دیا تھا۔ اپنے ہم وطنوں کے درد کو بڑی اچھی طرح محسوس کرتے تھے۔ وہ ملنسار، باوضع، خوش مزاج، متحرک، سرگرم، وسیع المشرب مسلمان، سیکولر سیاسی رہنما، ہمہ صفت اور مکمل انسان تھے۔ جواہر لال نہرو کے ساتھ لی گئی ان کی تصویریں اس حقیقت کی غمازی کر رہی ہیں کہ وہ بھی ان کی سماجی اور قومی خدمات کو وقعت اور استحسان کی نظروں سے دیکھتے تھے اور اس بنا پر ان سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ امجد صاحب ضلع اور صوبائی کانگریس سے وابستہ تھے۔ ۱۹۶۲ء میں نظام آباد حلقے سے اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔

امجد خوشحال، صاحبِ ثروت اور با اقتدار شخصیت کے مالک تھے لیکن انھوں نے اپنی شخصیت کر گرد کوئی ہالہ نہیں بنایا اور نہ اونچے اونچے خطابات کی دیواریں کھڑی ہونے دیں۔ ان کی شخصیت کوئی ایسی بلند عمارت نہیں تھی جس کے چاروں طرف کھڑکیاں اور دروازے بند رہتے ہوں۔ نہ تپتی ہوئی سڑکوں کی دھول اس میں داخل ہوتی ہو۔ اور نہ پل پل بدلتے ہوئے حالات کو

یہاں دستک دینے کی ہمت پڑتی ہو، بلکہ ان کی شخصیت کی تعمیر رواداری، سیر چشمی، حسنِ اخلاق، جذبۂ خلوص، ہمدردی اور انسانی دوستی کے آب وگل سے ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی مادی آسودگی کے باوجود دیہاتوں میں پگڈنڈیوں کے نشیب وفراز سے گزر کر غریبوں کے دکھ درد کو قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ اور افلاس، بھوک، جہالت، بے روزگاری کے خلاف مضبوط محاذ بنایا تھا۔

امجدؔ کو اردو زبان سے والہانہ محبت تھی۔ خود بھی شاعر تھے مگر شاعروں اور ادیبوں کی خدمت کر کے انھیں ہمیشہ یک گونہ سرور ملتا تھا۔ انھوں نے جو اسکول قائم کیا اس میں مسلم طلباء کے لئے اردو تعلیم ضروری قرار دی تھی۔ اقبال سہیل اور مرزا احسان بیگ نے آپ کے ذوقِ شعری کو نکھارا اور پروان چڑھایا تھا۔ جب گورکھپور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو ہندیؔ گورکھپوری، مجنوںؔ گورکھپوری، فراقؔ گورکھپوری اور عارفؔ بلگرامی کی صحبتوں سے فکر وخیال کی چنگاریاں ملیں۔ شعر گوئی کی محفل میں آپ کی ایک انفرادیت اور شناخت تھی۔

شاعری میں انھوں نے جذبات کی سچائی کو کبھی مصلحت کی چادر میں نہیں لپیٹا اور نہ ہی حقیقت اظہار پر مفادات کی ضرب پڑنے دی۔ انھوں نے انسان کی داخلی اور خارجی کیفیات کے ہر پہلو کو اپنا موضوع قرار دیا ہے اور زندگی کے سرد وگرم کو اپنی فکر کا حصہ بنایا ہے۔ اسی لئے ان کے اشعار میں ایک آنچ سی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا انداز روایت ودرایت اور حمایت وانحراف کے درمیان ایک ہم آہنگی اور مثبت ربط پیدا کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ انھوں نے پرانے پیمانے میں نئی شراب رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے موضوع سخن میں انسان کو مرکزی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی زندگی جس جہاد میں گزری اور ان کی شاعری اسی جہاد کے پسِ منظر سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں نجی درد بھی ہے اور غمِ دوراں کی نشتریت بھی موجود ہے حوصلہ، امنگ، تڑپ، کام کی لگن، زندگی کو حسین بنانے کی دیوانگی ان کے یہاں عام ہے۔ وہ جو خواب بنتے ہیں عمل کی دنیا میں اس کو اپنا نشانِ منزل قرار دے کر آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے یہاں بے عملی اور جمود کی کیفیت نہیں ہے وہ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے قائل ہیں اسی لئے ان کے یہاں مثبت افکار ہیں۔ امجد کی

شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سید احتشام حسین نے لکھا ہے کہ

"امجد غزنوی کی شاعری کے مرکزی نقطۂ عمل، اخلاق، انسانی اقدار اور امیدیں ہیں۔ یہ سارے تصورات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور اگر انھیں منطقی ربط کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاعر انسانی اقدار کے مٹنے کو اخلاقی زوال سے تعبیر کرتا ہے لیکن مانوس نہیں ہوتا بلکہ بہتری کی امید اسے عمل پر آمادہ کرتی ہے اور محسوس کرتا ہے کہ انسان بہرحال انسان ہے۔ کسی نہ کسی وقت اس کی انسانیت بیدار ہوگی اور وہ پھر ان قدروں کے لئے جد وجہد کرے گا جو اس کی غفلت سے کھوگئی ہے۔ اس ذہنی اور جذباتی طرز فکر میں وہ کیفیت تو نہیں ہوسکتی جو خالص عشقیہ شاعری سے وجود میں آتے ہیں لیکن اس کی بنیاد اگر خلوص پر ہو تو اس میں بھی وہی گرمی، وہی تپش اور وہی رنگینی پیدا ہوجاتی ہے جو عشق ومحبت میں اظہار کی راہیں تلاش کرتی ہے۔ مسائل دوسرے ہیں لیکن لگن ویسی ہی ہے اور انفرادی ہونے کے باوجود سماجی بنیاد رکھتی ہے۔ غزل کو صرف اظہارِ عشق تک محدود کرنے والے اور شاعری کو محض اپنی ذات کا مظہر سمجھنے والے کے لئے یقیناً یہ تسلیم کرنے میں دشواری ہوگی کہ غم کائنات اور غم انسان بھی شاعری کا محرک ہوسکتا ہے۔ امجد غزنوی کی شاعری کا یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے"۔(۱)

اس طویل اقتباس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ امجد کی فکر میں لکھنوی بوالہوسی اور عشق ومحبت کا فاسقانہ وسوقیانہ تصور نہیں۔ ان کی نظر میں انسانی غم کو اہمیت حاصل ہے اسی سے انسانی فلاح وبہبود اور بلند اخلاق کے تمام تصورات وابستہ ہیں۔ جو انسان کو تصوف کی طرف لے جاتے ہیں اور زندگی کے لئے اس کے وجود کو مسعود ومبارک بناتے ہیں۔

نمونۂ کلام

سراپا عمل جن کو ہم دیکھتے ہیں   فلک پہ انھیں کے قدم دیکھتے ہیں
نگاہوں میں جن کی ہے تصویرِ منزل   وہ کب راہ کے پیچ وخم دیکھتے ہیں
ترے ڈھونڈھنے والے راہِ طلب میں   خوشی دیکھتے ہیں، نہ غم دیکھتے ہیں

وہ سر کاٹ لینے کو جی چاہتا ہے — جسے در پہ باطل کے خم دیکھتے ہیں
جہاں جامِ جم ٹوٹ جاتا ہے امجدؔ — وہیں سیکڑوں جامِ جم دیکھتے ہیں
بہت سے خون کے دریا بہائے جاتے ہیں — تب انقلاب زمانے میں لائے جاتے ہیں
گلوں نے مجھ سے یہ طرزِ حیات سیکھی ہے — جگر ہے چاک مگر مسکرائے جاتے ہیں
وہ مرغانِ چمن صیاد کا دل جیت لیتے ہیں — قفس میں جرأتِ پرواز جن کی کم نہیں ہوتی
اسی پرتو اٹھا کرتی ہے چشمِ فیضِ ساقی بھی — جو لے کے میکدے میں جرأتِ رندانہ آتا ہے
دستِ طلب اٹھے یہ گوارا نہیں مجھے — مانا دوائے درد کفِ چارہ گر میں ہے
اتنا بھی کرم گردشِ ایام بہت ہے — اک جنبشِ پر، آج تہِ دام بہت ہے
جس قوم میں ایثار ومحبت نہیں وہ قوم — اِس دورِ ترقی میں بھی ناکام بہت ہے
کیا چیز ہے، اک چیز ہے یہ دردِ بشر بھی — جس درد کی تکلیف میں آرام بہت ہے
اے مہرِ کرم مجھ سے اسیرِ شبِ غم کو — اف صبح تو کیا، صبح کا پیغام بہت ہے
محروم ہیں وہ لذتِ غم ہائے چمن سے — گوشے میں قفس کے جنھیں آرام بہت ہے
کچھ بھی نہ سہی درد بھرا دل تو دیا ہے — امجدؔ مجھے قدرت کا یہ انعام بہت ہے
پہنچ سکا نہ وہ انسانیت کی منزل پر — جو وقف رہ تو ہوا، وقفِ کارواں نہ ہوا
وہ آدمی نہیں امجدؔ جو آدمی کے لئے — ہر ایک قطرۂ خوں شوق سے بہا نہ سکے
جمالِ عزم ہے ان میں نہ ہے جلالِ عمل — اس عہدِ نو میں جو دیکھے ہیں آدمی میں نے
وہ جماعت صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے خود — فرد میں جس کے عمل کا ولولہ ہوتا نہیں
زندگی رہتی ہے امجدؔ تشنۂ صہبائے زیست — عرصۂ ہستی میں جب تک کربلا ہوتا نہیں
ہرنوائے نَے میں پیغامِ حیاتِ تازہ سن — چشمِ بینا ہے تو خاکستر میں بھی اکسیر دیکھ
یہ مشتِ خاک اگر پرواز پر تیار ہوجائے — تو اس کون ومکاں کی سرحدوں سے پار ہوجائے
قیدِ زنداں سے نکل آئے نکلنا تھا جنھیں — دیکھنے والے کھڑے دیوار ودر دیکھا کئے
فکرِ نجات، ذوقِ عمل، دردِ آدمی — امجدؔ یہ آدمی بھی ہے، کیا کیا لئے ہوئے
خیرہ تھی جس کو دیکھ کے چشمِ بشر کبھی — امجدؔ کہاں وہ حسنِ بشر اس بشر میں ہے

حواشی:

(۱) سید احتشام حسین۔ ماہنامہ ہم چشم مئوناتھ بھنجن۔ مئی ۱۹۷۱ء ص ۱۶)

امجدؔ - امتیاز احمد فاروقی مبارکپوری

۲۲؍ستمبر ۱۹۱۹ء ـــــ ۱۱؍مئی ۱۹۹۷ء ۴۰-۱۱ بجے شب

آپ کی پیدائش ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں ہوئی، سند میں تاریخ ولادت ۲۲؍دسمبر ۱۹۲۳ء درج ہے۔ امجد کے والد ظفر حسن عینیؔ متوفی ۱۹۲۸ء، ۱۳۴۷ھ عربی وفارسی اور اردو کے جید عالم وشاعر تھے۔ حکومت نے شمس العلماء کا خطاب بھی دیا تھا۔ ڈھاکہ یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ امجدؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ امجدؔ بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تھے اس لئے ان کے بڑے بھائی احتشام احمد اور ان کے نام ۹؍اپریل ۱۹۳۶ء کو حکومت بنگال کی طرف سے پانچ پانچ روپئے ماہوار وظیفہ مقرر کیا گیا تھا۔ کیوں کہ والد کے انتقال کے وقت یہ دونوں نابالغ تھے۔ ان کے چچا مولوی ولی الحسن فاروقی ان کے سرپرست ہوئے انھیں کی نگرانی میں امجد کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ امجد کو بچپن ہی سے بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ سے عقیدت تھی جو آخری دم تک قائم رہی۔ مولانا کامل ولید پوری (۱۲۳۵ھ۔ ۱۳۲۳ھ) کے سلسلۂ بیعت میں بھی داخل تھے اور ہر سال ولید پور مولانا کامل نعمانی وصوفی جان محمد کے عرس کی تقریب میں عقیدت واحترام کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ انھوں نے قوالی بھی گائی ہے۔ امجدؔ پر فالج کا حملہ ہوا تھا لیکن وہ اس بیماری سے بہت جلد ہومیوپیتھی کے علاج سے شفایاب ہو گئے تھے۔ اور حسب معمول زندگی گزارنے لگے تھے۔ اپنے مکان کی طرحی نشستوں اور شاعروں کی مدارات کو بھی حسب معمول باقی رکھا تھا۔ ان کا مدفن قبرستان راجہ مبارک شاہ میں ہے۔

امجدؔ فاروقی نے ۶؍رمضان ۱۴۰۲ھ؍۱۹۸۳ء کو پہلی نعت پاک کہی اور ارشاد احمد جوہر متوفی ۲؍ستمبر ۱۹۸۶ء سے اصلاح لی۔ ان کے انتقال کے بعد منظور احمد منظر مبارکپوری (۱۹۴۳ء۔ ۲۹؍نومبر ۱۹۹۲ء) سے متعلق ہو گئے۔ امجد نے ۱۹۹۵ء میں حج کی سعادت بھی

حاصل کی تھی۔

امجد بہت زودنویس اور قادرالکلام تھے۔ طرح پر عموماً ایک ہی رات میں کلام تیار کر لیتے تھے، بسا اوقات رات میں دو دو کلام کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کے کئی مجموعے تیار ہو سکتے ہیں جو تشنۂ اشاعت ہیں۔ نعتوں کی ایک ضخیم بیاض ان کے شعری متروکات میں ہے جس کا نام خود انھوں نے "نغمۂ روح" تجویز کیا ہے۔

امجد نے غزل، نعت، حمد، منقبت، سہرا میں طبع آزمائی کی۔ جب ۱۹۹۵ء میں حج کے لئے گئے تو مزارِ اقدس کے پاس بھی عقیدت ومحبت میں ڈوب کر نعتیں کہیں اور صفہ پر بیٹھ کر والہانہ انداز میں اپنی نعتیں حاجیوں کو سنائیں اور ان سے انعام بھی حاصل کیا۔ امجد کے کلام میں عام انسانوں کے دکھ درد اور سوز وساز کا ذکر ان کے اپنے انداز میں۔ غزل میں وہی خیالات وجذبات اور انداز واشارات ہیں جو قدیم شاعری کی دین ہیں۔ انھوں نے نعتوں میں جذبے کی صداقت اور عشق رسول کی گرمی سے کام لیا ہے اور کسی کسی مقام پر اپنے والہانہ انداز بیان سے زور کلام کو بڑھا یا دیا ہے۔ ان کی مذہبی شاعری ان کے حسنِ اعتقاد اور جذبِ دروں کی آئینہ دار ہے۔ امجد نے اپنی شاعری میں ایسے خیالات پیش کئے ہیں جن سے زندگی کی ناپائداری اور موت کے برحق ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنی زندگی کے تجربات ومشاہدات پر بھی منظوم اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ ان کی زندگی کی جو نہج تھی ان کے اشعار میں اس کا اظہار ہوا ہے۔

نمونۂ کلام

یہ بے وفا ہے ساتھ نہ دے گی کبھی مرا　　پھر کس لئے کروں میں بھروسہ حیات کا
امجد میں جانتا ہوں جو اس کی بساط ہے　　ہے مثل بلبلا کے یہ رشتہ حیات کا
عالم کیف میں تھی یہ حالت مری　　شوق مجھ کو جگاتا رہا رات بھر
دل کا تار نفس آپ کی یاد میں　　نغمۂ دل سناتا رہا رات بھر
میرا حسنِ تخیل تھا جلوؤں میں گم　　اور دل جگمگاتا رہا رات بھر

تو امیر ہے، تو خبیر ہے، تو بشیر ہے، تو نعیم ہے
تو ہر ایک شے سے ہے باخبر تری ذات ذاتِ علیم ہے
یہ تو اپنا اپنا نصیب ہے، جسے چاہا جیسا بنادیا
وہ بھلا ہو یا کوئی ہو برا، ترا سب پہ لطفِ عمیم ہے
تری ذات پاک ہے اے خدا، ہے قصور شکر نہ جو کرے
تو شکور ہے، تو غفور ہے، ترا نام ربِ کریم ہے

میں کیا بتاؤں مجھے کیا عطا کیا تونے — مری طلب سے زیادہ کیا عطا تو نے
جب آنکھ میری مصیبت میں ڈبڈبائی ہے — مجھے رسول مکرم کی یاد آئی ہے
رہِ حیات میں کانٹے بچھے ہیں عصیاں کے — نگاہِ لطف ہو شاہِ ہدیٰ دہائی ہے
دل ہے جب آپ پہ قربان رسولِ عربی — کیوں نہ ہو اوج پر ایمان رسولِ عربی
روح امجدؔ کی مدینے میں پہنچ کر نکلے — بس یہی دل میں ہے ارمان رسولِ عربی
ایک جامہ، ایک حسرت، ایک اندازِ سخن — سب لئے پھرتے ہیں اپنے ہاتھ میں اپنا کفن(۱)
میرا دشمن بھی اگر مجھ کو پکارے ہمدم — دو قدم بڑھ کے میں سینے سے لگا سکتا ہوں
مجھ کو دیکھو نہ حقارت کی نظر سے لوگو — شعلۂ عشق ہوں، دنیا کو جلا سکتا ہوں
اپنی آنکھوں میں لئے پھرتا ہوں عکسِ کعبہ — دیکھنے والا کوئی ہو تو دکھا سکتا ہوں
کھلے ہیں پھول محمد کے مسکرانے سے — بہار آئی شہِ انبیاء کے آنے سے
جو آگ عشقِ محمد کی دل میں روشن ہے — وہ آگ دب نہیں سکتی کبھی دبانے سے
کرم یہ دیکھ کر ہر حال میں ہے ان کا کرم — کرم کا سلسلہ بس مصطفیٰ سے ملتا ہے
جبینِ شوق کے سجدے سلام کہتے ہیں — یہ میرے اشک کے قطرے سلام کہتے ہیں
بہرسو تیرگی ہی تیرگی کا ایک عالم تھا — کوئی تھا درد کا مارا، کوئی بادیدۂ نم تھا
گھروں میں ہر طرف دختر کشی کا ایک ماتم تھا — کسی کا بھوک سے اٹکا ہوا حلقوم پر دم تھا
اسی ماحول میں وہ بیکسوں کے غم گسار آئے

حواشی:

(۱) یہ حالت احرام میں کہا گیا تھا۔

امدادؔ - سیدامداداصغر ماہلی

۶؍صفر ۱۳۴۱ھ؍ ۱۹۲۴ء —

ماہل تحصیل پھول پور کی ایک چھوٹی سی بستی جو بڑی چھاؤنی اور چھوٹی چھاؤنی کے نام سے دوحصوں میں بٹی ہوئی تھی ان دونوں حصوں میں تعلیم یافتہ رئیس شیعہ گھرانے آباد تھے اور آج بھی قدریں بدل جانے کے بعد کچھ گھرانے یہیں سکونت گزیں ہیں۔لیکن زیادہ تعداد میں یہاں کے شرفا شہروں میں رہائش پذیر ہو چکے ہیں۔

امداد اصغر یہیں کے باشندے تھے۔سلطان المدارس لکھنؤ میں کیفی اعظمی کے ساتھ طالب علم رہے۔سید ابو محمد عیش کے بیٹے تھے۔گھر کا ماحول بھی دینی تھا اور ان کے مزاج کو غزل گوئی سے کوئی خاص مناسبت بھی نہیں تھی۔اس لئے غزل کے کوچے میں قدم نہیں رکھا۔اعتقادی شاعری کو اپنی فکر سے سرسبز کرتے رہے۔عمر اپنے گانو ماہل میں گزار دی۔

ان کے بارے میں سید علی جواد زیدی (۱۰؍مارچ ۱۹۱۶ء - ۶؍دسمبر ۲۰۰۴ء) نے اپنی کتاب قصیدہ نگاران اتر پردیش میں لکھا ہے کہ ماہل میں ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر ہیں۔شاعری سے بھی شغف ہے۔تیس بتیس قصیدے لکھے ہیں اور عنقریب مجموعہ شائع ہونے والا ہے۔قصیدے سب منقبتی اور نعتیہ ہیں۔

نمونۂ کلام

دیدنی ہے ان دنوں ہر ایک نقش رنگ وبو — سبزۂ بے گانہ بھی جامہ بدل کر آ گیا
باتوں باتوں میں ہنسی سوسن کے لب پر آ گئی — سامنے گلشن کے جو پُرکیف منظر آ گیا
موتیوں سے مانگ اپنی سنبلِ تر نے بھری — حسن چوٹی میں بنفشے کی سمٹ سمٹ کر آ گیا
کیوں نہ چومیں مست ہوکر نونہالانِ چمن — ساغر گل جب مئے شبنم سے بھر کر آ گیا(۱)

حواشی:

(۱) قصیدہ نگاران اتر پردیش۔سید علی جواد زیدی طبع دوم ۱۹۸۳ء ص ۱۰۰

امیرؔ - حکیم مولوی امیر علی مبارکپوری

تخمیناً ۱۸۳۶ء — ۱۹۲۱ء

محلہ پورہ خضر متصل تکیہ غریب شاہ مبارک پور مولد و مسکن تھا۔اور عربی و فارسی اپنے وقت کے اساتذہ سے پڑھی تھی۔ باقاعدہ عالم تو نہیں تھے مگر اچھے اچھے مولویوں سے زیادہ علمی و دینی معلومات رکھتے تھے اور ان کی یہ کثرتِ معلومات انہماک مطالعہ کی برکت تھی۔گھر پر بچوں کو پڑھاتے تھے۔ان کے زمانے میں باقاعدہ درس گاہ نہیں تھی خانگی مکتب میں درس دینے کا عام رواج تھا۔ان کے یہاں استاد سخن زماں مرحوم اور مولوی علی جواد صاحب نے بھی تعلیم پائی تھی۔ مولانا مفتی عبدالمنان اعظمی (۲۶ر نومبر ۱۹۲۵ء۔۲۹ر نومبر ۲۰۱۲ء) نے بھی ان کی درس گاہ سے استفادہ کیا تھا۔ اکل حلال کے لئے پارچہ بافی کو ذریعۂ معاش بنایا تھا۔کتابوں کی فروخت سے بھی کچھ یافت کر لیتے تھے۔ ہر قسم کی کتابیں بیچا کرتے تھے۔کئی بار شیعہ ہوئے کئی بار سنی۔مرثیہ پڑھنے لکھنؤ جایا کرتے تھے اور وہاں عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ان کی درس گاہ میں فارسی بھی پڑھائی جاتی تھی۔جو اس زمانے میں مسلمانوں کی اچھی تعلیم کا ایک لازمی حصہ تصور کی جاتی تھی۔ان کی خوبیوں میں قیافہ شناسی بھی شامل تھی۔جب گھر میں پڑھاتے تو بہو سے بچوں کے بارے میں بتاتے کہ اس بچے سے ہوشیار رہنا یہ چور ہوگا۔فلاں ایسا ہوگا۔اور حیرت کی بات یہ رہتی کہ واقعی وہ ایسا رہتا تھا۔

انھیں حکمت سے بھی لگاؤ تھا اور وہ دیسی جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے تھے۔اُن کے دو بیٹے تھے بڑے بیٹے محمد حسین ان سے چھوٹے صاحبزادے صفی اللہ پہلوان عرف ولی محمد استاد تھے۔ یہ فن کشتی اور بنوٹ کے مشہور استاد تھے۔محمد حسین (بڑے بیٹے) ۱۹۱۱ء میں اپنے ایک ماہی بیٹے محمد یٰسین فغاںؔ اور ان سے بڑے لڑکے ابوالحسن کو اپنی یادگار چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کیا۔

۱۹۱۷ء میں محمد حسین کی اہلیہ اور فغاں کی والدہ بھی فوت ہوگئیں تو معاشی پریشانیوں سے تنگ آ کر اپنے پوتوں ابوالحسن پہلوان اور محمد یٰسین فغاںؔ پسران محمد حسین کو ۱۹۱۹ء/ ۱۳۳۸ھ میں ساتھ لے کر سورت چلے گئے اور اس کی سرزمین نے انھیں اتنا گرویدہ بنالیا کہ پھر یہیں ۱۹۲۱ء/ ۱۳۴۰ھ میں تقریباً پچاسی سال کی عمر میں پیوند خاک ہو گئے۔ ان کے نمونۂ کلام معدوم ہو گئے۔

امینؔ - امین اللہ اعظمی

۱۹۰۲ء ـــــ ۲۶/ اگست ۱۹۶۶ء جمعہ

ان کے دادا شیخ چندن انصاری مرحوم مبارک پور سے متصل موضع ابراہیم پور سے نقل مکانی کر کے انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں محلہ باغ میر پیٹو (آصف گنج) شہر اعظم گڑھ میں آباد ہو گئے تھے۔ امین کے پدر بزرگوار شیخ عبداللہ انصاری مرحوم متوفی ۱۹۰۲ء اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے مگر توجہات کا مرکز ہونے اور لاڈ پیار کے باوجود ان کی خداداد ذہانت اور تعلیم سے فطری لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ اعظم گڑھ کے مسلمانوں میں وہ اولین طالب علم تھے جسے ۱۸۷۵ء کے آس پاس ویسلی مشن ہائی اسکول اعظم گڑھ میں ہائی اسکول کے امتحان میں درجۂ اول میں کامیابی کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان کی والدہ مکرمہ زینب بی بی محمد خلیل جراح ولد نصر اللہ پورہ صوفی مبارک پور کی پھوپھی تھیں اور ان کی فارسی دانی میں یہ اہلیت وصلاحیت تھی کہ وہی اپنے بیٹے امین کی فارسی تعلیم میں معلمۂ اول ہوئیں۔ امین کے دس بھائی اور دو بہنیں بچپن ہی میں طاعون کی نذر ہو گئے۔ اور ان کے منجھلے بھائی منشی رحمت اللہ اور خود یہ دستِ قضا سے مامون رہے۔ ان کے والد شیخ عبداللہ (ف ۱۹۰۲ء) تحریک آزادی کی حمایت کرنے کی وجہ سے انگریزوں کی ملازمت کے مخالف تھے۔ کسی انگریز افسر نے انھیں یقین دلایا کہ آپ کو پوسٹ ماسٹر بنا کر مبارک پور میں آپ کی تعیناتی کی جائے گی تو رضامند ہو گئے یوں سسرال میں سکونت رہی اور وطن کی مہاجرت کا درد ان کو جھیلنا پڑا۔

جیسا کہ ان کے خاندانی پسِ منظر سے والدین کی علمیت وذہانت اور ذہنی ساخت پر روشنی پڑتی ہے اس کا عکس امینؔ صاحب کی بھی بیدار مغزی اور ذہنی تشکیل میں نمایاں ہوا لیکن داغِ

یتیمی نے ان کی رسمی تعلیم کے افق کو دھندلا دیا اور یہ آٹھویں درجے کی تکمیل نہ کر سکے۔ اگر چہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکا مگر کتابوں اور رسالوں کی رفاقت، اہل علم کی صحبت، اور دانش مندانِ زبان وادب کی مجلسی گفتگو نے ان کے وجدان وشعور کو خروش آشنا کر دیا۔ ان کے صاحبزادے مسلم اعظمی نے لکھا ہے کہ "میں نے دیکھا ہے کہ ہر رات سونے سے پہلے لالٹین کی روشنی میں لیٹے لیٹے کچھ نہ کچھ ضرور پڑھا کرتے تھے" (۱)

سلسلۂ تعلیم منقطع ہوجانے کے بعد انھوں نے مختلف مقامات پر مختلف وسائل معاش اختیار کئے لیکن ان کی طبیعت کو کوئی کاروبار راس نہ آیا۔ کلکتہ اور رنگون کے اسفار بھی کئے۔ قصبہ کوٹواری ضلع بلیا کے رئیس حاجی عبدالغنی عراقی کے یہاں پیشۂ اتالیقی سے متعلق ہوئے۔ اعظم گڑھ کے شہرت یافتہ وکیل مولوی مرزا مرتضیٰ بیگ اور مرزا نیاز احمد بیگ کے محرر رہوئے۔ دوست احباب کی شرکت میں کاروبار شروع کیا۔ ان سب کے باوجود یہ کمائی کرنے والے آدمی نہیں بن سکے۔ مزاج کی افتاد ہی کچھ ایسی تھی کہ دنیاداری ان سے نبھ نہ سکی۔ اعظم گڑھ سے انگریزوں کے دور میں ہفتہ وار اخبار "سہیل" اپنے بچپن کے دوست افضال اللہ مالک ملت پریس کی شرکت میں نکالا۔ شعور کی آنکھیں کھولتے ہی شاعری سے دل چسپی لینے لگے آگے چل کر اس میں بڑا نام کمایا۔ ہر صنف میں کہا کرتے تھے۔ مذہبی کلام کے علاوہ غزل، نظم، سہرا، مثنوی، بچوں کی نظمیں، موضوعاتی اور خیر مقدمی اشعار، قطعہ، رباعی، مسدس، مخمس، شخصی مرثیہ، قطعۂ تاریخ، الوداعیہ، منظوم ترجمہ، منظوم دعوت نامہ، تکیہ کے اشعار ان کے مجموعۂ کلام سرمایۂ امین مرتبہ مسلم اعظمی مطبوعہ ۲۰۱۲ء میں شامل ہیں۔ انھوں نے بہت کچھ دوسروں کے نام سے بھی لکھا تھا۔ بہت پُرگو اور قلم برداشتہ لکھنے والوں میں تھے۔ برجستہ کہتے تھے اور اچھا کہتے تھے۔ زبان وبیان کی پابندیوں اور آدابِ سخن کی پاسداری کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کی معیاری شاعری کا کمال، نعت، قصیدہ اور غزل میں خوب ظاہر ہوتا تھا۔

ان کے موضوعات ان کی زندگی کے زائیدہ وپروردہ ہیں، کبیر احمد جائسی نے کہا ہے کہ "انھوں نے اپنے دلی جذبات کو اشعار کے قالب میں جس طرح ڈھال دیا ہے وہ ان کی زندگی کے حقیقی ترجمان ہیں۔ ان کے رشحات قلم اور ان کی زندگی میں بڑی یکسانی ہے۔ جس نے

امین صاحب کو نہ دیکھا ہو ان کے اشعار پڑھ لے اور اپنے ذہن میں ان کی خیالی تصویر بنا لے۔ یہ خیالی تصویر ان کی اصل تصویر سے قطعاً مختلف نہ ہوگی"۔

امین صاحب موضوع کے تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ اصناف کے مزاج شناس تھے۔ بحر و آہنگ کے انتخاب اور الفاظ کے استعمال میں ان کی شاعرانہ حس نے ہمیشہ بیداری کے ثبوت بہم پہنچائے ہیں۔ وہ لفظوں میں شعریت اور نشتریت پیدا کرنے کی تمام تر صلاحیت رکھتے تھے۔ انھوں نے موضوعات اور وزن کی ہم آہنگی کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ اور جو لفظ جس جگہ رکھا ہے وہیں آفتاب ہے۔ سیاق و سباق کلام پر غور کرنے کے بعد ہمیں اس سے زیادہ مناسب کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ اگر چہ ان کی شاعری ان کی زندگی کی تصویروں کا آئینہ خانہ ہے مگر انھوں نے اپنے حالات و کیفیات کے ذکر کے لئے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے جس سے ان کے دور کے انسانوں، سیاست کی سمتِ سفر، ان کے سماج کے مسائل، ان کی ہم عصر زندگی کی الجھنوں اور اس کے سوز و ساز پر بھی نظر جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہم عصر زندگی کے بیان و اظہار کے ادبی و شعری اسلوب کا بھی عرفان ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے اچھے شاعروں کی سچی شاعری کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ ان کے شاعرانہ اعتبار و استناد کے دعویٰ کو مضبوط کرتا ہے۔

ان کے اشارات و کنایات میں جہانِ معنیٰ اور ادبی نقطۂ نظر سے ایک گنجینۂ طلسم چھپا ہوا ہے۔ ان کی نظر بہت وسیع افق پر رہا کرتی تھی مگر جب ان کی لفظی تصویروں کو وہ اپنے شعری مرقع میں سجاتے تھے تو لفظ و بیاں، تعبیر و تفسیر اور صوت و آہنگ کی تمام قدریں اور شعری حسن کے تمام جلوے چند لفظوں میں سمیٹ لیا کرتے تھے۔ یہ تصویریں مختصر ہوتی تھیں مگر معنوی اعتبار سے ان میں بڑی وسعتیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے قادر الکلام اور فطری شاعر ہونے کا یہ بھی ایک اہم ثبوت ہے۔

ان کی نجی زندگی غمِ روزگار کا محور تھی۔ وہ تنگ دستی اور مفلوک الحال زندگی کی چلتی پھرتی تصویر تھے مگر مجال نہیں کہ ان کے شعر میں یاسیت زدگی یا اعصاب شکنی کی علامتیں ظاہر ہو سکیں۔ وہ زندگی کے محاذ پر ہمیشہ تازہ دم اور ہر دم جواں ہمت دکھائی دیتے ہیں۔ ہوائے ستم آندھی بن کے ان سے چھیڑ کرتی رہی مگر ان کی کلاہ ہر دور میں ایک معنیٰ خیز بانکپن کے ساتھ کج رہی اور ان کے پائے

ثبات میں کبھی لغزش نہیں ہوئی۔ وہ آسمانِ ادب سے لفظوں کے ستارے توڑ توڑ کے اپنی غزل کی مانگ سجاتے رہے مگر ان کے قدم روایت کی زمین سے کبھی الگ نہ ہوئے۔ ان کے یہاں بیان کی سادگی اور سہلِ ممتنع کی شان اپنی شعری حسن آفرینی کے پہلو بہ پہلو ملتی ہے۔ بازاری لب ولہجہ اور بدوی زبان سے انھیں اللہ واسطے بیر ہے۔ وہ اپنے جذبات وتاثرات کو تہذیب وشائستگی کے پردے میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ کائنات کو اپنی ذات کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے پر زور دیتے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری سے لطف وحظ اٹھانے کے لئے لسانی ریاضت کی بڑی ضرورت ہے، زبان دانی کی کنجی کے بغیر ان کے نکات سخن کے خزانۂ عامرہ کا مقفل دروازہ کبھی نہیں کھل سکتا۔

نمونۂ کلام

آفریں اے چشمِ نم تجھ سے بڑھا کوئی نہیں
رات دن برسا کرے، ایسی گھٹا کوئی نہیں

چاہتے ہیں تہ کا موتی ہاتھ آجائے مگر
تیرتے ہیں اوپر اوپر، ڈوبتا کوئی نہیں

دل کی دھڑکن سے ملا کرتی ہے آہٹ، ہے کوئی
میں نے جب آواز دی، آئی صدا، کوئی نہیں

کیا کام تجھے جلوۂ مستورِ حرم سے
اے ذوقِ نظر حسنِ در وبام بہت ہے

غم مجھ کو مٹادے گا بڑی دھوم تھی ہمدم
غم آیا مجھے راس تو کہرام بہت ہے

جاتے ہوئے ہنگامِ سحر، شام کا وعدہ
اس صبح کی ہوجائے اگر شام، بہت ہے

کروں میں غیر کا بھی احترام اے توبہ
تری خوشی ہے تو یہ ننگ بھی گوارا ہے

سمٹ کے آگئی ہے ساری کائنات اس میں
یہ میرا دل ہے کہ فطرت کا گوشوارہ ہے

حقیقت ہے آئینے میں تصویر مجاز بھی
ہے دل کعبے کا کعبہ اور بت خانے کا بت خانہ

مرا عالم عجب عالم، مری دنیا عجب دنیا
کہ ہے عشرت کدہ بھی اور غم خانے کا غم خانہ

تری راہ، شام وسحر دیکھتا ہوں
اسی رو میں اپنا سفر دیکھتا ہوں

مرے زخم کے ٹوٹ جاتے ہیں ٹانکے
میں جب جوشِ گلہائے تر دیکھتا ہوں

حرفِ اخلاص نہیں جنبشِ لب کا محتاج
دل کا افسانہ نگاہوں سے بیاں ہوتا ہے

تجھ پہ منھ بند کلی لاکھ تبسم صدقے
راز خود حسن ہے، جب تک کہ نہاں ہوتا ہے

زمانہ شانۂ تدبیر لے کر رہ گیا بیٹھا — الجھ کر ان کے گیسو سے مقدر ہم سنوار آئے
کیا سے کیا شمع یقیں کے سوختہ جاں ہوگئے — جل کے طور آرزو، بجھ کر فروزاں ہوگئے
بھر گیا پھولوں سے دامانِ نظر، دامانِ دل — میرے داغِ آستیں پر جب وہ خنداں ہوگئے
یاس کی ظلمت میں جتنے تھے نقوشِ آرزو — اک نگاہِ مہر پرور سے نمایاں ہوگئے
فطرت بدل گئی ہے کہ پیمانۂ نظر — چھوٹے بڑے سب ایک برابر کے ہوگئے
خاک، انسان ہے، انسان میں کیا رکھا ہے — عشق نے اس کو فرشتوں سے بڑھا رکھا ہے
یہ کیا ستم ہے کہ مرتے ہیں لوگ جینے پر — وہ زندگی ملے جینا حرام ہوجائے
سمندِ ناز نہ ان کی گرد کو پہنچے — زمانہ اور بھی کچھ تیز گام ہوجائے
شبِ آخر ہوچکی، تارے چھپے، آئی سحر لیکن — ہے پروانوں کو شمعِ انجمن کا انتظار اب تک
جنسِ وفا بھی ہے کہیں بازارِ حسن میں — چلئے دکانِ عشوہ گراں دیکھتے چلیں
ایسی خزاں کہ پھول چنے خود بہار بھی — وہ لالہ زارِ غم ہے دلِ داغ دار میں

نعت

بے ترے، جلوۂ صد رنگ دل آرا تو نہ تھا — حسنِ فطرت تھا مگر ذوقِ نظارا تو نہ تھا
کون تھا جلوہ دہِ عالمِ کن، صبحِ ازل — آپ سے پہلے کوئی انجمن آرا تو نہ تھا
تو ہے وہ نقطۂ تکوین کہ تجھ سے پہلے — کلکِ فطرت نے کوئی نقش سنوارا تو نہ تھا
کیوں نہ وابستۂ داماں یہ دوعالم ہوتے — تیرے دامن کے سوا کوئی سہارا تو نہ تھا

رباعی

دن تھے شباب کے یہ ابھی کل کی بات ہے — اندھیر دیکھو آج بڑھاپے کی رات ہے
اک سانس آئی اور یہ کہہ کر گزر گئی — یہ سارا انقلاب جہاں بے ثبات ہے
حسنِ کن، نورِ ذاتِ ہستی ہے — کتنی روشن صفات ہستی ہے
جو عدم کو وجود میں لائی — وہ مری بے ثبات ہستی ہے

حواشی:

(۱) سرمایۂ امین۔عرض مرتب طبع اول ۲۰۱۲ء ص ۸

انجانؔ - محمد یٰسین گرافر مبارک پوری

تخمیناً ۱۹۳۹ء ـــــ ۲۰/جولائی ۲۰۱۲ء/ ۲۹/شعبان ۱۴۳۳ھ جمعہ

انجان کئی بھائی بہن تھے اور یہ عمر میں سب سے چھوٹے تھے۔ بھائیوں میں حنیف بک سیلر، محمد سعید، عبدالسمیع، بہن حجن قمر النساء، اور صغریٰ تھیں۔ محمد سعید، عبدالسمیع پاکستان چلے گئے۔ محمد سعید نے ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۱ء میں حج کیا۔ محلہ پورہ صوفی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ مولد تھا۔ والد عبدالمجید منیم جی تھے والدہ کا نام قسیمہ تھا۔ خاندان خوشحال تھا۔ سفالہ پوش خوب صورت بلند و بالا مکان بھی گھر کے تمول کا اشاریہ بنا ہوا تھا۔ والد کئی جگہ بہی کھاتا لکھنے پر مامور تھے آمدنی بھی معقول تھی اس لئے بچپن ناز و نعم کے گہوارے میں سرمستی و خوش گواری کے ساتھ گزرا۔ مقامی مذہبی مکتب میں ان کی مکتبی تعلیم ہوئی تھی۔ خط اچھا تھا۔ گرافری کی وجہ سے خط بہار میں بھی کبھی نہ کبھی کچھ لکھ دیا کرتے تھے تو وہ بڑا جاذب نظر بن جاتا تھا۔ رشتے میں خاندان کے چچا عبدالرحمٰن تبسم مبارک پوری کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ انجان بھی مبارک پور کی مارکسی کمیونسٹ پارٹی کی باقاعدہ رکنیت رکھتے تھے اور اس پارٹی کے رہنماؤں سے ان کے گہرے مراسم اور خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ مذہب سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا مگر اپنے مذہبی مسلک پر بہت تصلب اور تمسک تھا اس کے باوجود اس مسلکی اعتصام میں تحزب و تعصب یا تشدد و تنفر کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ رواداری اور خوش مزاجی کو اصول زندگی بنانا پسند کرتے تھے۔ خود دار، غیرت مند اور کسی قدر گھر والوں کے لئے ترش رو اور غصہ ور بھی تھے عموماً اہل و عیال پر حاوی رہنے اور حاکمانہ انداز و طرز تحکم اختیار کرنے کے قائل تھے۔ اسی لئے کبھی کبھی ضدی اور اناپسند بھی بن جایا کرتے تھے۔ سرمایہ داری اور تمول کو وہ محنت کشوں، اور مزدوروں کا استحصال سمجھتے تھے اسی لئے وہ متمول طبقے کی دولت و ثروت کو پیشہ ور زمرے کے افراد کی کمائی اور اس میں ان افلاس کے ستائے ہوئے محرومانِ زمانہ کا حق جانتے تھے۔ وہ امیر لوگوں کے بارے میں کبھی کبھی بڑی دل چسپ فقرہ بازی کرتے تھے۔ وہ حسِ مزاح بھی رکھتے تھے ان کی طنزیہ و مزاحیہ پھبتیاں بڑی گرہ کشا، پُرلطف اور معنیٰ خیز ہوا کرتی

تھیں جن میں دل ودماغ رکھنے والوں کے لئے سوچ کے کئی زاویئے رہا کرتے تھے۔ان کی حاضر جوابی ان کی حاضر دماغی اور باذوقی کو ظاہر کرتی تھی۔ذہانت وذکاوت بھی ان کے حصے میں آئی تھی تعلیمی ترقی کے ساتھ اس کی اچھی تربیت ہوئی ہوتی۔لیکن تعلیم کی کمی نے ذہانت کی مناسب صیقل گرمی میں رکاوٹ ڈال دی۔

انجان کو کسی طرح کا استحصال پسند نہیں تھا اور اس سلسلے میں ان کی سماجی حس بڑی بیدار تھی۔وہ مذہبی شخصیات کے زہد واتقا اور لباس تقویٰ کے پردۂ زرنگاری میں چھپی دنیاداری اور حرص وتملق سے اچھی طرح واقف تھے۔مذہب کا استحصال کرنے والے صاحب جبہ ودستار، حامل تسبیح وسجادہ، رونق منبر ومحراب یا مسجد ومدرسہ کی مالیات پر اپنا نجی حق تصرف رکھنے والوں کے لئے ان کے دل میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔وہ ان افراد کی مذہبی سرگرمیوں کو مذہب کی تجارت کے زمرے میں رکھتے تھے۔توکل بیزار اور حرص دنیا کے شکار کو تبلیغ واصلاح اور دعوت کے کاموں میں دیکھتے تو اکثر آنند نارائن مُلّا کا یہ شعر دہراتے۔

جناب شیخ نے اپنا لئے دونوں جہاں ملاّ ۔ نمازیں پڑھتے جاتے ہیں خطائیں ہوتی جاتی ہیں

اپنی جوانی کی دوپہر میں انجمن اصلاحیہ کے نام سے چند احباب کی معیت میں ایک لائبریری بھی قائم کی تھی جس میں رومانی، جاسوسی، تاریخی ناول اور افسانوں کے مجموعوں کی تعداد زیادہ تھی فلمی رسالہ شمع بھی جو اس وقت کے نوجوانوں کے دل کی دھڑکن بنا ہوا تھا آیا کرتا تھا۔اس کے قیام سے اہل محلہ میں مطالعہ کے دائرہ کو پھیلنے اور کتاب خوانی کی دلچسپی کو ترقی کرنے کی راہ ہموار ہوئی۔اس کی وجہ سے شعور کی بیداری کے مواقع بھی ہاتھ آئے۔شادی بیاہ کی تقریب میں کرائے پر جانے والے برتن اور فرش کا بھی انتظام تھا۔بچوں کا ادب اور کچھ شعری وتنقیدی سرمایہ بھی فراہم تھا۔راقم الحروف بھی اپنے لڑکپن میں اس کے طواف واعتکاف میں لذت محسوس کرتا تھا۔والد مرحوم کے توسط سے خانۂ دل کی خالی منزل میں مہمان ہوتی ہوئی علامہ اقبال سے عقیدت کو پروان چڑھنے کا موقع یہاں کے ذخیرۂ کتب سے بھی ملا ہے۔انجمن ہاشمیہ جو ایک میلادی انجمن ہے مگر اب تعلیم وتعلم بھی اس کے عملی اقدام میں شامل ہو چکی ہے اس کے جلوس میلاد النبی سے بھی

وابستگی تھی پہلے اس کی نعت خواں ٹیم میں شریک تھے ترنم اچھا تھا آواز میں کوثر و سلسبیل کا لہرا تھا جہاں پڑھتے رنگ جمادیتے اور سماں باندھ دیا کرتے تھے۔ معاش کے لئے ریشمی ساڑیوں کے بیل بوٹے بناتے تھے جس کو ان اطراف میں نقشہ نویسی یا گرافری کہا جاتا ہے۔ مچھلی کے شکار کے بڑے شوقین تھے بلکہ راقم کی نگاہ میں عادی مجرم تھے۔ بیکاری کے اوقات عموماً ندی پر مچھلی کے شکار میں گزارتے تھے۔ ان کے لڑکے قمر اقبال، ظفر اقبال اور آصف اقبال ہیں ان ناموں سے انجان کی علامہ اقبال سے عقیدت و شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اقبال کی شاعری کے ساتھ حفیظ جالندھری کے شاہنامۂ اسلام اور شکیل بدایونی کے فلمی نغموں کے دلدادہ تھے۔

عمر بھر شاعری کی تمام مروجہ اصناف میں شاعری کی زلفیں سنوارتے رہے، ایوب مبارکپوری سیاسی رفیق راہِ سفر تھے انھیں کو فن شاعری میں اپنا رہنما بنایا۔ غزل کے مشاعروں میں ترنم سے کلام سناتے تھے آخری ایام میں شعرگوئی سے دل چسپی بڑھ گئی تھی۔ یہاں کی ماہانہ طرحی نشستوں میں پابندی سے شریک ہونے لگے تھے۔ برجستہ گوئی میں ایک اہم درجہ رکھتے تھے۔ ان کے ترنم نے شعر کو موزوں کرنے میں بڑی معاونت کی۔ وہ موزوں طبع شاعر تھے۔

ابتدائی دور میں انجمن ہاشمیہ کے میلاد النبی کے جلوس کی نعت خواں ٹیم کے لئے میلادی نعتیں لکھتے تھے۔ ایک زمانے میں ان کی ایک نعت بہت مقبول ہوئی تھی جس کا ٹیپ کا مصرع تھا" آئے بانیٔ اسلام، سارے نبیوں کے امام، ہے جن کا پیارا محمد نام" مبارک پور کے مشہور نوحہ خواں اکبر حسین اپنے مخصوص اور دلکش انداز میں جب پڑھتے تھے تو پورا مجمع سرمست و بے خود ہوجایا کرتا تھا۔ انجان اپنی شاعری میں اپنے دور کے احساسات و مسائل کی عکاسی بھی کرتے تھے۔ وہ واقعات و واردات اور حادثات و معاملات پر برجستہ شعر کہنے کے بھی عادی تھے۔ جو واقعۂ نفس الامری پر پوری طرح چسپاں ہوجایا کرتا تھا اور انجان کے اس طرح کے اشعار مذاق سخن سے دل چسپی رکھنے والوں کی داد و تحسین کا سبب بن جاتے تھے۔ راقم الحروف کو انجان کی اس طرح کی موضوعی شاعری سے لطف اندوز ہونے کا اکثر موقع ملا ہے۔ اس نوع کی شاعری کے نمونے اگر جمع کئے گئے ہوتے تو ان کی شعر گوئی کا یہ پہلو بھی ادبی و تنقیدی نقطۂ نظر سے بڑا وقیع خیال کیا جاتا۔

انجان نے زبان وبیان میں راست بیانی کو ترجیح دی ہے وہ خیال کو پیچ دے کر یا فکر کو استعارہ کا رنگ دے کر گہری بات اور فکری شعر کہنے کے فن سے عاری تھے۔ وہ سامنے کی بات کو سامنے کے لفظ وبیان کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔لفظوں کو اول معانی ان کے مختارات میں تھے اور تشبیہی واستعاراتی، رموزی وعلامتی، ثانی ومرادی معنیٰ ومفہوم ان کے متروکات میں شامل تھا جس کا وقفہ بہت کم ہوا کرتا تھا اسی لئے وہ برجستہ گوئی کا سہارا لیکر شاعرانہ مراقبے سے جلد آزاد ہوجانے کے عادی ہو گئے تھے۔

نمونۂ کلام

ثواب ہو کہ نہ ہو لذت ثواب لئے
خدا کے نام پہ ہوتی ہے میکشی ہرسو

میں کیسے جشنِ مسرت کا اہتمام کروں
غموں کی دھوپ میں جلتی ہے زندگی ہرسو

یہ عہد نارسا، یوں تو مرے برخلاف ہے
اک باوفا سے جیسے ستمگر خلاف ہے

آؤ کہ تیغ صبر ورضا تیز تر کریں
دیکھو یزید وقت کا لشکر خلاف ہے

تیری انا کا قتل بتا کس طرح کروں
جب اپنی آستیں کا ہی خنجر خلاف ہے

دیتا نہیں دعا تو مجھے بددعا نہ دے
یہ جرم، بندگی کے سراسر خلاف ہے

روداد بدنصیبی کی لکھوں تو کیا لکھوں
جب لفظ وحرف ومعنیٰ ومصدر خلاف ہے

مدت سے جو نظر میں تھا نظروں سے گر گیا
اب اشک بن کر آنکھ میں رہتا نہیں کوئی

سب کو پکارتا ہوں میں، پھر کیوں خموش ہیں
کیا تیری کائنات میں سنتا نہیں کوئی

میں دربدر پھروں یہ گوارہ ہے کب تجھے
در کا ترے فقیر ہوں، منگتا نہیں کوئی

چاندی سونے کا ذخیرہ کرلیا اب تاحیات
ہوسکے تو قرض مٹی کا ادا کرتے رہو

سچ ہے کہ سچ بول کر دنیا میں مارے جاؤگے
پھر بھی اظہارِ حقیقت برملا کرتے رہو

کتنی چہرے پر ضیا موجود ہے
دیکھ لیجے آئینہ موجود ہے

پاس میرے کیا نہیں تیرے سوا
ہر مصیبت ہر بلا موجود ہے

دیکھ کر انجانؔ اس کو یوں لگا
کوئی تو حق آشنا موجود ہے

خوشی کی چھانو میں اپنے سبھی نظر آئے
الم کی دھوپ میں سایہ نظر نہیں آتا

ترے فرمان سے ظاہر ہے کہ دنیائے فانی میں
سبھی ہیں میہماں یا رب تو کس کو میزباں لکھوں
ادا کرتا ہوں سنت میں ترے معصوم کی مولا
تبسم کے قلم سے میں غموں کی داستاں لکھوں
نہ میکدہ ہی سلامت نہ پیر میخانہ
ہمارا آپ کا گردش میں جام باقی ہے
ہر ایک لب پہ ہے نفرت کی داستاں جاری
برائے نام محبت کا نام باقی ہے
ہے قرض مٹی کا مجھ پر اسی لئے شاید
مرا جہاں میں قیام وطعام باقی ہے
کب تک زمیں کی خاک میں سر کو کھپائیں ہم
چل اٹھ کہ آسماں پہ نشیمن بنائیں ہم
کچھ کم نہیں ہے کوہِ الم اپنا، کس طرح
کاندھے پہ تیرے غم کا جنازہ اٹھائیں ہم
نام ونمود کے لئے واللہ آج بھی
کرتے ہیں کائنات میں کتنی خطائیں ہم

انجم - حکیم عبدالرشید اعظمی

۱۹۰۷ء —— ۱۱/اگست ۱۹۶۹ء

مئو کی بزم ادب کو زندگی دینے والوں میں ان کا بھی نام شامل ہے۔ اس انجمن نے پندرہ روزہ شعری نشستوں کا آغاز کرکے ادبی ماحول کو پروان چڑھایا بعد میں اسی کے اثر سے مشہور لائبریری دانش کدہ کا قیام عمل میں آیا اس سے مئو کا متمول طبقہ منسلک ہوا اور اس ادارہ نے علمی وادبی اور ثقافتی تقریبات کے لئے مرکزی حیثیت اختیار کرلی۔

انجمؔ مولانا عبداللہ شائقؔ سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے سند یافتہ حکیم تھے اور اپنی اردو شاعری میں بھی حکمت وفلسفہ کے خیالات ومضامین شامل کرکے اس میں رنگ دیگر پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بڑی باغ وبہار شخصیت کے مالک تھے اور باتیں بڑی دل نواز کرتے تھے۔ ہر ایک سے اچھی نباہنے کا بھی ہنر خوب معلوم تھا۔

مدرسہ فیض عام کے فارغ التحصیل تھے۔ اردو، فارسی اور عربی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ بڑا نکھرا ہوا ذوق سخن تھا۔ زبان وبیان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ دل کشی، شائستگی اور بلند خیالی ان کا مطمحِ نظر تھی۔ مشاعروں میں اپنا کلام ترنم سے سناتے تھے۔ اور اس خصوصیت میں منفرد

انداز کے مالک تھے۔

انجمؔ تقریباً نصف صدی تک مصروف شعر وسخن رہے۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں میں طرز ادا، جدت خیال، ندرت فکر، وسعت مضامین کی بدولت ایک انفرادیت حاصل کرلی تھی۔ انھوں نے ادب، ملک اور زندگی میں بڑے انقلابات دیکھے جن سے ہمارا سماج بھی متاثر ہوا اور ہمارے دانشور بھی۔ چونکہ ان کی فرودگاہ ہر طرح کے لوگوں کی بےتکلف نشست گاہ تھی اس لئے ان کی نگاہ نے ان انقلابات کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس لئے ان کے اشعار میں غم جاناں کے ساتھ انقلاباتِ زمانہ، کشمکش عصر، اور انسان کی محرومیاں موجود ہیں۔ اور ان کے دلوں کی دھڑکنیں بھی ان کے یہاں صاف سنائی دیتی ہیں۔ ان کا کلام ہمت، جواں مردی اور بیداریٔ عمل کا پیغام بھی دیتا ہے اور اپنے اندر تغزل کی دل کشی، رعنائی، لوچ، نرمی اور سوز وگداز بھی رکھتا ہے۔

حکیم انجمؔ صاحب مہمان نوازی، نکتہ رسی، بذلہ سنجی، برجستہ گوئی، طنز فرمائی اور اخلاقی بلندی میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کی انجم فارمیسی سب کے لئے ایک بےتکلف نشست گاہ تھی جہاں دین ودانش، شعروادب اور مذہب وسیاست پر کھل کر گفتگو ہوتی تھی اور اسے مئو کے علمی وادبی حلقوں کے شائستہ مذاق اور شعور حیات کا نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں بہت سنجیدہ، سنبھلے ہوئے، خاموش اور باہوش لوگوں کے پہلو بہ پہلو بات بات پر مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑنے والے جام وشراب میں ڈوبے اور بہکے ہوئے لوگ بھی ہوتے تھے۔ خود حکیم صاحب ایک خوش فکر وخوش گو شاعر ہونے کے باوجود چھوٹوں میں چھوٹے، بڑوں میں بڑے، سب سے یکساں محبت کرنے والے، سب میں بااثر، دوستوں کے دوست، دشمنوں کے دشمن، حکیم صاحب کو ایک انجمن کہا جاتا تو بےجا نہ تھا۔

نمونۂ کلام

ساعتِ بندگی پیر مغاں ہے اے دوست ہرلب جام پہ گلبانگِ اذاں ہے اے دوست
پھر مری عرض تمنا سے ہے بیگانہ وشی پھر ترے لب پہ حدیثِ دگراں ہے اے دوست
چھوڑتی ہی نہیں جینے کی تمنا مجھ کو پھر تری یاد انیس دل وجاں ہے اے دوست
شمع ہر انجمنِ ناز میں روشن ہے مگر شوقِ جاں سوزیِ پروانہ کہاں ہے اے دوست

عشق نے حرکت رندانہ سکھادی مجھ کو
کون اب نازکشِ سودوزیاں ہے اے دوست

آج بھی چاک ہے دامانِ سکوں اے انجمؔ
آج بھی گردشِ ایام جواں ہے اے دوست

لے جائے جہاں چاہے ذوقِ غمِ جانانہ
ہر انجمن اپنی ہے گلشن ہو کہ ویرانہ

اے شمع کہیں تیرا دامن نہ سلگ جائے
ٹپکا ہے پھر آنکھوں سے سوزِ دلِ پروانہ

اک شعبدۂ رنگیں، اک خوابِ نشاط آگیں
یہ عمر دوروزہ بھی افسانہ ہے افسانہ

ابھی تو صبح کے لب پہ تبسم آیا ہے
ابھی سے کیوں غمِ تیرہ شبی کی بات کرو

الجھے رہو سورج سے کرن کی طرح لیکن
شبنم کی طرح مہرِ درخشاں سے نہ کھیلو

نہ ستم کاان سے ملال ہے، نہ کرم کاان سے سوال ہے
جوانھیں کی راہ میں کھوگئی اسی زندگی کی تلاش ہے

نہ ہوا حریف وفا کبھی، نہ ہوا ملولِ جفا کبھی
مرارنگ ہی ہے الگ مجھے تری بے رخی کی تلاش ہے(۱)

جس غم کا ترے کوئی طلبگار نہیں ہے
وہ ہم کو عطا ہو، ہمیں انکار نہیں ہے

کیا اہل جنوں وضعِ جنوں چھوڑ چکے ہیں
زنجیرِ جنوں کی کہیں جھنکار نہیں ہے(۲)

صحرائے جنوں ہو کہ فراز رسن ودار
دیوانے کہیں سے کبھی ناکام نہ آئے

انجمؔ ہے بہت مستیٔ صہبائے تصور
مجھ تک یہی اچھا ہے کوئی جام نہ آئے(۳)

اے نگاہِ تغافل ادھر دیکھنا
ہم کو بھی بے نیازی کی خو ہوگئی

خونِ دل میں تھیں اُف کتنی رنگینیاں
آرزو اور بھی سرخ رو ہوگئی

جو ہوا پردۂ دوستی میں ہوا
دشمنی کیوں یہ بے آبرو ہوگئی

حواشی:

(۱) ماہنامہ شاعر بمبئی دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۳۷

(۲) ایضاً نومبر ۱۹۶۹ء ص ۴۲

(۳) شاعر بمبئی، جنوری ۱۹۵۹ء ص ۳۸

انجمؔ - مشتاق احمد اعظمی (پروفیسر)

۲؍جنوری ۱۹۳۱ء ـــ ۲۱؍فروری ۱۹۹۰ء (کراچی)

مولد ومنشا فتح پور تال رتوئے ضلع اعظم گڑھ۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں رہ کر دیگر اساتذہ کے علاوہ خصوصی طور سے رشید احمد صدیقی سے فیض تلمذ اور شرف شاگردی حاصل کیا۔ اقبال سہیل سے کافی متأثر تھے۔ بعد میں ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور وہیں فوت بھی ہوئے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہوئے۔ ان کے مضامین ادبی رسالوں میں وقعت کی نظروں سے پڑھے جاتے تھے۔ لب رخسار، لہو کے چراغ، چہرہ، زیر آسماں ان کے شعری مجموعوں کے نام ہیں۔ نثری کتابوں میں شاعری کی زبان، جدید اردو لٹریچر، اعلیٰ تعلیم کے مسائل، ان کی علمی وادبی اور تنقیدی صلاحیتوں کا آئینہ ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں ''چہرہ'' کو انجمن مصنفین پاکستان کی طرف سے پانچ ہزار روپئے کا ایوارڈ ملا تھا۔

انجمؔ ایک اچھے تنقید نگار تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین علمی وادبی حلقوں میں شوق اور دل چسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ یہ اپنے دور کے تنقیدی رجحانات ومیلانات اور مسائل ومباحث کی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ اس لئے جو کچھ بھی لکھتے اور کہتے تھے اس کی استنادی حیثیت ہوا کرتی تھی۔ نورنگ کراچی کے ستمبر ۱۹۵۲ء کے شمارے میں مثنوی زہر عشق کا ایک نیا تجزیہ کے زیر عنوان ان کا جو مقالہ اشاعت پزیر ہوا تھا اس نے ادبی حلقوں مین زیادہ دنوں تک دھوم مچا رکھی تھی۔ ان کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ادبی وفکری عقیدے میں یہ بات شامل تھی کہ ادب کو نئے ہونے کے ساتھ ساتھ کسی ایسے معنیٰ کا بھی حامل ہونا چاہئے جو زندگی کے ادراک میں ایک جہت کا اضافہ کرر ہا ہو۔ کسی نئے رخ کو روشنی میں لانے کا سبب بن رہا ہو یا انسانی روح میں جھانک کر کسی نئے درد، نئی خوشی یا نئے آہنگ کا ترجمان بن چکا ہو۔ ادب کو نئی روح اور نئے رخ کی تلاش میں ادب کی روایت سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے۔ ہرآن بدلتی ہوئی زندگی سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں قدرتِ اظہار اور اپنے خیالات کو زبان کا لباس پہنانے میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ

کرنا فن کار کی اہم ذمہ داری ہے۔ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اپنے ہی گرد وپیش کی زندگی سے تشبیہ واستعارہ اور تمثال پیش کرنا چاہئے تا کہ اپنے جغرافیائی ماحول اور قدرتی ساخت ومزاج سے پیش کش کا ٹکراؤ نہ ہو اور قاری کو ادب پارے سے ایک خاص قسم کا انس پیدا ہو۔

انجم ہیئت پرستی کے شدید مخالف تھے۔ بہت زیادہ سوچنے اور زندگی کے بارے میں جاننے کو اہمیت دیتے تھے۔ ابلاغ اور معنیٰ پر نظر رکھنے کے قائل تھے۔ تجربے میں اپنے عہد کی گہری فکر اور شدید جذبے کی بھی آمیزش ہو تو وہ مستقبل کی ضمانت ہے جس میں سیاست کا نیا تصور، تہذیب کی نئی چمک، معاشی زندگی کے نئے رشتے اور جنس کا نیا عرفان ہو وہی شعر جدید کہلانے کا مستحق ہے۔ ان کے خیال میں جدید بالکل جدید نہیں ہوتا بلکہ ماضی کے سمندر سے ابھرنے والی اس موج کا نام ہے جو ہماری نظروں کو صرف خیرہ ہی نہیں کرتی بلکہ ہمیں حال اور مستقبل عطا کرتی اور روایت کی ایک نئی کڑی دریافت کرتی ہے۔ان کے نزدیک یہ بھی اہم ہے کہ شاعر یا ادیب اپنی انفرادیت کا نقش بھی اپنے فن پارے کے حوالے اور ذریعے سے ابھارے۔ نگار کے جولائی ۱۹۶۵ء کے جدید شاعری نمبر سے ان کے نظریاتِ نقد اور عقیدۂ شاعری کا بہت واضح علم ہوتا ہے۔

نمونۂ کلام

ہے کہاں زیست کی وادی میں بہاروں کا خرام
آج بھی بھڑکی ہوئی سینوں میں ہے آتشِ غم
جن کے محلوں میں نئی شان کی آرائش ہے
ان خزاں دیدہ بہاروں نے ہمیں لوٹا ہے
اب بھی محنت کا صلہ بھوک ہے، عریانی ہے
شب کے بے نور ستاروں نے ہمیں لوٹا ہے
پھر صدا دیتے ہیں وہ درد بھرے پیار کے گیت
پھر بلاتے ہیں وہی ٹوٹے ہوئے دل کو
آج تہذیب کا ہر زخم ہوا پھر عریاں
آج پھر پانا ہے ہر درد کا ساحل ہم کو
ایک بار اور سہی خون کی ہولی ہے تو کیا
گرد آلود فضاؤں میں نہیں جی سکتے
ایک بار اور نکھرنا ہے گلستانوں کو
زہر آلود ہواؤں میں نہیں جی سکتے
ہے جہاں خونِ شہیداں کی شفق پھوٹی ہوئی
ہم نئی زیست کا وہ سرخ افق چھو لیں گے(۱)

زندگی اب بھی ہے احساس گراں بار سے چور
غم سے بوجھل ہے مگر تیری تمنائی نہیں
آج ٹھکرا بھی سکا رسم وفا کے آداب
تیرا سودائی بھی شاید ترا سودائی نہیں
آج کس طرح کا الزام مرے سر آیا
ہر ستم ہنس کے سہے، زیست بھی شرمائی نہیں
درد سے دل بھی ہے ایک چھلکتا ہوا جام
غم کی مینا ہو، مگر غم کی شکیبائی نہیں (۲)

حواشی:

(۱) شاہراہ دہلی مئی ۱۹۵۰ء ص ۶۳

(۲) شاہراہ۔ دسمبر ۱۹۵۳ء ص ۵۴

انجم - محمد مبین خیرآبادی

ـــــ ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۶ء

انجم کے والد محمد سعید شاعر تو نہیں تھے مگر مدحت صحابہ میں اشعار ترنم سے پڑھا کرتے تھے اور غالباً مدح صحابہ کی نظمیں جلسوں جلوسوں میں سنانے ہی کی وجہ سے مجاہد بھی کہے جانے لگے تھے۔ انجم کے استاد سخن ضیا مالیگانوی تھے۔ انصاری لائبریری خیرآباد میں شاعرات کو مشاعرہ میں مدعو کرنے نہ کرنے کے سلسلے میں اختلاف ہوا تو ۱۰ر ستمبر ۱۹۷۰ء/ ۱۳۹۰ھ کو اردو لائبریری کا وجود عمل میں آیا جس کے پہلے صدر انجم خیرآبادی منتخب کئے گئے اور انھوں نے اس ادارہ کو اپنا مقصد حیات قرار دے کر اہل علم وفن کے لئے مرجع خاص بنا ڈالا اور اس کے ذخیرۂ کتب میں اہم علمی وادبی اور حوالے کی کتابوں کا اضافہ کیا۔ انجم خیرآباد کے علاوہ متعدد مقامات اور شہروں میں بسلسلۂ معاش مقیم رہے اور وہاں کے تجربات ومشاہدات نیز ادبیات وشعریات سے استفادہ کرتے رہے۔ اس کا اظہار ان کے ۱۹۸۹ء میں شائع مجموعۂ کلام "گلہائے صد رنگ" سے ہوتا ہے جس میں ان کی نظمیں اور غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ انجم کی غزلوں میں روایت کا احترام اور لب ورخسار کا مینا بازار قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے قدماء کے مضامین واسلوب کو اختیار کر کے اپنے دور کے رنج وراحت اور عکس وشخص اپنے نگار خانۂ سخن میں جگہ دی ہے۔ کہیں کہیں زبان وبیان اور تلفظ کے

معیار کو باقی نہیں رکھ سکے۔ جیسے

طبع رنگیں کا مری فیض ہے انجمؔ یہ سب ۔ صف شعرا میں جو میں نے یہ جگہ پائی ہے
اٹھے جو ہم تو جہاں سے خراج وداں لئے ۔ گرے تو خاک کی آغوش میں اماں لئے

خراج وداں میں واوعطف، اور شُعَراء کے بجائے شُعُرا غلط ہے۔

انجمؔ نے غزل، نظم، نعت، منقبت، سہرا اور دیگر موضوعاتی اصناف میں شاعری کی۔ ان کی نعتیں دینی جلسوں میں داد و تحسین حاصل کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں بدلتے ہوئے اسلوب و انداز اور زبان و بیان میں ابھرتی ہوئی تبدیلیوں کو جگہ دی۔ مطالعہ نے ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ وہ لفظوں کے مزاج شناس بن گئے تھے۔ ان کی شاعری مبتذل خیالات و رکیک الفاظ سے ہمیشہ دامن کش رہی۔ فقر و فاقہ اور زندگی کے مصائب و شدائد جھیلنے والوں کی زندگی کی ترجمانی ان کے یہاں بہت اچھے انداز میں ملتی ہے۔ کہیں کہیں امیرانہ طرزِ معاشرت اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کے خلاف ان کی آواز میں احتجاجی لے بہت زیادہ ابھرتی ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا شعری سرمایہ ان کے دور کے دکھ سکھ، رنج و خوشی، اور افلاس و محرومی کی منظوم داستان ہے۔ جس میں ان کی شعری و ادبی اور لسانی و فکری صلاحیتوں نے نئے ابعاد روشن کئے ہیں اور اپنی اہمیت و انفرادیت کا احساس دلایا ہے۔ ان کی ایک نظم "دوشیزۂ اردو" ہے جس میں انھوں نے تاریخ شعر و ادب کے صاحبانِ تاج و دستار کے ناموں کے دوش بدوش اپنے گردو نواح کے ان شعراء کے نام بھی لئے ہیں جن کی شاعری نے اپنے دیار کی شعری لے بلند کرنے میں نمایاں کام کیا ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

میرے آنچل میں فضاؔ نے ٹانکے ہیں کرنوں کے تار ۔ اور ان کو کر دیا فکر اثر نے زرنگار
فکر سیفی نے پرویا ان میں درِّ آبدار ۔ ذوقِ حاصلؔ نے مکمل کر دیا میرا سنگھار
میری زد میں جو بھی آیا، ہو گیا صید زبوں
دیکھ کر مجھ کو فرشتے بھی لٹا بیٹھے سکوں
سہاگنوں کو تمہیں نے تو بیوگی دی ہے ۔ ہر اک کلی پہ تمہیں نے درندگی دی ہے

کنول سے بچوں کی نیزوں سے زندگی لی ہے　　کبھی جو بجھ نہ سکے آگ وہ لگائی ہے

خدا کرے بہت جلد ایسا وقت آئے
تمہارے اسلحہ خانوں میں آگ لگ جائے (امریکہ سے خطاب)

تیری آمد سے چمن نے اوڑھ لی گل کی ردا
تیری آمد سے پہن لی پھول نے رنگیں قبا
تیری آمد سے ملی ہاتھوں میں کلیوں نے حنا
تو چمن کا حسن، تو ہی ہے بہاروں کی دلہن
اے مری صبحِ وطن، رنگینیٔ شعر و سخن (صبحِ وطن)

بہادرو! ہے یہی وقت کی پکار بڑھو　　سنبھالے ہاتھ میں شمشیرِ آبدار بڑھو
مثالِ شیر اٹھو، مثل شعلہ بار بڑھو　　لگاتے کشتوں کے پشتے بصد وقار بڑھو
تمہیں ہو ہند کے جاں باز وجاں نثار بڑھو　　تمہارے ساتھ ہے ہندوستاں کا پیار بڑھو
بڑھو جوانو بڑھو تیغِ بے اماں کی طرح
گرو غنیم پہ برقِ شرر فشاں کی طرح (بہادروں سے خطاب)

جلوہ ہائے چمن، نازکیِ سمن، تابِ درِّ عدن، بوئے مشکِ ختن
ٹھنڈی ٹھنڈی پون، یہ زمیں وہ گگن، ہاں یہ سارے کے سارے ہیں انکے لئے
جب نسیمِ سحر، گل کے رخسار پر، رولتی ہے گہر، صبح دم جھوم کر
پڑھ کے صل علیٰ، بلبلِ خوش نوا، کہتی ہے یہ نظارے ہیں ان کے لئے

کبھی وسیع فضا میں سمندروں میں کبھی　　پھرے ہے آدمی چھوٹی سی ایک جان لئے
کس طرح کٹی شامِ الم، ہم سے نہ پوچھو　　لو صفحۂ رخ آپ ہی خود پڑھ لو سوالو
کانٹوں نے تو پوچھا تھا فقط حال تمہارا　　کیوں پھوٹ کے روئے ہوارے پاؤں کے چھالو
دونوں کی زندگی کا منشا ہے آشکارا　　تیری نظر میں ساحل، میری نظر میں دھارا
ہمیں نہ ہوں گے تو کیا ہوں گے ساغرو مینا　　ہمارے دم سے ہی آباد ہیں یہ مے خانے
ابھی تک راز اپنا راز ہے تم پر کھلا کیا ہے؟　　ابھی میں نے کہا کیا ہے ابھی تم نے سنا کیا ہے؟

یہ کہہ کر شمع کے پہلو میں پروانے نے دم توڑا
فنا کے بعد ہوتی ہے سکوں کی زندگی حاصل

یہ کس نے آتے ہی پھولوں کو تازگی بخشی
یہ کون آیا فضاؤں کو مشک بو کرتے

افشائے راز کرنہ سکے ہم زبان سے
مجبور ہوگئے ہیں مگر چشمِ تر سے ہم

پھولوں کی محبت میں کانٹوں سے بھی الفت کی
خوشیوں کے لئے میں نے غم سے بھی رفاقت کی

بجھانا چاہتے ہو پیاس تو ہاتھوں کو جنبش دو
لبوں تک خود بہ خود اٹھ کر تو پیمانہ نہیں آتا

جلا گئی مری پلکوں پہ قمقموں کی قطار
وہ ایک یاد جو آئی کسی کا نام لئے

لبوں پہ پیار کے گل دل میں آتشِ نفرت
اک آگ باہر ایک اندر ہے دیکھئے کیا ہو

انجم - نجم الہدیٰ صدیقی

۱۲/ربیع الاول ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء ـــــ ۱۵/ستمبر ۱۹۹۸ء

مولانا قمرالدین قمرؔ ساکن موضع ہمایوں پور عرف ہمئی پور تحصیل پھول پور ضلع اعظم گڑھ کے بیٹے ہیں۔ ادیب وشاعر وصحافی تھے۔ اصلاح میں پڑھا چکے ہیں اور آپ نے بھی اسی مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں متوسطات کی تعلیم حاصل کی تھی اور اردو، فارسی، عربی میں یہیں کے اخذ واستفادہ سے صاحب استعداد ہوئے تھے۔ زراعت وتجارت ذریعۂ معاش تھا۔ گھر میں دینی ماحول تھا اس لئے ذہن ومزاج کی تشکیل بھی مذہبی نہج پر ہوئی تھی۔ شعروادب کا بڑا اچھا ذوق تھا، نثر ونظم پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ قلم میں بڑی روانی اور طبیعت میں جولانی تھی۔ طبعاً سیلانی تھے جم کر کوئی کام نہ کر سکے۔ آخر عمر میں رنگ سازی کرنے لگے تھے اور اسی کو ذریعۂ معاش بنالیا تھا۔ بڑے ہی مہمان نواز اور سیر چشم تھے۔ اپنے کلر لے کر مبارک پور آیا کرتے تھے۔ اچھی اور سنجیدہ گفتگو کرتے تھے۔ نرم خوئی اور خندہ روئی ان کی سیرت کا روشن پہلو تھی۔ ان کے بڑے بھائی مولانا نورالہدیٰ اصلاحی، صاحب صلاحیت عالم وشاعر اور حافظ وقاری تھے۔ نورؔ تخلص تھا۔

انجم نے سرائمیر سے ایک ہفتہ وار "آغازِ سفر" نکالا تھا جس کے مدیر خود تھے اور سرپرست ناطق اعظمی کو بنایا تھا۔ اس سلسلے میں ناطق صاحب کا یہ شعر اکثر لوگوں کی زبان پر آج بھی ہے چونکہ

کسی نے ناطق صاحب سے آغازِ سفر کی اشاعت کے بارے میں پوچھا تھا جس کا جواب یہ شعر تھا۔

مدت ہوئی آسودۂ منزل ہوا راہی ۔ دھوکے میں ابھی آپ ہیں آغازِ سفر کے

اسی طرح انھوں نے اپنی ادارت میں ہفت روزہ "الجہاد" سرائمیر بھی جاری کیا تھا۔ اس کے مالک شاہ عالم شروانی تھے۔ اس کے علاوہ ہفتہ وار جبریل سرائمیر سے بھی وابستہ رہے جس کے مدیر اعلیٰ مولوی مرتضیٰ صاحب تھے۔

کلام انجم کے نام سے انھیں کی ترتیب میں ۶۹ صفحات پر مشتمل ان کا ایک مجموعہ ان کی وفات کے بعد ۲۰۰۷ء میں گلشن اقبال کراچی پاکستان سے اشفاق احمد کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکا ہے جس میں غزلوں کے علاوہ ۲۴ قطعات اور ایک نعت پاک شامل ہے۔

انجم کا ذوقِ شعری بہت منجھا ہوا اور شائستہ تھا۔ ان کی زبان لکنت وژولیدگی سے پاک اور ادبی حسن سے آراستہ ہے۔ ان کے خیالات ومحسوسات اور مشاہدات وتجرباتِ سخن میں شاعری کی کئی سو برس سے مسلسل چلی آرہی شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے ذخیرۂ الفاظ، اپنے خزینۂ تعبیرات، اپنی اساطیر وروایات، اپنی تاریخ، اپنی لسانی تحریک سے اکتساب واستفادہ جم کر کیا ہے اسی لئے ان کے یہاں اپنی ادبی بازیافت اور شناخت کا عمل بہت تیز ہے۔ ان کے لہجے میں جو رچاؤ ہے وہ بہت کم شاعروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ان کی زبان شرفائے انجاب اور روسائے ادب کی تراشی اور نکھاری زبان کی پروردہ ہے۔ ان کے یہاں ژولیدگی یا تعقید کا کوئی عیب نہیں ہے۔ انھوں نے نہایت آسانی سے اپنی بات اس سلیقے سے کہی ہے کہ سننے والے کے دل ودماغ میں نشتر بن کر اتر جائے اور ذہن کے ابعاد روشن ہو جائیں۔ ان کے یہاں لفظ ومعنیٰ کا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوتا۔ غزل جن خوبیوں کی وجہ سے غزل کہی اور سمجھی جاتی ہے وہ سب خوبیاں انجم کے یہاں موجود ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں تغزل کی روح کو باقی رکھتے ہوئے اپنے دور کے مسائل، اپنے زمانے کی الجھنوں، اپنے وقت کی کرب ناکیوں کو بھی بیان کیا ہے۔ وقت کی نبض پر ان کی انگلی اور زمانے کی رفتار پر ان کی نگاہ تدبیر وتدبر کے تقاضوں کے ساتھ ہے۔ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا یا اپنے گرد وپیش کی دنیا میں جو کچھ ہوتے دیکھا ان کا اظہار بے کم وکاست حق وصداقت کے تمام مطالبوں کی

رعایت کے ساتھ شاعرانہ انداز واسلوب میں کر دیا ہے اور کسی مقام پر عجز بیان اور نارسائی فکر وخیال کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔ یہ ان کی قدرت کلام اور فن شاعری پر ماہرانہ دسترس کو ظاہر کرتا ہے۔ انجم کی شاعری جذبہ وتاثیر کے اعتبار سے بھی ایک عمدہ مثال ہے۔ انھوں نے زندگی کے سوز وساز کو شعر کا پیرہن عطا کیا ہے اور تغزل کی روح کو کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیا ہے یہ اُن کا کارنامہ ہے۔ اُن کی شناخت ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے ہے جو فن سخن کے تمام اصولوں اور لوازمات پر نگاہ رکھتا ہے۔

نمونۂ کلام

عرب کی سرزمیں پر جہل کی تھی تیرہ سامانی — تھا پیکر میں بنی آدم کے رقص روحِ پیشانی
یکایک رحمت حق نے جلائی شمع ایمانی — ہدایت کی تجلی نے کیا عالم کو نورانی
حرا کے غار سے نکلا مہِ کامل رسالت کا — نویدِ صبح لیکر آئی شب کی چاک دامانی
بجز ان کے زمیں سے کون پہنچا عرشِ اعلیٰ تک — سوا ان کے ہوئی کس کو میسر حق کی مہمانی
بصیرت کی نگاہوں سے اگر دیکھے کوئی انجمؔ — نظر آئے گا احمد میں جمالِ نورِ یزدانی (نعت)

یہ اشکِ غم نہیں یارو مسافر ہیں یہ مہماں ہیں — یہ آئے ہیں دلِ حسرت زدہ کے ترجماں بنکر
بھلا تشنہ لبی اس کے ارادے کو بدل دیتی — اٹھا جو حق کی خاطر عزم کا کوہِ گراں بنکر
لکھی ہے خون سے اپنے جو تفسیرِ وفا تو نے — رہے گی صفحۂ ہستی پہ نقشِ جاوداں بنکر
دیتی رہیں سہارا خود بجلیاں چمک کر — ملتا رہا اجالا گزرا جہاں جہاں سے
عنوان بن گیا ہے افسانۂ خرد کا — جو حرف بے خودی میں نکلا مری زباں سے
شبنم کہیں کہ اشک کہیں یا گہر کہیں — کیا چیز ہے یہ دیدۂ حیراں لئے ہوئے
ہم ان سے کیا امیدِ مداوائے غم کریں — جو خود ہیں اپنا چاک گریباں لئے ہوئے
تڑپ تڑپ کے شبِ غم گزارنے والے — سحر بھی راس نہ آئی اگر تو کیا ہوگا
مٹاؤ شوق سے لیکن یہ سوچ لو دل میں — ہماری خاک سے اٹھے شرر تو کیا ہوگا

بے نور سویرا ہوتا ہے غربت کی اندھیری راتوں کا
بڑھ جاتی ہے غم کی تاریکی جب صبح نمایاں ہوتی ہے

طلبگارِ غم پھر ہواؤں کی زد میں　　چراغِ تمنا جلانے لگے
طلب کی راہ میں ایسے بھی کچھ مقام آئے　　جو تیز دھوپ ہوئی، دور ہوگئے سائے
نہیں ہے زیست کی اب دل میں آرزو لیکن　　یہ چاہتا ہوں مسیحا کی لاج رہ جائے
داستانِ غم کہوں یا ناقۂ محمل کی بات　　رنگ کوئی ہو مگر رہتی ہے اپنے دل کی بات
جرأتِ حق گوئی انجم سیکھ لے ہم سے کوئی　　تیغِ قاتل سر پہ تھی، پھر بھی کہی قاتل کی بات
میری فطرت چاہتی ہے کھیلنا خود موج سے　　ورنہ میں چاہوں تو آجائے یہیں ساحل ابھی
بھلا یقین ہو کیسے بہار گزری ہے　　ابھی نسیمِ سحر اشک بار گزری ہے

عبرت کی ہے جا یہ بادہ کشو جس نے پلائی مے سب کو
نیرنگِ زمانہ تو دیکھو ہاتھوں میں اسی کے جام نہیں

وارفتگانِ عشق کی منزل نہیں کوئی　　دل نے کہا جہاں یہ وہیں خیمہ زن ہوئے
مصیبتوں میں گھر کے بھی گزارتے ہیں زندگی　　ہے دلکشی وہ کون سی جہانِ فتنہ ساز میں
دل کو ملا نہ غم سے مسرت میں بھی فراغ　　اب غم کی آرزو ہے اگر کوئی غم نہیں
کشتئ امید ڈوبی کیسے بحرِ یاس میں　　کاش ساحل ہی پہ وہ آکر تماشا دیکھتے
ڈوبتے دیکھی سب نے کشتی　　بڑھ کے کوئی دوگام نہ آیا
حرف حرف نشتر ہے، لفظ لفظ خنجر ہے　　اس کتابِ ہستی کا ہر ورق منور ہے
ظلم، جور، خوں ریزی، درد، کرب، محرومی　　باغِ آدمیت کا ہر شجر تناور ہے
ہر مکیں مقید ہے ذات کے گھروندے میں　　ہر خیال بے پر ہے، ہر مکان بے در ہے
سوچ میں زمانہ ہے کیا کرے کہاں جائے　　جاں فشاں ہوائیں ہیں، دلفریب منظر ہے
کب کسی کی چاہت کا دم بھرے کوئی انجم　　نرم خو محبت کا سنگ دل مقدر ہے
بوسیدہ وشکستہ سہی اک منار ہوں　　اپنی چھتوں پہ چڑھ کے ادب سے بلائیے

(قطعات)

نہ کر خائف مجھے تو آسماں برقِ تپاں سے　　ہزاروں بار گزرے ہیں شرارے آشیاں سے
زمانے کے ستم سے وہ کبھی پسپا نہ ہوگا　　جسے ملتی رہی ہو تازگی بادِ خزاں سے

شکوۂ جور کروں میں تو بغاوت ہوجائے
طالبِ رحم بھی ہوں میں تو بغاوت ہوجائے
جس قدر بھی وہ کریں ظلم کوئی بات نہیں
بات حق کی کہوں میں تو بغاوت ہوجائے
شکوۂ سختیٔ آلام کروگے کب تک
ماتمِ گردشِ ایام کروگے کب تک
جس سے ہوجائے سیہ خانۂ قسمت روشن
ایسا آغازِ خوش انجام کروگے کب تک
اپنی محرومی پہ خوش ہیں کیا علاجِ غم کریں
کس لئے ہم اہلِ گلشن فکرِ بیش وکم کریں
مٹ چکے اک ایک کرکے زندگانی کے نقوش
آؤ مل کر ملتِ مرحوم کا ماتم کریں

انجم معروفی - غضنفر علی

۱۹۴۹ء — ۱۹۹۹ء

ان کا مسقط الراس پورہ معروف کوپا گنج ضلع اعظم گڑھ (اب مئو) تھا۔ ان کے والد گرامی ابوالحسن عرف چھوٹک انصاری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ انجم کی والدہ فاطمہ اور خالہ ہاجرہ بھی شاعرہ تھیں اور اہل بیت اطہار کی مدح میں شعر کہتی تھیں۔ انجم کی تعلیمی لیاقت کوئی خاص نہیں تھی۔ فارسی وعربی کی معمولی تعلیم تھی۔ مگر بڑی وافر صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ گھر کے ادبی وشعری ماحول اور والدہ وخالہ کی آغوش شعروسخن میں ذہنی بالیدگی اور شعور کی پختگی کا سامان موجود تھا۔ خود بھی شعر کہنے لگے اور اپنی مناسبت طبعی سے بہت شگفتہ لب ولہجہ میں زمین سخن کو لالہ زار بنانے لگے۔ اپنی شعرگوئی کی جہت نو سے ارباب ذوق کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ عوام وخواص میں ان کی شاعری کا اعتبار ووقار قائم ہوگیا۔ ان کی معیاری شاعری کی ایک اہم وجہ ان کی محنت شاقہ اور جانگسل فنی ریاضت ومزاولت بھی ہے۔ وہ اپنی تعلیم کی کمی کو کتاب ومطالعہ کی رفاقت سے دور کرنے میں کامیاب تھے۔ طبیعت ایسی خلیق پائی تھی کہ وہ معمولی سے معمولی فرد کو بھی کلام لکھ کر دیدیا کرتے تھے۔ کسی کو محروم کرنا ان کی شریعت سرشت میں گناہِ عظیم سے کم نہیں تھا۔ ان سے بہتوں نے شہرت ونیک نامی پائی اور ترقی کے زینے طے کرکے آگے بڑھے۔ ان کے کلام کو صدابند کرنے والے ذاکر مجتبیٰ عرف جمن مسمّیٰ بہ انجم معروفی انھیں کی توجہ خاص کے نور سے محافل ومجالس کا

ایک چمکتا ہوا ستارہ بنے ہوئے ہیں۔ راقم کے بار بار کے استفسارات پر بھی ان محترم نے کبھی اصلی انجم معروفی کا سراغ تک لگنے نہیں دیا۔ وہ تو مولانا رضی عابد اور کلیم معروفی کی عنایت ہوئی کہ انجم کے حالات و کلام تک راقم کی رسائی ہوگئی ورنہ شاید اتنا اچھا دبستان اعظم گڑھ کا فن کار اور ادب گاہ شبلی کا نمائندہ شاعر تذکرہ کے حرف وحکایت میں جلوہ گستر نہیں ہو پاتا۔

انجم معروفی کو تمام اصناف پر دستگاہ حاصل تھی۔ ان کے مزاج میں شاعرانہ اسپرٹ موجود تھی۔ ان میں بے پناہ موزونیت تھی۔ ان کے استعمال میں آنے والے الفاظ اپنے اندر زندگی کا آبشار اور ترنم وموسیقی کا بہاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں فکر کی بلندی اور نئے مضامین وخیالات کی چاندنی بھی نظر آتی ہے۔ وہ لفظوں کو سوچ سمجھ کر نگینے کی طرح اشعار میں جڑتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری صنعت مرصع کاری کا عمدہ نمونہ بن گئی ہے۔ وہ موضوع کے اعتبار سے لفظوں کا انتخاب اور صنائع وبدائع کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نشتریت ملتی ہے۔ جو ان کے قادرالکلام شاعر ہونے کی گواہی دیتی ہے۔

نمونۂ کلام

تیروں سے نہ نیزوں سے تیغوں سے نہ خنجر سے ۔۔۔ اسلام تو پھیلا ہے اخلاق پیمبر سے
جو ساقیِ کوثر کی آنکھوں سے چھلکتی ہے ۔۔۔ اس مے کا مزا پوچھو اصحابِ پیمبر سے
اسلام کی دنیا میں تاریخ نمایاں ہے ۔۔۔ ہے نام پیمبر سے باقی ہے بہتّر سے
سرکار کی سیرت کو اپنالو مسلمانو! ۔۔۔ لینا ہے اگر ٹکر اس دورِ ستم گر سے
مداحوں میں آقا کے نام اس کا بھی آتا ہے ۔۔۔ حق نے یہ شرف بخشا انجمؔ کو مقدر سے

اے مری جانِ غزل کیا میں ترا نام رکھوں ۔۔۔ ساز کہہ دوں کہ ترنم کی ادا نام رکھوں
مرمریں جسم کو سب تاج محل کہتے ہیں ۔۔۔ زلف کا تیری میں ساون کی گھٹا نام رکھوں
اب تو ہر نام پرانے سے مجھے لگتے ہیں ۔۔۔ سوچتا ہوں تیری آنکھوں کا نیا نام رکھوں

عشق کی راہ میں قربان کہاں ملتے ہیں ۔۔۔ اب محبت کے نگہبان کہاں ملتے ہیں
وہ تو کہئے کہ کوئی مل گیا اپنے جیسا ۔۔۔ ورنہ اس دور میں انسان کہاں ملتے ہیں

روز اگر یوں ملاقات ہوتی رہے کچھ تسلیِ جذبات ہوتی رہے
تم ابھی میرے پہلو میں بیٹھے رہو رات ہوتی ہے تو رات ہوتی رہے
آنکھوں آنکھوں میں مطلب سمجھ جایئے یہ ضروری نہیں بات ہوتی رہے
آپ چاہیں مگر ہم نہیں چاہتے کچھ چمن میں خرافات ہوتی رہے
دامنِ شوق انجؔم کا بھرتا رہے اس کے در سے یہ سوغات ہوتی رہے
بات پینے کی جو میخواروں میں چل جاتی ہے شیخ صاحب کی طبیعت بھی مچل جاتی ہے
جان دیتے ہیں تو کہتے ہیں حیاتِ تازہ جل کے پروانوں کی تقدیر بدل جاتی ہے

انصؔر۔ حکیم سید علی انصر

یہ پارہ ضلع غازیپور کے رہنے والے تھے۔علم طب حاصل کیا تھا اور محمد آباد گوہنہ میں مستقلاً قیام کر کے مریضوں کو اپنی مسیحانفسی اور دست شفا سے فائدہ پہنچاتے تھے۔نسخہ لکھنے سے پہلے تسبیح کے دانوں پر استخارہ کرنے کو اپنا طبی معمول بنا رکھا تھا۔سیدواڑہ محمد آباد کی مذہبی مجلسوں، محفلوں اور مقاصدوں میں شرکت کرتے تھے۔ان کے قصائد معمولی انداز کے ہوتے تھے جو بزمِ شعری کی خانہ پری اور رنگ محفل قائم رہنے کے لئے سنے جاتے تھے۔چند برس پہلے فوت ہوئے۔

انصؔر۔ مولوی حاجی سید علی انصر کیدلی پوری

۱۹؍دسمبر ۱۸۷۴ء ـــــ صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں

مولوی سید علی اظہر اظہرؔ ساکن کیدلی پور ضلع اعظم گڑھ کے صاحبزادے تھے،انھیں سے ابتدائی تعلیم پائی۔علوم عقلی ونقلی کی تعلیم مکمل کر کے ٹھکماں کے اسکول میں ناگری (ہندی) بھی حاصل کی۔شروع سے مذہبیات کی طرف رجحان تھا۔بعد میں ریاست پیرپور سے وابستہ ہوگئے تھے وہاں عقائد ووظائف سے متعلق اردو میں ایک کتاب ”مسائل جعفریہ“ کے نام سے لکھی جس کو قبول عام نصیب ہوا اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے،اس کے علاوہ ”حیات سادات بجولی“ نامی

کتاب بھی تصنیف کی۔

تصنیف وتالیف کے علاوہ شعروشاعری سے بھی لگاؤ رکھتے تھے۔ان کا کلام تونہیں مل سکا، البتہ" مسائل جعفریہ" میں جواپنا نسب نامہ نظم کر کے شامل کیا ہے اس کے ابتدائی حصے پیش کئے جارہے ہیں۔

بعد حمدِ خدائے پاک وقدیم اور نعت نبی وآل کریم
عرض کرتا ہے بندۂ عاصی جاہل وعاجز، افقر وخاطی
نام بندے کا ہے علی انصرؔ پسر مولوی علی اظہر
جد مرے، تھا کمال جن کا نام معتقد اُن کے خاص تھے اور عام
ورع وزہد کا ہوا جو ظہور صاحبِ کشف ہوگئے مشہور
مورث خاندان تھے حضرت معدن عزّ وشان تھے حضرت(۱)

حواشی:

(۱) بشکریہ سید علی جواد زیدی

انصرؔ- علی انصر ماہلی

نہایت باذوق آدمی تھے لیکن اپنے کوشاعر کی حیثیت سے ایک دن بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔یعنی ان کی شاعری معرضِ تحریر میں نہیں آئی۔ ماہل میں جب احتشام صاحب اپنی طالب علمی کے زمانہ میں واپس آتے توان سے تمام بات چیت نظم میں ہوتی تھی۔کبھی یہ لوگ نثر میں گفتگو نہیں کرتے تھے۔(۱)

حواشی:

(۱) سید اولاد اصغر صاحب مکتوب بنام راقم الحروف مؤرخہ یکم جولائی ۱۹۸۱ء

انصرؔ- علی انصر مبارک پوری

۱۹۴۴ء ـــــ ۴؍نومبر ۲۰۰۷ء (اتوار صبح ۹؍بجے)

ان کے بڑے بھائی علی کوثر کی پیدائش ۱۹۴۰ء میں ہوئی تھی یہ ان سے چار برس کم تھے۔ والد کا نام رحیم اللہ تھا۔ باب العلم کی مکتبی تعلیم تھی۔ یہ دونوں بھائی کوثر و انصر علی مختار مبارک پوری (۲۵؍جنوری ۱۹۳۳ء ۔ ۱۸؍نومبر ۲۰۰۹ء) ولد ممتاز علی کے خالہ زاد بھائی اور بہنوئی بھی تھے۔ اور زین العابدین عارف مبارکپوری (۱۳؍مارچ ۱۹۳۶ء ۔ ۲۹؍دسمبر ۱۹۹۹ء) کے ہم زلف تھے۔ حاجی علی حماد مبارکپوری (۱۹۱۹ء ۔ ۲۸؍دسمبر ۲۰۰۹ء) سے فن شاعری میں وابستہ تھے یہ اور منظور احمد منظور مبارکپوری اپنی شاعری کو خوب سے خوب تر بنانے میں حق رفاقت ادا کرتے تھے اور دونوں فرصت کے لمحات میں عموماً ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ بھرا چہرہ، گداز بدن، بڑی بڑی آنکھیں جو سرمستی وخمار میں ڈوبی ہوئی لگتی تھیں، ہر وقت خیالوں میں گم رہتے تھے۔ شاعری میں ابھی ناپختگی اور فنی اظہار کی کمی تھی کہ فوت ہوگئے عمر نے مہلت دی ہوتی تو شاید شاعری کا کچا پن دور ہوجاتا اور زبان و بیان کی ناہمواری ختم ہوگئی ہوتی۔

ان کی شاعری مذہبی معتقدات، دینی جذبات واحساسات، ملی وقومی تاثرات وتصورات، مسلکی تشخص، محامد رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، مؤدت ومحبت اہل بیت اور ائمہ اطہار سے عقیدت کے محور پر گردش کرتی ہے۔ کبھی کبھی وہ چندہ کی نظمیں، غزلیں اور سہرا بھی موزوں کرلیا کرتے تھے۔

نمونۂ کلام

جو دل کو ماہ منور سے جگمگا نہ سکا　　وہ پاس رہ کے اجالوں کی بھیک پا نہ سکا
سدا وہ کرتا تھا اعلان پارسائی کا　　فریب حسن سے دامن مگر بچا نہ سکا
فنا وہ ہوگیا نفرت کی آگ میں جل کر　　چراغ میری محبت کا جب بجھا نہ سکا
وہ لاکھ کرتا تھا دعوائے دوستی لیکن　　وفا وعشق کی تشنہ لبی بجھا نہ سکا

محبوب خدا جنت سے حسیں ہے آپ کا گھر سبحان اللہ
جھکتا ہے ہمیشہ چوکھٹ پر جبریل کا سر سبحان اللہ

بات رسولِ اعظم کی قرآن و شریعت ہوتی ہے
اسلام پر آقا کی ہر دم رہتی ہے نظر سبحان اللہ

اے نورِ مجسم، شاہِ عرب، اے دینِ الٰہی کے رہبر
ہے منزلِ قرآں آپ کا گھر سب سے بڑھ کر سبحان اللہ

ہم سب کی گناہیں محشر میں پتوں کی طرح جھڑ جائیں گی
جب دامنِ سرور کا سایہ ہوگا ہم پر سبحان اللہ

لو سج گیا ارضِ بطحا پر دربار رسولِ اعظم کا
کرتے ہیں فلک والے آ کر دیدار رسولِ اعظم کا

کیونکر نہ شبِ اسریٰ چومیں جبریل نبی کے تلووں کو
سردارِ ملائک سے پوچھو معیار رسولِ اعظم کا

تبلیغ سے اسکی ہوتا ہے کافر بھی مسلماں دنیا میں
قرآں ہے قیامت تک کے لئے شہکار رسولِ اعظم کا

خلاقِ دوعالم نے جس کو قرآن میں خود والشّمس کہا
چہرہ ہے وہ کالی کملی میں ضوبار رسولِ اعظم کا

توحید کی پاکیزہ صہبا جب نور کے ساغر میں آئی
پی کر مئے وحدت جھوم اٹھا میخوار رسولِ اعظم کا

ہے دینِ خدا شاہد اسکا قرآن گواہی دیتا ہے
ہے وجہ بقائے الا اللہ کردار رسولِ اعظم کا

محبوب سے کتنی الفت ہے معراج میں انکو بلوا کر
خود خالق اکبر کرتا ہے دیدار رسولِ اعظم کا

ہر درد کی بس ہے ایک دوا تو پی لے مئے حبِ احمد
دیتا ہے شفا بیماروں کو بیمار رسولِ اعظم کا

طوفانِ حوادث میں انصرؔ ہوگا نہ سفینہ غرق مرا
ہے کشتیٔ ایماں میں میرے پتوار رسولِ اعظم کا

انمولؔ - محمد یٰسین انصاری

۱۹۳۶ء — ۲۷/نومبر ۱۹۹۷ء

حاجی مکی جہانا گنج کے بیٹے اور مشہور شاعر شمس الدین شمسیؔ کے برادر بزرگ تھے۔ پیشۂ حیا کت سے وابستہ رہ کر کسب معاش اور رزق حلال کا انتظام کرتے تھے۔ متاہل زندگی گزاری اولاد میں چار لڑکے ریاض احمد، منظور احمد، مقصود اعظم فاضلی اور محمد انظر ہیں۔ اور لڑکی شبانہ خاتون ہے۔ مقصود اعظم فاضلی بھی شاعری کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں جن کا تخلص اعظمؔ ہے اور اچھی شاعری کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ زیادہ تر مزاحیہ شاعری کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سنجیدہ شاعری کے لیے بھی کچھ نہ کچھ وقت نکال لیا کرتے تھے۔ شعری نشستوں میں شریک ہوکر اپنا کلام

خود سناتے تھے اور مساجد و مدارس کے چندوں کے لیے اپنی ایک ٹیم بنا رکھی تھی۔ خوش الحانوں کے ساتھ نظمیں اچھے انداز میں پڑھتے تھے جس کو عوامی مقبولیت بھی حاصل تھی۔

نمونۂ کلام

بنا رہا ہے ہزاروں برس کے منصوبے ۔۔۔ یہ آدمی جو فقط چار دن کا مہماں ہے
دکھا دے راستہ اسلام کا کوئی اس کو ۔۔۔ جدید دور کا انساں بہت پریشاں ہے

کچھ نہ کہہ کر بھی کہوں گا آج اس راڑی کا بھاؤ ۔۔۔ جس نے مدھم کر دیا ہر ایک کی گاڑی کا بھاؤ
روپیہ آیا اُدھر سے اور اِدھر غائب ہوا ۔۔۔ تنگ کر رکھا ہے سب کو آج کل ڈانڑی کا بھاؤ
بن گئے ہیں ڈاکٹر اب چھوڑ کر پیشہ کمھار ۔۔۔ اس لئے بے ڈھب ہوا ہے دوستو ہانڑی کا بھاؤ
کل تلک بکری کے داموں پر ہی ملتی تھی مجھے ۔۔۔ آج ہاتھی سے بھی زیادہ ہوگیا پاڑی کا بھاؤ
آج کل دنیا میں اتنے پینے والے ہوگئے ۔۔۔ بادۂ گل گوں سے اونچا ہوگیا تاڑی کا بھاؤ
منہگا ہوتا جارہا ہے سوت ریشم نائلون ۔۔۔ اور گھٹتا جاتا ہے بڑھتا نہیں ساڑی کا بھاؤ
کون سی حکمت لگائیں تاؤ لانے کے لیے ۔۔۔ آسماں چھونے لگا انمولؔ اب ماڑی کا بھاؤ

چھپ چھپ کر یہ پیار محبت کبتک آخر آخر کبتک ۔۔۔ ہوگی یہ نازیبا حرکت کبتک آخر آخر کبتک
نیک عمل کرنے کی خاطر رب کو منانے کی خاطر ۔۔۔ تم کو ملے گی کام سے فرصت کبتک آخر آخر کبتک
کٹوا کر کیے جو درگت روٹھ گئی ان سے بھی رحمت ۔۔۔ پھول چڑھے گا پربت پربت کبتک آخر آخر کبتک
بچپن گزرا آئی جوانی رات و دن کر کے من مانی ۔۔۔ بنواؤ گے اپنی حجامت کبتک آخر آخر کبتک
باز نہ آئے جو فطرت سے جوتا جوتی اور چپل سے ۔۔۔ کرواؤ گے اپنی مرمت کبتک آخر آخر کبتک
وقت بہت کم ہے یہ دیکھو مرنے پہ کیا ہوگا سوچو ۔۔۔ ساتھ تمہارا دیگی طاقت کبتک آخر آخر کبتک
کہتا ہے انمول یہ تم سے اس دنیا میں زندہ رہ کے ۔۔۔ کرتے رہو گے ایسی حماقت کبتک آخر آخر کبتک

انورؔ - شیخ حافظ نورالدین مئوی

شوق قانع نے لکھا ہے کہ میر سوز بعہد احمد شاہ ابدالی کے وقت میں منصب دار تھے(۱)

حواشی:

(۱) بیاض اثر انصاری مرحوم مئو

انور اعظمی - انوار احمد مہواروی

۱۹/جولائی ۱۹۲۶ء ـــ ۶/مارچ ۱۹۶۱ء

انور اعظمی کے اسلاف کا آبائی وطن بھدیٹھی ضلع جون پور تھا۔ ان کے دادا الٰہی بخش کا نانہال موضع مہوارہ کلاں ضلع اعظم گڑھ تھا۔ انھوں نے اپنا آبائی وطن ترک کر کے مہوارہ کلاں میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ جائداد اسلاف کی تھی اور کچھ یہاں آ کر انھوں نے خرید کر بنائی۔ انھوں نے جس ماحول اور گھرانے میں آنکھیں کھولیں وہ گھر گانو اور اطراف میں ایک ذی حیثیت اور مہذب گھرانہ مانا جاتا تھا۔ ان کے والد بزرگوار کا نام مختار احمد تھا۔(۱)

ضلع اعظم گڑھ کی ایک معروف بستی مہوارہ کو مولد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ تعلیم کی شروعات پانچ برس کی عمر میں ہوئی۔ قرآن مجید، دینیات، خوش نویسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم مولوی عبدالحمید مرحوم کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ اور دس برس کی عمر میں معروف درس گاہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں داخل ہو کر ۱۹۴۷ء میں عربی زبان وعلوم کی تکمیل کی سند حاصل کی۔ ایک سال تک انگریزی تعلیم کے لئے شبلی کالج سے بھی وابستہ رہے۔ بعد میں انھوں نے انگریزی میں اعلیٰ قابلیت پیدا کر لی تھی انگریزی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد مدرسۃ الاصلاح میں مدرس ہو گئے۔ انور افکار وخیال کے اعتبار سے نہایت روشن دماغ، بیدار مغز، نکتہ رس نگاہ، بلند عزائم کے مالک اور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے گوناگوں اور متنوع خصوصیات کے حامل تھے۔ ایک عرصہ تک رام پور میں ماہنامہ زندگی کے مرتب رہے۔ ۱۹۵۲ء میں برما کا سفر کیا اور وہاں بھی ہفت روزہ البلاغ، روزنامہ انقلاب سے اپنی صحافتی زندگی کا رشتہ جوڑا۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے برما کی صحافت کو صحت مند، توانا اور باوقار بنا کر بے لاگ دیانتدارانہ اور اصول واقدار پر مبنی پیشۂ اخبار نویسی کو زندگی کی پالیسی سازی میں ایک بلند اور نمایاں مقام عطا کر دیا۔ ۱۹۶۰ء میں برما سے وطن مالوف کی طرف

مراجعت کی اور ادارہ روزنامہ پیغام کان پور سے منسلک ہوگئے وہ سال بھر پیغام سے وابستہ رہے۔ ہفتہ وار تسنیم اور ماہنامہ کارواں کے نام سے قلمی جرائد بھی نکالے اور اچھے مقالے لکھے۔ پروفیسر اسرار احمد (۱۹رجولائی ۱۹۴۰ - ۲راپریل ۲۰۱۰ء) اپنے بھائی انور اعظمی کے انتقال کے بعد ان کے لڑکوں پرویز احمد اور جاوید احمد کو تعلیم کے لئے علی گڑھ لے گئے تھے اور انھیں اپنے ساتھ رکھا تھا جاوید زیادہ نہ پڑھ سکے مگر پرویز نے یہیں پر تعلیم حاصل کی۔ انور صاحب کے تیسرے بیٹے (پروفیسر) اسلم اصلاحی سرائمیر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اس لئے ان کو وہیں پڑھنے کے لئے چھوڑ دیا گیا (۲)

انور اعظمی باصلاحیت ادیب، سلجھے افسانہ نگار، اصول پسند صحافی، مذہبی حسیت سے سرشار، عربی داں اور بے باک انسان ہونے کے علاوہ خوش فکر اور خوش گو شاعر بھی تھے انھوں نے غزل، قطعہ اور نظم کے ذخیرے میں اپنے افکار و خیالات سے وقیع اضافہ کیا اور شبلی اسکول کی روایات کو تازہ دم بنانے میں اہم خدمات انجام دیں۔ ان کی شاعری بجلی کا ایک عارضی کوندا اور شعلے کا دم زدن ختم ہوجانے والا لپکا نہیں ہے۔ ان کی فکر کے نگارخانے میں ارتعاش و اہتزاز کی جو رنگینی ہے وہ زندگی کی بنیادی اقدار اور توانا رجحان کو صحت مند بناتی ہے۔ انھوں نے شاعری کو حیاتِ انسانی کا ایسا مرقع بنانے کی کوشش کی ہے جس میں مسائل کے ساتھ مسائل کا پائیدار حل، خواب کے شانہ بشانہ تعبیر خواب، شک و ریب کے بطن میں یقین کی خلد نظر تاب اپنی پوری تنقیدی و تفسیری اور تعبیری و تشریحی ابعاد کے ساتھ موجود ہے۔ انھوں نے سنجیدہ فکری کی جو روشنی پھیلائی ہے اس کا سلسلہ اور رابطہ مستقبل کی دانشوری سے بھی ہے اور حال کی تلاش منزل سے بھی۔ انھوں نے انسانی کامیابیوں کو "ہر لمحہ نیا طور نئی برق تجلی" کی بشارت سنائی ہے اور "ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی ملتی ہے" کا پیغام دیا ہے۔

انور بڑے خود دار، غیور، شریف النفس اور خلیق تھے۔ حلقۂ احباب وسیع تھا۔ جہاں جاتے اور جس سے ملتے اس کو اپنا گرویدۂ محبت بنا لیتے۔ انھوں نے ذہین و فعال طلباء کی ایک تنظیم بھی "اصلاح المسلمین" کے نام سے قائم کی تھی۔ برما میں اصلاحِ ملت کے لئے کئی قابلِ تعریف اور مستحسن کام کئے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ایک اچھے خطیب بھی تھے ان کی اصلاحی تقریروں کے

اثرات نمایاں طور پر مرتب ہوا کرتے تھے۔انور نے افسانہ نگاری سے بھی دل چسپی کا اظہار کیا وہ پریم چند کے انداز میں لکھتے مگر اپنی انفرادیت کا نقش ابھارنا نہیں بھولتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں ان کی نظموں کا مجموعہ ”اذانِ سحر“ کے نام سے چھپ چکا ہے۔غزلوں کا مجموعہ پریس میں ہے۔افسانوں اور مقالات کا مجموعہ بھی مرتب ہو کر منتظر اشاعت ہے۔

”اذانِ سحر“ میں انور کے عقائد ونظریات کی منظوم پرچھائیاں ذہن وفکر کے دریچے کو نئی روشنی اور تازہ ہوا سے آشنا کر رہی ہیں۔دلکش استعارات وعلائم اپنے اندر شعریت وادبیت کا سحر حلال چھپائے ہوئے ہیں۔لفظوں کے استعمال اور تراکیب کی تراش خراش میں خلاقانہ صلاحیتوں اور فن کارانہ ذہن کی کارفرمائی شاعر کی قدرتِ کلام اور شعری ہنرمندی کی منھ بولتی حقیقت بن گئی ہے۔شاعر جو محسوس کرتا ہے اس کو پوری صیقل گری کے ساتھ پیش کرنے میں کہیں بھی عجز بیان کا شکار نہیں ہوا۔اس کے زیرِ قلم جو لفظ آیا، جو ترکیب نوکِ خامہ سے چھوگئی وہ نوائے سروش بن گئی۔ بے سُر لفظ میں بھی غنائیت کی ہزاروں لہریں متحرک ہو اٹھیں۔انورؔ کا یہ کمالِ فن اور اعجازِ سخن دیارِ شبلی کو دیارِ شعر ونغمہ کی حیثیت سے پہچنوانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔شبلی اسکول کے لئے انور کی شاعری ایک بڑی دین ہے جس کا اعتراف نہ کرنا تنقیدی خیانت ہی نہیں کتمانِ حق کے زمرے میں آئے گا۔انھوں نے شاعری کو اسلامی اور مذہبی احساس سے مالا مال کیا ہے۔اسلامی ادب کے معماروں میں ان کی جگہ بہت اونچی اور لائق احترام ہے۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی انورؔ کے ذہنی وفکری اور ادبی پس منظر کے تعلق سے اپنی یادوں کے منظر نامے کو ابھارتے ہوئے ایک جگہ ارقام فرماتے ہیں ”ادارۂ ادب اسلامی کا میں ایک فعال اور ہمہ وقتی کارکن تھا۔انور اعظمی مرحوم بھی اس سے منسلک تھے اور ان کا شمار اس صف کے اچھے شعراء میں ہوتا تھا اس وقت تک میرے واقعی تعلقات انور مرحوم سے تھے“۔(۳)

ان کے کلام میں اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ کا رنگ ہے۔انور مسدس اور مثنوی کے علاوہ نظم کی ہیئت میں نئے تجربات کرتے ہیں۔ان کے یہاں متنوع اوزان وبحور کا استعمال ملتا ہے۔عمر بہت کم صرف پونے ۳۵ برس کی پائی مگر اسی میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔

اوراسلامی ودینی شاعری کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا۔

انور اعظمی کے افسانوں،غزلوں،اداریوں اور مضامین کے مجموعے ان کے چھوٹے بھائی اشتیاق احمد راشد(پ۱۸رنومبر ۱۹۳۳ء) شائع کرنے کی تیاریوں میں ہیں۔ان سب کی اشاعت سے انور کی علمی وادبی اورفکری وفنی جہت کو سمجھنے میں مزید سہولت پیدا ہوگی اوران کی مختصر عمری میں اُن کے ذریعہ اردو زبان وادب،شعروصحافت کی کیا کیا خدمات انجام پائیں اُن کی قدروقیمت کا بھی صحیح صحیح اندازہ ہوسکے گا۔

نمونۂ کلام

میں اک فقیر، جس کا خموشی ہی کل ہنر　　اپنے جہاں میں گم ہوں زمانے سے دور دور
یہ دور چونکہ دورِ خوشامد پسند ہے　　ہے اس میں بے نیازی کا شیوہ بڑا قصور
یہ سچ ہے گر ہو فنِ خوشامد سے باخبر　　جگنو فضا کا بنتا ہے صدرشکِ شمعِ طور
انکار اس کمال کا ممکن نہیں مگر　　بے فیض ہیں یہ چونہ لگائی ہوئی قبور
میں کیا ہوں، کچھ نہیں ہوں مگر جانتا ہوں یہ　　وہ ننگِ دیں ہے جس کی طبیعت نہیں غیور
ممکن نہیں ہے صلح حسین اور یزید میں　　اسلام ہے تو فکر سے ٹکرائے گا ضرور
کیا کررہے ہیں وہ مرے ایماں پہ تبصرہ　　بوجہل کو بھی زر کے لئے جو کہیں حضور
کوہ ساروں سے راہ جاتی ہے　　اور ڈاکو چھپے ہیں غاروں میں
ہر طرف چھارہا ہے سناٹا　　ایک وحشت سی ہے نظاروں میں
میرا ذوقِ سفر دہلتا ہے　　موت آئے نہ ریگزاروں میں
میں اگر لٹ گیا تو کیا ہوگا

(کشمکش)

کمال دردِ محبت ہے وحدت آدم　　بنائے وحدتِ آدم اللہ کی توحید
ترا پیام کبھی عام ہو نہیں سکتا　　کہ شرعِ وحدتِ آدم کی، کی نہیں تجدید
میکشی بندگیِ جام سے آگے نہ بڑھی　　چشم ساقی کو ہے محفل سے گلہ میرے بعد
شیوۂ عشق ہوا جاں کا سلامت رکھنا　　گھٹ گئی قیمتِ انداز وادا میرے بعد

گردشِ جام وگردشِ دوراں
ایک تیری نگاہ کا اعجاز

تشنہ لب محفل سے اٹھ سکتا ہوں اے ساقی مگر
اپنا پیمانہ گدایانہ اٹھا سکتا نہیں

تجھ سے ملنا جرم ٹھہرا ہے تو پھر یوں ہی سہی
کیا ترے غم کو میں سینے سے لگا سکتا نہیں

زندگی کرتا ہے موجوں کے سہارے پر بسر
ولولہ جس کا نئے طوفاں اٹھا سکتا نہیں

کون سمجھے درد اس مایوس کا جس کے لئے
ہر مسرت اک نئی افتاد بن کر رہ گئی

نام گلشن پڑ گیا پھولوں کے زخموں کا مگر
گل کی قسمت نکہتِ برباد بن کر رہ گئی

یہ شکایت ہے کہ وعدوں نے دیا تیرے فریب
شکر اس پر کہ تری یاد نہ جینے دے گی

اپنی غیرت کو کسی احساں سے مت رسوا کرو
چھوڑ دو ٹوٹے سفینے کو تباہی کے لئے

یہ روپ نگر، یہ رنگ محل، محفل میں چھنکتے یہ پایل
چہرے تو گلستاں ہیں لیکن سینے میں سلگتے ویرانے

کچھ بھی غبار قیس نہیں ہے، نہیں سہی
آباد ایک گوشۂ صحرا ہوا تو ہے

فلک جینے نہیں دیتا ہے تم مرنے نہیں دیتے
مری ہر سانس مرگِ ناگہاں کی آزمائش ہے

یہ وہ دنیا ہے کہ محفل میں اجالے کے لئے
بے زباں شمع کو زندہ ہی جلا دیتی ہے

جب سے انورؔ مکتب دردِ محبت بند ہے
آدمی دنیا میں ہے انسان افسانے میں ہے

اس قید شش جہات سے بیزار ہے جنوں
دامن کو اپنے میرا بیاباں بنایئے

فضا پر ہے شبِ تاریک طاری
نگہ میں دھند ہے وہم وگماں کی

دعاؤں سے سحر پیدا نہ ہوگی
ضرورت ہے مجاہد کی اذاں کی

زمانہ پھر اٹھا مجھ کو مٹانے
خدایا ہمتِ شبیر دینا

مرے دشمن کو ہر ساماں عطا کر
مجھے مولا! مری تکبیر دینا

نوا سنجی سے بہتر ہے خموشی
ہو مایوسی جو سرمایہ سخن کا

توقع پھر ہنرمندوں سے کیا ہو
اگر لیں کام پرچم سے کفن کا

چھپا چھپا کے نہ رکھ ان جگر کے داغوں کو
انھیں ستاروں سے اک آفتاب پیدا کر

نہ ہوسکے تو شکایت نہ کر زمانے کی
جو ہوسکے تو کوئی انقلاب پیدا کر

حواشی:

(۱) بزمِ شبلی ص ۱۴۵ (شبلی کالج اعظم گڑھ میگزین ۲۰۱۰ء) ایڈیٹر ڈاکٹر شباب الدین میں شامل سلیمان احمد خاں کے مقالہ "انور اعظمی کی ادبی جہات" سے اقتباس ص ۱۴۵

(۲) بزم شبلی ۲۰۱۰ء شبلی نیشنل کالج کی سالانہ علمی وادبی پیشکش، ایڈیٹر ڈاکٹر شباب الدین ص ۱۵

انورؔ - انوار الحسن اعظمی

۱۱؍دسمبر ۱۹۰۵ء ـــــ معلوم نہیں

جہاناگنج کے پاس ایک گانو امدہی ہے وہیں کے ایک صالح خاندان میں زندگی سے پیمان رفاقت باندھا۔ ۲ سال تک گھر پڑھا، ۸ سال کی عمر میں جہاناگنج کے پرائمری اسکول میں داخل ہوکر اردو، ہندی کی تعلیم پنجم تک حاصل کی۔ اپنے حقیقی چچا شبیر حسن کے ہمراہ کلکتہ گئے اور کاشی پور کلکتہ کی جوٹ مل میں ملازمت کرلی۔ بچپن ہی سے بیت بازی کا شوق تھا اسی سلسلے میں ٹوٹے پھوٹے شعر کہنے لگے تھے۔ کلکتہ میں اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ جذبات سخن ابھرے تو غزل کہہ کے جرمؔ محمد آبادی (۴؍فروری ۱۹۰۳ء۔ ۱۵؍جنوری ۱۹۸۰ء) سے غیر رسمی طور پر اصلاح لی۔ انھیں کے ہمراہ مشاعروں میں کلام سنانے کا موقع ملتا رہا۔ ہر انداز کی ادبی وفنی اور مذہبی کتب کے مطالعے کی عادت پڑی تو کلام وفکر میں گہرائی آئی۔

وسیع مطالعہ کے بعد جرمؔ صاحب کے باضابطہ تلمیذ سخن بنے۔ جرمؔ کی تربیت میں رہ کر اردو، ہندی کا علم بڑھا، تذکیر وتانیث، معنیٰ مصدر، اشتقاق لفظ، بحر و وزن اور تقطیع سے واقفیت ہوئی۔ کلام کی تاثیر بھی بڑھی۔ کلکتہ چھوٹا تو کچھ دنوں تک کان پور میں رہے اور بزمِ سخن کی نشستوں میں اہل ذوق کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ پھر سید پور ضلع رنگ پور (موجودہ پاکستان) میں جہاں فوجی چھاؤنی اور ریلوے کارخانہ تھا، آئے، یہاں شعروسخن سے دلچسپی رکھنے والوں کی معیت میں متواتر دس سال تک ذوق شعر اور مشق سخن کی صیقل گری ہوتی رہی۔ والد کی وفات نے انھیں مکان پر گزراوقات کا پیغامِ قدرت پہنچایا۔ یہ انقلابی کروٹوں کا دور تھا۔ ہندوستان کی آزادی اور

ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں تقدیر سنوارنے، قوم کی خفیہ صلاحیتیں ابھارنے، معاش ومعیشت کی سمت متعین کرنے کا جذبۂ آتشیں پیدا ہو چکا تھا۔ فکر معاش ستانے لگی تو بمبئی چلے گئے۔ بمبئی سے ترک سکونت کر کے وطن لوٹ آئے اور مستقلاً جہانا گنج کی ادبی وشعری بزم آرائی کا حصہ بنے رہے۔ راقم الحروف کے غریب خانہ پر بھی تشریف ارزانی فرماتے رہے۔

ان کے کلام کے مجموعے کلامِ انور اور جذباتِ انور کے نام سے علیم الدین اسٹریٹ کلکتہ سے شائع ہوئے۔ قصائد کا مجموعہ "لطف سخن" ۱۹۶۱ء میں بمبئی سے چھپا، سیٹھ عبدالحمید بھورم پوری، سیٹھ فتح علی اور ماسٹر افتخار حسن کے مالی اشتراک سے شمع انور، بزمِ انور، انوار العزا بمبئی میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

انور اعظمی بہت پُرگو اور مشاق شاعر تھے۔ ذراسی فکر میں اشعار کے دریا بہا دیتے تھے۔ کلام میں پرانے رنگ، پرانی لفظیات، پرانے اساطیر وروایات، پرانے تشبیہ واستعارہ، پرانی تعبیرات وتلازمات سے ان کی شاعری کا خمیر اٹھتا تھا۔ جرم محمد آبادی سے شرف تلمذ ضرور حاصل کیا تھا مگر کلام میں ان کا رنگ تغزل اور ان کے استاد آرزو لکھنوی کی لسانی خوبیاں، ان کے دبستان کا انداز ہ تب وتاب بہت کم نمایاں ہو سکا ہے۔ کلام میں اکثر مقام پر شعری تسامحات اور فنی اسقام موجود ہیں۔ غالباً کلکتہ چھوڑنے کے بعد جرم سے اکتساب فیض کا سلسلہ کم رہ گیا ہوگا اور کلکتہ میں رہ کر یہ پختہ کلامی کا مرحلہ طے نہیں کر سکے ہوں گے۔ پھر بھی انور نے ایک دور افتادہ بستی اور وسائل سے محروم چھوٹے سے گانو میں رہ کر شعر وادب کی شمع کو عمر بھر جلائے رکھا اور شاعری کو اپنا خونِ جگر پلاتے رہے یہ بہت بڑی بات ہے۔ ان کے دم قدم سے جہانا گنج اور اطراف میں شعر گوئی کی روشنی اپنی موجودگی کا احساس کراتی رہی اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان اردو کی آبیاری کا شوق پروان چڑھتا رہا۔ یہ ان کا اہم کارنامہ ہے ورنہ ایسے ماحول میں کس کا جذبۂ سخن زندہ رہ پاتا ہے۔ انھوں نے عوامی سطح پر شعر وسخن سے دل چسپی کے مشغلے کو عام کیا اور نومشقوں کی ذہنی تربیت میں حصہ لیا غیر علمی کاروبارِ معاش میں مصروف مردانِ جفاکش اور مزدوروں کو بھی اردو شاعری کا شوق دلایا اور انھیں اپنی روشنی میں راہیں طے کرنے کا حوصلہ دیا۔

نمونۂ کلام

کیوں پریشاں دلِ مغرور نظر آتا ہے — رنگ سرکار کا کافور نظر آتا ہے
لاکھ آزاد ہوئی فطرتِ انساں لیکن — آدمی آج بھی مجبور نظر آتا ہے
ہم نے مانا کہ بڑے پردہ نشیں ہو لیکن — کس کا جلوہ سرِ طور نظر آتا ہے
جم کے پروانے جلے شمع پہ پھر بھی انورؔ — رنگِ محفل ابھی بے نور نظر آتا ہے

شرر بنیں گے وہ تنکے وہ انقلاب آیا — ہزاروں بجلیاں کوندیں گی آشیانے سے
سنانِ ظلم کو سینے پہ کھاکے بیٹھا ہوں — لہو ٹپکتے ہیں اب تک مرے فسانے سے
ہمارے نام سے تاریخِ ہند روشن ہے — یہ حرف مٹ نہیں سکتے کبھی مٹانے سے
ہزاروں مرتبہ طوفاں نے سر اٹھایا ہے — ہلا نہ دل کبھی کشتی کے ڈگمگانے سے

ملا کرتا ہے سنتے ہیں اسے درجہ مجاہد کا — جو مارے نفسِ امارہ کو وہ قاتل نہیں ہوتا
دمِ آخر تری چوکھٹ پہ سر رکھ کر یہ کہہ دیں گے — کہ سجدہ آخری کیا ناز کے قابل نہیں ہوتا
سفینہ دل کی حسرت کا کہاں تک لے چلوں کھے کر — سنا ہے ہم نے بحرِ عشق میں ساحل نہیں ہوتا

دل اضطرابِ درد سے بیدار ہوگیا — کیا ان سے رسم وراہ کا اقرار ہوگیا
کافر نہیں ہوں ناصحِ مشفق تری قسم — رحمت کے آسرے پہ گنہگار ہوگیا
اللہ رے ذوق عشق میں ایماں کی پختگی — دیکھے بغیر بھی ترا اقرار ہوگیا

ان کا پیغام نہ آیا نہ قضا تک آئی — کام مرے نہ مری آہِ رسا تک آئی
اپنی محرومیِ قسمت کا ٹھکانہ کیا ہے — جاکے ناکام سرِ عرش دعا تک آئی
گھر تمناؤں کا برسات میں جلتے دیکھا — چشمِ گریاں تجھے مطلق نہ حیا تک آئی
آپ کے ابرو وگیسو کا تصور توبہ — تیغ گردن پہ چلی سر پہ بلا تک آئی
کون کرتا نہیں ماتم ترے دیوانے کا — خاک اڑاتی ہوئی صحرا سے ہوا تک آئی
تری مخمور نگاہوں کی بدولت ساقی — مے چھڑکتی ہوئی ساون کی گھٹا تک آئی

نامرادِ عشق کا افسانہ دہراتا ہوں میں — زندگی کے ساز پر نغماتِ غم گاتا ہوں میں

احترامِ کوئے جاناں یہ کئے جاتا ہوں میں　　سر کو موجوں کی طرح ساحل سے ٹکراتا ہوں میں
حسن بھائے عشق کو اور عشق بھائے حسن کو　　مفت میں بدنام ہو کر ٹھوکریں کھاتا ہوں میں
شبِ وصال کے ساغر میں برف کی مے لا　　جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
تمہارے مشقِ تصور کی دل نوازی سے　　تہ مزار نہ اب تک کفن ہوا میلا
تکمیل محبت میں اب یہ مرا نقشہ ہے　　اک آنکھ میں مجنوں ہے اک آنکھ میں لیلا ہے

انیسؔ - انیس احمد

تخمینی ۱۹۱۵ء ـــــ ۱۹۹۳ء تخمینی

ان کی ولادت راجہ پور سکرول ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔ ان کے دور میں قوالیوں کا بڑا رواج تھا اور سماج میں قوالوں کو مقبولیت حاصل تھی۔ ان کا کلام قوالی کی محفلوں کو آباد رکھنے کے لئے قوال دل چسپی سے سناتے تھے۔ خیال، کجلی وغیرہ ان کی اصناف شاعری تھیں۔ صنف خیال کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مصرعے طویل بحروں میں کہے جاتے تھے۔ اور ان میں ہر قسم کے خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔

انیسؔ اعظمی - انیس احمد صدیقی

۱۹۴۷ء ـــــ ۱۹/اگست ۲۰۱۲ء/یکم شوال ۱۴۳۳ھ

ان کا خاندانی تعلق موضع ہمایوں پور (جو ان دنوں ہمئی پور کے نام سے عوام میں مشہور ہے) کے علمی ودینی اور شعری وادبی خانوادے سے ہے۔ ان کے دادا مولانا قمر الدین صاحب اپنے وقت کے زبردست عالم وماہر درسیات شاعر تھے۔ ان کے والد مولانا ضیاء الہدیٰ اصلاحی کئی مدرسوں کے مؤسس وبانی، مقرر وخطیب، انشاء پرداز اور علمِ تفسیر وحدیث وفقہ میں صاحبِ بصیرت ہونے کے ساتھ نصابِ درسِ نظامی کے اچھے مدرس بھی تھے۔ وہ عرصۂ دراز تک مدرسہ کریمیہ رحیم

خاں دربھنگہ کے صدر مدرس تھے۔ اس کے علاوہ اس مدرسہ کے بانیوں میں سے تھے ان کے خاندان میں انجم اور نور اصلاحی بھی شاعر وصحافی گزرے ہیں۔ان کے بھائی مولانا شفیق اصلاحی بھی معلم تھے جو وفات پا گئے ہیں۔

موضع سیہی پور متصل سیدھا سلطان پور ان کا ننہال تھا۔ ان کے والد کی رہائش یہیں کی ہوگئی تھی۔ ان کا مولد ومنشا یہی گانو تھا۔ انیس کی تعلیم وتربیت مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے ماہرینِ فن اساتذہ کے زیرِ درس ہوئی۔علی گڑھ اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے چشمۂ فیض سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ بی یو ایم ایس ڈاکٹری کے سند یافتہ ہونے کے علاوہ اردو میں ایم اے بھی تھے۔ فزیکس میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ جے، این، یو دہلی میں فزیکس ڈپارٹمنٹ میں ایک سال پڑھایا تھا لیکن مرض جنوں کی بنا پر تدریس ترک کردی تھی۔ آزادانہ ماحول، مغربیت زدگی، اختلاطِ مرد وزن اور کچھ مزاجی کیفیت نے دین وایمان سے بیزاری پیدا کردی تھی۔ آخر عمر میں مبتلائے جنوں ہوکر پورے طور سے مجذوب فرنگی بن گئے تھے۔ بیس سال اسی کیفیت میں گزارے عید کے دن طلوع آفتاب کے بعد وفات پائی۔

جب پروائی چلتی تو گردوپیش سے بے نیاز ہوکر اپنی مستی میں خوب شعرخوانی کرتے۔ اقبال سہیل کے اشعار زیادہ وردِ زبان رہتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بلا کے ذہین تھے۔ مزاج میں وارفتگی شامل تھی۔ اسی لئے علمی صلاحیتوں اور بلند ادبی لیاقتوں کے باوجود کوئی اہم علمی کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ علم ہوا ہے کہ انھوں نے تصنیف وتالیف کا کام بھی اپنے قلم سے لیا تھا۔ اور کچھ کتابیں تصنیف کی تھیں۔

شاعری ان کی خانہ زاد تھی اور اس فن سے ان کی ذہنی وفکری مناسبت بھی تھی۔ اس لئے ان کی شاعری کی ایک نہج، ان کی ایک علاحدہ سوچ تھی۔ ان کا اپنا ایک اسلوب، ایک رنگ اور ایک معیار تھا۔

انیسؔ - ڈاکٹر عباد کو پا گنج

۱۹ء ـــــ ء

تذکرۂ مشاہیر کو پا گنج مولوی محمد عثمان معروفی کے صفحہ ۴۴ پر جو فہرست شعراء کو پا گنج ہے اس میں آپ کو بھی شامل کیا گیا ہے لیکن حالات وکلام کا اندراج نہیں ہے۔

انیسؔ - انیس الرحمٰن ابراہیم پوری

۱۸؍رمضان ۱۳۷۴ھ؍۱۹۵۵ء ـــــ ۱۶؍شوال ۱۴۲۹ھ؍۱۷؍اکتوبر ۲۰۰۸ء

انیس الرحمٰن ابن علی اصغر ابن امانت اللہ ابن محمد علی اپنی عرفیت انیس ادیب سے مشہور تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن ابراہیم پور ضلع اعظم گڑھ کے مدرسہ فیض العلوم میں حاصل کی۔ عربی فارسی بورڈ اتر پردیش الہ آباد سے پرائیویٹ طریقے سے تیاری کر کے منشی، منشی کامل اور جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب ماہر، ادیب کامل کا امتحان پاس کیا۔ الہ آباد عربی فارسی بورڈ سے طب فاضل کی سند بھی پائی تھی۔ دبلے پتلے، میانہ قد اور گندم گوں چہرے بشرے کے خوبصورت شاعر تھے۔ شرع کی پابندی اور حق گوئی ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ انھوں نے اولاً مدرسہ مظاہر العلوم ابراہیم پور میں معلمی کا آغاز کیا اس کے بعد مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

عنفوانِ شباب ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ محمد عمر سیفی الاعظمی (یکم جنوری ۱۹۲۶ء۔ ۱۶؍مارچ ۲۰۰۲ء) سے اصلاح لیتے تھے۔ نظم، غزل، نعت، منقبت اور سہرے بکثرت کہے ہیں۔ آپ ظریف النفس بھی واقع ہوئے تھے اور لطیفہ سنجی میں بھی کافی مشہور تھے۔ اس لئے مزاحیہ اور طنزیہ اشعار بھی کہے۔ جس میں عوامی دل چسپی کا سامان ہوا کرتا تھا۔ کلام میں کوئی خاص رنگ نہیں۔ روایتی اور پامال مضامین ہوتے تھے۔ نعت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عقیدت سے کہتے تھے۔ کچھ تو مسابقتی نعتیہ مظاہرے اور کچھ طبیعت کی مناسبت سے غزلوں سے زیادہ نعتیں کہی ہیں۔ ان کے کلام میں زبان وبیان کی خامیاں اور عروض وفصاحت کی کمزوریاں بھی ہیں۔

نمونۂ کلام

نگاہِ شوق طیبہ کے درودیوار پر صدقے　　تمنائے حسیں، ہر کوچہ وبازار پر صدقے
فضائے گلستاں ہے زلفِ عنبر بار پر صدقے　　ستارے چاندسورج روئے پُرانوار پر صدقے
بہارِ باغِ جنت ہوگئی سوجاں سے اے رضواں　　مرے سرکار کی ہر وادیِ پُرخار پر صدقے
محض حور وملک جب وبشر کا تذکرہ کیسا؟　　دوعالم کی ہر اک شے احمد مختار پرصدقے
الٰہی وادیِ طیبہ میں میری آبلہ پائی　　مسلسل ہو بصد اخلاص نوکِ خار پر صدقے
تمام عالم کے اخلاص اور جذبات ووفاداری　　غلامانِ نبی کے جذبۂ ایثار پر صدقے
تمنا ہے انیسؔ اک روز دیکھوں گنبدِ خضرا　　ہے خودعرشِ بریں جس نور کے مینار پر صدقے
یوں ہوا نور کا جلوہ گر آئینہ　　دیکھتی رہ گئی ہر نظر آئینہ
مرحبا مرحبا آفریں آفریں　　ہے مدینے کی شام وسحر آئینہ
خاکِ پائے رسالت کے فیضان سے　　ہوگیا کوہِ فاراں کا سر آئینہ
نورِ وحدت کی جس میں ہیں تابانیاں　　ہے وہ سینہ وہ دل وہ جگر آئینہ
روئے سرکار کو سامنے دیکھ کر　　ہوگئی آئینے کی نظر آئینہ
تذکرہ شاہِ بطحا کا ہو جس جگہ　　اے انیسؔ ہے یقیناً وہ در آئینہ

اوجؔ - منشی علی محمد مبارک پوری

ـــ ۱۹۱۴ء (حیات)

مبارک پور کے باشندے تھے۔سوداگری کے تعلق سے ملک کے مختلف مقامات پر ان کی آمدورفت تھی۔ کپڑوں کی تجارت کرتے تھے اور اسی کے ساتھ شاعری کے تانے بانے کو بھی درست کرتے تھے۔ان کا کلام وقت کے گلدستوں میں چھپتا تھا مگر حالات کا علم نہیں ہوسکا۔

نمونۂ کلام

کیا کمر باندھی ہے ظالم نے مری تشہیر پر　　کاٹ کر رکھا مرے سر کو سرِ شمشیر پر
قتل ہے کس بے گنہ کا آپ کے مدِ نظر　　ہاتھ کیوں پڑتا ہے ہردم قبضۂ شمشیر پر

حضرتِ دل آپ پہلے پڑتے ہیں کس واسطے
بے وفائی کا روغن یار کی تصویر پر

دیر آئیں، جلد آئیں، آپ کو ہے اختیار
لب نہ کھولے گا کوئی تعجیل پر، تاخیر پر

ساتھ ہی گردش کے تیری یہ بھی گردش میں رہی
کیا اثر اے چرخ تیرا پڑگیا تقدیر پر

فیصلہ دونوں کا ابرو اور نظر نے کردیا
دل فشارِ تیغ ہے، قرباں جگر ہے تیر پر

پھر نگاہِ ناز سے دیکھو تمہیں میری قسم
دل مرا کہتا ہے میں قربان ایسے تیر پر

مل گیا قاتل کو میری بے گناہی کا پتہ
قتل کرکے دیر تک لرزہ رہا شمشیر پر

کس نے روئے بےنقاب اپنا دکھایا ہے اسے
جھائیاں سی پڑگئیں ہیں ماہِ پرتنویر پر

میں نے پوچھا وقتِ آخر بھی ملوگے یا نہیں
بولے اب یہ بات بھی کہتے ہیں ہم تقدیر پر

سچ اگر پوچھو زباں دانی ناسخ ہند میں
فخر رکھتی ہے کلام مصحفی و میر پر

یہ نظر سے گرتے ہی ہوجائے گا بس چور چور
مان لو کہنا، نہ رکھو شیشۂ دل تیر پر

عاشقوں کو دے رہی ہے نیم مرضی کا پتہ
یہ تری اُمیت خموشی وصل کی تقدیر پر

آکے آدھی دور سے اے اوجؔ وہ کیوں پھر گیا
پڑگئے پتھر یہ کیسے آہ کی تاثیر پر(۱)

اپنے گھر وہ سنگار کرتے ہیں
ہم ادھر انتظار کرتے ہیں

دیکھ یوں دل سے پیار کرتے ہیں
جان تجھ پر نثار کرتے ہیں

آج وعدہ ہے ان کے آنے کا
اس لئے انتظار کرتے ہیں

مرنے والے کسی کی صورت پر
جان ودل سب نثار کرتے ہیں

اوجؔ تم نے لکھی غزل اچھی
بات یہ ہونہار کرتے ہیں(۲)

قتل گہہ میں آیئے انداز سے
قتل کیجے مجھ کو تیغ ناز سے

جان بھی اب لے لو اوناوک فگن
دل ہوا زخمی نگاہِ ناز سے

اب نہ کہنا دل کی مانیں گے کبھی
ہوگئے آگاہ اس دم باز سے

کیوں تردد ان کو دل دینے میں ہے
مانگتے ہیں ناز سے، انداز سے

جھوٹوں بھی پوچھا نہ آکر آپ نے
حال دل کا عاشقِ جاں باز سے

یاد آتا ہے سوالِ وصل پر
مسکرا دینا کسی کا ناز سے

اوجؔ حالِ عشق دل سے پوچھئے — اک یہی آگاہ ہے اس راز سے(۳)
اُدھر ابرو ہے، اِدھر تیغِ ادا رکھی ہے — جان اس پر بھی مگر ہم نے بچا رکھی ہے
کیوں نظر جانبِ پہلو ہی جما رکھی ہے — چیز مطلب کی یہاں کہئے تو کیا رکھی ہے
پاس جب کچھ نہ رہا خواہشِ پا بوسی میں — صورت نقشِ قدم جان مٹا رکھی ہے
چین کچھ دیر تو لینے دے مجھے مرقد میں — شورِ محشر نے یہ کیوں دھوم مچا رکھی ہے
آج بیہوش بنانا ہے کسے مدِ نظر — کیوں نقاب آپ نے چہرے سے ہٹا رکھی ہے
طلبِ بوسۂ ابرو پہ یہ ملتا ہے جواب — دیکھ یہ تیرے لئے تیغِ ادا رکھی ہے
چین لے اے دل دل مضطر کہ مجھے چین آئے — بے قراری نے مری نیند اڑا رکھی ہے
عشق میں ذلت وخواری کو سمجھ کر عزت — آبرو اوجؔ نے مٹی میں ملا رکھی ہے(۴)
مروت نہ الفت نہ ہے وہ وفا — تری بات پہلی وہ کیا ہوگئی(۵)

حواشی:

(۱) گلدستہ شاہد اضطراب ص ۴۔۵ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۰ء مطبوعہ رہبر پریس مراد آباد
(۲) پیام یار لکھنؤ۔اپریل ۱۹۱۴ء ص ۷
(۳) پیام یار لکھنؤ۔اگست ۱۹۰۴ء ص ۳
(۴) محبوب الکلام۔شمارہ نمبر ۷ جلد ۸، محبوب پریس علاقہ پیشکاری حیدر آباد، دکن ص ۱۰۔ ۶/شوال المکرم ۱۳۲۳ھ
(۵) پیام یار لکھنؤ، دسمبر ۱۹۰۵ء ص ۱۱

اویسؔ - مولانا غلام جیلانی اعظمی

۱۹۰۲ء/۱۳۲۰ھ ـــــ ۲۵/فروری ۱۹۷۷ء/۶/ربیع الاول ۱۳۹۷ھ

نام محمد اویس حسن، عرف غلام جیلانی اور لقب شیخ العلماء مجمع البحرین، صدر الصدور، امام الادب اور استاذ الاساتذہ وغیرہ تھا۔مگر عرف کو اتنی شہرت ملی کہ یہی نام سمجھا جانے لگا۔آپ کا تعلق گھوسی ضلع اعظم گڑھ کے ایک علمی گھرانے سے تھا۔ والد گرامی مولانا صدیق گھوسوی متوفی ۲۱/مارچ ۱۹۱۶ء تلمیذ رشید استاذ العلماء مولانا ہدایت اللہ رام پوری متوفی ۱۳۲۶ھ اپنے دور کے

باکمال صاحبِ درس عالم تسلیم کئے جاتے تھے جن کی تعلیم کا شہرہ مدرسہ اشرفیہ مبارک پور کے ابتدائی ایام میں خوب رہا ہے۔ وہ مدرسہ حنفیہ جون پور کے ممتاز اور ارشد تلامذہ میں تھے۔ مولانا صدیق صاحب مولانا امجد علی (۱۸۸۵ء - ۱۹۴۸ء) کے چچا زاد بھائی تھے اور عمر میں ان سے بڑے تھے۔ انھوں نے ابتدائی کتابوں کا درس مولانا صدیق صاحب سے بھی لیا تھا۔ مسلکی اختلاف کے بعد مدرسہ مصباح العلوم قائم کرنے کی تحریک میں مولانا حفیظ اللہ رضوی مبارک پوری بن شیخ دین محمد قریشی پورہ دیوان متوفی ۲۴/نومبر ۱۹۶۴ء/ ۱۳۸۴ھ کے ساتھ ان کا بھی مشورہ شامل تھا۔ اگرچہ طلبہ کم تھے مگر تعلیم کا معیار بہت بلند تھا۔

آپ کی ابتدائی تعلیم وطن میں ہوئی۔ چودہ برس (۱) کی عمر میں اویس سایۂ پدری سے محروم ہو گئے، والدۂ مکرمہ نے تنگدستی کے باوجود ان کی تعلیم میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، انھوں نے مختلف مقامات پر اپنے وقت کے جید علماء سے تحصیل علم فرمائی۔ فراغت کے بعد مختلف مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور میں بھی ۱۳۶۶ھ سے ۱۳۷۳ھ تک کل سات سال ان کا فیض جاری تھا۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے، جن میں پنجابی، سندھی، بخاری، سمرقندی، افغانی، ترکی، افریقی، ایرانی بھی شامل ہیں۔ (۲)

نہایت وسیع النظر اور جامع العلوم مدرس تھے۔ تفہیم کا انداز اتنا دل نشیں اور قابل فہم تھا کہ غبی الذہن طلباء بھی دولت علم سے بے بہرہ نہ رہ پاتے، اور علم کی روح تک پہنچ جایا کرتے تھے۔ جب مسند درس پر بیٹھ جاتے اور طلباء کی جماعت میں مختلف ذہنی سطح رکھنے والوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر تدریسی گوہرافشانی میں لگ جاتے تو علم و معارف کے دریچے یوں کھولنے لگتے کہ پھر دلوں کے سارے قفلِ جہل ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتے، تدریس کے ساتھ مروجہ طریقۂ افہام وتفہیم کے ساتھ نت نئے اسلوب و انداز بھی اختراع کرنے اور ان سے کام لینے کے گر سے اچھی طرح واقف تھے۔ آپ کی نظر بدلتی ہوئی قدروں اور رفتارِ زمانہ پر بھی تھی۔ ماہر تعلیم ایسے تھے کہ تعلیمی انحطاط اور علمی زوال کے اسباب وعلل کو مجذوب فرنگی سے زیادہ سمجھتے تھے اور مقام علمیت کیا ہے؟ اس کی پوری فہم وبصیرت سے گرانمایہ تھے۔

آپ کی تدریس کے بارے میں راقم کے استاد گرامی حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری صاحب قبلہ رقم طراز ہیں کہ ”حضرت شیخ العلماء سے دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور میں نے بھی چند کتابیں پڑھی ہیں۔ آپ کا علم مستحضر تھا اور آپ کی تفہیم بھی شاندار تھی۔ درس وتدریس میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ مشکل ترین مسائل بڑی خوش اسلوبی سے طلبہ کو ذہن نشین کرا دیتے۔ منطق کی ابتدائی کتاب کبریٰ پڑھتے وقت مشترک اور تمام مشترک کا فرق مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آپ نے منٹوں میں ایسا ذہن نشین کرا دیا کہ اب تک وہ محفوظ ہے۔ (۳)

آپ جیسے نابغۂ روزگار کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی اہل قلم جماعت سے آپ کا تعلق ہوتا تو نہ جانے کس کس لقب سے ملقب کئے گئے ہوتے اور کیسے کیسے خطابات سے نوازے جاتے، ان کی فکری وفنی اور علمی ودینی قدر وقیمت متعین کرنے کی کوشش میں کتنے مضامین وکتب اور رسائل کے خصوصی نمبروں کے انبار لگ چکے ہوتے۔ نام ونمود سے کچھ اتنے دور ونفور رہے کہ عربی واردو میں جو کچھ کہا، لکھا، پڑھا، وہ بھی محفوظ نہیں رہا، نہ کسی کو اتنی توفیق ہوئی کہ اسے محفوظ کر سکے۔ آپ کے صاحبزادے مولانا غلام ربانی فائق (یکم جولائی ۱۹۳۶ء- ۲۸/اگست ۲۰۰۰ء) بھی اچھے شاعر تھے۔

مولانا کی ساری عمر درس وتدریس میں گزری، وہ اپنے علمی وروحانی اسلاف کے صحیح وارث تھے۔ جہاں جاتے اپنی ذات سے ایک انجمن بن جاتے اور سارے علمی خروش کے مرکز ثقل کی حیثیت اختیار کر لیتے تھے، جس جگہ گھنی چھانو دیکھ کر بیٹھ جاتے، غریب الوطنی اپنے آثار وآزار کی دھوپ سمیٹ لیتی اور مسند درس وحکمت بچھ جایا کرتی تھی۔ ذہانت وفطانت ایسی تھی کہ ساری علمی فتوحات آپ کے فتراکِ نظر کا صید وشکار لگتی تھیں۔ بعض فنون میں انھیں اتنی مہارت تامہ حاصل تھی کہ وہ اپنے اقران وامثال میں بہت نمایاں اور ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ علم وادب کی جملہ اقسام، علمِ صرف ونحو، لغت وانشاء، بلاغت، عروض وقوافی، علم اشتقاق ورسم الخط، شجرۂ لسان وتاریخی ارتقاء کے رموز ونکات سے آگاہ تھے اور ان فنون کی جزئیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ حدیث وتفسیر، علم کلام، فقہ واصول، منطق وفلسفہ کے اسرار غامضہ بھی آپ پر روشن تھے۔ علمی یادگاروں میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں، جو

آپ کی صلاحیتوں کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔

(۱) شرح مختصر المعانی (۲) شرح متن الکافی فی العروض والقوافی (۳) شرح رسالہ لامیہ (۴) حاشیہ المجتنی (۵) حاشیہ منثورات (۶) حاشیہ دیوان متنبی (۷) حاشیہ مسلم الثبوت (۸) حاشیہ شرح عقائد نسفی (۹) حاشیہ ملاحسن (۱۰) حاشیہ ہدایۃ الحکمت (۱۱) حاشیہ ہدیہ سعیدیہ (۱۲) حاشیہ متن حکمۃ العین (۱۳) شرح بحث وجود رابطی (۱۴) شرح بحث العلم ان کان اذ عاناللنسبۃ فتصدیق والافتصور (۱۵) شرح فصل الجوہر جوہر (۱۶) ترجمہ شفاء قاضی عیاض (۱۷) شرح خطبۂ شرح تہذیب (۱۸) حیثیت اور امکان کی تعریف اور ان کے اقسام پر دو مختصر رسالے (۱۹) قطبی کے ابتدائی مباحث اور اخیر تصدیقات کے پیچیدہ مسائل کی عام فہم شرح (۲۰) شرح مقدمۂ صحیح مسلم (نامکمل) (۲۱) حیات شیخ المشائخ (نامکمل) ۱۳۹۷ھ میں اپنی عمر کے آخری حصہ میں حضرت مولانا امجد علی صاحب کی حیات اور کارنامے پر طویل وبسیط مضمون قلم بند فرمایا تھا جسے ماہ نامہ اشرفیہ کے صدرالشریعہ نمبر کی ترتیب کے وقت ایڈیٹر صاحب لائے لیکن نہ معلوم کیسے ان کے پاس سے ضائع ہوگیا یا کسی مصلحت سے چھپا دیا۔ کیوں کہ اشرفیہ ان دنوں غیر مفتی کو مفتی، غیر مصنف کو صاحبِ تصنیف ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے اور تاریخ وتذکرہ کی علمی وتحقیقی جہت کو غلوئے عقیدت اور شخصیت پرستی کی طرف خواہ مخواہ موڑنے کی کوشش کررہا ہے۔

مولانا اویسؔ درسیات کی امہات کتب پر عبور تامہ رکھنے کے علاوہ ادب سے خصوصی شغف بھی رکھتے تھے، اور کبھی کبھی عربی میں حسبِ موقع اشعار بھی موزوں کرتے تھے، فارسی اور اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالمصطفیٰ صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے مکتوب گرامی بنام راقم مورخہ ۵ رستمبر ۱۹۸۰ء میں لکھا ہے کہ "مولانا غلام جیلانی صاحب قبلہ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہہ لیا کرتے تھے اگرچہ شاعری ان کا کبھی مشغلہ نہیں رہا" مگر عربی زبان سے زیادہ ذہنی مناسبت تھی، اسی لئے شیخ الادب کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ ویلور کے زمانہ قیام میں حضرت عبداللطیف ویلوری کی شان میں ایک عربی قصیدہ لکھا تھا، جس کی سلاست وروانی اور شعریت پر ایک گھڑی بھی انعام میں ملی تھی، عربی نثر ونظم میں ایسی خصوصی دستگاہ

حاصل تھی کہ قلم برداشتہ لکھنے میں کچھ بھی تکلف وتامل مانع نہ تھا۔

مولانا کو اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی اور ان کے بھائی مولانا حسن رضا خاں بریلوی تلمیذ داغ دہلوی کی نعتیہ شاعری سے خصوصی دل چسپی تھی۔آپ نے نعتیہ کلام کو زیر مطالعہ رکھا اور اس صنف کے مزاج ومعیار اور انداز واقدار کو اپنی فکری وعلمی جولان گاہ بنایا۔مولانا محمد عاصم صاحب کے سوال کے جواب میں ۴؍شوال ۱۳۹۶ھ کو انھوں نے فرمایا تھا کہ "میں نے اردو شاعری کے ذخائر میں صرف نعتیہ شاعری کا مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں کلامِ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ سے بے حد متاثر ہوں۔اعلیٰ حضرت کی شاعری قلب کے حقیقی جذبات کی ترجمان ہے اور شعر کا ایک ایک لفظ عشق وعرفان میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔نعت پاک کے پڑھنے یا سننے سے قلب متاثر ہوتا ہے اور روح عشقِ محمدی کا سرور پاتی ہے۔معنیٰ ومفہوم کے لحاظ سے اعلیٰ حضرت کے اشعار گرانقدر علمی معلومات فراہم کرتے ہیں اور جتنا زیادہ علم وفضل جس کے نصیب میں ہے وہ اتنا ہی زیادہ کلامِ اعلیٰ حضرت کی گہرائیوں تک پہنچ کر اشعار کے نکات ومعارف کی تہ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔مولانا حسن رضا خاں صاحب بریلوی علیہ الرحمہ کی نعتیہ شاعری سے بھی متاثر ہوں اور اسے پسند کرتا ہوں۔(۴)

مولانا نے ابتدا میں قاسمی تخلص اختیار کیا تھا مگر جب دارالعلوم دیوبند کے فارغین نے اپنے نام کے ساتھ قاسمی لکھنا شروع کر دیا تو آپ اس تخلص کو خیر باد کہہ کر اویس تخلص فرمانے لگے۔

مولانا اپنی جودت ذہنی اور ذکاوت فکری کی وجہ سے برجستہ اور قلم برداشتہ شاعری کے باوجود سنگلاخ زمینوں میں بہت آبدار اور تازہ کار اشعار کہتے تھے۔شعر وادب سے ان کی طبیعت کو خصوصی مناسبت تھی۔ان کی فکر یا ان کا قلم کہیں قلت لفظ اور کوتاہی مفہوم ومضمون کا شکار نہیں ہوا۔ان کی نظر قرآن وحدیث اور فقہ وتاریخ پر بڑی گہری تھی اسی لئے ان کے کلام میں ان کی علمیت کا عکس وجمال جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف کو اپنی فکری جولانگاہ بنایا۔نعت،قصیدہ،منقبت، الوداعیہ،استقبالیہ،وفات نامے وغیرہ ان کی منظوم یادگاریں ہیں جو کچھ فراہم ہوسکا ہے اس سے

ان کی خوش ذوقی، خوش فکری اور خوش گوئی کی شہادت ملتی ہے۔ انھوں نے جن شخصیتوں کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے اس میں انھوں نے مخفی صلاحیتوں، خفیہ خوبیوں اور باطنی کمالات پر خاص توجہ کی ہے اور عام نگاہوں سے جو صفات پوشیدہ تھیں ان کو خصوصی طور سے بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ انھوں نے چادر اور گاگر جیسی پامال اصناف اور بنجر موضوع کو وسیلۂ اظہار قرار دیا تو ان میں بھی سادہ وسلیس پیرایۂ بیان اختیار کر کے ایسے بامعنی اشعار کہے کہ ان اصناف کی روایت میں فکری توسیع کی راہیں کشادہ ہوگئیں۔ عربی کے برجستہ مصرعے ان کی عربیت پر دسترس کا ثبوت ہیں۔

دارالعلوم شمس العلوم گھوسی سے متعلق آپ کے عربی سلام کے چند اشعار یہ ہیں:

یا مرجع الانام ویا صاحب الھمم — صلی علیك ربك ذوالفضل والکرم
یا من اذا دعوت الی دین ربنا — وانت لك الغرب ولانت لك العجم
فی لیلۃ الفراق لقد اظلم الفضا — نور بنور وجھك یا کاشف الظلم
شمس العلوم قد طلعت فی دیارنا — فارق بھا الھدایۃ والرشد والحکم
انعم علی من اقتسبو انور علمکا — واسلك بھم سبیلك یا ھادی الامم

نمونۂ کلام

مولانا مفتی جلال الدین امجدی کی حج سے واپسی پر یہ اشعار موزوں کئے گئے تھے

مرحبا، مرحبا حاجی امجدی (۵) — آمدِ باکرامت پہ لاکھوں سلام
تیرے احرام کی دل ربا کیفیت — اس ادائے محبت پہ لاکھوں سلام
مثل پروانہ کے، گرد کعبہ پھرے — اس طوافِ زیارت پہ لاکھوں سلام
آبِ زم زم بھی سیراب ہوکر پیا — اس کی پاکیزہ لذت پہ لاکھوں سلام
جب حطیمِ مقدس میں داخل ہوئے — اس خوشا بخت ساعت پہ لاکھوں سلام
پھر منیٰ اور عرفات کی حاضری — اس مبارک اقامت پہ لاکھوں سلام
روضۂ پاک کی جالیوں کے قریب — اس دعا کی اجابت پہ لاکھوں سلام
درحقیقت ہے یہ فیض امجد علی — ان کی پاکیزہ تربت پہ لاکھوں سلام
ہم سبھوں کے لئے بھی دعا کیجئے — اس دعا کی محبت پہ لاکھوں سلام

بس اویسِؔ حزیں پر نگاہِ کرم اس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

نعت پاک

جو بلبل ہے گلستانِ محمد کے گل تر کا
مزہ آتا ہے اس کو نعت میں قندمکدر کا

رخ پر نور احمد سے جہاں پردہ ذرا سرکا
زمانہ ہوگیا روشن، کھلا دروازہ خاور کا

زماں اس کا زمیں اس کی، مکاں اس کا مکیں اس کے
اسی کا عرشِ حق والی ہے وہ اللہ کے گھر کا

سخاوت میں، شجاعت میں، امامت میں، عبادت میں
جہاں میں کون ہمسر ہوسکا محبوب داور کا

سکونت دشت طیبہ کی ہمیں سوجان سے بھائی
مبارک تجھ کو رضواں خلد میں گھر سیم اور زر کا

کبھی دیوانگی میں قیس مجھ سے بڑھ نہیں سکتا
وہ دیوانہ ہے لیلیٰ کا، میں دیوانہ پیمبر کا

وہ خود ہیں نور اور ان کی ہر اک نسبت بھی نوری ہے
کھلونا عہد طفلی میں ملا ماہِ منور کا

سکندر سے کہو آبِ بقا سے کچھ نہیں کم ہے
وہ آنسو جو نکلتا ہے ہمارے دیدۂ تر کا

مبارک قاسمؔ وہ ناخدائی کو تری آئے
تو کیا کھٹکا ہے اب مجھ کو مخالف بادصرصر کا

منقبت درشان حضرت خواجہ صوفی محمد حسن صاحب بھینسوڑوی رام پور

ہند اور پاک کو آقا ہے بھروسا تیرا
سرورا! مرجعِ کل ہے درِ والا تیرا

جلوۂ شاہ حسن مجھ پہ ہو پھیرا تیرا
حسرتیں آٹھ پہر تکتی ہیں رستا تیرا

واہ رے عطر خداداد مہکتا تیرا
خوبرو ملتے ہیں کپڑوں میں پسینا تیرا

خسرِوِ کون ومکاں اُس پہ تواضع ایسی
ہاتھ تکیہ ہے ترا، خاک بچھونا تیرا

خفتگانِ شب غفلت کو جگا دیتا ہے
سالہا سال وہ راتوں کا نہ سونا تیرا

تجھ کو بغداد سے حاصل ہوئی وہ شانِ رفیع
دنگ رہ جاتے ہیں سب دیکھ کے رتبہ تیرا

کس کے دامن میں چھپوں، کس کے قدم پر لوٹوں
تیرا سگ جائے کہاں؟ چھوڑ کے ٹکڑا تیرا

بھیک بے مانگے فقیروں کو جہاں ملتی ہے
وہ ہے بھینسوڑ میں آقا درِ والا تیرا

نئے انداز کی خلوت تھی وہ خاک نشیں
آنکھیں مشتاق رہیں دل میں ہو کلوہ تیرا

یہ عروسِ جناں کی چادر ہے
یعنی قاسم میاں کی چادر ہے

جان وایمان ودل منور ہیں
نورِ "نوری میاں" کی چادر ہے

رکھو سر پر لگاؤ آنکھوں سے جانتے ہو، کہاں کی چادر ہے؟
گلشنِ اولیا کھلا جس جا یہ اسی گلستاں کی چادر ہے
اک جہاں میہمان ہے جس کا یہ اسی میزباں کی چادر ہے
اس کو جھک کر ملک بھی لیتے ہیں شاہِ عالی مکاں کی چادر ہے
بلکلِ خزاں! یہاں آؤ گلشنِ بے خزاں کی چادر ہے
جاں بلب مژدۂ خزاں سن لے لے، یہ جانِ جہاں کی چادر ہے
لذتِ سلسبیل آتی ہے سر پہ آبِ رواں کی چادر ہے
راز ہے یہ غلافِ کعبہ کا ہائے کس رازداں کی چادر ہے
قسمت قاسمی ہے زور آور سر پہ قاسم میاں کی چادر ہے

"گاگر"

اٹھی قاسمِ باخدا کی یہ گاگر چلی نائبِ مصطفیٰ کی یہ گاگر
یہ ہے پیکرِ رُعبِ جاہ وجلالت کہ ہے ابن شیرِ خدا کی یہ گاگر
پڑھو سُنّیو! جوش سے یہ ترانہ ہے محبوبِ احمؔد رضا کی یہ گاگر
منور ہے دل، جان وایمان، اس سے کہ ہے جانِ بدرالعلیٰ کی یہ گاگر
کرے گی، یہی آج مشکل کشائی کہ ہے ابن مشکل کشا کی یہ گاگر
شفاءِ مرض کے لئے ہے یہ کافی رکھو، سرپہ دارالشفا کی یہ گاگر
یہ کہتا ہے ساقی چلے آؤ پیاسو بٹی سرورِ اولیاء کی یہ گاگر
خذوا فاشربوہ ھنیئاً مریئاً کہ ہے شاہِ جود وعطا کی یہ گاگر
اَلَا اِنَّ فِیہِ شَرَاباً طَھُوراً ہے بے شبہ آب بقا کی یہ گاگر
بھلا قاسمؔی کیوں ہو محروم اس سے کہ ہے قاسم بادشا کی یہ گاگر

تاریخ وفات حسرت آیات حضرت خواجہ صوفی ارشاد علی صاحب قدس سرہٗ العزیز

ہم غریبوں کا امیرِ کارواں جاتا رہا گلشنِ اسلام کا وہ باغباں جاتا رہا
آہ! ہم سے وہ پناہِ بیکساں جاتا رہا شاہ ارشاد علی فخرِ جہاں جاتا رہا

تھے وصالِ حق کے پیاسے جوشِ ایمانی کے ساتھ
ہر قدم ان کا اُٹھا آیاتِ قرآنی کے ساتھ

کس قدر تھا آپ کو مرشد سے ملنے کا خیال — عالمِ بالا میں پہونچے چھوڑ کر اہل وعیال
شوقِ رحلت نے کئے تھے دور سب رنج وملال — مسکراہٹ تھی لبوں پر ضعف سے تھا خستہ حال

آپ سے باقی ہے پیغامِ امیرالاولیاء
تا اَبد باقی رہے نامِ امیرالاولیاء

خوب پھیلایا ہے فرمانِ رسالت آپ نے — شوق سے کردی ہے تکمیل ہدایت آپ نے
واقعی پورا کیا حقِ ولایت آپ نے — اللہ اللہ خوب دکھلائی کرامت آپ نے

کاش ان کی راہ پر ہم گامزن ہوتے اویسؔ
حق کی خاطر خوگرِ رنج ومحن ہوتے اویسؔ

حسین سر حقیقت کا رازداں تو ہے — رسائی عقل وخرد کی نہیں جہاں تو ہے
حسین فخر جہاں، فخر انس وجاں تو ہے — حسین سیرت سلطانِ دوجہاں تو ہے
حسین باعث تسکینِ قلب وجاں تو ہے — شکستہ حال غریبوں کا پاسباں تو ہے
ہے تجھ سے زندہ زمانہ میں نام شاہ رضا — امیر لشکر آزادیِ جہاں تو ہے
زمینِ جہدوعمل پر تو بے نظیر ہوا — یقین وصبر وتحمل کا آسماں تو ہے
ہے مستحقِ نوازش اویسؔ بھی تجھ سے — اسے نواز کہ عالم پہ مہرباں تو ہے

غمزدہ دل کے سہارے حضرتِ یارِ علی — قبلہ وکعبہ ہمارے حضرتِ یارِ علی
نورِ محبوبِ الٰہی مظہرِ عبداللطیف — آپ تھے حق کے سنوارے حضرتِ یارِ علی
مونسِ قلبِ حزیں، چارہ گرِ دردِ نہاں — بے سہاروں کے سہارے حضرتِ یارِ علی
سنیت سونی ہوئی، ہاں اٹھ کے سینہ تان کر — پھر بجا دیجے نقارے حضرتِ یارِ علی
سونے سونے سے نظر آتے ہیں جب سے تم گئے — بزمِ عرفاں کے نظارے حضرتِ یارِ علی
کیا اویسؔ خستہ جاں کو اب نہیں ہوں گے نصیب — تیرے جلوؤں کے نظارے حضرتِ یارِ علی

حواشی:

(۱) متعدد جگہ آپ کی بے پدری نو برس میں بتائی گئی ہے مگر راقم کو ایک قلمی ڈائری شیخ عبدالمجید متوفی ۱۹۳۶ء میں مولانا صدیق کی وفات مذکورہ بالا مندرج ملی ہے۔

(۲) روداد دارالعلوم امجدیہ کراچی ص ۱۷ بحوالہ ماہنامہ فیض الرسول براؤں اپریل، مئی ۱۹۷۷ء ص ۷۰

(۳) تاثرات۔تذکرۂ صدرالشریعہ۔مولانا غلام جیلانی۔مرتبہ احمد رضا ص ۱۲

(۴) ماہنامہ فیض الرسول۔اپریل، مئی ۱۹۷۷ء ص ۲۴-۲۵

(۵) حج وزیارت۔مفتی جلال الدین امجدی ص ۱۳۳

ایازؔ اعظمی - رئیس احمد

مارچ ۱۹۳۸ء ــــ ۱۵/فروری ۲۰۰۷ء

راجہ پور سکرور ضلع اعظم گڑھ ان کا مولد مسکن تھا۔ والد کا نام عنایت اللہ تھا، بچپن ہی میں سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے تھے، رحمت الٰہی برق اعظمی (۱۹۰۵ء - ۴/اکتوبر ۱۹۸۳ء) کے ممتاز شاگردوں میں آپ کا بھی نام لیا جاتا ہے۔"محراب جان" ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے، جس سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور فکری جہتوں کا پتا چلتا ہے۔زندگی بڑی عسرت اور خانگی الجھنوں کا شکار رہی ہے، مگر ان کی شاعری میں شگفتگی اور تازگی کی فضا ملتی ہے، انھوں نے زہر پی کر زندگی کی جمالیاتی قدروں کو نئے ابعاد دیئے۔ یہ مشاعروں میں ترنم سے پڑھتے تھے، اور عوام میں پسند کئے جاتے تھے، شاعری میں تجربہ کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے۔

ایازؔ ایک کہنہ مشق شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ انھوں نے شاعری کے فن کو نئی نسل تک پہنچانے کی روایت کو بھی زندہ رکھا تھا۔ انھوں نے دیہاتی زندگی میں افلاس کے بڑے بڑے تھپیڑے کھائے تھے، محنت ومزدوری سے تنگدستی کو شکست دینی چاہی تھی۔ اس لئے ان کے تجربات وسیع تھے۔

وہ متعدد غیر مطبوعہ مجموعۂ کلام کے مصنف بھی تھے، ان کے بے شمار شاگرد آج بھی موجود ہیں، وہ بڑے منکسر المزاج، سادہ دل، صاف ستھری طبیعت کے مالک تھے، شاگردوں اور چاہنے والوں سے انھیں خاص قسم کا تعلق خاطر پیدا ہو جاتا تھا، ان کا کلام قدیم وجدید رنگ تغزل کا نمائندہ

ہے۔ انھوں نے اپنے فکر وفن سے اپنے دور و دیار کو متاثر کیا۔ انھوں نے لفظوں کا تخلیقی استعمال کرنے میں اپنی فنکارانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ حالات و زمانہ پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ اسی لیے ان کے اشعار میں تہ داری اور زمانہ شناسی کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے شعری اظہار کے حوالے سے ان کی معاصر پر چھائیوں کی معنویت کو سمجھا جا سکتا ہے، زندگی سے معاملہ کرنے اور مسائل سے مجادلہ کرنے کا ہنر انھیں معلوم تھا۔ فن اور حیات کے رشتے کو انھوں نے مضبوط کر کے شاعری کو نئے اسالیب، سماج کی بدلتی، بکھرتی، پھیلتی، سمٹتی، بنتی بگڑتی، ٹوٹتی جڑتی قدروں سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ علامتوں اور تشبیہات واستعارات کے استعمال میں انھوں نے اپنی ذہنی پختگی کا لوہا منوایا۔ شعر غور وفکر سے کہتے تھے اور اس کی نوک پلک کی درستی پر خاص توجہ دیتے تھے۔ اسی لیے ایازؔ کے یہاں تازگی اور شگفتگی ملتی ہے۔ دونوں رنگوں کے امتزاج سے ان کی شاعری میں حسن اور نکھار پیدا ہو گیا ہے۔ وہ زندگی کے اکہرے اور سادہ انداز کو بھی پہلودار بنا کر پیش کرتے ہیں۔

ایازؔ اعظمی کی غزلوں میں ایک ادبی سحر آفرینی اور لفظوں کے زیر و بم میں ایک خاص قسم کی نشاط انگیز موسیقیت اور نغمگی ہے، ان کا شعری آہنگ ادب کی جمالیاتی قدروں کی اساس پر قائم ہے۔ ان کا احساس جمال ہر جگہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ اسی طرح ان کے ادبی شعور میں مذہب کی آفاقیت اور دین کی اہمیت بھی شامل ہے۔ ان کی فکر مذہب بیزار نہیں ہے بلکہ وہ عقیدۂ آخرت اور انسانیت کے احترام پر اصرار کرتی ہے۔ وہ دین وسیاست کی ہم آمیزی پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں اسلامی افکار کی کہکشاں ان کے اشعار کے افق پر روشن ملتی ہے۔ ان کی شاعری دنیا کے خرابے کو آباد کرنے اور زندگی کی نامیاتی قدروں کے اثبات کا دوسرا نام ہے۔ ایازؔ معنویت وافادیت کے پیمانۂ نظر سے شعر کے وزن و وقار کو بھی ناپتے ہیں، اور مقصدیت کے محور سے کبھی اپنی سوچ کو علیٰحدہ نہیں ہونے دیتے۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی کی کچھ معنویت ہے، اسی معنویت کی تلاش کی ایک سمت و جہت شعر وادب بھی ہے۔ مگر ان کا نظریہ ہے کہ شعر وادب کو جمالیاتی قدروں اور احساسِ حسن کا نمائندہ ہونا چاہئے۔ جمال وجلال دونوں انسانی زندگی کے بنیادی عنصر ہیں۔ ان دونوں حقیقتوں سے کائنات میں تب وتاب اور توانائی پیدا ہوتی ہے، حرکت کا

تصور زندگی کی علامت ہوتا ہے، ایاز کی شاعری نے اپنی غم انگیزی اور حالات کے جبر کا شکار رہنے کے باوجود وہ زندگی کے حرکی تصور سے بے نیاز اور لاتعلق نہیں ہے۔ وہ حالات کی ستم ظریفی سے نبرد آزمائی کو یداللٰہی اور کارمردانگی سمجھتے ہیں، ان کے یہاں جن علامتوں کا استعمال عام ہے، ان سے ان کی زندگی سے محبت کا پتا چلتا ہے۔

نمونۂ کلام

کبھی زندگی میں ایازؔ رنگ بھر نہ سکا
رہی شاعری، سو نکھرگئی تو نکھر گئی

خزاں کی آنکھ کا شہتیر بن گیا ایازؔ
یہ اک گلاب سرِ شاخ لہلہاتا ہوا

دولت والے کھائیں سنہری تھالی میں
نردھن جی کے بھاگ میں باسن مٹی کا

بیچ میں کیسی نفرت کی دیوار ایازؔ
ہم مٹی کے رام کھلاون مٹی کا

سر شام چراغ جو ہاتھ میں لے لیا
بس اسی کی لو میں تمام رات گزری گئی

ہوں چند سانحے تو حوادث کا نام دیں
اک واردات ہو تو سپردِ قلم کریں

ہم کو خوابوں کے صحرا ملے
تشنہ کامی کے دریا ملے

زندگی کا سفر خوب ہے
پانو ٹھہرے نہ رستہ ملے

لذتِ زخمِ تمنا کوئی ہم سے پوچھے
ہرخوشی دل پہ گزر جاتی ہے تیروں کی طرح

جہاں رات گوہرِ کہکشاں سے سنور گئی
وہیں اپنے گھر کی اداسیوں پہ نظر گئی

پیکر پیکر دیکھ رہا ہوں
کرب کا منظر دیکھ رہا ہوں

شاید تجھ میں غیرت جاگے
زہر بھی پی کر دیکھ رہا ہوں

نیتِ قاتل کچھ بھی ہو لیکن
ہاتھ میں خنجر دیکھ رہا ہوں

ہوا کے زہر سے محفوظ کوئی پھول نہیں
یہ برگ برگ پہ دھبے پڑے ہوئے ہیں سو دیکھ

منتشر منتشر ہیں خواب بہت
روشنی بن گئی عذاب بہت

در، دیواریں، طاق، دریچے، کوٹ، اٹاری کاغذ کی
قریہ قریہ پھیل گئی ہے اب بیماری کاغذ کی

گن والے ہو تم ہی بتاؤ کیسے بیڑا پار لگے
موجوں کا قد سر سے اونچا ناؤ ہماری کاغذ کی

درونِ جاں بے کراں اندھیرے، مگر لبوں پر چراغ روشن
جیب عالم ےاس صدي ابجھا بجھا دل دماغ روشن

نہ جانے خورشیدِ آشتی کی سحر فروزی کا حشر کیا ہو | سنا ہے دانش گہِ ستم میں ہیں سازشوں کے چراغ روشن
نگارِ صبح دیکھ لے یہ حضرت ایازؔ ہیں | بجھے بجھے چراغ سے کھلے کھلے گلاب سے
یہ مہک آئی کہاں سے، یہ اجالا کیوں ہوا؟ | سوچتا ہوں اس دلِ ویراں میں گھر کس نے کیا

ایمن - مولوی حافظ عبدالمنان

۱۹۰۲ء ـــــ نومبر ۱۹۶۹ء/ رمضان ۱۳۸۹ھ

آبائی وطن کوپاگنج کے محلہ پھلیل پورہ میں رہائش تھی۔ ان کے والد حاجی ثناء اللہ تھے۔ حافظ عبدالغنی کوپاگنجی کے مکان پر ان سے قرآن حفظ کیا۔ تجوید و قرأت کی تعلیم مولوی شبلی کوپاگنجی متوفی ۶/ اکتوبر ۱۹۶۸ء سے ان کے دولت کدے پر حاضر ہو کر حاصل کی۔ اس کے بعد درس نظامی کے عربی و فارسی نصاب کی کتب متداولہ کی تکمیل کر کے پورے عالم و فاضل بن گئے۔ حالانکہ یہ نابینا تھے لیکن جذبہ و شوق نے مہمیز کی تو مشکوٰۃ شریف تک مسلسل پڑھا۔ ان کی عربی تعلیم اتنی مضبوط تھی اور ان میں تفہیم کی ایسی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی کہ بلا تکلف و توقف طلبائے درس کو تمام شرائط درس کے اہتمام کے ساتھ نہایت عمدگی سے پڑھاتے تھے۔

ان کے اساتذہ میں مولانا محمد اسحٰق کوپاگنجی (۱۲۷۲ھ - ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء) مولانا عبدالصمد کوپاگنجی (۱۳۰۵ھ- ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء) اور مولانا عظیم اللہ کوپاگنجی (۱۳۱۰ھ - ۱۹۶۷ء) کے نام نمایاں ہیں۔ ان کی درس گاہ علمی مدرسہ مصباح العلوم کوپاگنج ہے۔ اس کے بعد مولانا وصی اللہ فتحپوری (۱۳۱۰ھ - ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) سے بیعت ہوئے۔ کچھ دنوں تک گھر پر بچوں کو حفظ کرانے کا مبارک مشغلہ جاری رکھا تھا پھر حکم شیخ پر انھیں کے مدرسہ میں حفظ قرآن کا درس دینے لگے۔ مولانا وصی اللہ الہ آبادی منتقل ہوئے تو وہاں بھی انھیں حفظ کرانے کی تدریس سونپی گئی۔ پوری عمر پڑھانے میں گزار دی۔ بیمار ہو کر گھر آئے اور کوپاگنج میں فوت ہوئے۔ تذکرۂ مشاہیر کوپاگنج، ص ۴۴ پر درج فہرست شعراء میں آپ کا نام مع تخلص شامل ہے۔ آپ کے حالات تو مذکورہ تذکرہ میں ص ۱۲۵ - ۱۲۶ پر ہیں لیکن نمونۂ کلام درج نہیں البتہ اسی کتاب کے ص ۱۵۳ پر

التفات نظر کے عنوان سے ایک قطعہ درج ہے۔ جو یوں ہے

کیسی کیسی ہستیاں گزری ہیں نکتہ سنج دیکھ　　دی صدا ہاتف نے یہ تاریخ کوپا گنج دیکھ
تذکرہ کیا خوب ہے اسلافِ کوپا گنج دیکھ　　کاوشِ عثمانِ عاصی قابلِ تحسین ہے

کوپا گنج میں ایک انجمن توضیح البیان ۱۳۷۶ھ میں قائم ہوئی تھی اس کے ایک یا دو قلمی رسالے "البیان" کے نام سے جاری ہوئے تھے جس کے مرتب ایمن صاحب تھے۔ اس کا پہلا شمارہ ربیع الثانی ۱۳۷۶ج مطابق نومبر ۱۹۵۶ء میں نکلا جو بہت دیدہ زیب تھا۔

ایمن شہابیؔ - حفیظ الرحمٰن سمبھی

منگل ۶ر ربیع الآخر ۱۳۲۷ھ ریکم اپریل ۱۹۰۹ء ـــ ۱۷ر جنوری ۱۹۹۳ء

مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب کا نام مولوی غلام عباس مبارک پوری نے رکھا ہے، اس سے مادۂ تاریخ ۱۳۲۷ء نکلتا ہے، مولانا کی ولادت پر مولوی غلام عباس صاحب نے قطعۂ تاریخ بھی کہا تھا۔ یہ سمبھی میں اہل علم گھرانوں کے اتالیق تھے، ایمن کی بسم اللہ بھی انھوں نے ہی کرائی تھی۔ سمبھی کے پرائمری مکتب میں پڑھنے کے بعد چندولی ضلع بنارس اپنے عزیز کے یہاں رہ کر ۱۹۲۴ء میں مڈل پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں شبلی ہائی اسکول اعظم گڑھ سے ہائی اسکول کی ڈگری لی۔ کانپور میں انٹرمیڈیٹ اور منشی کامل اور اردو اعلیٰ قابلیت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں مدرسہ فیضِ عام (موجودہ انٹر کالج) کان پور سے وابستہ ہوکر تدریسی مشغلہ کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۶ء میں کے کے کالج کان پور میں بحیثیت اردو پرشین لکچرار تقرر ہوا، ۱۹۵۲ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ تقسیم ہند کے بعد ملازمت ترک کرکے وطن واپس آگئے۔ ماحول سے مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے پھر تعلیم و تعلم کا مشغلہ اختیار کیا اور جون ۱۹۵۳ء میں دارالعلوم مئو میں مدرس اور کلرک ہوکر خدمات انجام دینے لگے۔ یکم مارچ ۱۹۸۱ء سے سبکدوشی کی مدت گزاری۔

مئوناتھ بھنجن میں منشی ایمن کے نام سے معروف تھے، اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں مہارت کی وجہ سے اہل مئو کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت تھی۔ علم عروض کے بڑے واقف

کار تھے۔ یہ فن انھوں نے اپنے وقت کے رجال فن سے سیکھا تھا۔ ڈاکٹر ایک نسیم اعظمی اور مولانا مفتی انور علی اور بہت سے دیگر اہل علم نے ان سے فن عروض میں اکتساب فیض کیا تھا۔ ایم نسیم اعظمی لکھتے ہیں کہ بڑی سنجیدہ، باوزن اور پُروقار شخصیت کے حامل تھے۔ یہ راقم الحروف بھی ان کی علمیت اور ذوقِ علمی سے اچھی طرح واقف ہے، اور ان کی خلیق و متین اور پُرخلوص شخصیت کا معترف بھی ہے۔ سمبھی اور مئو کے بعض شاعروں کے حالات وکلام کی فراہمی میں انھوں نے بڑی مدد کی ہے۔

ان کے والد بزرگوار شیخ احمد اللہ بن شیخ بدیع اللہ (داروغہ) تھے، ان کے بارے میں رضوان اللہ فاروقی لکھتے ہیں کہ وہ محکمہ پولس کی بعض کارروائیوں کو غلط سمجھتے تھے، جب ان سے سمجھوتہ نہ کر سکے تو استعفیٰ دے کر سیدھے مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی کی خدمت مین حاضر ہو گئے، بیعت کے بعد کچھ عرصہ وہیں قیام کیا، اور پھر وطن واپس آ کر بقیہ عمر عبادت میں گزاردی۔(۱)

ایمن بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ دادا شیخ بدیع اللہ نے اپنی پرورش میں لیا، رضوان اللہ صاحب نے ان کی زندگی کے یہ اہم واقعات قلم بند کئے ہیں کہ مولوی حفیظ الرحمٰن ایمن شہابی اعظم گڑھ میں تعلیم سے فراغت کے بعد کان پور چلے گئے، وہاں کانیہ گنج ہائی اسکول میں فارسی کے استاد تھے۔(۲) ۱۹۶۰ء کے ریٹائرڈمنٹ کے بعد مدرسہ دارالعلوم میں منشی کامل وغیرہ کے طلباء کو آخر عمر تک پڑھاتے رہے۔

۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء میں ایک دل چسپ واقعہ یہ ہوا کہ وہ بیمار ہو گئے اور اسکول سے طویل رخصت لے لی۔ ان کی جگہ پر کیفی اعظمی پڑھانے لگے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ اس جگہ پر انھیں مستقل کر دیا جائے، لیکن پرنسپل پانڈے صاحب نے انکار کر دیا تو وہ مزدور تحریک سے وابستگی اختیار کر کے بہت دور تک نکل گئے۔(۳)

کان پور میں ان کے تعلقات نشور واحدی (۱۵/اپریل ۱۹۱۲ء۔ ۴/جنوری ۱۹۸۳ء) شہید اردو دیونرائن پانڈے اور سید محمد ثاقب کان پوری متوفی ۷/دسمبر ۱۹۸۵ء وغیرہ سے مستحکم تھے۔ ابتدا میں مولانا غلام عباس مبارک پوری سے جو اہل سمبھی کے خاص اتالیق و معلم تھے،

اصلاح لی، پھر کان پور میں مولانا احسن سمبھی سے وابستہ ہوئے، مولانا سید محمد ثاقب کان پوری متوفی ۷ر دسمبر ۱۹۸۵ء سے بھی فیضِ اصلاح پایا تھا۔ راقم کو یہ بات ثاقب کان پوری کے صاحبزادے سید ابوالحسنات حقی (پ ۶ر دسمبر ۱۹۴۰ء) نے ۵ر اپریل ۲۰۱۳ء کو صبح میں بتائی۔ احسن سمبھی کے سو شعر کے نام سے انھوں نے ایک مختصر سا کتابچہ شائع کیا تھا۔

یہ اپنے تخلص کے بعد شہابی کی نسبت اختیار کرتے تھے، کیونکہ ان کے موضع سمبھی میں ایک بزرگ قاضی شہاب الدین کا مزار ہے، انھیں کی طرف خود کو منسوب کرتے تھے، بتایا جاتا ہے کہ جون پور میں ان سے اور شاہ بدیع الدین قطب مدار (۲ر شوال ۲۴۲ھ۔ ۱۷ر جمادی الاول ۸۳۸ھ) میں جن کا مزار مکن پور کان پور میں آج بھی مرجع خلائق ہے، چشمک تھی، شہاب الدین صاحب سمبھی میں آ گئے تھے۔ قطب مدار سے فیض اٹھانے والوں میں قاضی شہاب الدین نام کے دو بزرگوں کے نام ملتے ہیں ایک مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے مرید اور سرکار جون پور کے قاضی القضاۃ جو دولت آبادی کی نسبت سے مشہور ہیں ان کا مزار جون پور میں ہے۔ دوسرے قاضی شہاب الدین قدوائی ساکن موضع چملائی المعروف بڑا گاؤں (نواح دریاباد ضلع بارہ بنکی) ہیں۔ یہ حضرت مدار شاہ کے مرید خاص وخلیفہ تھے۔ (۴)

ایمنؔ بڑے پاکباز، اسلامی شعائر وآداب کے پابند، وضعدار، بااخلاق، سراپا اخلاص ومروت، شرفاء کی وضع کے نمونہ اور رسم محبت کو نبھانے والے بزرگ تھے۔ بڑے چاک وچوبند اور خطوط کے جوابات میں تساہل کو ناپسند کرتے تھے، سمبھی کے شاعروں کے حالات واشعار کے سلسلے میں مجھ حقیر کے غریب خانے پر کئی بار تشریف ارزانی فرمائی، انھیں غزل، نعت، حمد کے علاوہ قطعات تاریخ میں بھی درک تھا، انھوں نے دیونرائن پانڈے اور بہت سی شخصیات کی وفات پر قطعات تاریخ موزوں کئے ہیں، ان کی غزلیں مختصر مگر کئی حسنِ مطلع سے آراستہ ہوا کرتی تھیں۔ کسی مقام پر عجز کلام اور قلت لفظ کا احساس نہیں ہوتا۔ سیاق وسباق کی رعایت ومناسبت سے لفظوں کا استعمال کرتے تھے۔ زبان وبیان کے پارکھ اور سلاست وروانی پر جان چھڑکتے تھے۔ یہ جو کچھ بھی کہنا چاہتے تھے اور واقعات کو جس پیرائے میں بیان کرنے کی خواہش رکھتے تھے، زبان پر دستگاہ کی وجہ سے انھیں

کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی، ان کے خیالات میں بلندی ہے، نگاہ باریک، دماغ شگفتہ اورشعور بالیدہ ہے۔ خاندانی شرافت، نسلی نجابت اور شرفاء کی اقدار زندگی کا پاس ولحاظ ایمنؔ کی شاعری کا محور ہے۔ الفاظ تراشیدہ، لکنت سے پاک، تعقید وابہام کے الزام سے مبرا۔ شائستگی سے بھرپور اور بلاغت کا نمونہ ہیں۔ انھوں نے اہل علم کی صحبتوں میں رہ کر بہت کچھ سیکھا تھا۔ ادب وآداب سے کماحقہ واقفیت تھی۔ زبان کی پوری صیقل گری کرڈالی تھی۔ انھوں نے اپنے افکاراوراپنے ہنرکوتابندہ تر بنانے کی مہم سر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ شاعری میں ان کے اپنے اضافات بھی ہیں اور افاضات بھی۔ جو کچھ بھی کہا ہے، اپنے رنگ وآہنگ اور اپنی مخصوص آواز میں۔ بات وہی کہی جو سب نے کہی ہے مگر اس میں سوچنے اور سمجھنے کا اپنا انداز اور کہنے کا اپنا ڈھنگ ہے۔

ایمنؔ کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۳۲ء سے پہلے کا ہے۔ اس دور میں ان کا تخلص احقر ہوا کرتا تھا اس زمانۂ سخن میں زیادہ تر قیام بمبئی میں تھا، طالب علمی کا وقت تھا، مولانا غلام عباس صاحب جب تشریف لاتے تھے تو ہر ہفتہ نشست ہوجایا کرتی تھی، مصرع ہائے طرح دیئے جاتے تھے اور غزلیں کہی جاتی تھیں۔ مولانا غلام عباس کی شعرنوازی اور شاباشی کی وجہ سے وطن عزیز میں ۱۹۲۴ء میں آغازِ سخن کیا، اس زمانہ میں غزلیں کہا کرتے تھے، اور اپنے موضع کے چند لوگوں میں بیٹھ کر شعر سناتے تھے، جب کان پور گئے تو احقرؔ تخلص ترک کر کے ایمنؔ ہو گئے، یہ تخلص احسن کے قافیہ پر رکھا گیا، مولانا احسن بمبئی جوان کے ہم وطن تھے اور کان پور میں صحافت کی زلفیں سنوارنے کے ساتھ شاعروں کی تربیت کا کام بھی جاری رکھے ہوئے تھے، ان کے استادِ سخن ہوئے، کان پور میں نشور واحدی سے تعلقِ خاطر بڑھا تو انھیں بھی کلام دکھا کر مشورہ کرنے لگے۔

نمونۂ کلام

عنایت کی مجھ پر جو تیری نظر ہے — دماغ آج ساقی مرا عرش پر ہے
وہ ہے باخبر جو یہاں بے خبر ہے — محبت کی دنیا بھی کیا طرفہ تر ہے
یہ کیا بے خودی ہے کہ میں پوچھتا ہوں — سرِ منزل آکر کہ منزل کدھر ہے
کہا ایک ہچکی نے دم بھر میں سب کچھ — مری داستاں کس قدر مختصر ہے

نہیں منزلِ عشق دشوار ایمنؔ
جو شوقِ ملاقات خود راہبر ہے

کچھ احتیاط وضبط کا ساماں نہ کرسکے
ہم یک بہ یک نظارۂ جاناں نہ کرسکے

ان سے شکایت غم ہجراں نہ کرسکے
اشکوں کو اپنے زینت مژگاں نہ کرسکے

پیشِ نظر تھا کون نہ جانے بہار میں
ہم بے خودی میں چاک گریباں نہ کرسکے

بے چین ہوکے رہ ہی پڑے اس کی یاد میں
ہم انتظارِ ابر بہاراں نہ کرسکے

ایمنؔ اسی کا نام ہے مجبوریِ تمام
صورت سے بھی جو غم کو نمایاں نہ کرسکے

اب نہیں احساس کچھ تکلیف کیا آرام کیا؟
بے خودیِ شوق کردے گی ہمیں بدنام کیا؟

زندگی یہ چند روزہ ہوہی جائے گی بسر
اک مسافر کے لئے تکلیف کیا آرام کیا

قطرہائے اشک آنکھوں میں ٹھہرتے ہی نہیں
وائے مجبوری محبت ہوگی طشت از بام کیا؟

باعث رونق زمانے کے لئے ہیں گردشیں
ہو اگر آرام ہی آرام تو آرام کیا؟

کار فرما ہر طرف ایمنؔ ہے تقسیمِ ازل
گردشِ تقدیر کیسی، گردشِ ایام کیا؟

زندگی کچھ رفتہ رفتہ معتبر ہوتی گئی
ان کی ادنیٰ سی توجہ کارگر ہوتی گئی

ہم سفر سے چھوٹ کر بھی سفر کرتے رہے
کوئی شی منزل بہ منزل راہبر ہوتی گئی

بقیدِ غم ملی ہے زندگانی
کرم ان کا ہے ان کی مہربانی

کہانی اپنی اور اپنی زبانی
ہوئی آخر کو وجہِ بدگمانی

معطل کردیئے کار دوعالم
سر عرش اور یوں کی میزبانی

ابتدائی دور کا کلام

ہے درود آپ پر ہر آن رسولِ عربی
جان ودل آپ پہ قربان رسولِ عربی

عجب کشمکش ہے قیامت میں ایمنؔ
مرا ہاتھ ہے اور دامن کسی کا

درد وغم اندوہ وحرماں نالہ وآزار ورنج
عمر بھر یہ ساتھ اپنے مونس وہمدم رہے

آکے کرتا ہی نہیں کوئی تمنائے ارم
کوچۂ یار کی کچھ ایسی ہوا ہوتی ہے

مضطرب شام وسحر رہتے ہیں احقرؔ بے حد
الفتِ زلف ورخِ یار بھی کیا ہوتی ہے

ہوگیا ملکِ سخن میں نام اے احقرؔ ترا
حضرتِ عباس نے کیا سے مجھے کیا کردیا

چند قطعات تاریخ

مولانا شوکت علی

بڑی شان وشوکت کا شوکت علی تھا بظاہر مجاہد بہ باطن ولی تھا
ہوا نذر افسوس بادِ خزاں کی شریعت کے گلشن کی وہ اک کلی تھا
۱۹۳۸ء

علامہ اقبال

ڈاکٹر اقبال وہ روحِ سخن اس جہاں سے ناگہاں جاتا رہا
ذرہ ذرہ محوِ ماتم ہے کہ حیف شاعر جادو بیاں جاتا رہا
۱۹۳۸ء

حواشی:

(۱) ہمارے گاؤں ہمارے لوگ۔ رضوان اللہ طبع اول ۲۰۱۱ء ص ۳۵
(۲) خود ایمنؔ نے کان پور چھوڑنے کا زمانہ ۱۹۵۲ء اور مئو کی تقرری جون ۱۹۵۳ء کی بتائی ہے۔
(۳) ہمارے گانو ہمارے لوگ۔ رضوان اللہ۔ طبع اول ۲۰۱۱ء ص ۳۵
(۴) گلستان مدار۔ سید عرفان علی شاہ حیدر آباد مئی ۱۹۹۵ء ص ۱۵۴)

حکیم محمد ایوب بلریا گنج

۱۹۲۳ء (۱) ـــــ ۳؍رمضان ۱۴۲۵ھ ؍اکتوبر ۲۰۰۴ء

بلریا گنج کے رہنے والے ملک گیر شہرت کے مالک طبیب تھے، جن کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی تھی، بہت سستا اور اچھا علاج کرتے تھے، دوائیں نہایت سستی ہوا کرتی تھیں ایسی کہ غریب سے غریب مریض بھی برسوں علاج میں زیر باری محسوس نہ کرے، کنٹھ مالا کے علاج میں ان کا نام خوشبو کی طرح تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ان کے کچھ مخصوص قسم کے معالجاتی مشاہدات تھے۔ وہ کافی کبیدہ خاطر تھے کہ یونانی اور دیسی ادویہ سازی میں عرصہ سے تحقیقی وتجرباتی کام کا سلسلہ بند ہے اور اس سمت میں کہیں سے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی ہے۔

حکیم صاحب اردو کے بڑے حامی اور سرپرست تھے، وہ اپنا نسخہ اردو میں لکھا کرتے تھے، وہ عربی وفارسی اور علوم دینیہ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں درجۂ چہارم تک ہی پڑھ سکے تھے کہ تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں داخل کردیئے گئے، ایک سال میں نصاب کی تکمیل کرکے طب کی سند حاصل کرلی اس کے بعد لکھنؤ کے مشہور طبیب حکیم عبدالحکیم صاحب کے یہاں زیرِ تعلیم رہ کر نسخہ نویسی سیکھی اور منبع الطب کالج لکھنؤ سے بھی طب کا امتحان پاس کیا۔ پہلے یہ صرف یونانی طریقۂ علاج کے قائل تھے بعد کے تجربات نے انھیں ایلوپیتھی دواؤں کی افادیت سمجھادی اور یہ ایلو پیتھک علاج کی طرف بھی توجہ دینے لگے۔ وہ خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار اور مریض وطالب علم کے مونس وغم خوار تھے، مریضوں کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے شفیق باپ اپنے بچوں کے مسائل اور ان کے دکھ درد کی کہانی سنتا ہے، اور اس کے ازالہ کے لیے فکرمند ہوجاتا ہے، وہ مریضوں کی تنگ دستی کا بڑا خیال کرتے تھے، کتنوں کو دوائیں مفت تو دیتے ہی تھے کرائے کا بھی انتظام کردیا کرتے تھے، ضرورت مندوں کی ضرورت کے بارے میں معلومات حاصل کرکے ان کی خفیہ مدد کرنے میں انھیں بڑا سکون ملتا تھا، آج اس صارفیت اور مادہ پرستی کے دور میں جب کہ پیشۂ طب دولت کمانے کا ایک بڑا ذریعہ بن چکا ہے، اور مسیحائی کا دعویٰ کرنے والے حکیم وڈاکٹر اپنی گراں دواؤں، لمبی فیس اور طرح طرح کی مشینی جانچ سے مریضوں کی معاشی موت کا انتظام کرتے ہیں، حکیم ایوب صاحب کا وجود تپتے صحرا میں گھنے درخت کا سایہ بنا ہوا تھا۔ حکیم صاحب نے بچپن میں یتیمی کا درد سہا تھا اور اچھے دنوں میں بھی بے پدری کے کرب کا احساس ان کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا اسی لئے وہ دوسروں کے دکھ درد کی آنچ کو اپنے سینے میں محسوس کرتے تھے، ان کی نرم خوئی، خندہ روئی اور دلجوئی سے ہی مریضوں کی آدھی بیماریاں دور ہوجاتی تھیں۔

وہ جماعت اسلامی کے زبردست رکن تھے، اور ایمرجنسی کے دور میں قید وبند کی صعوبتیں جھیل چکے تھے، بڑے پختہ عزم وحوصلہ کے مردِ مومن تھے، مدرسۃ الافلاح بلریا گنج کے اربابِ حل وعقد میں اہم درجہ پر تھے، ان کے دل میں قوم وملت کا بڑا درد تھا، وہ تعلیمی، سیاسی، سماجی اور دینی وقومی مسائل سے دلچسپی لیتے تھے اور اپنے گردوپیش کے واقعات وحالات پر

گہری نظر رکھتے تھے، انھیں دین کے اخلاقی ومعاشرتی پہلو سے بڑی گہری وابستگی تھی، وہ انسانی زندگی میں دین کے اثر ونفوذ کے قائل تھے، وہ چاہتے تھے کہ انسان اپنے انسانی منصب کو سمجھے، اور پیغمبرانہ راہِ ہدایت پر چلے، استحصال وارتدادفکری سے بچے، آدمیت کی تلاش میں اسلامی طرزِ زندگی کی تفہیم وتنفیذ کرے۔ان کی معالجاتی زندگی میں طبابت کا لفظ کسی جامد معنیٰ اور محدود مفہوم میں نہیں تھا، ان کے نزدیک اس کا بڑا وسیع اور پہلودار مفہوم تھا۔ وہ اس فن کو بھی عبادت کے درجے میں رکھتے تھے۔ان کی کتاب معالجاتی مشاہدات کا یہ اقتباس ان کی طبیعت کی صالحیت اوران کے مزاج کی نشان دہی کررہا ہے ملاحظہ ہو"آج کی معالجاتی دنیا کو ایک نئے چیلنج کا سامنا ہے۔بغیر فیس لئے مریض کو نہ دیکھنے کا بڑھتا ہوا رجحان، بڑی فیس، بڑے ڈاکٹر کا علامتی نشان، ایکسرے، سونوگرافی، سی ٹی اسکین، ایم آر آئی جانچ گھروں، دوافروشوں کی جانب سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کمیشن کی پیش کش، اور معالجین حضرات کی طرف سے اس کی ہمت افزائی وپذیرائی سے صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ مریض کی قوت علاج مفلوج ہوکر رہ جاتی ہے بلکہ معالج کی قوت تشخیص بھی متاثر ہوتی جارہی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے"۔

حکیم صاحب کو شعروشاعری سے بھی کچھ نہ کچھ دل چسپی تھی، مولانا ابواللیث ندوی کے انتقال پُرملال پر ان کی آنکھوں نے جوخون کے آنسو روئے، اس نے مرثیہ کی شکل اختیار کرلی، ذیل میں اس کو پیش کیا جارہا ہے تاکہ حکیم صاحب کی زندگی کا یہ پہلو بھی سامنے آجائے۔

حکیم صاحب کی ایک کتاب"معالجاتی مشاہدات"ان کی زندگی میں شائع ہوچکی ہے، جس میں ان کے طبی تجربات ومشاہدات بیان کئے گئے ہیں، اس کتاب سے ان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔"یہ بے چارے ممولے" اور"ایک فکری فساد" بھی ان کے مختصر رسالے چھپ چکے ہیں۔ بنگالی ایمنسٹی کے ایک سروے کے مطابق گزشتہ پانچ دہائیوں میں سب سے زیادہ مریض دیکھنے کا ریکارڈ حکیم صاحب کے نام ہی تھا، انھوں نے اپنی آمدنی کا بڑا حصہ فلاحی ورفاہی کاموں کے لیے مختص کررکھا تھا۔

مرحوم کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، جن میں سے ایک بیٹے جامعہ اسلامیہ دہلی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، بقیہ فن طب سے وابستہ ہیں۔

بیادگار مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی

وجہِ سکونِ قلب پریشاں چلا گیا — تڑپے ہے درد، درد کا درماں چلا گیا
ہم عصر ساتھیوں میں وہ ممتاز و بے مثال — بچے اداس نازشِ طفلاں چلا گیا
اک شاخ سایہ دار سی، اک سخت سی چٹان — اک صاحبِ عزیمت وایماں چلا گیا
وہ اپنی سلطنت کا اک شاہ گدا نما — فوج وسپاہ جس پہ تھیں نازاں چلا گیا
نانِ جویں کو ناز تھا جس، نہیں رہا — ہے بوریا اداس کہ سلطاں چلا گیا(۲)

حواشی:

(۱) ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے ۱۹۲۱ء لکھی ہے۔ دیکھئے اعظم گڑھ تاریخ کے آئینے میں ص ۲۹۰

(۲) قائد تحریک اسلامی ہند ابواللیث اصلاحی ندوی ماہنامہ حیات نو بلریا گنج۔ فروری یا جون ۱۹۹۱ء ص ۵۴

ایوبؔ - محمد ایوب مبارک پوری

۱۸ رمحرم ۱۳۴۳ھ/ ۲۰ راگست ۱۹۲۵ء — ۲۹ ررمضان ۱۴۲۶ھ/ ۳ رنومبر ۲۰۰۵ء

ان کی ولادت کے سنہ میں اختلاف ہے اور متعدد جگہ متعدد سال پیدائش درج ہیں۔ مبارک پور کے شاعروں میں ایک قابل احترام اور استاد شاعر کی حیثیت سے نمایاں تھے۔ کہنہ مشقی اور زود گوئی میں ان کے برابر کم ہی ملیں گے، مگر بہت کم کہتے تھے۔ اس معاملے میں کافی تساہل پسند تھے، لیکن جب کچھ کہتے تھے تو فن سخن اور ضابطۂ شاعری کا حق ادا کر دیتے تھے۔ کتاب ومطالعہ اور اساتذہ خصوصاً انیس دبیر کے کلام کی گہرائیوں میں اترنے کی وجہ سے زبان وبیان، اصلاح کلام، فنی رموز ونکات سے پوری طرح آگاہ تھے اور اس معاملے میں ان کی نگاہ علم اتنی وسیع تھی کہ اپنے قریب رہنے والوں کو ایسی ایسی باریکیاں سمجھاتے تھے کہ سیکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتے تھے۔ اساتذہ کے لسانی وفنی معرکوں، موازنوں، اعتراضات وایرادات اور اصلاح زبان کی تحریکات، دبستانِ سخن کے امتیازات وخصوصیات پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ انھوں نے فن کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ انھوں نے خطیبوں کی تقریروں اور اہل علم کی صحبت نشینی سے علم کی گہرائی میں کچھ حصہ پالیا تھا، اس لئے یہ جہاں بھی رہتے، اپنے علم وخبر کی وجہ

سے ممتاز رہتے تھے، شاعروں کی صف میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔فنی رموز اورقواعد کی پیچیدگی آپ سے مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔

ایوب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ باب العلم میں ہوئی تھی۔انگریزی تعلیم کے حصول میں بھی محنت کی تھی۔فارسی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔مولانا عبدالرحمٰن (۱۸۶۰ء۔۱۹۳۱ء) جو باب العلم کے اولین مدرس ومعلم اور امام جمعہ وجماعت تھے، اور حکیم مولوی عبدالمجید فاخرؔ (۱۹۰۸ء۔۱۹۷۷ء) جوفخر الاطباء کہے اور سمجھے جاتے تھے، ان کے اسلاف خاندان سے تھے۔ایوب نے حکیم صاحب سے بھی زندگی کے سردوگرم اورنشیب وفراز سے معاملہ کرنے کا ہنر سیکھا تھا۔ وہ فخر الاطباء کا احترام کرتے تھے،مولوی عبدالحمید شاہ ناظر (۱۹۰۳ء۔۱۵؍جولائی ۱۹۹۰ء) سے فن شاعری میں اکتساب فیض کیا تھا۔

ایوب صاحب اہل علم ودانش کے قدرداں اور اچھے شاعروں کے سخن شناس تھے۔ انھوں نے بہت سے شاعروں کی ذہنی تربیت کی تھی، قدیم شاعروں کے معرکوں،موازنوں، اعتراضات وایرادات،لکھنؤ اور دہلی کے لسانی اختلافات، تذکیروتانیث کی بحثوں نے انھیں فن شناس اوراچھازبان داں بنادیا تھا،انھوں نے علمائے ذاکرین کی نجی گفتگواوران کی مجلسوں سے بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔کتابوں کے مطالعہ کا ذوق تھا۔اسی طرح وہ مجلسی انسان بھی تھے۔کمیونزم سے متاثر تھے۔اورعمر بھر مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے رکن رہے۔

ایوب صاحب نے مدرسہ باب العلم میں صیغۂ تدریس سے وابستہ رہ کر قوم کی ذہنی ساخت اورشخصیت کی تشکیل میں بھی اپنا حصہ ادا کیا۔ان کے پڑھانے کا انداز بہت دل نشیں اور سمجھانے کا طریقہ کافی دل چسپ ہوتا تھا۔مشکل سبق کواپنی تفہیم سے آسان بنادیتے تھے۔انھوں نے اپنی قوم کی ذہنی بیداری اورشعور کی پختگی کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کی خاطر ہمیشہ آمادگی ظاہر کی اورکبھی اس سے پیچھے نہیں ہٹے۔

ایوب شاعری کا فطری ذوق لے کر پیدا ہوئے تھے، ان کی شاعری کی ابتداء ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ان کی پہلی غزل

شبِ فرقت سنائے کس کو اپنی داستاں کوئی ۔ کوئی ہمراز آتا ہے نظر نہ مہرباں کوئی

دوسروں کے مقابلے میں ان کا مذاقِ سخن کافی پاکیزہ اور صاف ستھرا تھا۔ انھوں نے اس فن کو سیکھنے کے لیے بھی بڑا ریاض کیا تھا۔ اساتذہ کو پڑھا تھا، فن کی روح کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی تھی، انھوں نے رعایت لفظی، مناسبت لفظی اور تلازمات لفظی کا بڑا خیال رکھا تھا۔ وہ اس معاملے میں بڑے حساس واقع ہوئے تھے۔ وہ ایک ہی لفظ سے دو معنیٰ پیدا کرنے کا شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے قدماء کے نشان راہ کا ہمیشہ پاس ولحاظ رکھا۔ ان کی عائد کی ہوئی فنی شرائط اور لسانی قیود کی پابندی کو ایک عقیدے کی طرح قبول کیا تھا، اور کبھی کھنچی ہوئی لکیر سے اپنے قدم کو باہر نہیں نکالا، ان کی نظر میں مواد سے زیادہ طرز اظہار اور خیال سے زیادہ اندازِ بیان کی اہمیت تھی۔ اسی لیے ان کا کلام زبان وبیان کے کانٹے پر تلا ہوا اور فن کی کسوٹی پر کسا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ فنی پابندیوں کی پل صراط جیسی وادیوں سے دامن بچا بچا کر اور قدم پھونک پھونک کر اس شعور رہروی کے ساتھ گزرے ہیں کہ ان کی شاعری سحر سامری اور سلیقۂ آذری کا شاہ کار بن گئی ہے۔ ایوب نے تمام مروجہ اصناف کو سرسبز کیا ہے۔ ان کے دائرۂ فکر سے کوئی صنف آزاد نہیں رہی۔ انھوں نے غزل، نعت، نوحہ، سلام، منقبت، قصیدہ، سہرا، قطعہ، رباعی، مسدس، مخمس، چندہ، استقبالیہ، الوداعیہ، آمد رمضان، اختتام رمضان، اور زائرین حرم کے لئے جو بھی کہا ہے، اپنے رنگ وانداز میں کہا ہے، اور اچھا کہا ہے۔

ان کی اس قسم کی موضوعاتی نظموں میں بھی ایک ادبی حسن، شعری جاذبیت اور رنگ تغزل شامل ہے۔ انھوں نے ہنگامی اور وقتی شاعری میں اپنا خون جگر کھپا کر معجزۂ فن کی نمود کی ہے، ان کے یہاں تلمیحات کا استعمال ادبی پس منظر کو روشن کر دیتا ہے، چندے کی نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

پڑا ہے مثل فطرس یہ مدرسہ ۔ حسینی ہے تو اس کو بال و پر دے

ان کی فکر میں توانائی اور اسلوب وادا میں رعنائی ملتی ہے، وہ مادۂ تاریخ کی تخریج میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ اور پاس پڑوس کے بچے بچیوں کے تاریخی نام رکھنے میں مشہور تھے۔

ان کے نوحہ وسلام کا ایک مجموعہ فرات اور تشنگی ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکا ہے

فرات اور تشنگی کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۳ء اور "دامن دامن آنسو" و "پیغمبر عطش" یہ دونوں مجموعے اسی سال چھپے اور ۲؍نومبر ۲۰۱۳ء کو ان تینوں کتابوں کی رسم اجراء بھی ادا ہوئی۔

نمونۂ کلام

پھر متاع ہوش لے کر آئے گا کوئی کلیم
جلوہ سامانی اگر ہو دشت ایمن کی طرح

سرنگوں پرچم نہ ہوجائے کبھی
آدمیت خم نہ ہوجائے کہیں

بجھ رہا ہے عزم وہمت کا چراغ
انجمن برہم نہ ہوجائے کہیں

دلِ مضطرب کو قرار آ نہ جائے
خزاں آتے آتے بہار آ نہ جائے

سناتا تو ہوں داستانِ محبت
مرے حال پر ان کو پیار آ نہ جائے

میں چلتا ہوں کوئے محبت میں لیکن
زمانہ کہیں سازگار آ نہ جائے

راتوں نے رات کاٹی کواکب کے درمیاں
تاریکیاں نباہتی ہیں یوں ضیا کے ساتھ

ساقی نے بند کردیا ایوب میکدہ
پینے کا حکمِ عام جو آیا گھٹا کے ساتھ

روشنی کے چاہنے والوں پہ ہیں پابندیاں
آنکھ والے جا نہیں سکتے چراغاں کی طرف

اس قدر ہنگامۂ دوراں سے جی گھبرا گیا
زندگی بڑھنے لگی شہر خموشاں کی طرف

یہ جنوں پرور ہواؤں کا کرشمہ دیکھئے
خود ہی دیوانے چلے آئے ہیں زنداں کی طرف

پرالم تھا عید کا منظر جگر کے شہر میں
تھی صف ماتم بچھی گھر گھر جگر کے شہر میں

ڈوب جاتی کیوں نہ خوں میں کشتیِ جمہوریت
ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا لنگر جگر کے شہر میں

جس کی ڈیوڑھی سے ملا کرتی تھی محتاجوں کو بھیک
ہوگئے بے سایہ وبستر جگر کے شہر میں

موت کی کالی بلا پھرتی تھی منھ کھولے ہوئے
کانپتی تھی زندگی تھر تھر جگر کے شہر میں

وہ جانتے نہیں کانٹوں کی پیش دستی کو
چمن سے دور جو دامن بچائے بیٹھے ہیں

بتاؤ کون اب اس بے خودی میں پہچانے
ہم اپنے آپ کو خود ہی بھلائے بیٹھے ہیں

سرکشی ظلم کی جب حد سے گزر جاتی ہے
ہاتھ مظلوموں کے تلوار تک آجاتے ہیں

محفل حسن میں مقصد تھا نمایاں ہونا
آگیا کام مرا بے سرو ساماں ہونا

سعیِ ناکام نے ایوبؔ یہ عقدہ کھولا
کتنا مشکل ہے کسی کام کا آساں ہونا

تری یاد نے رنگ آمیزیاں کیں
تصور کے اوراق اب تک تھے سادے

وہ دیوانگی ارتقائے خرد ہے جو بھٹکے مسافر کو رستہ بتادے
زمیں کی تھیں یہ باتیں آسماں سے پوچھ کیا بیٹھے فرشتے کیا بتائیں گے کہ انسانوں پہ کیا گزری
سحر کی بات ہے اس کو ستارے کیا بتائیں گے بجھی جب شمع محفل میں تو پروانوں پہ کیا گزری
ہر رہ گزر میں پانو پھسلتا دکھائی دے مجھ کو یہ شہر آج پگھلتا دکھائی دے
دیکھے جو عندلیب پتنگوں کی آنکھ سے ہر پھول میں چراغ سا جلتا دکھائی دے
اس طرح کائنات میں جلوے بکھیر دو پیراہنوں کا رنگ بدلتا دکھائی دے
چشمِ فسوں طراز ہو یا سحر سامری جادو وہی دلوں پہ جو چلتا دکھائی دے
پرکھے ہوئے کھوٹے کو کھرا کہنے لگے ہیں پھر لوگ اسی بت کو خدا کہنے لگے ہیں
تف کتنے ستم پیشہ ہیں یہ وقت کے قاضی مجبور خموشی کو رضا کہنے لگے ہیں
اب بھی دُرِ یکتا کے خریدار بہت ہیں یوسف اگر آجائیں تو بازار بہت ہیں
حق مانگتے ہیں بھیک نہیں مانگتے ساقی! کچھ بھی ہو مگر رند یہ خود دار بہت ہیں
دانستہ کبھی دل شکنی کرنہیں سکتے کہتے ہیں کہ ایوب روادار بہت ہیں
سرکارِ دوجہاں کی شجاعت نہ پوچھئے آغوش میں جو پل گیا جرار ہوگیا
صد شکر کہ ہونٹوں پہ مرے مدحِ نبی ہے چھوٹی ہے زباں میری مگر بات بڑی ہے
اے کاش پہنچ جاؤں میں دربار میں ان کے پلکوں کو مری حسرتِ جاروب کشی ہے
طوفانوں نے خود تیرے سفینے کو ابھارا آندھی میں تری شمع جہاں تاب جلی ہے
بڑی دیر سے آپ کے آستاں پر گدا دے رہے ہیں صدا بھیک دے دو
جو دیتا ہے اس کے لیے مانگتے ہیں تمھیں اور دے گا خدا بھیک دے دو

قطعات

منزل بھی، راہ بر بھی ہیں، جادہ بھی آپ ہیں انسانیت کے دل کی تمنا بھی آپ ہیں
فطرس کے واقعہ سے یہ ہم پر عیاں ہوا مشکل کشا بھی اور مسیحا بھی آپ ہیں

مرزا احسان بیگ کی یاد میں قطعہ

ہم کو ہے قصۂ اربابِ وفا یاد ابھی بھول جائیں کسی محسن کو وہ مینوش نہیں ہے
بزمِ احسانؔ میں روشن کرو یادوں کے چراغ کردو ثابت کہ ہم احسان فراموش نہیں

کتابیات

۱ اتر پردیش کے لوک گیت۔اظہر علی فاروقی۔طبع اول ۱۹۸۱ء

۲ احسان اللہ عباسی۔حیات اور کارنامے۔فیروز احمد ۱۹۷۶ء

۳ احسن سمبھی کے سو شعر۔حفیظ الرحمٰن ایمن شہابی ۱۹۴۳

۴ احوال و افکار۔مولانا محمد عاصم اعظمی دسمبر ۲۰۰۹ء

۵ اذان سحر۔انور اعظمی ۱۹۶۷ء

۶ اردو کا ابتدائی زمانہ۔شمس الرحمٰن فاروقی۔مکتبہ جامعہ نئی دہلی طبع دوم ۲۰۱۱ء

۷ اردو میں قومی شاعری کے سو سال۔علی جواد زیدی طبع دوم ۱۹۸۲ء

۸ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام۔مولوی عبدالحق ۱۹۷۹ء

۹ اشاریہ معارف۔جمشید احمد ندوی ۲۰۱۲ء

۱۰ اشاریہ نیا دور۔اول، دوم۔محمد اطہر مسعود خاں ۲۰۰۹ء

۱۱ اعجاز سخن۔اعجاز اعظمی مرتبہ طارق اعجاز اعظمی ۲۰۰۸ء

۱۲ اعظم گڑھ تاریخ کے آئینے میں۔ڈاکٹر مرزا انصار بیگ طبع اول ۲۰۱۳ء

۱۳ افکار سہیل۔شوکت سلطان، حماد عباسی ۱۹۵۷ء

۱۴ اقبال سہیل۔حیات اور شاعری۔ڈاکٹر منور انجم ۱۹۹۵ء

۱۵ الاسلام۔مولوی احسان اللہ عباسی

۱۶ بزم شبلی کی آخری شمع۔امجد غزنوی۔ڈاکٹر فخر عالم اعظمی

۱۷ بزمِ شبلی (شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ میگزین) ڈاکٹر شباب الدین ۲۰۱۰ء

۱۸ بیاض قلمی۔اسیر محمد آبادی

۱۹ بیاض قلمی۔مولوی ضیاء اللہ احقرؔ مہراج گنجی

۲۰ بیاض قلمی۔عبدالحفیظ احسنؔ رسول پوری

۲۱ بیاض قلمی امتیاز احمد امجدؔ فاروقی مبارک پوری
۲۲ بیاض قلمی۔ انیس الرحمٰن انیسؔ ابراہیم پوری
۲۳ بیاض قلمی۔ مولوی ابوالحسن مئوی
۲۴ پروانۂ چراغِ مزارخود یم ما۔ حکیم محمد اسحٰق مرتبہ ڈاکٹر محمد شعیب اعظمی نومبر ۱۹۷۵ء
۲۵ پنجاب میں اردو۔ محمود شیرانی فوٹو آفسیٹ ایڈیشن ۱۹۸۲ء اردو اکیڈمی لکھنؤ
۲۶ پیامِ زندگی۔ مرزا احسان احمد بیگ ۱۹۸۶ء
۲۷ پیامِ کیف۔ مرزا احسان احمد بیگ ۱۹۴۰ء
۲۸ پیغبر عطش۔ ایوب مبارک پوری ۲۰۱۳ء
۲۹ تاریخ اعظم گڑھ۔ افضال اللہ قادری ۲۰۱۱ء
۳۰ تاریخ ادبیات۔ گورکھ پور سلام سندیلوی
۳۱ تاریخ اقلیم وادب۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ حصہ اول ۱۹۷۹ء، حصہ دوم ۱۹۸۰ء
۳۲ تاریخ جیراج پور۔ ضیاء الرحمٰن اعظمی ۲۰۰۴ء
۳۳ تاریخ زبان وادب اردو حصہ اول۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ ۲۰۱۲ء
۳۴ تذکرۂ سخنورانِ مئو۔ اثر انصاری ۱۹۸۱ء
۳۵ تذکرۂ علمائے اعظم گڑھ۔ حبیب الرحمٰن اعظمی طبع اول ۱۹۷۶ء۔ طبع دوم ۲۰۱۲ء
۳۶ تذکرۂ علمائے اہل سنت۔ محمد احمد قادری ۱۳۹۱ء
۳۷ تذکرۂ علمائے مبارک پور۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری باراول ۱۹۷۴ء
۳۸ تذکرۂ علمائے مبارک پور۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری طبع دوم ۲۰۱۰ء
۳۹ تذکرہ مشاہیر کوپا گنج۔ مولانا محمد عثمان معروفی سنہ ندارد
۴۰ تراجم علمائے اہل حدیث ہند۔ ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی، ناشر الکتاب انٹرنیشنل دہلی سنہ ندارد
۴۱ تقویم ہجری وعیسوی۔ محمد خالد ناشر انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۴۲ تلاش وتعارف۔ حنیف نقوی پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء
۴۳ تہذیب انجان شہید۔ (مولانا آزاد انٹر کالج وقدوائی نسواں ہائی اسکول کا مشترکہ میگزین)

۴۴ جدید ادب منظر اور پس منظر۔احتشام حسین مرتبہ جعفر عسکری ۱۹۷۸ء، ۱۹۸۲ء
۴۵ جنتی زیور۔مولانا عبدالمصطفیٰ اعظمی
۴۶ جواہر ملیہ۔اسلم جیراج پوری طبع دوم ۱۹۳۰ء
۴۷ حج وزیارت۔مفتی جلال الدین امجدی
۴۸ حیات ابوالمکارم۔مولانا ابوالقاسم عبدالعظیم مئوی ۲۰۱۱ء
۴۹ حیات افضل قلمی۔مرتبہ مولوی منظور دوعالم
۵۰ حیات شبلی۔سید سلیمان ندوی ۱۹۹۳ء
۵۱ خم خانۂ جاوید اول۔لالہ سریرام دہلوی مطبوعہ لاہور ۱۹۰۸ء
۵۲ خم خانۂ جاوید پنجم۔لالہ سریرام و پنڈت برج موہن وتا تریہ کیفی۔دہلی ۱۹۴۰ء
۵۳ داخلہ رجسٹر۔مدرسہ باب العلم مبارک پور
۵۴ داغ فراق۔اسلم سہیل جون پوری۔۱۰ رنومبر ۱۹۶۶ء
۵۵ دامن دامن آنسو۔ایوب مبارک پوری ۲۰۱۳ء
۵۶ دبستان گورکھ پور۔مسلم انصاری ۱۹۹۷ء
۵۷ دستاویز۔شائع کردہ یو پی اردو اکیڈمی لکھنؤ
۵۸ دکن میں اردو۔نصیر الدین ہاشمی
۵۹ دیار پورب میں علم اور علماء۔مولانا قاضی اطہر مبارک پوری طبع اول ۱۹۷۹ء
۶۰ دیار پورب میں علم اور علماء۔مولانا قاضی اطہر مبارک پوری طبع اول ۲۰۰۹ء
۶۱ ڈائری (قلمی) شیخ عبدالمجید دلال ولد حاجی عبدالرحمٰن مبارک پور
۶۲ ذکر فراہی۔شرف الدین اصلاحی ۲۰۰۱ء
۶۳ ردجولاہے نامہ۔حکیم محمد احمد آزکوئریا پاری ۱۸۹۹ء
۶۴ رسالہ جلوۂ طور۔علی مختار مبارک پوری
۶۵ رسالہ شعلۂ طور۔جون رضا مبارک پوری
۶۶ روداد مختصر مدرسہ باب العلم مبارک پور۔علی مختار مبارک پوری ۱۹۸۰ء

۶۷ روشنی کے دریچے۔سید احتشام حسین مرتبہ جعفر عسکری، الہ آباد ۱۹۷۳ء

۶۸ زندہ رود۔جاوید اقبال۔لاہور بار اول ۲۰۰۴ء

۶۹ سازِ خاموش۔اعظم حسین اعظمؔ مرتبہ عباس شکیلؔ۔فروری ۱۹۸۱ء

۷۰ سرمایۂ امین۔منشی امین اللہ امینؔ اعظمی۔مرتبہ مسلم اعظمی ۲۰۱۲ء

۷۱ سووینیر جشنِ جوہر صدیقی۔مرتبہ ابوعبیدہ خاں عبدہؔ ۱۹۸۲ء

۷۲ سیرت المصطفیٰ۔مولانا عبدالمصطفیٰ اعظمی ۱۹۸۵ء

۷۳ شبلی کالج کا مایۂ ناز فرزند۔کبیر احمد جائسی۔مرتبہ ڈاکٹر شباب الدین ۲۰۱۰ء

۷۴ شجرۂ طیبہ۔مولوی محمد احمد اعظم گڑھی ۱۳۴۰ء

۷۵ شجرۂ طیبہ۔مولانا کرار حسین اظہری مبارک پوری۔اگست ۲۰۰۷ء

۷۶ شہرِ سخن۔ماہرؔ عبدالحئی و سردار شفیق ۲۰۰۷ء

۷۷ صدائے العطش۔زار غازیپوری، ارمان شام نگری ۱۹۷۶ء

۷۸ صدرنگ۔فیاض گوالیاری۔قمر الزماں مبارک پوری ۱۹۷۰ء

۷۹ علمائے اہل سنت فتح پور اور ماسٹر حاجی اعجاز احمد (مرحوم)۔مفتی ممتاز احمد خاں نوری سنہ ندارد

۸۰ فرات اور تشنگی۔ایوب مبارک پوری طبع اول ۱۹۷۷ء، طبع دوم ۲۰۱۳ء

۸۱ فرہنگ آصفیہ۔سید احمد دہلوی

۸۲ فضائل اعمال۔مولانا محمد زکریا کاندھلوی (عکسی)

۸۳ فغان احمد۔مولوی محمد احمد اعظم گڑھی 1915ء مہتاب پریس اعظم گڑھ

۸۴ قائد تحریک اسلامی ہند۔ابواللیث اصلاحی ندوی ماہنامہ حیات نو بلریا گنج۔فروری تا جون ۱۹۹۱ء

۸۵ قصص الجمیل فی سوانح الخلیل۔خلیل الرحمٰن فاروقی طبع اول ۱۹۷۳ء مع اضافات جدیدہ۔

۸۶ نجم الرحمٰن فاروقی۔طبع دوم الہ آباد ۲۰۰۶ء

۸۷ قصیدہ نگاران اتر پردیش۔سید علی جواد زیدی طبع اول ۱۹۷۸ء

۸۸ قصیدہ نگاران اتر پردیش۔سید علی جواد زیدی طبع دوم ۱۹۸۳ء

۸۹ کلام انجم ۔ نجم الہدیٰ نجم صدیقی ۔ گلشن اقبال کراچی پاکستان ۲۰۰۷ء

۹۰ کُن ۔ افتخار اعظمی (سید افتخار حسین) مارچ ۱۹۷۷ء

۹۱ گاؤں محمد پور عمر رفتہ سے ۔ خان محمد صادق خان ۲۰۱۱ء

۹۲ گل سخن ۔ اعجاز اعظمی طبع اول ۱۹۹۹ء

۹۳ گلہائے رنگارنگ ۔ ملک اکرام اللہ ۔ سرفراز آفسیٹ پریس مئو ۔ دسمبر ۱۹۹۶ء

۹۴ گلہائے صد رنگ ۔ محمد مبین انجم خیرآبادی ۱۹۸۹ء

۹۵ لہولہو ۔ مرتبہ ایم اے دل حسینی سنہ ندارد

۹۶ متاع درد ۔ ثاقب کان پوری

۹۷ مثنوی نگاری ۔ علی جواد زیدی ۱۹۷۵ء

۹۸ مجموعۂ نعت ۔ یتیم خانہ مدرسہ اسلامیہ اشرفیہ مبارک پور سنہ ندارد

۹۹ محراب جاں ۔ ایاز اعظمی ۲۰۰۱ء

۱۰۰ مدرسہ اشرفیہ سے الجامعۃ الاشرفیہ تک ۔ مفتی عبدالمنان اعظمی ۲۰۱۳ء

۱۰۱ مطالعات ومشاہدات ۔ ڈاکٹر الیاس الاعظمی ۲۰۱۰ء

۱۰۲ معالجاتی مشاہدات ۔ حکیم محمد ایوب بلریا گنج ۲۰۰۳ء

۱۰۳ مغربی بنگال میں اردو آزادی کے بعد ۔ جاوید ارشد ۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء

۱۰۴ مقالات احسان ۔ مرزا احسان احمد بیگ ۱۹۶۸ء

۱۰۵ منزل کی طرف ۔ علی مختار مبارک پوری، یوتھ لیگ مبارک پور سنہ ندارد

۱۰۶ موج صبا ۔ اختر مسلمی ۱۹۸۱ء

۱۰۷ موج نسیم ۔ اختر مسلمی ۱۹۶۱

۱۰۸ مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ ۔ مومن محی الدین ۱۹۹۴ء

۱۰۹ مئو، شہر ہنروراں ۔ ڈاکٹر شکیل احمد بار اول جون ۲۰۱۲ء

۱۱۰ مئے طہور ۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ۔ ترتیب وتقدیم قمر الزماں مبارک پوری ۲۰۰۶ء

۱۱۱ میں اور میری ادبی صلاحیت۔ مرزا احسان احمد بیگ ۱۹۷۱ء
۱۱۲ نمود سحر۔ شرر مصباحی۔ تنظیم ادب کٹرہ مبارک پور، فروری ۱۹۶۳ء
۱۱۳ واردات قلب۔ مولانا محمد اکرام الحق نقشبندی مجددی۔ اپریل ۱۹۹۷ء
۱۱۴ وفیات مشاہیر اردو۔ بشارت علی خاں فروغ ۲۰۰۰ء
۱۱۵ ہگلی اور اردو ادب۔ مشتاق احمد جامی۔ فروری ۱۹۸۶ء
۱۱۶ ہمارے گاؤں ہمارے لوگ۔ رضوان اللہ طبع اول ۲۰۱۱ء
۱۱۷ ہم قبیلہ۔ سید علی جواد زیدی۔ یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۰ء
۱۱۸ یہ بیچارے مولے۔ حکیم محمد ایوب بلریا گنج

اخبار و رسائل

۱۱۹ اخبار محمدی دہلی (متعدد شمارے)
۱۲۰ ماہنامہ آج کل دہلی (متعدد شمارے)
۱۲۱ ماہنامہ الجواد بنارس (متعدد شمارے اور خاص نمبر)
۱۲۲ ماہنامہ اعظم نامہ اعظم گڑھ (متعدد شمارے)
۱۲۳ ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ (متعدد شمارے)
۱۲۴ العلم بمبئی نعت خیر المرسلین نمبر
۱۲۵ ماہنامہ الواعظ لکھنؤ (مختلف سنین)
۱۲۶ ماہنامہ بزم سہارا
۱۲۷ ماہنامہ تجلیات رضا بریلی۔ بحر العلوم نمبر
۱۲۸ ماہنامہ خدنگ نظر لکھنؤ
۱۲۹ ماہنامہ زمانہ کان پور (متعدد شمارے)
۱۳۰ ماہنامہ شاعر آگرہ (متعدد شمارے)
۱۳۱ ماہنامہ شاعر بمبئی مشاعرہ نمبر ۱۹۵۰ء (متعدد شمارے)

۱۳۲ ماہنامہ شاہراہ دہلی (متعدد شمارے)
۱۳۳ شاہ کار بنارس۔ احتشام حسین نمبر
۱۳۴ ماہنامہ فیض الرسول براؤں، شیخ العلماء نمبر۔ اپریل، مئی ۱۹۷۷ء
۱۳۵ علی گڑھ منتھلی (مختلف شمارے)
۱۳۶ ماہنامہ ہم چشم مئو (متعدد شمارے)
۱۳۷ ہفتہ وار الاصلاح بمبئی
۱۳۸ ہفتہ وار انصار بہرائچ
۱۳۹ ہفتہ وار ترجمان بمبئی
۱۴۰ ہفتہ وار ہماری زبان دہلی
۱۴۱ سرفراز لکھنؤ (متعدد خاص نمبر)
۱۴۲ سہ ماہی اسلام اور عصر جدید نئی دہلی۔ اپریل ۱۹۷۶ء
۱۴۳ روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو لکھنؤ
۱۴۴ شبلی نیشنل کالج میگزین اعظم گڑھ (متعدد سال کے)
۱۴۵ گلدستہ پیام یار لکھنؤ (مختلف سنین کے)
۱۴۶ گلدستہ تحفۂ خوشتر گورکھ پور (متعدد شمارے)
۱۴۷ گلدستہ شاہد اضطراب رہبر پریس مرادآباد
۱۴۸ گلدستہ گلبن سخن بھوپال مرتبہ عبدالشکور اخلاصؔ
۱۴۹ گلدستہ محبوب الکلام۔ محبوب پریس حیدرآباد
۱۵۰ گلدستہ مشاعرہ سلمان بورڈنگ ہاؤس میور سنٹرل کالج الہ آباد ۱۹۱۴ء